

اگست 2017

میا بھر منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ



www.PakistaniPoint.Com

سلسلہ مورتی

زندہ مورتی

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

محمد رفیع
کامیاب
مختار شفیق

کافی
میرزا علی
منتظم

میں آمل پاکستان نڈر ہجہ سرائی
دکھن لکھنؤ پاکستان نڈر ہجہ سرائی

MEMBER
APNS
CPNE



ست رنگی کہانیاں

30

احمد صغیر صدیقی

کہانیوں کے نت نئے رنگ۔ عالمی معیار کی
مختصر ترین کہانیاں

جرم ہے محبت

74

اے ویرا

گھر کو برباد کرنے والی ایک لڑکی
کی نادانی

صدائے سحر

94

ہمیں سلمان

انسان کا پیٹ صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے جب
تک زندہ رہتا ہے کسی نہ کسی لالچ میں لگا رہتا ہے

رشتے

163

ریاض طاہر

دو سو تیلی بہنوں کے درمیان جھوٹ اور
غرض کی کہانی

زندہ مورتی

8

ایم اے راحت

قارئین عمران کے لیے ایم اے راحت کی
طرف سے ایک خاص تحفہ

انتہائے عشق

42

صائمہ عروج

دو پیار کرنے والوں کی حب الوطنی

بے وفا لمحے

84

انٹل چاکلہ

فرسٹریشن کا شکار ایک عورت کا انجام

پرائی عورت

151

سدیق کار

محبت و رقابت کا شاخسانہ

جیب کتری

181

عکریٹھ ٹکیش

حسن و ذہانت سے بھر پور ایک لڑکی
کا ماجرا

حادثہ

194

اولیں احمد

اس شمارے کی ایک منفرد انجام کی تحریر

عمر رفتہ

223

یاسین فرحت

عمر رفتہ کو آواز دینے والے بوڑھے
کی کہانی



خانہ برباد

173

حاتی عدیل

وہ سچا واقعہ جن کا کوئی عقلی جواز
ممکن نہیں

نیا سا جن پرانا آنکھن

188

احسان بن جان

شیطان کے بہکاوے میں آئی ایک عورت کی
شقی القلبی

احساس کی زنجیر

204

نوازش شاہین

اس شمارے کی ایک احساس دل گداز
سچی کہانی

اعتراف شکست

232

سہریہ ریکس

ایک حرمان نصیب کی کہانی اس کے تارتار
دل کو ایک رفوگر کی ضرورت تھی

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37- اردو بازار، کراچی

زندہ مورتی

ایم۔ اے۔ راحت

دوسری قسط

Pakistanipoint.com

ایم اے راحت اردو ادب کے چند بڑے ناموں میں سے ایک نام ہیں، آٹھ سو سے زائد ناووں کے لکھاری، کالا جادو، ناگ دیوتا، کمند، کالے گھاٹ والی کفن پوش، صندل کے تابوت ان کی دیو مالائی تخلیقات ہیں۔

انہوں نے بچوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھیں۔ جب کہ تلفظ اور املا کے ساتھ ایسی لفاظی کی کہ بچے باآسانی پڑھ کر ان کے گرویدہ ہوئے۔

عمران ڈائجسٹ کے لیے بطور خاص انہوں نے ایک اچھوتی تحریر لکھی ہے جو وہ اپنی زندگی میں مکمل کر کے گئے تھے جو یقیناً عمران ڈائجسٹ ایک اچھا اضافہ ثابت ہوگی

قارئین عمران کے لیے ایم اے راحت کی طرف سے ایک خاص تحفہ





پھر پہلے لڑکے نے گرجی کو گن کر پیسے اسے دیے اور کہا۔

”آج پورے پانچ ہزار کمائے ہیں۔“
”شباباش میرے چیتے، شباباش، چل فقیرے تو کیا لایا ہے۔“

”دو ہزار روپے۔“

”صرف دو ہزار۔“

”جی استاد۔“

”تو محنت نہیں کر رہا آج کل۔“

”بس استاد۔ کوئی شکار نہیں ملا۔“

”چل آگے بڑھ۔“ پھر ایک کے بعد ایک لڑکا آتا

رہا اور اپنے پیسے استاد کو دیتا رہا۔ میرا ڈر کے بارے برا حال تھا۔ میرے پاس تو پھولی کوڑی بھی نہ تھی۔ تو کیا مجھے مار دے گی۔ خیر پہلے غفلو بھی مارتا تھا۔ پھر مانی باری آگئی اور اس نے جیب سے پیسے نکالے۔

”استاد پورے نو ہزار روپے ہیں۔“

”ارے واہ میرے شیر۔ کیا یہ تم دونوں کی کمائی ہے۔“

”نہیں استاد میری ہے۔“ وہ فخر سے بولا۔

”شباباش۔۔۔ اور سورج تو کس کو نے میں کھڑا ہے۔“

میری جان کیا ہوا کہاں ہے تیرا مال۔“

”وہ استاد۔“

”ہاں ہاں بول۔“

”وہ استاد آج آج۔“

”کیا ہوا تجھے، دوبلی کیا ہوا اسے۔“

”کچھ نہیں استاد، اصل میں کوئی شکار نہیں ملا اسے۔“

”کیا۔۔۔ ابے سورج۔۔۔ تجھے کوئی شکار نہیں ملا نہ۔“

بھئی نہ میں مان ہی نہیں سکتا۔“

”استاد یہ سچ کہہ رہا ہے۔“ میں ڈرتے ہوئے بولا۔

”کیا۔“ استاد کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ پھر اس نے

کوٹے میں پڑا ڈنڈا اٹھایا۔ سب لڑکے کوٹے میں دیک

گئے۔ اس نے وہ ڈنڈا میری ٹانگوں پر رسید کیا۔

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

میرے منہ سے ایک کراہ نکلی اور پھر وہ مجھے مارتا رہا اور

جب سار کر تھک گیا تو رک گیا۔

”سارے۔۔۔ کل سے اگر پیسے نہ دے تو تیری ٹانگیں

توڑ دوں گا سالامال نہیں لایا۔ ارے دیکھو تو اسے ہوا کیا

ہے اس سورج کو براست ہو رہا ہے۔ سارے کا کھانا

بند کر دو خیر وار کوئی رات کا کھانا نہ دے اسے۔“

”اچھا استاد۔“ کسی نے کہا اور سب ادھر ادھر ہو

گئے۔

اچھی خاصی مار پڑی تھی۔ سارا بدن دکھ رہا تھا۔ اسی

کمرے میں ایک جگہ جا کر پڑ گیا اور آنکھیں بند کر کے

لیٹ گیا۔ کافی دیر یوں ہی گزر گئی۔ حلق میں کانٹے پڑ

رہے تھے، بھوک بھی لگ رہی تھی۔ پھر اچانک مجھے

بالی کی آواز آئی۔

”ابے سورج، ابے سورج۔“ اس کی آواز پر میں

نے آنکھیں کھولیں تو وہ پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

”یار میں نے کہا تھا کہ ہوش میں آجا۔ دیکھ لیا

پٹائی ہو گئی۔ بڑی ذور سے مار پڑی ہے۔“ پھر وہ زمین پر

بیٹھ گیا اور پانی میری جانب بڑھایا۔ میں نے پانی پیا اور

دوبارہ لیٹ گیا۔ بالی خاموشی سے گلاس لے کر واپس چلا

گیا۔

میں اسی خاموشی سے لیٹا رہا، پھر کافی رات گزر گئی

۔۔۔ دل عجیب سی کیفیات کا شکار تھا۔۔۔ میں عجیب

عذاب میں گم رہتا تھا، میں ضرور یہاں سے بھاگ جاؤں

گا، مجھے اس ماحول میں نہیں رہنا جہاں ہر لمحہ مار اور

پکڑے جانے کا خوف ہو۔۔۔ میں یہاں سے ضرور

بھاگ جاؤں گا۔“ میں نیم غنودگی کی حالت میں پڑا رہا

۔۔۔ نقاہت تھی یا زخموں کی تسکین مجھے نیند آگئی۔

صبح خود بخود میری آنکھ کھل گئی میں نے کمرے میں

مجیدے اور ایک کوٹے میں بالی کو دیکھا۔ دونوں ابھی

تک سو رہے تھے۔ بھوک سے میرا برا حال تھا کچھ دیر

بعد وہ بھی اٹھ گئے۔ پھر وہ دونوں باری باری ہاتھ دھو

گئے۔ انہوں نے مجھے سارا دے کراٹھانا چاہا۔

”نہیں اب میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کراہتے

ہوئے کہا۔ پھر اپنے پیروں پر چلتا ہوا ہاتھ دھو تک پہنچا

انہوں نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے۔

گیا تو سیدھا چلا جاؤں گا اور تو آہستہ آہستہ آجانا ٹھیک ہے نا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا اور شاید قسمت مجھے بھانگے کاموں دے رہی تھی۔

بالی نے ایک عورت کا پرس جھینا تھا اور وہ زور زور سے چلا رہی تھی اس کی چیخ پر کئی لوگ بالی کی جانب دوڑے اور مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بالکل مخالف سمت اختیار کر کے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا پھر میرے قدم تیز سے تیز ہوتے گئے۔ میں جی جان سے دوڑ رہا تھا۔ دل میں بس ایک ہی خیال تھا کہ مجھے استاد سے

جان چھڑانی ہے۔ بھاگتے بھاگتے جانے کوں سی جگہ آگئی تھی۔ پھر ایک چوترا نظر آیا۔ جس کے عین اوپر ایک درخت نے سایہ کیا ہوا تھا۔ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول گئی تھی۔ کچھ دیر سانس لینے کو میں اس چوترا پر آ بیٹھا اور اپنی سانس بحال کرنے لگا۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ بدن کے جوڑوں کا برا

حال تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی زمین پر دو ٹانگیں نظر آئیں۔ پشاور کی چپل پہنے ہوئے۔ میں نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور میری جان نکل گئی۔ یہ گریو سوائی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ پھر اس کا زور دار پھڑپھڑ میرے منہ پر پڑا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

”سلا بھاگ رہا تھا۔ پاتال سے بھی نکال لائیں گے ہم تجھے تیرے باپ ہیں ہم۔ اور وہ بالی کہاں ہے۔“

”دھم دھم۔“

”میں پوچھتا ہوں کہاں ہے بالی۔“

”وہ ایک عورت کا پرس پھین کر بھاگا تھا اور میں ادھر آ گیا۔“

”بس یہیں تو مار کھا گیا بڑا، میری پہنچ کہاں تک ہے یہ تیرے فرشتوں کو بھی پتا چل گیا ہو گا۔ اب تو اڑے پر چل۔ تیرا وہ حال کدوں گا۔ کہ نہ زندوں میں رہے گا نہ مردوں میں۔ چل ابھی تجھے پتا ناہوں۔“ اس نے کہا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا اور میں سہا ہوا اس کے ساتھ چلتے لگا۔ آہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

”میں خود چلا جاؤں گا میں ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے میرے ہاتھ چھوڑ دیے۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر آ گیا باہر کمرے میں ایک چائے کا کپ اور پراٹھا رکھا تھا۔

”یہ تیرا ناشتا ہے، ہم باہر ناشتا کر رہے ہیں تو جلدی سے ناشتا کر لے پھر دھندے پر چلتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مرے مرے انداز میں کہا پھر وہ دونوں چلے گئے۔ میں نے ناشتا کیا اور باہر آ گیا، استاد موجود نہیں تھا۔ البتہ بالی اور دو لڑکے وہاں موجود تھے۔

”چل بیٹا جلدی نکل۔ استاد دیکھے گا تو پھرتپ جائے گا۔“ بالی نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔ پھر ہم دونوں ایک طرف چلے گئے۔

ہم بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے، مجھے چلنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی۔

”شہزادے طبیعت کیسی ہے۔“ بالی نے اچانک کہا۔

”ٹھیک ہوں اب۔“

”بھوت اتر گیا ایک ننگ کک۔“ جواب میں میں خاموش رہا۔

بہر حال دوپہر تک ہم یوں ہی پھرتے رہے کوئی شکار نہیں ملا تھا۔ پھر بالی نے کہا۔

”شہزادے چل تجھے کھانا کھلاؤں، کل پورے پانچ سو بجائے تھے۔“

”کہاں سے۔“

”ابے وہی جو پاکٹ ماری تھی۔ اور کیا سارے پیسے دے دیتا استاد کو۔“

”تم یہ بھی کرتے ہو۔“

”یہ تو پتا حق ہے حق نہ ملے تو چھین لو۔“ اس نے کہا پھر ہم ایک ہوٹل میں پہنچے ذرا صاف ستھرا ہوٹل تھا یہاں ہم نے کھانا کھایا اور چائے پی، میری حالت کافی بہتر ہو رہی تھی۔ پھر ہم اگلے اور چلتے چلتے ایک بازار میں آ گئے۔ یہاں بے پناہ رش تھا۔

”میں یہاں کچھ ہاتھ پیر مارتا ہوں۔ اگر کامیاب ہو

کے فاصلے پر تھی۔ آواز آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور پھر رک گئی۔ میں سانس روکے دیکھتا رہا کہ اب دیکھو کیا ہوتا ہے تب ہی اچانک آواز آئی۔

”بس اب بہت دیر ہو گئی تھی تمہیں آرام کرتے ہوئے اب باہر نکل آؤ۔“ کسی نے کہا جانے کیوں اس عورت کی آواز جانی پہچانی لگی۔ مخاطب بھی شاید میں ہی تھا۔ پھر بھی میں چھپا رہا۔ میں نے سوچا ممکن ہے کسی اور کو پکارا گیا ہو۔

”سنئے نہیں ہو تم، میں تم سے مخاطب ہوں شاہو، صوفے کے پیچھے سے نکل آؤ۔“

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ یہ کون ہو سکتا ہے جو مجھے میرے نام سے پکار رہا ہے۔ اور اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ آواز میں نرمی تھی۔ جو مجھے بے حد پیار سے پکار رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جب میں نے اس عورت کی شکل دیکھی تو میری عاقبت روشن ہو گئی۔ میں نے اک لمحے میں اس عورت کو پہچان لیا تھا جس کی وجہ سے میں اس حال تک پہنچا تھا۔ دل تو چاہا کہ چھلانگ لگاؤں اور ان کا گلا گھونٹ دوں، لیکن میرے وجود میں جیسے جان نہیں تھی۔

”نکل آؤ صوفے کے پیچھے سے۔“ انہوں نے نرم اور مسکراتی آواز میں کہا۔ کجمنت کی صورت تو پہلے ہی بہت اچھی تھی۔ میں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود یہ عورت خوب صورت ہے۔ اس کے لمبے نے میری ہمت باندھی، انتقام کی آگ سینے میں جل رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ میں کسی کا کچھ نہیں لگاؤں سکتا۔ میں کمزور اور بے وسیلہ آدمی ہوں۔

”آؤ صوفے پر بیٹھو۔“ انہوں نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی صوفہ تھا جس کے پیچھے میں گھسنا تھا۔ میں نے صوفے کو دیکھا اور پھر اپنے حلیے کو اور کھڑا رہا۔

”یہ خیال دل سے نکال دو، بیٹھو مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”کیا اب بھی اپنا نام تسلیم نہیں کرو گے؟“

گرو مجھے ساتھ لے کر چل رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ بے رحم انسان پارمار کر میری ہڈیاں توڑ دے گا۔ اندر سے آواز آرہی تھی۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جا۔ اچانک ہی سامنے سے ایک پولیس کی موبائل نظر آئی۔ جو ہماری طرف آرہی تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر پولیس موبائل رکی اور اس میں سے سپاہی اور ایک انسپکٹر نیچے اترا اور کہا۔

”یہی ہے گرو سوامی۔ پکڑو اسے۔“

”ارے بھاگ بھاگ بیٹا ورنہ مارے گئے۔“ اس نے کہا اور خود ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ سب پولیس والے اس کی طرف بھاگے، میری خوش قسمتی تھی کہ کسی کو میرا خیال نہ آیا کہ میں بھی گرو کے ساتھ تھا۔

”سوامی رک جاؤ ورنہ گولی چلا دیں گے۔“ انسپکٹر چلایا۔ وہ رکے بنا ایک دیوار پھلانگتا اور غائب ہو گیا پھر پولیس کو میرا خیال آیا۔ اور انہوں نے کہا۔

”یہ بھی اس کے ساتھ تھا پکڑو اسے، یہ بتائے گا کہ گرو کہاں ہے۔“

”ارے باپ رے۔“ میں نے سر ہٹ بھاگنا شروع کر دیا۔ میں یوں بھاگ رہا تھا جیسے موت میرے پیچھے پڑی ہے میں بھاگتا رہا مجھے نہیں پتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ بس یہی دھن تھی کہ مجھے اپنی جان پہچانی ہے۔ پولیس میرے پیچھے تھی یا نہیں میں نہیں جانتا تھا، اچانک مجھے ایک دیوار نظر آئی اور میں نے اسے پھلانگ لیا۔ یہ دیکھ بٹا کہ یہ عمارت کیسی ہے۔ اندر کودتے ہی مجھے جو دروازہ نظر آیا میں اس میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں مجھے صوفہ نظر آیا اور میں اس کے پیچھے گھس گیا اور اپنی سانس بحال کرنے لگا۔ میں زندگی کے بڑے عذاب میں گھر گیا تھا اور اب دیکھنا تھا کہ قسمت کیا گل کھلاتی ہے۔ پولیس والے اندر نہیں آئے تھے۔ انہوں نے مجھے کودتے ہوئے شاید نہیں دیکھا تھا۔ میں صوفے کے پیچھے آوندھے منہ لیٹ گیا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ مجھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور میں ہوشیار ہو گیا، مصیبت اب چند گز

مارے مارے پھرتے ہیں، بس کبھی کبھی کوئی نیک دل پسند آجاتا ہے۔ جس سے میں اپنا کام لیتا چاہتی ہوں۔ لیکن کئی بد قسمت ایسے ہیں جو میری بات نہ مان کر اپنی زندگی کو بیٹھتے ہیں۔
”کون سی بات۔“

”وہ جو میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں۔“
”تو بتائیے پھر۔ بتائیں، یوں سمجھ لیں کہ میں اب مرجانے کی حد تک پریشان ہو گیا ہوں۔“
”اس میں تمہاری غلطیاں ہیں۔“
”میری کیا غلطی ہے جی۔“

”سنو شاہو۔ زندگی کے دوسرے ہوتے ہیں سیاہ سفید۔ روشن تاریک۔ انسان ان میں سے رخ کا انتخاب خود کرتا ہے۔“
”لو جی، انسان اپنی مرضی سے سورج چاند کیسے نکال سکتا ہے۔“

”سورج اور چاند نہیں نکال سکتا لیکن اپنی زندگی روشن اور تاریک کر سکتا ہے۔“
”میں نے تمہیں زندگی کے دوسرے دکھائے ہیں، تم فقیر تھے تو کیا تمہارا کوئی مستقبل تھا۔“
”نہیں جی۔۔۔“

”تم ہاتھ پھیلاتے تھے اور مانگنے کے لیے اماں حلیمہ کی معذوری کا سہارا لیتے تھے۔“
”سب فقیر ایسا ہی کرتے ہیں۔“
”یہ بتاؤ نیچے والا ہاتھ عزت والا ہوتا ہے یا اوپر والا۔“

”مسوال ٹیڑھا ہے جی۔۔۔“
”جواب دے۔“
”نیچے والا ہاتھ ایک فنکار کا ہوتا ہے، بھیک مانگتا بھی ایک فن ہے۔“
”چلو مان لیا کہ تم دلوں کو متاثر کر کے بھیک مانگتے ہو۔ لیکن بھیک دینے والے کو کیا کہتے ہو؟“

”وہ بے وقوف ہوتا ہے جی۔۔۔ میں نے کہا اور خود ہی ہنس پڑا۔ بیگم صاحبہ بھی میرے ساتھ ہنس پڑیں۔“
”کہتے تو تم ٹھیک ہو انسان جانے کیسے کیسے دولت

”کیسا نام۔۔۔“
”یہی کہ تم شاہو ہو۔“
”میں نے کب انکار کیا، لیکن لیکن۔“
”جو تمہارے ذہن اور دل میں ہے وہ میں جانتی ہوں۔“

”آپ نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اماں حلیمہ۔“
”مجھے سب معلوم ہے، مگر زری باتیں مجھے سنانے کی کوشش نہ کرو۔“
”اماں حلیمہ تو بے موت ماری گئی۔“

”کوئی بے موت نہیں مارا جاتا، اس کے بارے میں ام۔مہ میں بتا دیں گے، تم سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بتاؤ کچھ لٹاؤ کے یا پچ کے۔“
”نہیں بیگم صاحبہ، آپ کو خدا کا واسطہ۔“
”مجھے کسی کا واسطہ نہ دو، براہ راست بات کرو۔“

”ہم۔۔۔ مگر میری جان بخشی کروں۔“
”کوئی کسی کی جان نہیں بخشا، ہر کوئی اپنی جان خود بخشا ہے۔“
”میں سمجھا نہیں۔“
”یہی تو سمجھانا چاہتی ہوں۔“

”بیگم صاحبہ ایک بات بتاؤں آپ کس۔۔۔“
”ہاں۔۔۔“
”پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔“
”مجھے سب معلوم ہے۔“
”آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پچھلے دنوں مجھ پر کیا

”گزرتی رہی۔“
”تم مجھ سے پوچھو گے تو میں تم کو ایک ایک لمحہ بتاؤں گی۔“
”آپ کو سب کیسے معلوم ہوا۔“
”بس میری معلومات کے کچھ ذریعے ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

”آپ کو پتا ہے کہ میں بے قصور ہوں، میں اپنے ذریعے پر واپس جانا چاہتا ہوں۔“
”شاہو پچاس لاکھ انسان جانے کہاں سڑکوں پر

کھاتا ہے اور پھر خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ دولت
تم جیسے میں تقسیم کرتا پھرتا ہے۔“
”ہمارا کام جیسے کانٹے سے تو اچھا ہے۔“
”جیسے تو تم بھی کانٹے ہو۔ خیر چھوڑو۔ تم اپنے کام

سے خوش تھے۔“
”اور کیا کرتا بی۔“
”تم اپنے بارے میں نہیں جانتے۔ تم اپنے بارے
میں کچھ بھی نہیں جانتے میں نے تمہارا انتخاب ایسے تو
نہیں کیا تا۔“
”کیا مطلب۔“

”تم فقیر تھے۔ پھر تم شادی محل میں گئے۔ تمہیں
دلیر سنگ کے نام سے پکارا گیا۔ باندیاں تمہارے
ارد گرد گھومتی تھیں، تمہاری خدمت کرتی تھیں۔ مگر
تم تھے کہ تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آ رہی تھی۔“
”آپ کو معلوم تھا بی۔“

”بار بار مجھ سے یہ سوال نہ کرو۔“
”لیکن میں دلیر سنگ تھے نہیں تھا۔“
”اس دنیا میں بہت سے لوگ روپ بدل کر رہتے
ہیں، کوئی کچھ نہیں ہوتا، لیکن بن جاتا ہے دولت کے
کیے ایسے کچھ بھی بننا پڑے بن جاتا ہے۔“
”اس کا مطلب میں دلیر سنگ بنا رہا تھا۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن تم وہ بن کر نہیں رہ سکتے تھے، وہ تو
ایک نمونہ تھا جو تمہیں دکھایا۔ کیسی گلی وہ زندگی؟“
”زندگی تو مزے کی تھی، لیکن یہ ڈر تھا کہ اصل دلیر
سنگ آگیا تو جو تے برس گے۔“
”وہ کبھی نہیں آتا۔“
”کیوں؟“

”کہونکہ دلیر سنگ کوئی ہے ہی نہیں۔“
”لیکن وہ مجھے اسی نام سے پکار رہی تھیں۔“
”وہ سب میرا کھیل تھا۔“
”کھیل۔۔۔“
”ہاں۔۔۔ کھیل۔۔۔“
”وہ کیسے؟“

”میں بتا رہی ہوں۔ بس تم غور کرتے جاؤ۔“

”غور کر رہا ہوں بی۔“
”میں نے تمہیں وہ روپ دکھایا ہے جو روش
تھا۔“

”آپ نے یہ روپ دکھانا تو مجھے پہلے بتایا ہوتا۔“
”نہیں بتانے کی ضرورت نہیں ابھی تم سے بہت
سے کام لینے ہیں مجھے یہ تو امتحان تھا تمہارا۔“
”عجب امتحان تھا بی۔ وہ لوگ ہمیں سانپ کو سجدہ
کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔“
”تم نے جو زندگی پائی تھی شاہو۔ اس زندگی میں اگر
تم یہ تمہارا سا کام لیتے تو کیا ہو جاتا۔“

”بس جی دیکھو۔ یہ کام تو ہمارے لیے مشکل ہے
بیگم صاحبہ۔ ہم ویسے تو نماز نہیں پڑھتے۔ مگر کبھی
کبھی فضلو کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے چلے جاتے
تھے۔ مولوی صاحب اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے۔ وہ
کہتے تھے کہ انسان کو نماز پڑھنی چاہیے۔ بیگم جی ہمارا
دھندہ تو کچھ ایسا ہی ہے کہ گندے مندرے رہنا پڑتا
ہے۔ اب آپ خود بتائیے نماز تو وہ لوگ پڑھ سکتے ہیں۔
جن کے پاس اتنے صاف ستھرے کپڑے ہوں اور پھر
بیگم صاحبہ جی نماز پڑھنے جاتے تو فضلو شائی کرتا۔“
”کتے رہو، کتے رہو۔“

”مگر ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، اللہ
کے سامنے تو ہم سجدہ کر سکتے ہیں، وہ تو سانپ کے
سامنے ہم سے سجدہ کرنے کا کہہ رہے تھے۔“
”اگر تم سانپ کو سجدہ کر لیتے تو تمہیں پتا ہے
تمہیں کیا مل جاتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ہمارا ایمان تو چلا جاتا۔“
”کیسی باتیں کرتے ہو شاہو۔ اس دنیا میں لوگ
پیسے پیسے کے لیے اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔ تم بہت
بڑے آدمی بننے کے لیے اپنا ایمان بیچ رہے تھے۔“
”نہیں بیگم صاحبہ۔ یہ ہم نہیں کر سکتے تھے۔“
”اور اس کے بعد شاہو تم نے زندگی کا دوسرا روپ
دیکھا۔ یعنی بالی کے ساتھ ایک جیب کترے کے روپ
میں۔“

”ہاں جی۔۔۔“

”میں تمہیں بادشاہ بنا سکتی ہوں۔“

”آپ۔“

”ہاں۔“

”تو پھر اس سے بھلا کس کو انکار ہو گا۔“

”شان دار کار میں تمہارے آگے پیچھے ہوں گی۔
لوگ تمہیں عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے، سب
تمہارے آگے پیچھے گھومیں گے۔ کیا تم یہ پسند نہیں
کرو گے۔“

”کریں گے۔ پھر تو ہم فقیروں کی بستی میں بھی
جائیں گے اور فخلو کو اپنے ہاتھ سے بھیک دیں گے۔“
”ہاں تم کر سکتے ہو اور میں وعدہ کرتی ہوں۔ ایک دن
تم کو فقیروں کی بستی میں لے جاؤں گی۔“
”تب تو بھیک ہے جی۔ لیکن ہم اپنا نام نہیں بدلیں
گے۔“

”ہاں نہیں بدنا۔“

”کرنا کیا ہو گا ہمیں۔“

”سہلے تو تم مجھ سے سات بار اقرار کرو کہ جو کچھ میں
کہوں گی وہی کرو گے۔“
”وہی کروں گا۔“

”کسو سات بار۔“ اور اس کے بعد میں نے سات
بار بیگم صاحبہ کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ میں وہی
کروں گا جو بیگم صاحبہ کہیں گی۔ بیگم صاحبہ مسکرانے
لگیں، پھر انہوں نے کسی کو آواز دی۔
”پاروتی۔ او پاروتی۔“ اندر سے ایک خوب
صورت سی عورت نکل آئی۔

”دیکھو یہ شاہو ہے۔ اسے صاف ستھرے کپڑے
دو۔ اچھا کھانا دو اور آرام سے ایک کمرے میں رکھو۔
تین دن کے بعد میں اس سے ملاقات کروں گی۔“
”جی کر شاہی۔“ پاروتی نے کہا تو مجھے پہلے بار اس
عورت کا نام معلوم ہوا۔ باہر کی خوف ناک دنیا سے بہتر
تھا کہ کچھ وقت میں کرشنا کے ساتھ گزارنا۔ اس لیے
میں پاروتی کے ساتھ چل دیا۔

”اتنے موڑ۔ اتنے الٹ پھیر۔ اوپر والے تیرے
کھیل نزلے۔ جانے ابھی کتنے کھیل میرے منتظر

”نویس، ٹھو کریں، جوتے گولیاں اور اس کے بعد
زندگی کا خاتمہ، کیسا ریتا اگر تمہارے بدن میں چار
گولیاں ہیوست ہو جاتیں۔“

”ہم مر جاتے۔ سارے بدن کا خون نکل جاتا۔“

”تم کو خشق تو یہی کر رہے تھے نا۔“

”نہیں بیگم۔ قسم لے لو ہم تو بس جا بھینے تھے
وہاں۔ وہ سر نہ جانے ہمیں کیوں سورج کٹنے لگے
تھے۔“

”یہ بھی میری ہی تخلیق تھی۔“

”کہنا مطلب ہے جی۔“

”اگلی۔ تم کوئی مطلب نہیں سمجھو گے۔ اب بتاؤ
”لوں میں سے کون سا روپ پسند ہے، تمہیں دلیر سنگھ
والا یا یہ۔“

”یہ کون سا جی۔“

”میرا مطلب ہے گرو سوامی کے ساتھ۔“
”نہیں جی۔ خدا کے لیے اس سے تو ہمیں بچالیں
بیگم صاحبہ۔“

”نہیں کہتے ہو تم اپنی کوشش سے۔“

”مطلب۔“

”دیکھو اگر تم میری باتیں مان لیتے ہو، میرے ساتھ
تعاون کرتے ہو تو تم وہی زندگی گزارو گے جو دلیر سنگھ
والی زندگی تھی، یہ دور دلیر سنگھ کا نہیں، راجاؤں کا دور
نہیں۔ لیکن عالی شان کوٹھیوں میں رہنے والے، شان
دار بنکوں میں پرورش پانے والے، قیمتی گاڑیوں میں
باہر گھومنے والے دلیر سنگھ ہی ہوتے ہیں۔“

”مگر ہم تو شاہو ہیں جی۔“

”میں تمہیں دلیر سنگھ بنانا چاہتی ہوں۔“

”میں یہ نام بھی نہیں بدلوں گا اپنا۔“

”نہ بدلو۔ شاہو ٹھیک رہے گا۔ شاہ جانتے ہو کس
کو کہتے ہیں۔“

”بادشاہ کو جی۔“

”بادشاہ تو تم ہو، مگر جدید دور کے بادشاہ۔“

”ارے چھوٹیے بیگم صاحبہ، ہم کہاں سے آئے
بادشاہ۔“

ڈرتے ہوئے وہ مورتی پکڑ لی۔
 ”اب تم سمجھ لو کہ یہ مورتی ہر اس جگہ تمہارے
 کام آئے گی جہاں پیسہ بھی تمہارے کام نہیں آئے
 گا۔“

”وہ کس طرح۔۔۔“
 ”جب تم اسے استعمال کرو گے تو تمہیں پتا چل
 جائے گا۔“

”آپ کی باتیں مجھے مشکل سے ہی سمجھ میں آتی
 ہیں۔“ میں نے کہا تو بیگم صاحبہ ہنس دیں۔
 ”سب سمجھ جاؤ گے۔ تیاریاں کر لو آج گھومنے کی۔
 اپنا لباس خود منتخب کرو۔ الماریاں تم نے دیکھ لی ہیں۔
 جاؤ تیار ہو کر آ جاؤ، پھر باہر گھومنے چلتے ہیں۔“
 ”جی اچھا۔۔۔“
 ”اور سنو۔۔۔“

”اس مورتی کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرنی اور
 ایک لمحہ کے لیے بھی اسے خود سے الگ مت کرنا
 سمجھ۔“

”جی سمجھ گیا۔“ پھر میں واپس کمرے میں چلا گیا۔
 جو لباس نظر کو سب سے خوب صورت لگا وہ نکال لیا۔
 نما کر کپڑے بدلے اور تیار ہو کر مورتی پکڑی اور باہر
 آ گیا۔ بیگم صاحبہ مجھ سے پہلے ہی تیار کھڑی تھیں۔
 انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور دیکھتی رہ گئیں۔
 ”بہت سندر لگ رہے ہو۔“

”جی شکریہ۔“ میں شرمایا۔
 ”مورتی کہاں ہے۔“ اور میں نے اندرونی جیب
 سے مورتی نکال کر ان کو دکھائی۔

”شاباش۔ اس مورتی کو اپنے پاس رکھا کرو۔“
 ”جی۔۔۔ میں نے کہا۔“

”چلو۔۔۔“ انہوں نے کہا اور ہم باہر نکل آئے۔
 ”باہر ایک جدید ماڈل کی کار موجود تھی۔ ڈرائیور
 نے کار کا دروازہ کھولا اور بیگم صاحبہ نے مجھے بیٹھنے کا
 اشارہ کیا، پہلے تو میں جھجکا، پھر بیگم صاحبہ نے کہا۔
 ”اسے اپنی ہی کار سمجھو شاہو۔ شاباش بیٹھ جاؤ۔“
 میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر بیگم صاحبہ

”ہیں۔“
 انسان ہمیشہ اپنے لیے آسائشیں تلاش کرتا ہے،
 حالانکہ حالات کبھی کبھی اس کی بالکل سمجھ میں نہیں
 آتے۔ میں بھی ان سارے معاملات کو سمجھ نہیں سکا
 تھا۔ پھر تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن بیگم صاحبہ خود
 آ گئیں۔ خوش گوار موڈ میں کھنکھنے لگیں۔
 ”لےسے ہو شاہو۔“

”ٹھیک ہوں بیگم صاحبہ۔“
 ”نتی جگہ پسند آئی۔“
 ”بہت اچھا ماحول ہے۔“ طبیعت خوش ہو گئی

”چلو اچھا ہے۔ تمہاری طبیعت اچھی ہوئی۔ کیسی
 لگی یہ زندگی۔“
 ”ظاہر ہے جی ہر کسی کو ایسی زندگی اچھی لگتی
 ہے۔“
 ”پھر کیا سوچا؟“

”جب میں نے کہہ دیا کہ میری ہر حرکت آپ کے
 حکم کی تابع ہوگی، تو پھر میں وہی کروں گا جو آپ کو پسند
 ہو گا۔“

”دیکھو شاہو، آج کے دور میں انسان ہر چیز کو حاصل
 کرنے کے لیے پیسہ استعمال کرتا ہے، پیسہ آج کی
 سب سے بڑی حقیقت ہے۔ طاقت ہے۔ رگوں میں
 دوڑتی ہوئی زندگی ہے، لیکن کچھ چیزیں پیسوں سے بھی
 حاصل نہیں ہوتیں۔“
 ”میں سمجھا نہیں۔“

”سمجھ جاؤ گے۔ سب سمجھ جاؤ گے۔“ انہوں نے
 کہا اور پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا پےس میں سے کوئی چیز
 نکالی اور میرے سامنے ہاتھ کر دیا۔ میں نے وہ چیز
 دیکھی۔ یہ پیتل کی ایک مورتی تھی۔ سر سے پیر تک
 چادر میں لباس ایک عورت کی مورتی۔ اس کی سب
 سے بڑی خاصیت اس کا حجم تھا۔ یہ صرف ساڑھے
 تین انچ کی تھی، لیکن اتنی خوب صورت تراش خراش
 کہ جود بھٹکا دیکھتا رہ جاتا۔

”تمہارے لیے ہے۔ لے لو۔“ اور میں نے

میرے ساتھ آکر بیٹھ گئیں۔ میں تھوڑا سا کسمسلیا۔ لیکن ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پھر ڈرائیور نے کار اشارت کی اور آگے بڑھادی۔ بالی کے ساتھ شہر دیکھنے کی کیفیت عجیب تھی۔ لیکن اب یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ صاف ستھری سڑکیں، بازار، گاڑیاں سب کچھ بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ یہ شاید احساس کی بات تھی۔ انسان جب مصیبت میں ہو تو اسے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہر کوئی دشمن لگتا ہے۔ لیکن اب مجھے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

”کیسا لگ رہا ہے۔“

”بہت اچھا۔“

”یہی ہے زندگی۔“

”بہت اچھی۔ بے حد حسین۔“

”بس میری ہدایات پر عمل کرتے جاؤ۔ زندگی اس سے زیادہ اچھی لگے گی۔“ میں جواب میں ایک مسکراہٹ کے ساتھ خاموش رہا۔ پھر کار مختلف راستوں سے گزرتی ایک جگہ جا کر رکی۔ یہ شاید کوئی ہوٹل تھا۔ لیکن اتنا شان دار۔ یہاں تو صرف امیری ہی آلتے تھے۔ پھر ڈرائیور نے کار پارک کی اور بیگم صاحبہ نیچے اتریں، پھر مجھ سے کہا۔

”چلو نیچے اترو۔“ اور میں حیران و پریشان سا نیچے اتر آیا۔ سامنے آٹھ دس سیڑھیاں تھیں۔ جس کے بعد ایک شیشے کی دیوار تھی اور وہاں باوردی پسرے دار کھڑے ہوئے تھے۔

بیگم صاحبہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیاں طے کرنے لگیں۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا، جیسے ہواؤں میں اڑ رہا ہوں۔ دربان نے ادب سے ہمیں دوسرے کمرے کا سلام کیا۔ ان تین دونوں میں باوردی نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ بیگم صاحبہ نے بڑی رعونت سے اس کے سلام کا جواب دیا اور میں نے سر ہلادیا اور پھر ہم اندر چلے گئے۔

اندروں ایک بہت بڑی جگہ تھی۔ جس کے ایک طرف کلاؤن رہتا ہوا تھا۔ جس کے پیچھے چند لڑکیاں اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ آگے بڑھے تو دایمیں اور

بائیں جانب شیشوں کے دروازے نظر آئے۔ سامنے کی طرف سیڑھیاں تھیں۔ پھر بیگم صاحبہ نے دائیں جانب کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ ایک کھلا ہوا حصہ تھا، اس کھلے ہوئے حصے میں تھوڑے فاصلے پر سونگ پول تھا۔ جس میں خوب صورت لڑکے لڑکیاں نہا رہے تھے۔ کچھ چھتریوں کے نیچے لیٹے تھے۔ میں حیران و پریشان یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میری نظر بیگم صاحبہ کی جانب اٹھی، وہ مجھے ہی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”کیسی ہے یہ جگہ۔“

”بہت اچھی بیگم صاحبہ۔“

”نہیں اب تم مجھے صرف میڈم کہو گے، صرف

میڈم۔“

”جی میڈم۔“

”شباباش۔ مجھے تمہاری یہ ہی اوپنڈ ہے، اچھا ان

لڑکیوں کو دیکھ رہے ہو۔“

”جی۔“ میں مسکرایا۔

”وہ سب تمہاری ہیں۔“

”ہی ہی ہی۔“

”ویسے تو سب اچھی ہیں، تمہیں کون سی پنڈ

ہے؟“ جواب میں، میں خاموش رہا، لیکن چہرے پر

مسکراہٹ تھی۔

”کون سی چاہیے۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”ہوں۔“

”میں نے پوچھا کون سی پنڈ ہے۔“ میں پھر

خاموش رہا۔

”وہ مورتی ہے نا تمہارا پاس۔“

”جی۔“

”اس کا کام دیکھو، اس نکال کر اپنے ہاتھ میں لے

لو۔“

میں نے جیب سے مورتی نکال کر اسے اپنے دائیں

ہاتھ پر رکھ لیا اور بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔

”اب اپنی پنڈ کی لڑکی کی طرف دیکھو۔“ اور میں

نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ

کے لوگ اہل حلیہ، جس کو آپ نے۔۔۔
 ”دیکھو شاہو، ہر عمل کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔
 بعض چیزیں تو ہمیں وقتی طور پر عجیب لگتی ہیں، بری
 لگتی ہیں، لیکن وقت آنے پر ہمیں ان کا اصل محرک
 پتا چل جاتا ہے تو ہم سوچتے ہیں کہ واقعی وہ کام ہمارے
 لیے بہتر تھا۔ اس لیے اہل ان واقعات کو بھول جاؤ
 اور آگے کی طرف دیکھو، ایک روشن کل کی طرف جو
 تمہارا بے چینی سے منتظر ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ پھر چائے اور سینڈویچ آگئے۔
 ہم نے خاموشی سے کھایا۔ میڈم نے بل ادا کیا تو ہم
 وہاں سے اٹھ گئے۔ ابھی ہم بیڑھیوں سے اتر ہی رہے
 تھے کہ ہماری کارین اس جگہ آکر کی جہاں اس نے
 ہمیں اتارا تھا۔ ہم کار میں بیٹھے اور کار ہوٹل کے
 احاطے سے باہر نکل آئی۔

”ریس کورس۔“ میڈم نے کہا اور ڈرائیور نے
 گردن ہلکا کر کار کا رخ بدل دیا۔

”شاہو۔ ہم ریس کورس جارہے ہیں۔“

”جی میڈم۔“

”تم نے اس سے پہلے کبھی ریس کورس دیکھا

ہے۔“

”دیکھا نہیں۔ لیکن نا ہے۔ ہمارے ڈیرے پر

ایک فقیر تھا وہ ریس کے لیے جاتا تھا۔“

”ہں۔ فقیر ریس بھی کھیلتے ہیں۔“ بیگم صاحبہ

ہنس دیں۔

”ہاں اور ہمیشہ ہار کر آتا تھا۔“

”چھا۔“

”اور پھر رات رات بھر وہاں سب مذاق اڑاتے

تھے۔“

”ہائے بے چارہ فقیر۔“ وہ ہنس دیں اور یوں ہنستے

اور باتیں کرتے ریس کورس آگیا۔ ہم کار سے اترے

اور اس طرف چل پڑے، جس طرف تماشاویں کے

بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ایک بیچ پر ہم بیٹھ گئے۔ پھر ریس

شروع ہونے کا اعلان ہوا اور میدان میں گھوڑے

آگئے۔ ہر کوئی اپنے گھوڑے کے ساتھ میدان میں

بیگم صاحبہ کی اس مورتی میں کیا کمال ہے۔ جو اس
 طرح بڑھ چڑھ کر اس کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔
 پھر میں نے ایک لڑکی کو مسلسل گھورتا شروع کر دیا۔ وہ
 ان سب میں سب سے خوب صورت تھی۔ دودھ جیسے
 سفید ہاتھ پاؤں، انتہائی معصوم سی شکل، پھر میں نے
 دیکھا وہ لڑکی چوٹی، پھر وہ پانی سے نکل آئی اور اس کے
 قدم بے اختیار ہماری جانب بڑھنے لگے۔ وہ ہمارے
 قریب آکر رگ گئی، میں حیران و پریشان یہ سب دیکھ رہا
 تھا۔ اس کے بعد اچانک اسے ایک جھٹکا لگا۔ لیکن وہ
 سنبھل گئی، پھر اس نے ہمیں دیکھا اور بولی۔

”آپ نے بلایا ہے مجھے۔“

”جے بی آپ بہت خوب صورت ہیں۔“ بیگم

صاحبہ نے کہا۔

”شکریہ۔ لیکن آپ نے مجھے بلایا کیوں۔“

”کچھ نہیں بے بی، تم اچھی لگی ہو، بہر حال اب تم

جاسکتی ہو۔“

”چھا۔“ وہ حیران و پریشان واپس مڑ گئی اور ہمیں

مڑ مڑ کر دیکھنے لگی۔ میں نے بیگم صاحبہ کی طرف

دیکھا۔

”زبردست۔ زبردست۔ میڈم میں بہت حیران

ہوں۔ آخر ایسی کیا بات ہے اس میں جو مجھے نظر نہیں

آتی۔ لڑکی مورتی، مورتی لڑکی۔“

”ہاں یہ اسی مورتی کا کمال ہے۔ یہ مورتی ہاتھ میں

لے کر جس چیز کے حصول کی خواہش کر دے وہ ہاتھ

میں آجائے گی۔ آؤ کچھ کھاتے ہیں۔“ میڈم مجھے لے

کر پھر اسی دروازے سے واپس مڑ گئیں۔ پھر ہم بائیں

دروازے کی جانب مڑ گئے۔ یہ ایک بڑا ڈانکن ہال

تھا۔ ہم ایک میز پر جا بیٹھے۔ ایک ویٹر فوراً ہماری

جانب بڑھا تھا۔

”جی میڈم۔“

”کلب سینڈویچ۔ اور چائے۔“ ویٹر نے آرڈر

نوٹ کیا اور چلا گیا۔

”پچھلی زندگی یاد تو نہیں آتی۔“ میڈم نے پوچھا۔

”آتی ہے۔ بہت سے لوگ یاد آتے ہیں۔ ڈیرے

آگے نکل گیا۔ وہ یوں دوڑ رہا تھا جیسے بجلی سے چل رہا ہو۔ پانچ بمبر صرف پانچ انچ کے فاصلے سے جیتا تھا۔ لوگ حیران و ریشان ٹکڑے تھے۔ میڈم نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

”کمال ہے۔ واقعی کمال ہے۔“ میرا لہجہ دھیما تھا۔ بیگم صاحبہ نے کچھ نہ کہا۔ پھر ہم وہاں سے اٹھ گئے راستے میں بیگم صاحبہ کہنے لگیں۔

”دیکھا شاہو۔ جیت اب تمہارا مقصد ہے۔ تمہیں اب کوئی نہیں ہراسکتا۔ اب تم جو چاہو گے تمہارا ہوگا۔“

”جی میڈم۔“ میں خاموش ہو گیا۔ پھر اسی خاموشی سے راستہ طے ہونے لگا۔ پھر بیگم صاحبہ بولیں۔

”یہ مورتی تمہارے پاس ہے۔ اس سے تم کروڑوں کے مالک بن سکتے ہو۔ ہر وہ کام کر سکتے ہو جو عام حالات میں ناممکن ہو۔ لیکن یاد رکھنا ہر چیز کا ایک طریقہ ہے۔ ایک انداز ہے۔ جلد بازی ہر کام کے لیے بری خیال کی جاتی ہے۔ اور اس طرح بے ترتیبی کام لگاڑی ہے۔ اس لیے ہر کام دھیان سے ترتیب سے کرنا ہی اچھا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔“

”جی میڈم۔“

”چنانچہ تم بھی ان سب چیزوں کا خیال رکھنا۔“

”جی۔“

”پھر ہم واپس کوٹھی میں پہنچ گئے۔ میں خوش بھی تھا اور حیران بھی۔ پھر ہم ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔“

”کوٹھہ شاہو مزا آیا۔“

”بہت مزا آیا۔“

”بس اب دیکھتے جاؤ۔ زندگی کیسے مزے سے گزرتی ہے۔“

”واقعی۔ زندگی کا اصل لطف اب آرہا ہے۔“

”چھ۔۔۔ چلو اچھا ہے۔ وہ مورتی کہاں ہے۔“

”میرے پاس ہے۔“

”اسے نکالو۔“

آ رہا تھا۔ پھر سب گھوڑے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے سوار ان کی زین درست کرنے لگے۔ پھر ایک آدمی نے ہوائی فائر کی اور تمام گھوڑے دوڑ پڑے۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ایسے بیچ رہے تھے، جیسے چھلی بازار میں ہوں۔ بلکہ شاید وہاں بھی یہ کیفیت نہ ہو۔

”بے دوڑ۔ ابے چنک دوڑ۔ الو کے شے دوڑ۔ ابے نو نمبر تھہر دو لاکھ لگائے ہیں کم بخت۔“ بیگم صاحبہ نے ہنسنے لگے۔ مجھے دیکھا، میں ہانپ رہی تھی۔ ریس دیکھ رہا تھا۔ میں نے جانا کہ جوا، دانی، ہا۔۔۔ بیت کی خوشی ناقابل بیان اور دیوالیہ ہو جانے کا فہم بے تماشاً، بہر حال عبرت ناک مناظر تھے اور پھر دوسری ریس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

بیگم صاحبہ نے کہا۔

”شاہو۔۔۔“

”جی۔“

”دوڑتی نکالو۔“

”جی امپاس۔“ اور میں نے مورتی نکالی۔

”بس اب دیکھنا اس کا کمال۔“ میں نے عجیب سی نظروں سے ان کو دیکھا۔ اور پھر ریس شروع ہو گئی۔

”مورتی ہاتھ میں ہے نا۔“

”جی۔“

”اب دیکھو۔ کون سا گھوڑا جیتا ہے۔“

”جی۔“

”جلدی بولو۔ وقت نکل رہا ہے۔“ میں نے پوری توجہ کے ساتھ دیکھا اور ایک مرل سا گھوڑا مجھے نظر آیا جو سب سے آخر میں دوڑ رہا تھا۔ اس کا نمبر پانچ تھا۔

میں نے سوچا دیکھوں یہ گھوڑا کیسے جیتتا ہے۔ اس کے لیے میں نے اس پر جوا لگایا۔

”نمبر پانچ۔“

”بڑی تیز نظر ہے شاہو تمہاری۔ بہر حال کمال دیکھو۔“

اور پھر واقعی کمال ہو گیا۔ وہ مرل گھوڑا سب سے

قدی کرنے لگا۔ پاروتی نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی اور جلد ہی ملازم کے ساتھ ناشتا لے کر آگئی۔ اور لان کی ایک میز پر ناشتا لگا دیا۔ پاروتی میرے قریب بیٹھ گئی۔
”تم جاؤ۔“ پاروتی نے ملازم کو واپس بھیجا۔
”تم نے ناشتا کیا۔“
”جی۔“

”اچھا چائے تو پیو گی میرے ساتھ۔“
”جی ضرور۔“ پھر اس نے میرے اور اپنے لیے چائے بنائی۔ میرا کپ مجھے دیا اور خود اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس دوران وہ مجھ پر باتیں کرتی رہی۔ ابھی میں ناشتا سے فارغ ہوا تھا کہ میڈم آگئیں۔ وہ بھی سیدھی ہمارے پاس لان میں آگئیں۔

”کیسے ہو شاہو۔“
”بالکل ٹھیک۔“
”مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا تھا اس لیے مجھے صبح جلد نکلنا پڑا۔ اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہمیں ایک جگہ چلنا ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ میں واپس کمرے میں آکر تیار ہونے لگا۔ اب مجھے خود بھی اچھا لگتا تھا۔ گھومنا پھرنا اور گاڑیوں کی سیر کرنا۔ میں تیار ہو کر آیا تو بیگم صاحبہ تیار کھڑی تھیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی سفر طے کرتی رہی۔ مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے گاڑی ایک سنسان سڑک پر آگئی۔ غالباً یہ شہر سے باہر جاتی تھی۔

بہر حال سفر طے ہوتا رہا اور پھر سڑک کے دونوں اطراف میں درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کافی آگے جا کر سڑک دائیں جانب مڑ جاتی تھی۔ گاڑی مسلسل چلتی رہی۔ کچھ دور جا کر میڈم نے کہا۔
”گاڑی بس یہی روک دو۔“

”جی اچھا۔“ ڈرائیور نے کہا اور پھر گاڑی آہستہ کر کے ایک طرف روک دی۔
”چلو شاہو نیچے اترو۔“ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔
”چلو۔“ اس نے کہا اور مجھے لے کر کچے راستے کی

”جی اچھا۔“ میں نے کہا اور لباس میں سے مورتی نکال لی۔
”لائف۔ اب اسے مجھے دو۔“
”جی۔“
”ہاں۔ یہ مجھے واپس کر دو۔“ اور میں نے وہ مورتی ان کے ہاتھ میں دے دی۔

”اچھا۔ اب منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔“ اور میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ میں نے ہاتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ بال سنوارے، پھر ڈائننگ ہال میں آگیا۔ میز پر کھانا موجود تھا۔ اور بیگم صاحبہ انتظار کر رہی تھیں۔

ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ لیٹ کر میں سارا دن کے واقعات سوچنے لگا۔ کس قدر خوش گوار دن تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بیگم صاحبہ سے وہ مورتی مانگ لوں۔ پتا نہیں وہ کیا سوچیں گی۔ کچھ تو کروں گا۔ بات کروں گا بیگم صاحبہ سے۔ اب میں کبھی ڈیرے نہیں جاؤں گا۔ یہی رہوں گا۔ پھر کالی دیر تک یہ ہی سوچیں ذہن پر حاوی رہیں اس کے بعد نیند آگئی اور سوچیں آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔ دوسری صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ ہاتھ روم جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ پھر باہر نکل آیا۔ ایک طرف پاروتی جاتی ہوئی نظر آئی۔

”پاروتی۔“
”جی۔“
”میڈم کہاں ہیں؟“
”وہ اس وقت باہر ہیں۔“
”کچھ بتا کر گئیں ہیں؟“
”نہیں۔ کچھ بتا کر نہیں گئیں۔ آپ کے لیے ناشتا لگا دوں۔“
”ہاں۔“

”باہر لان میں لگاؤں یا ڈائننگ میں۔“
”نہیں میں لان میں ہی ناشتا کروں گا۔“
”جی بہتر۔“ پاروتی نے کہا اور ایک جانب چلی گئی۔ پھر میں ٹھٹکا ہوا لان میں آگیا اور گھاس پر چل

تھوڑا سا خوف زدہ اور پھر اس جگہ پر تو اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جاتے۔ میں کیا چیز تھا۔

”تمہیں چالیس دن یہاں رہنا پڑے گا اور ہمیں اس مورتی کے پاس بیٹھ کر جاپ کرو گے جو میں تمہیں بتاؤں گی۔ زندگی گزارنے کے لیے ضرورت کی چیزیں تمہیں خود ہی مل جائیں گی۔ اس دوران تم اٹھان بالکل نہیں کرو گے اور یہاں سے باہر نہیں نکلو گے۔ اس جاپ کے لیے دن رات کی قید نہیں ہے۔ بس من لگانے کی بات ہے۔ بولو کر سکو گے یہ جاپ“ میں کیا جواب دیتا۔ یہ ان کے اکیلے رہنے کے خیال سے ہی مجھے خوف آنے لگا تھا۔ لیکن موقع مل رہا تھا سنہری زندگی کو پانے کا۔ اس مورتی کو حاصل کرنے کا اور اگر میں کامیاب ہو گیا تو میرے دارے نیارے ہو جائیں گے۔ ساری زندگی عیش سے گزرے گی۔

”دیکھو شاہو۔ یہ اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کروں گی۔ لیکن اگر تم کام شروع کرنا چاہتے ہو تو من لگانا پڑے گا۔“

اوپر اوپر کے خیالات سے ذہن کو صاف رکھنا پڑے گا۔ سب سے بڑھ کر اپنے خوف پر قابو پانا پڑے گا۔ خوف صرف دلوں میں ہوتا ہے اس کی بذات خود کوئی حیثیت نہیں۔ جو لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں وہ مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی میں کبھی اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ تمہیں دھیان لگانا ہو گا۔ بحث کرنا ہو گی۔ اس کے بعد تمہیں وہ مل جائے گا اس کی تمہیں خواہش ہے۔

”میزم۔“

”ہاں کمو۔“

”آپ نے مشکل میں ڈال دیا ہے مجھے۔“

”مشکل کی کوئی بات نہیں ہم اگر یہ سب کرنا نہیں

چاہتے تو ہم ابھی واپس چلتے ہیں کوئی زبردستی نہیں

ہے۔“ پھر میں سوچنے لگا میرے لیے فیصلہ مشکل تھا یہ

موقع روز بروز نہیں ملے فیصلہ میں نے کر لیا۔ پھر میزم

سے کہا۔

”مجھے کیا جاپ کرنا ہے۔“

طرف چل دی۔ ہم آگے بڑھتے رہے۔ درخت آگے جا کر مزید گھنے ہو گئے تھے۔ اطراف میں خود رو جھاڑیاں اُٹی ہوئی تھیں۔ غالباً یہ کوئی جنگل تھا۔ عجیب سا ماحول تھا۔ ہم کافی دور نکل آئے۔

پھر ہم نے ایک عمارت دیکھی۔ یہ کوئی مندر ہی معلوم ہوتا تھا۔ بڑا پراسرار سا ماحول تھا یہاں کا۔ عجیب سا سناٹا۔ گہری خاموشی، حواسوں پر طاری ہونے والا ماحول، ہم لوگ خاموشی سے چلتے چلتے اس مندر میں داخل ہو گئے۔ ہم مندر کے اندرونی گمرے میں داخل ہو گئے وہ بال نما کمرہ تھا اور اس کے درمیان میں جو چیز میں نے دیکھی وہ میرے لیے حیران کن تھی۔ یہ ایک بڑا مجسمہ تھا اور اس کی شبیہ ہو ہو مورتی جیسی تھی۔ صاحبہ اس مورتی کے پاس پہنچ کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

”شاہو۔“ ان کی آواز گہرائیوں سے آئی تھی۔

”جی میڈم۔“

”شاہو۔۔۔۔۔ تم اس مورتی کو حاصل کرنا چاہتے تھے

”

”جی ہاں۔“

”اے کی۔ ضرور ملے گی۔ دیکھو یہ ویسی ہی ہے

”

”جی ہاں۔“

”یہ سپورنی ہے۔ دیویوں کی ملک ہے یہ جسے مل جائے اسے جیون کی ساری خوشیاں مل جاتی ہیں۔ اس کا جیون سمجھل ہو جاتا ہے۔ یہ مورتی ہے۔ ملک اپنے سیوک کو دان دیتی ہے۔ بہت بڑا دان ہے اور جانتے ہو اس کی سیوا کیا ہے۔“

”کیا؟“ میں حیران تھا کہ رانی کرشنا خالص ہندی کے الفاظ بول رہی ہے۔

”اس سیوک کے جاپ کرنا پڑتے ہیں۔ چالیس

دن تک۔ پھر اس سیوک کو وہ بخشی ملتی ہے جس کے

تحت وہ کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ جو وہ چاہتا ہے۔

ذنوں کو تابع بناتی ہے اور تمہیں بھی وہ جاپ کرنا

ہو گا۔“ میں حیران و پریشان اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

ختم ہوئے، میں اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کھانا کھایا اور سیر ہو کر پانی پیا، پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے دوبارہ جاب شروع کر دیا۔ اس بار میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جاب کرتے کرتے میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ جھوٹے برتن غائب ہو چکے تھے۔

اس تمام حیرانی کے باوجود میں خوف زدہ نہ ہوا اس جاب کر رہا تھا۔ اس تسلسل کو قائم رکھنا ضروری تھا۔

وقت گزر گیا۔ شام ہوئی پھر رات آگئی۔ اس مخصوص جگہ پر مجھے رات کا کھانا مل گیا بڑی عجیب بات تھی لیکن مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے کھانا کھایا اور پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ جاب کا تسلسل برقرار تھا۔ کبھی غنودگی طاری ہو جاتی لیکن نیند نہیں آتی تھی۔

ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی کہ تمام رات ایک روشنی پورے ماحول پر چھائی رہی۔ اور اتنی تھی کہ میں اپنے آپ کو اور ارد گردی چیزوں کو دیکھ سکتا۔

پھر صبح ہو گئی۔ میں نے جاب جاری رکھا، میرے غیر مرئی دوستوں نے میرے نائنے کا انتظام کیا۔ وقت گزر گیا اور پھر دوسرا تیسرا اور چوتھا دن بھی سکون سے گزر گیا۔ لیکن چوتھے دن کی رات میرے لیے انتہائی سنسنی ثابت ہوئی۔ رات کھانے کے بعد میں نے ایک بلی کی آواز سنی۔ میں چونک گیا، پھر میں نے دیکھا کہ وہ بلی میری جانب بڑھ رہی ہے، اس عجیب و غریب بلی کا جسم عام بلیوں سے بڑا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آکر رک گئی، اس کے بعد ایک اور بلی کسی دوسرے کونے سے آئی اور پہلی والی کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد دوسری تیسری جگہ سے نکلیں اور ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں اور پھر ان کی بانچھیں کھل گئیں، اور ان کے منہ سے آوازیں خارج ہونے لگیں۔ خدا کی پناہ۔ خدا کی پناہ۔ ہنسی کی آوازیں تھیں، انسانی ہنسی کی آوازیں، پھر ایک بلی نے میری جانب چھلانگ لگاتیں، اک لمحہ کو میں لرز گیا۔ دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا اور مسلسل منتر کرتا رہا وہ بلی میرے سر سے ہوتی ہوئی پیچھے چلی گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور پھر ایک عجیب کھیل

”ایک جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھنا ہے اور پھر یہ پڑھنا ہے۔“ میڈم نے اونچی آواز میں یہ پڑھنا شروع کیا۔ میں اس منتر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے کہا۔

”یہ منتر میرے ساتھ دہراؤ۔“ اور میں اس منتر کو دہرانے کی کوشش کرتا رہا۔ میڈم نے وہ منتر مجھے اچھی طرح یاد کرایا۔

”اچھا آنکھیں بند کر کے پورے دھیان کے ساتھ مجھے یہ منتر سناؤ۔“ اور میں نے آنکھیں بند کر کے وہ الفاظ دہرانے لگا۔ مجھے خود لگا کہ میں نے وہ لفظ حرف بہ حرف یاد کر لیے ہیں۔ منتر بڑھ کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”میڈم، میڈم میں نے یاد کر لیا۔“ میں نے اس طرف منہ کر کے کہا جہاں میڈم کھڑی تھیں، لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

”میڈم، ٹیکم صاحبہ۔“ میں نے آواز دی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئیں ہیں۔ پھر میں نے مندر کے اطراف کا جائزہ لیا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھے یہاں پھوڑ کر چل گئی ہیں۔

مجھے اس ماحول سے خوف آنے لگا میں یہاں اتنا وقت کیسے گزاروں گا، مجھے سوچ کر ہی خوف آیا، لیکن اب عمل کا وقت تھا۔ مجھے اپنے فیصلے پر قائم رہنا تھا۔ میں نے جاب شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس مورچے کے سامنے میں نے ایک جگہ کو صاف کیا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کر کے میں نے منتر پڑھنا شروع کیا۔ تمام احساسات سے بے نیاز ہو کر جانے میں کتنی دیر تک منتر پڑھتا گیا۔ پھر اچانک میں نے آنکھیں کھولیں اور گردن کھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ منتر کے الفاظ اب بھی میرے لبوں پر تھے۔ اپنے اس غیر دانستہ عمل پر مجھے حیرت ہوئی۔ پھر مجھے ایک جگہ کھانا رکھا ہوا نظر آیا۔ کھانے کو دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی۔ جب لے منتر کے آخری لفظ میرے ہونٹوں پر تھے۔ پھر وہ

گئیں۔ اور پھر اس کی آواز بند ہو گئی۔ وہ عورت اسے کھائی رہی۔
 ”آہ میں نہیں بچا تو بھی نہیں بنے گا یہ عورت تجھے بھی کھالے کی ٹلڑے پر بٹا ہوا رہتا ہے تو کیا گیارے۔“
 اتنی بھیا تک آواز تھی کہ میرے ہوش و حواس رخصت ہوئے جا رہے تھے یہ ماحول اتنا ہی بھیا تک تھا۔ پھر اس عورت نے اس کی آنکھیں نوچیں اور منہ میں ڈال دیں، دانتوں نے ناک اور کان کاٹ کر چباتی رہی۔ اس نے سر اٹھایا تو اس کے منہ پر خون لگا ہوا تھا۔ اس نے خون خوار نظروں سے مجھے دیکھا پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور میری جانب بڑھنے لگی۔ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

”ارے ہیرا، ارے ہیرا، میں بھوکی ہوں رہے، مجھے ابھی اور بھی بھوک لگی ہے۔ اب میں تجھے کھاؤں، کھا جاؤں گی تجھے۔“

یہ کہہ کر وہ میری جانب بڑھی۔ اس کے نوکیلے دانت اور ناخن دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اب وہ میری جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی اور وہ میرے قریب آگئی تھی۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور مرنے کو تیار ہو گیا۔

پھر نجانے کیا ہوا، اس نے ابھی تک مجھے چھوایا نہیں، اپنے دانت کیوں نہیں گاڑے، مجھ پر، میں نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے یقین نہیں آیا تھا، میری آنکھوں کو بہت بڑا دھوکا ہوا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ہنچا ہوا اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ نہ ہی فرش پر خون۔ بات اب سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ سب مجھے اس جاب سے روکنے کے لیے کیا جا رہا تھا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ میرا جاب کسی طرح ٹوٹے، میں اس خوف ناک منظر سے ڈر جاؤں، اپنی جگہ سے بھاگ جاؤں، لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہ عورت غائب تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ رات بھر کے واقعات دماغ سے چپک کر رہ گئے تھے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ ان سب کا مقصد صرف مجھے ڈرانا ہے، یہ مجھے کوئی جانی نقصان نہیں پہنچا سکتے، پھر میں اپنی جگہ لیٹ گیا،

دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اس کا دایاں ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اپنے دانت اس کے شانے میں پوسٹ کر دیے۔ وہ تکلیف سے ترپنے لگا اور نیچے گر گیا۔ لیکن اس نے اپنے دانت نہیں ہٹائے۔ پھر وہ بری طرح شانے کو جھنجھوڑنے لگی۔ ساتھ ساتھ ہاتھ موڑنے لگی۔ وہ آدی تڑپ رہا تھا۔ اب اس کا بازو اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ مزے لے کر کھا رہی تھی۔ وہ آدی کرب سے زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اتنا خوف ناک منظر، اتنی وحشت، وہ عورت تیزی سے اس کا ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ پھر وہ دوبارہ اس کی جانب بڑھی اور اس کا دوسرا بازو بھی شانے سے جدا کر دیا۔ لیکن اس بار سیدھی میری جانب آئی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

”لے مانو، کھالے، تو بھی کھالے، بڑا سوادشت ہے، مرزا آرہا ہے، بھگوان کی سوگند، اس سے پہلے کبھی اتنا مرزا نہیں آیا۔ ارے ڈر کیوں رہا ہے، کیوں گھورے جا رہا ہے، نہیں کھانا تو نہ کھا، میں کوئی زبردستی تو نہیں کر رہی۔“ پھر وہ ایک جگہ جا کر بیٹھ گئی اور پھر دوسرا ہاتھ صاف کر گئی۔ اور وہ آدی تین تین فٹ اٹھل رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھیا تک چیخیں نکل رہی تھیں۔
 ”کھا گئی، کھا گئی، مانو تو اٹھ، بھگوان تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا، تو نے میرا جیون نہ بچایا، تو کبھی اپنے عمل میں کامیاب نہ ہو گا، یہ میرا شراب ہے تجھے یاد رکھنا آہ۔“

میرا رواں رواں کانٹ رہا تھا۔ یہ منظر کسی انسان کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا تھا۔ پھر اس عورت نے آدی کی ٹانگیں نوچنا شروع کیں۔ اور امیں جٹ کر گئی، مجھے صبر آنا چاہا رہا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، لیکن میں اس آدی کو نہ بچا سکا۔ میرا جاب ٹوٹ جاتا، اور پھر سب ختم ہو جاتا۔ میرے جاب کی رفتار وہی رہی۔ جس پر مجھے جبرانی ہوئی۔ اگر میں اسی دھیان سے جاب کرتا رہا تو مجھے کامیابی مل جائے گی۔ آہستہ آہستہ اس آدی کی چیخیں مدہم پڑتی

اس نے تیسرے بونے سے کہا اور چمپک نے گردن جھکلی۔ اس بڑے بونے نے چمپک کی گردن اڑادی اور پھر میں نے حیرت ناک منظر دیکھا۔ چمپک اطمینان سے اس جانب مڑا اور اپنی گردن اٹھائی اور اپنے شانوں پر رکھ لی۔ دوبارہ تلوار زمین سے اٹھائی اور اس بڑے بونے کی طرف مڑ گیا۔

”مالک یہ کیا حرکت تھی۔“

”چمپک“ میں ماروں گا اسے تو ہٹ جا میرا دادا بدل گیا ہے۔“

”تو آپ مجھے ایسے ہی منع کر دیتے۔“

”بس میری مرضی یہ تھی تو منع کرنا ہی ہوتا۔“

”اچھا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں کون اسے مارتا ہے۔“

یہ کہہ کر چمپک اس بڑے بونے کی طرف لپکا اور ان دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ پھر لڑتے لڑتے وہ دونوں بھی شدید زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بچ میں سے اڑھا اڑھا کاٹ دیا۔ دونوں کے اڑھے اڑھے جسے زمین پر پڑے تھے اور پھر دونوں غائب ہو گئے۔ ابھی میں اس سحر میں کھویا سوچ رہا تھا کہ عجیب تماشے دکھا رہے ہیں میرے میزبان۔ ان سب کا مقصد صرف مجھے جاپ سے روکنا تھا۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ پھر اچانک مندر کی زمین لرزنے لگی اور میں چونک پڑا۔ کیا ہوا۔ شاید زلزلہ آ رہا ہے۔ میرے حریف اب ناکام ہو کر مجھے زمین میں دفن کر دیتا چاہتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر میں لرزے کی وجہ ذہن میں آ گئی۔ آٹھ دس جنگلی بھینسے تیزی سے دوڑتے ہوئے میری جانب آرہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند نہیں کیں اور نہ ہی خوف زدہ ہوا۔ اب یہ بھینسے مجھے اپنے کھوڑوں سے چل دیں گے یا پھر اپنے سینگوں پر مجھے اچھالیں گے۔ میں مرجاؤں گا۔ لیکن اب میں مرنے دم تک یہ جاپ دہرانا چاہتا تھا۔ وہ بھینسے میری جانب بڑھے اور پھر کسی چیز سے ٹکرائے۔ وہ گیا تھی۔ سامنے تو شفاف تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ بھینسے ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ کسی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ کسی کے

کیسے پڑ پڑ رہا ہے۔“

”پڑھنے دے رے، پڑھنے دے پر سوچ لے۔ نہ صرف تو بلکہ ہم سب اس کے نیچے آجائیں گے۔ دیکھ چمپک، ایک تو یہ ٹھہرا مسلمانہ بھی نہ میں تو نہ آؤں گا۔ اس کے پھیر میں۔“

”پھر کیا کریں مالک۔“

”تم میں سے ایک اسے مارے گا۔“

”ہم میں سے۔۔۔“

”ہاں تم لوگوں میں سے۔۔۔“

”پر مالک۔۔۔“

”یہ کیا پر پر لگا رکھی ہے، طے کر لو کس نے مارنا ہے۔“

”میں ماروں گا۔“ وہ بونا جسے چمپک کہا گیا تھا اس نے کہا۔

”میں ماروں گا۔“ ایک دوسرے نے کہا۔

”نہیں تم دونوں میں سے کوئی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔“

تیسرے بونے نے کہا اور پھر ایک عجیب ہی ٹھیل شروع ہو گیا۔ یہ سب آپس میں لڑنے لگے تھے۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ میری موت اس کے ہاتھوں ہو۔

پھر میں نے دیکھا انہوں نے اپنے لباسوں میں سے چھوٹی چھوٹی تلواریں نکالیں اور تلواریں لہرانے لگے اور آگے پیچھے ہو کر پینتے بدلتے گئے۔ ان کے انداز اگر عام حالات میں کوئی شخص دیکھتا تو اس کا ہنسی کے مارے برا حال ہو جاتا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بونے بھی اس عمل سے مجھے روکنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ میں خاموش رہا۔ پھر ان دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ وہ چاروں آپس میں ماہرانہ جنگی انداز میں لڑ رہے تھے۔

پھر ان میں دو بونے زخمی ہو گئے اور زمین پر گر کر کراہنے لگے اور پھر اچانک ہی غائب ہو گئے۔ اس دوران وہ دونوں میں جنگ شروع ہو گئی اور پانچواں اچھل اچھل کر ان کو جوش دلاتا رہا۔

”شاباش مارو، ٹانگ مارو، ادھر سے تلوار چلاؤ،“

شاباش بہت خوب۔“

سینک ٹوٹ گئے تھے۔ وہ میرے قریب آتے اور کسی چیز سے ٹکرا کر پلٹ جاتے۔ پھر تھک کر وہ بھی غائب ہو گئے۔ بڑی اذیت ناک رات تھی۔ اس کے بعد کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اب صرف ایک ہی لگن تھی کہ میں کسی طرح دن پورے کر کے اس مورنی کا مالک بن جاؤں۔ اور پھر چالیسواں دن بھی آگیا۔ شکر ہے کہ اس کے بعد کوئی تنگ کرنے والا نہیں آیا۔ دل میں خوف تھا کہ اب کیا ہوتا ہے اور خوشی بھی تھی کہ چلو یہ جاپ ختم ہو۔ دن آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ میں جاپ میں مصروف تھا۔ اس دوران مجھے کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے کیسے مجھے روکا گیا۔ لیکن اب یہ الفاظ مجھے پھر پر لکیر کی طرح یاد تھے۔ جن کو میں اب شاید ہی کبھی بھول پاؤں۔ اب اس جاپ کے اختتام کا وقت آگیا تھا۔

پہر سو بج ڈھل گیا اور یہی وقت تھا جب میرا جاپ مکمل ہو گا۔ پھر اچانک میں نے کسی کو اپنی طرف آنے دیکھا اور میں سہم گیا۔ پھر یہ سوچ کر کے یہ میرے محسنوں کی طرف سے پھر کوئی تحفہ ہو گا چنانچہ میں نے خود کو تیار کر لیا۔



وہ غالباً ”کوئی عورت تھی۔ جس کے پیروں میں کھٹکھڑ بندھے ہوئے تھے اور اس کے قدموں کی دھک کے ساتھ آواز پیدا کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ قریب آگئی اور اس کا چہرہ واضح ہو گیا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ آنے والی کرشنا تھی۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں وہی روشنی۔ لیکن مجھے محتاط رہنا چاہیے ہو سکتا ہے یہ بھی قریب نظر ہو اور اگر میں نے اپنی جگہ چھوڑی دی تو سب ختم ہو جائے گا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔

”شاہو۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”شاہو“ یہ میں ہوں تمہاری دوست۔ میڈم رانی کرشنا۔“

جواب میں ”میں خاموش رہا۔ وہ پھر بولی۔“ شاہو تمہارا جاپ ختم ہو گیا۔ اب تم آزاد ہو، تم بول سکتے ہو

”ان چالیس دنوں میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد تمہاری آواز کرشنا جیسی ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔“

”میں رانی کرشنا ہی ہوں“ اچھا۔ کھو۔“ پھر وہ میری جانب بڑھی اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا۔ میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں کھڑا ہو گیا۔

”مجھ سے پہلے تم نے جن چیزوں کو دیکھا اور جن کے ساتھ تمہارا بالا بڑا انہوں نے تمہیں چھوا بھی نہیں۔ اور چھو بھی کیسے سکتے تھے۔ جاپ کے دوران تمہارے گرد ایک دیوار حائل تھی جس کی وجہ سے باہر کی چیزیں تمہارے نزدیک نہیں آسکتی تھیں، تم تک پہنچنے والی ہر چیز دیوار سے ٹکرا کر رک جاتی تھی اور جہاں تک خون کے چھینٹوں کا تعلق ہے تو وہ ایک بے ضرر چیز تھی۔ میں نے تم کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ میں ہی تمہاری میڈم دوست پیگم صاحبہ اور رانی کرشنا ہوں۔ اب تم آزاد ہو۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی سب کچھ درست لگ رہا ہے۔ اگر یہ کرشنا ہوتی تو مجھے چھو نہیں سکتی تھی۔ اس سے پہلے جتنے بھی بد ہیئت لوگ آئے ان میں سے کوئی بھی مجھے چھو نہیں سکا تھا۔

”اور اب جبکہ تم آزاد ہو تو آؤ تمہیں تمہارا انعام دوں۔“ اس نے کہا اور مجھے لیے ہوئے سپورٹی کے جوتے کے پاس چلی گئی۔ پھر اس نے سپورٹی کے پیروں

ہے تو ان کے لیے بیدار کیا سزا تجویز کرتا ہے۔ سمپورانی کا دلارا بیدار کیا اپنے من پسند شراب میں اس کا بھگت ڈال دیتا ہے۔ اور پھر سارا بھگت بھی گزارتا ہے۔

”تو میں نہیں بیدار کیا سے ملوایں“ وہ مجھے ایک جانب لے چلی۔ سامنے دیوار ہی تھی اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے، پھر جلد ہی سمجھ بھی آ گئی۔ سامنے دیوار میں ایک خلا پیدا ہوا۔ کرشنا نے مڑ کر مجھے دیکھا اور کہا۔

”اوشاشو، میرے پیچھے چلے آؤ۔“ اور میں اس کے پیچھے پیچھے اس خلا میں داخل ہو گیا۔ یہاں نسبتاً زیادہ روشنی چھائی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں میں نے ایک بڑا مجسمہ دیکھا۔ جو زمین سے پانچ فٹ اونچا تھا۔ چہرہ انتہائی بھانک بدن پر لبابہ تراشا گیا تھا۔ جس میں سے ہاتھ پاؤں نکل کر پھیل گئے تھے۔

”یہ بیدار کیا ہے، سمپورنی کا چیتا، میرے من کا میت۔ میرے من کا میت۔“ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں شمار چڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی ہیں۔ پھر رانی نے تھرکنا شروع کر دیا۔ کہیں سے طبلے کی آواز آرہی تھی بس آواز تھی اس کا وجود نہیں۔ وہ کسی ماہر رقاصہ کی طرح رقص کر رہی تھی میں حیرانی سے اس کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ بڑا بچان خیز رقص تھا۔ میں نے پہلے اسے اتنے جوش میں نہیں دیکھا تھا۔ کافی دیر تک وہ رقص کرتی رہی۔ اس کا چہرہ شدت جوش سے سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کیا۔ اس کے چہرہ کی کھال پھٹنا شروع ہو گئی۔ پھر اس کے ہاتھوں پیروں کی کھال بھی پھٹنے لگی۔ اس کا بدن نیلاڑتا جا رہا تھا۔ اس کی زبان اس کے سینے پر لٹک گئی۔ آنکھیں انگارہ ہو گئیں۔ جڑے کھچ گئے۔ میں خوف زدہ بھی تھا اور حیران بھی کہ اسے کیا ہوا ہے، پھر اس کے رقص کی رفتار کم ہونے لگی۔ ساتھ ساتھ طبلے کی آواز بھی مدہم پڑنے لگی۔ پھر وہ بھی ختم ہو گئی۔ کرشنا نے رک کر مجھے دیکھا۔ آہ وہ آنکھیں، ان آنکھوں میں انگارے روشن تھے پھر طبلے کی تھاپ دوبارہ شروع ہوئی اور وہ دوبارہ رقص کرنے لگی۔ اس کے بعد میں نے ایک عجیب

پہچان اور میں نے دیکھا کہ وہاں سے زمین سرکنے لگ گئی تھ۔ غالباً اس کے پیروں میں کوئی ٹپن تھا جس نے وہاں سے زمین میں خلا نمودار ہو گیا تھا۔ پھر وہاں اتنی جگہ بن گئی کہ ایک آدمی وہاں سے با آسانی اندر جا سکے، رانی کرشنا نے میرا ہاتھ پکڑا اور نیچے قدم رکھ دیے۔ یہ سیڑھیاں کسی تہہ خانے میں جا کر ختم ہوتی تھیں۔ ابھی ہم نے آٹھ دس سیڑھیاں اتری تھیں کہ ایک جانب سے آواز آئی۔

”بچالو ہمیں، ہمیں بچالو۔“ میں نے چونک کر ادھر دیکھا، وہ سرکنا شخص تھا۔ میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں دیکھا تھا۔ وہ سرکنا ہی تھا۔ لیکن وہ کیسے بول رہا تھا۔ میں خوف سے کانپنے لگا۔

”شاہو ڈرو نہیں، یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ کچھ نیچے اترتا تو ایک اور شخص تھا اس کے پورے جسم پر کانٹے تھے، دونوں آنکھیں غائب تھیں۔

”ارے لڑکے، بچالے ہمیں، ہمیں۔ بڑا نپائے ہوا ہے بلکہ ظلم کیا ہے ہم نے اپنے جیون کے ساتھ۔ بھگوان کے لیے ہمارا جیون بچالے۔“ میں بہر حال انسان تھا اور گیا تھا لیکن کرشنا کے ہوتے مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ نیچے اترتے تک اس طرح کے کئی لوگ مجھے ٹکرائے تھے سب کی ایک ہی زبان تھی کہ ہمیں بچالو، کوئی کوڑھ کا مریض تھا، کوئی ہاتھوں سے محروم تہہ خانے میں پہنچ کر مدہم روشنی مل گئی۔ ہر چیز واضح تھی۔ بلکہ غار جیسی جگہ تھی۔ جیسے غار کا اندرونی حصہ ہو۔

”جانتے ہو یہ لوگ کون تھے۔“ جواب میں میں نفی میں سر ہلایا۔

”یہ سب اس مورتی کے خواہش مند تھے۔“

”کیا۔۔۔“

”ہاں، تم سے پہلے بھی ان لوگوں نے اس مورتی کے لیے کوشش کی تھی۔ اور میں انہیں یہاں لے آئی۔ لیکن یہ سب کمزور دل کے مالک تھے۔ وہ ان سب چیزوں سے ڈر گئے تھے جو صرف نظر کا دھوکا تھی۔ جاپ سے روکنے کے لیے تھی اور جب جاپ روکا جاتا

بہادر

ایک محفل میں یہ بحث چھڑ گئی کہ مرد حضرات اپنی بیویوں سے زیادہ ڈرتے ہیں یا خواتین اپنے شوہروں سے۔! آزمائش کے لیے تمام مرد حضرات سے درخواست کی گئی کہ جو حضرات اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں۔

محفل میں موجود سارے مرد کھڑے ہو گئے۔ لیکن ایک صاحب بہت اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھے رہے۔ تمام مردوں کو ان کی قسمت پر برا رشک آیا۔ ان صاحب کی بڑی تعریفیں ہوئیں، کچھ دیر بعد ایک صاحب نے انہیں علیحدگی میں لے جا کر راز دارانہ انداز سے پوچھا:

”کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ کون سا شخص ہے جس پر حمل کر کے آپ کو اپنی بیوی سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔؟“

ان صاحب نے ادھر ادھر دیکھا پھر بے چارگی سے بولے۔ ”یار کیا کرتا۔ میری بیگم نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ تم کرسی سے مت اٹھنا۔!“

کے صلے میں میں تم سے ایک کام لیتا چاہتی ہوں۔“
”مجھے بتائیں۔ کیا کرتا ہے، میں ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔
میری اب بھی وہی حالت تھی۔

(جاری ہے)



منظر دیکھا۔ اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں میں سے مزید ہاتھ پیر نکلتے گئے اور وہ ان اضافی ٹانگوں کے ساتھ برا سرار رقص کر رہی تھی۔ وہ کسی چڑیل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ بکھرے بال، لٹکی ہوئی زبان، بہت سارے ہاتھ پاؤں پھٹا ہوا گوشت پھر وہ رقص کرتے کرتے اچانک رک گئی اور مجھ دیکھا۔
”شاہو۔“ بڑی عجیب آواز تھی اس کی۔

”جی۔ جی۔“

”مجھے مورٹی چاہیے نا۔“

”جی۔“ میں شدید خوف زدہ تھا۔

”آؤ میرے پاس آؤ۔“

”ایسا۔“

”میرے پاس آؤ شاہو۔“ وہ نرمی سے بولی لیکن اس کے حلیے سے میں خوف زدہ تھا۔

”میں آج خوش ہوں شاہو، بہت خوش۔ تم اپنے نام، سنا، باپ ہو گئے۔ تم نے وہ حاصل کر لیا جس کے لیے تم نے اپنا جیون منوایا تھا۔ کیا اوشو۔“

”جی ہاں۔“

”اچھا تو پہلے یہ مورٹی لے لو۔“ اس نے اپنے لباس میں سے ایک مورٹی نکال کر مجھے دی۔ جو پہلے دی گئی۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور مورٹی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”تم نے یہ مورٹی بے شک لے لی۔ تم اس کے حق دار ہو۔ لیکن لیکن۔ یہ کام تم نے صرف اپنے لیے کیا ہے نا۔“

”جی۔“

”اور انعام بھی تمہیں ملانا۔“

”جی۔“

”سارا فائدہ تمہیں ملا، مجھے کیا ملا۔“

”آپ جان لے سکتی ہیں میری۔“

”ارے نہیں، اتنا اہم والا لڑکا جس نے اتنا بڑا کام کیا۔ اس کی زندگی تو میرے لیے انتہائی قیمتی ہے۔ سب سے بڑھ کر تم میرے دوست ہو اور اس دوستی

ست رنگی کہانیاں

احمد صغیر صدیقی

دنیا میں بے شمار ممالک ہیں جن میں ان گنت لوگ بستے ہیں ان ممالک کی ثقافت ان میں رہنے والوں کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح ان کی کہانیاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

کہانیوں کے ست رنگ - عالمی معیار کی مقتصر ترین کہانیاں

سے بات نہ ہو گئی ہوتی تو میں تم جیسے گدھے سے پھر کبھی بات نہ کرتا۔
”ت۔۔۔ تم۔۔۔“ وہ ہلکایا ”میں تمہیں پہچان نہیں سکتا۔“

”خوب، بہت خوب۔ گورنر کی اولاد بھلا تم کیسے پہچانو گے تم شاید اب تو اپنے باپ کو بھی نہیں پہچان رہے ہو گے؟“

آواز مانوس سی تھی مگر پہچان میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا یہ ساری بے ہودہ باتیں آپریٹرن رہا ہو گا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں فون بند کر رہا ہوں۔“
”ٹھہرو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”میں کیدار بول رہا ہوں۔“

”اوہ تو تم کیدار ہو۔ کب آئے؟“ اس نے بڑی مشکل سے مصنوعی گفتگو کی وہ تو کتنا چاہتا تھا ابے گدھے تو یہ تو ہے کہاں مرا ہوا تھا۔

”آیا کب؟ چل اوھر آجا۔“
”میں یہاں دو دن سے ہوں اور تم سے مسلسل بات کرنے کی کوشش میں تھا۔“

پہلا رنگ..... یکجائی

رات جب وہ لیٹا تو صرف ایک ناگوار سے خیال نے اسے ذرا سا پریشان کیا اور پھر وہ فائلوں فون کالز وغیرہ میں گم ہو گیا۔ ناتجھ کے ذہن میں اب اس واقعے کی یاد ذرا سی بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں سگریٹ ٹٹولی پھر دن بھر کے واقعات کا جائزہ لینے لگا۔

پھر جیسے ہی اس نے ریسیور رکھا اچانک سیاہ ٹیلیفون فائلیں پیروٹ، پن کشن، وزینگ کارڈز وغیرہ سب کے سب اچھل کر اس کے سامنے آ گئے۔

اس نے اپنی قمیص کا کالر درست کیا اور بڑبڑایا۔
”کچھ آدمی“ اسے لگا جیسے دروازے کے چھچھے کوئی لپٹا ہوا۔ اس نے جلدی سے ہونٹوں پر چسکی ہوتی رخ مسکراہٹ کو غائب کیا اور سنجیدہ ہو گیا۔

فون پر دوسری طرف سے کیدار نے اس سے بات کی تھی۔ ”کچھ آدمی۔۔۔ میں نے سنا ہے تم بھی وزیر صاحب کے ساتھ ایک توپ آدمی بن گئے ہو۔ کوئی دس فون کم چکا ہوں ہر بار تمہاری سگریٹری ٹٹلا دیتی ہے۔“ صاحب مصروف ہیں۔ ہنہ! اگر اس بار تم



یہ کیدار عجیب احسن آدمی تھا۔ اس کے اشاروں کو ذرا بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال کہ کیدار اوھر شاید کسی کمپنی کے لائسنس وغیرہ کے چکر میں آیا۔ اس نے سوچا اچھا کیا میں نے اسے یہاں نہیں بلایا۔ اس احسن کو تو اسٹیشن کو برقرار رکھنا تک نہیں معلوم۔



اس شام جب وہ دو لگا بھی پہنچا تو اس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا اسے پیچھے سے کسی نے پھینچ لیا۔ اور اپنے سے چمٹا لیا۔
”کمال ہے تم تو وقت کے پابند ہو گئے ہو۔“
”ہیلو۔“ اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔
کیدار اُسے کمر میں ہاتھ دے کر کرسیوں تک لے گیا۔ کمریوں میں لباس دیر تک ٹھیک نہیں رہتے۔

”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں وہیں رہنا بس یہ بتا دو اشوکا ہو مل سے تمہاری طرف کا راستہ کون سا ہے۔ مجھے دہلی کے راستوں کا زیادہ علم نہیں۔“ تمہاری آمد سے میں خاصا خوش ہوں۔ رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا مگر میں ابھی تم سے نہیں مل سکتا ذرا میں اپنی اپوائنٹمنٹ ڈائری دیکھ لوں۔“

”واہ میرے دوست گویا پورے صاحب بن گئے ہو ٹھیک ہے کھانا ساتھ کھائیں مگر میں تم سے مل کر تمہارے دلغ کے کیڑے جھارتا چاہتا ہوں۔“
”نہیں ابھی مت آنا مجھے اسٹر صاحب کے لیے چند اہم کاغذات تیار کرنے ہیں۔“

”پھر؟“
”تم شام کو سات بجے دو لگا میں پہنچ جاؤ۔“ اس کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

اور پھر کوئی لپٹے چسے تو ان کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

کرنا تھ نے ادھر دیکھا۔

تھوڑے فاصلے پر تھری پیس سوٹ میں لمبوس ایک
معر آدمی انہی کی جانب آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں
چھڑی تھی وہ بہت آہستگی سے چل رہا تھا۔ اس نے
دیکھتے ہی پہچان لیا۔

یہ پروفیسر لال تھے۔

جلدی سے وہ دونوں ایک قریبی ستون کی اوٹ میں
ہو گئے۔ یہ پروفیسر لال تھے جنہوں نے مہینوں تک
کیدار کی کلچ فیس اپنی جیب سے بھری تھی اور اسے
کلچ سے خارج ہونے سے بچایا تھا۔ اور جب ہاتھ کو
ملک سے باہر جانے کا چانس ملا تھا تو انہوں نے دس
ہزار روپے دے کر اس کی مدد کی تھی۔

جب پروفیسر ادھر سے آگے نکل گئے تو دونوں
ستون کے پیچھے سے نکل آئے۔

انہوں نے لمبی سانس لی۔ اگر وہ نہ چھپتے تو انہیں
بڑے ادب سے جھک کر پروفیسر سے ملنا پڑتا۔ اور ان
کے پیچھونے کا خیال تو بہت ہی پریشان کن تھا۔

ویسے ان کے دماغوں میں یہ احساس ضرور تھا کہ
پروفیسر نے ان پر جو احسانات کیے تھے وہ اس کا بدلہ کسی
دن ضرور چکا میں گے۔ کچھ دور تک وہ ساتھ چلے
اجنبیوں کی طرح۔ پھر انہوں نے الوداع کہی۔ ایک
ٹیکسی کی طرف بڑھا ایک اپنی کار کی طرف۔ کار
اشارت کرتے ہوئے ہاتھ کو خیال آیا کہ وہ کیدار کو اس
کی منزل تک پہنچا سکتا تھا اور اسے اس سے دوسری بار
ملنے کے لیے بھی کہنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے سر
جھٹک کر ان خیالات کو نکل دیا۔

اس وقت وہ کچھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے
اندھیرے سے نکل آیا ہو جہاں بے حد ٹھن تھی۔
اس نے جان بوجھ کر کنٹا پیلس کی منور راہ
دار یوں کی طرف نہیں دیکھا۔ مبادا کوئی اور شناسا
اسے دیکھ لے۔



دوسرا رنگ..... واقعہ

”میرا خیال ہے یہ فشر کچھ گھامڑ سا ہے۔ ورنہ یہ تم
جیسے چور کے ہاتھ میں سارے کام نہ دے دیتا۔“ کیدار
نے بیٹھنے کے بعد کہا۔ ہاتھ صرف مسکرایا۔ ویسے
اسے اس وقت بے حد بوریٹ ہو رہی تھی۔ اس نے
بے دلی سے کہا۔ ”اچھا اب تم اپنے پارے میں ہٹاؤ۔“
”دیکھو بیٹے۔“ کیدار چکا چکاری ہاتھیں
ایسے نہیں ہوسکتیں۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ لندن اور پیرس گھوم چکے
ہیں۔ ہم نے بھی آپس میں تکلف نہیں برتا۔ تم مجھ
سے اس قدر منہ باز انداز میں پیش آرہے ہو جیسے میں
کوئی اجنبی ہوں۔ یہ نہیں چلے گا۔ ابے تے کرو کچھ
گالیاں بھی دو۔“

پھر ان کے درمیان پرانے زمانے کی باتیں چل
پڑیں۔ پارٹیوں میں وہ ساتھ ساتھ بن ٹھن کے چایا
گرتے تھے۔ وہ وہاں بہت قریب سے بولتے تھے۔ مگر
جب آپس میں بولتے تھے وہ الفاظ اور طرح کے ہوتے
تھے۔ ابے گدھے گھامڑ۔ دونوں بچپن کے دوست
تھے دونوں کے درمیان تکلفات نہیں تھے گالم گلوچ
کے بغیر انہیں بات کرنے کا مزاج ہی نہیں آتا تھا۔ ان کی
موجودہ باتوں میں اس طرح کے جملے بھی تھے۔

”اس نوکری نے تو مجھے جکڑ ہی لیا ہے۔“
”میں نے دلی کا رخ کرتے ہوئے طے کر لیا تھا کہ
تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔ میرا خیال ہے اب چلنا
چاہیے۔“

رہداری میں ہاتھ کو خیال آیا کہ وہ ایک
وزیر مملکت کا پرسنل سیکریٹری ہے کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک
فضول گفتگو کرتے ہوئے اسے جھٹکن ہو رہی تھی۔
اسی نے کیدار کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

مگر اس کے لیے جواز بناتے ہوئے اس نے جیب
سے کنجی نکالی یہ کار کی کنجی تھی۔
”معا“ کیدار نے کہا۔ ”ذرا دیکھنا کون آیا ہے؟“ گھبرا

”کیا چاہتے ہو؟“ میں نے مزے بغیر پوچھا۔
”آنکھیں۔“

”کیا؟ آنکھیں؟“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو میرے پاس کچھ رقم ہے وہ رکھ لو اور مجھے جانے دو۔“
”نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، کما گیا۔ مجھے صرف آنکھیں چاہئیں اور بس۔“

”مہم۔ مگر کیوں؟“ میں کھکھکیا۔
”یہ میری محبوبہ کی فرمائش ہے۔ اسے نیلی آنکھوں کا تحفہ چاہیے۔ مگر ایسی رنگت والی آنکھیں مل نہیں رہی ہیں۔“

”میری آنکھیں نیلی نہیں ہیں یہ بھوری ہیں۔“
میں نے جلدی سے بتایا۔

”میری طرف گھومو۔“ کھرورے لہجے میں کہا گیا۔
میں گھوما تو میں نے دیکھا کہ یہ آدمی قیامت میں مختصر سا بے مگر اس کے ہاتھ میں لائے پھل والا ایک چمکدار چاقو ضرور موجود تھا۔

”اپنا چہرہ مجھے دکھاؤ۔“
میں نے ماچس جلا کر سر اٹھایا۔
روشنی سے میری آنکھیں کچھ سکر گئی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میری ایک آنکھ کو پھیلایا۔ ماچس جل کر ختم ہو رہی تھی۔ میں نے تیلی گرا دی۔
”دیکھ لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم بہت چلاک آدمی لگتے ہو۔“ اس نے کہا۔
ایک تیلی اور جلاؤ۔“ میں نے دوسری تیلی جلائی۔ اس نے حکم دیا ”بیٹھا جاؤ۔“ میں اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال پکڑے اور جھٹکے سے میرا سر اونچا کیا۔ پھر وہ مجھ پر جھک گیا اس کا انداز بیجان سا تھا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے چاقو سنبھالا۔
میں نے بے چارگی سے آنکھیں بند کر لیں اور رونے لگا۔

میں خود کو کوئٹہ لگا میں نے آخری روز ڈنگ ہاؤس کے مالک کی بات کیوں نہیں مانی۔
اب میں اپنی آنکھوں سے محروم ہونے جا رہا تھا۔

جب میں جاگا تو پسینے سے نما ہوا تھا۔ سرخ اینٹ بنے بنے راستے پر نازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ اس سے اجرات اٹھ رہے تھے۔ اور ایک زرد پریوں والی تیلی روشنی کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ میں اپنے بستر سے نکلا اور ننگے پاؤں ہی چل پڑا اور کھڑکی کے پاس جا رک۔ میں نے باہر کی دیکھی ہوا کو سینے میں بھرا۔ باہر رات سانس لے رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر جاکر پانی سے تولیہ بھگوا۔ اسے سر پر اور سینے پر پھیرا۔ پھر میں نے لباس تبدیل کیا۔ اور ہرے رنگ والی پیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ بورڈنگ کے دروازے ہی پر مجھے اس کا مالک مل آیا۔ یہ ایک آنکھ والا آدمی تھا اور وقت سگار پی رہا تھا۔
”کہاں چلے؟“ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔
”اندر بہت گرمی ہے ذرا ٹھنڈی لگا۔“

”مگر اب تو دکانیں بھی بند ہو گئی ہوں گی یہاں سڑکوں پر روشنی نہیں ہوتی تم بہتر ہے رات میں باہر نہ جاؤ۔“

”میں بلدی ہی لوٹ آؤں گا۔“ میں نے کہا اور اندھیرے میں کھس پڑا۔ واقعی یہاں کے رستے بہت اندھیرا تھا۔ مگر میں پلٹا رہا۔ میں سگریٹ جلائی اسی وقت چاند بھی بادلوں سے نکل آیا اور اطراف روشن ہو گئے۔ سامنے ایک دیوار بھی بہت شگفتہ سی۔ ہوا سنبھال بجا رہی تھی۔ مجھے پودوں کی مہک محسوس ہوئی۔ کیرٹے کھوڑوں کی آوازوں سے رات گونج رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ دنیا آوازوں کا مجموعہ ہے۔

میں نے سگریٹ پھینک دی اور در تک چلتا رہا۔ میں نے ایک جگہ سے سڑک پار کی تو مجھے ایک مکان سے نکل کر کوئی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ مجھے اپنے پیچھے چاہیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر نہیں دیکھا مگر چاہیں تیزی سے مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں نے سوچا بھاگ لوں۔ مگر اس سے قبل ہی کسی چاقو کی نوک مجھے اپنی پیٹھ میں چبھتی محسوس ہوئی۔

”مسٹر۔ خاموش رہنا ورنہ پیٹھ میں چھید ہو جائے گا۔“ ایک آواز سنائی دی۔

”اے آنکھیں کھولو۔“ اس نے میرے سر کو جھٹکا۔

جذبات سے لا تعلق سے لگ رہے تھے۔ وہ دراصل اسے ایک قربان نگاہ پر قربان کرنے کی تیاری میں منہمک تھے۔ وہ ادھر کے علاقوں میں تین برسوں سے محوم رہا تھا۔ اس نے مقامی زبانوں پر بھی خاصا عبور حاصل کر لیا تھا۔ اس نے جلد جملے بول کر آزمایا تو اندازہ ہوا وہ لوگ اس کی بات سمجھ سکتے ہیں۔

تب اس کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ وہ ایک خاصا پردہ لکھا آدمی تھا اس نے ارسطو کو بھی پڑھ رکھا تھا۔ اسے یاد آیا کہ آج سورج گرہن ہونے والا ہے۔ اس نے طے کیا وہ اس علم کو اپنی جان بچانے کے لیے استعمال کرے گا وہ ان جاہل و خشیوں کو ایک زبردست چکر دینا چاہتا تھا تاکہ وہ اس سے مرعوب ہو جائیں اور اسے چھوڑ دیں۔ اسے ان و خشیوں کی نفسیات کا مناسب علم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ ساحروں، جادو گروں و میوہ سے بہت ڈرتے اور خائف رہتے ہیں۔

تب اس نے جتنے کو مخاطب کیا۔
”لوگو! دیکھو تم نے اگر مجھے ہلاک کیا یا کوئی گزند پہنچائی تو میں آسمان میں جھمکتے ہوئے اس روشن ترین گولے کو سیاہ کر دوں گا۔“ مقامی باشندوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

بارٹونی نے ان کی آنکھوں میں حیرت کو ابھرتے صاف دیکھا۔

اس نے دیکھا پھر ایک چھوٹی سی مجلس مشاورت کے لیے بیٹھ گئی۔ وہ خاصا پر اعتماد ہو گیا۔ اسی امید مندہ گئی تھی کہ یہ لوگ خوف زدہ ہو کر اسے چھوڑ دیں گے۔

دو گھنٹے بعد برادر بارٹونی ارا زولا کے کٹے ہوئے سر سے نکلنے والے خون کے فوارے نے جھینٹ کے پتھر کو سرخ کر دیا۔ جو پورے طرح گمناے ہوئے سورج کی ملجی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جبکہ مقامی باشندوں میں سے ایک معرخص وہیں کھڑا پرسکون آواز میں پورے وثوق سے ایک کے بعد ایک ان تمام نامہ نچوں کو دہراتا چلا جا رہا تھا۔ جن میں چاند گرہن اور سورج گرہن

میں نے آنکھیں کھول دیں۔
تیلی بالکل میری پلکوں کے پاس ہی جل رہی تھی۔
پھر اس نے میرے بال چھوڑ دیے۔
”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا ”تمہاری آنکھیں نیلی نہیں بس جاؤ بھاگو۔“ اس کے بعد وہ خود بھی واپس چل دیا۔

میں قریبی دیوار سے ٹک کر ہانپنے لگا۔
جب میں گرنا پڑا تو بورڈنگ ہاؤس پہنچا۔ تو دروازے پر ہی اس کا الگ اسٹوپل پر بیٹھا مل گیا۔
اس نے مجھے دیکھ کر اپنے سرگاہ کا ایک لمبا کش لیا۔
پھر دھواں اگل دیا۔ مگر مجھ سے کچھ پوچھا نہیں۔ میں نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا۔
دوسرے ہی دن میں قصبے سے نکل بھاگا۔



تیسرا رنگ۔۔۔ گرہن

بالا خیر اور بارٹونی نے تسلیم کر لیا کہ اب زندہ بچنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ راستہ بھول چکا تھا۔ گولوا کے گھنے جنگلات نے اسے مکمل طور سے گھیر لیا تھا۔ یہاں کے جغرافیائی نقشے سے لاعلمی کے باعث اس کے لیے کوئی اور راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ بیٹھا رہے اور اپنی موت کا انتظار کرے۔ اسے معلوم تھا کہ موت یقینی ہے۔

اس کے خیالات یہاں سے بہت دور اسپین میں بھٹک رہے تھے جہاں اس نے کانوٹ سے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور پھر مذہبی جوش سے لبریز ہو کر وہ مذہبی خدمت اور تبلیغ کے لیے ادھر جنگلوں کی طرف چل دیا تھا جہاں و خشیوں کی بستیاں تھیں تاکہ وہ انہیں انسانیت کی راہ دکھا سکے۔

جب وہ خیالات سے چونکا تو اس نے دیکھا کہ مقامی لوگوں نے جتنے میں اسے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ یہ سب کے سب ہشکلوں سے بے رحم اور

ہونے والے تھے۔
 مایانی قبیلے کے دانا بچوں نے ارسطو کی تحریروں کی
 مدد کے بغیر یہ وہ ساری تاریخیں معلوم کر لی تھیں اور
 برسوں پہلے انہیں اپنے ہدایت ناموں میں درج کر دیا
 تھا۔

برادر بارٹونی شاید مارا نہ جاتا اگر اس روز سوچ
 گر بن کا دن نہ ہوتا۔ قبیلے پر واجب تھا کہ اس روز
 اس موقع پر کسی انسان کی قربانی دے جائے۔



چوتھا رنگ۔۔۔ خط

بارش زدہ رات تھی جب پٹنہ میل نے برڈوالی
 اسٹیشن سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ہوا تیز تھی اور بادل
 کرج رہے تھے۔ اور اندھیرا بجلی کی چمک سے روشن
 ہو رہا تھا۔ ٹرین نے سٹی دی اور ایک چھوٹے سے
 اسٹیشن سے گزرتی چلی گئی۔ انجن کی اگلی روشنی پلیٹ
 فارم پر پڑی اور آگے بڑھ گئی اس میں دور تک چاول
 کے لٹیت دکھائی دے رہے تھے۔ بنگال کے دیہی
 علاقے کا یہ ایک بے رنگ سا منظر تھا۔

ٹرین کے پچاس ڈبوں میں خاموشی تھی۔ بتیاں
 بھی ہوئی تھیں۔ صرف اس بوگی کی روشنی جل رہی
 تھی جو ڈاک سے متعلق تھی۔ برڈوالی سے حاصل کردہ
 خطوط کے تحلیفے بوگی کے ایک کونے میں رکھے تھے۔
 پوسٹ مین ابھی تک ان خطوں کے ساتھ مصروف تھا
 جو اسے کلکتہ سے ملے تھے۔ اسے کوئی جلدی نہیں
 تھی۔ پٹنہ پہنچنے سے پہلے ابھی اس ٹرین کو دو اور
 اسٹیشنوں پر رکتا تھا۔ گویا پوری رات اس کے پاس
 تھی۔ اسے جاگنا بھی تھا۔

ڈبے کے دوسرے گوشے میں رام بابو نے کرسی
 سنبھالی ہوئی تھی۔ انہوں نے سگریٹ جلائی وہ میل
 ٹرین کا پوسٹ ماسٹر تھا۔ اور وہ پوسٹ مین اس کی نگرانی
 میں تھا۔ پوسٹ مین پر اتنا آدمی تھا۔ اور قابل بھروسہ
 بھی تھا۔ رام بابو نے ایک رجسٹر میں کچھ لکھا پھر اس پر
 اپنے دستخط کر دیے۔

رام مکرجی اب پچاس سال کا ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنی
 عمر سے زیادہ ہی بوڑھا لگتا تھا۔ اس کے بال سفید ہو
 چکے تھے اور سران سے خالی ہو چکا تھا۔ رخساروں کی
 ہڈیاں دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ پچھلے دس برسوں سے
 کلکتہ سے پٹنہ مسلسل سفر کرتا رہا تھا۔ یہ ڈیوٹی اسے
 ہفتے میں تین بار انجام دینی ہوتی تھی۔ وہ یہ راتیں
 سوئے بغیر گزارنے کا عادی تھا۔

وہ پٹنہ میں ایک دن اور کلکتہ میں تین دن اپنے
 فلیٹ میں گزارتا تھا۔ اپنی بیوی سمیتا کے ساتھ۔ جو
 جوان العزورت تھی۔ اس نے سمیتا سے دس سال
 قبل شادی کی تھی۔ جب وہ صرف بیس سال کی تھی۔
 اسے امید تھی کہ وہ ٹرین میں پوسٹ ماسٹر بن جائے گا۔
 لیکن پھر اسے کلکتہ بھیج دیا گیا تھا۔ رام بابو نے اپنی
 زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ خود سمیتا بھی ہر
 بات ماننے والی لوکی تھی۔

اس رات ٹرین موسلا دھار بارش میں رواں تھی۔
 رام بابو کے دل میں کوئی خاص سوچ نہ تھی۔ وہ سمیتا
 کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس نے
 سگریٹ بجا دی۔ پوسٹ مین کی طرف دیکھا اور جلدی
 سے خطوں کا پیکٹ اٹھا لیا جو ابھی Sort نہیں ہوا تھا۔
 اس نے ان خطوں پر لکھے پتوں کو دیکھنا شروع کیا۔
 پوسٹ مین نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی اور انجان
 بن گیا تھا۔ اسے رام بابو کی اس عادت کا علم تھا وہ اسے
 ایک تجبیطی سمجھتا تھا۔ جسے دوسروں کے خط پڑھنے کی
 عادت ہوتی ہے۔

پیکٹ لے کر وہ اپنی میز پر چلا گیا اس نے تھرمس
 سے چائے انڈلی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے باہر
 جھانکا اور سوچا لوگ اس وقت کیا سوچ رہے ہوں
 گے۔ رام بابو اکثر ایک فلسفی بن جاتا تھا۔ پچھلے چند
 عرصے سے وہ ایک خیالی دنیا میں رہنے لگا تھا۔

اس نے پیکٹ سے ایک خط اٹھایا۔ یہ مروانہ تحریر
 تھی پتا تھا۔ مس سوہاسین 150 سٹریٹ پٹنہ۔

ذرا دیکھتے ہیں یہ مس سوہاسین کیا چیزیں؟

اس نے چاقو کی مدد سے لفافہ کھولا۔ پھر وہ بڑے

اشتقاق سے خط پڑھا کہ تمہارا خط ملا۔ میں یہ خط اسٹیشن ہی سے لکھ رہا ہوں۔

رام بابو نے کچھ جملے چھوڑے اور آگے بڑھا۔

افسوس ابھی تک حالات قابو میں نہیں آئے ہیں میں اسی لیے تم سے شادی نہیں کر سکا۔ تمہیں معلوم ہے تمہارے والد ہماری شادی کے خلاف ہیں۔ البتہ اگر مجھے کوئی عمدہ نوکری مل جائے تو معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔

فصول سا خط ہے۔ رام بابو بیڑا لے۔ اس نے ایسے بہت خط دیکھے تھے جس میں کم تنخواہ سنگ دل بابوں اور شادی نہ ہونے کا رویہ ہوتا تھا۔ اس نے ایسے بہت سے خط پھاڑ کر بھی پھینکے تھے۔ وہ ایک دقیانوسی آدمی تھا اور اس بات کا مخالف تھا کہ لڑکیاں رومان بازیاں کریں۔

اس نے بہر حال یہ خط نہیں پھاڑا اسے دوبارہ لفافے میں ڈال کر بند کر دیا۔ دوسرا خط کسی عورت کی تحریر میں تھایہ کسی سبب سے نام تھا۔ پتے کی سائڈ میں بھیجنے والی کا نام لکھا تھا۔ پرات بھا۔

اس نے اسے نہیں کھولا۔ عورتوں کے خطوں سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔

اس نے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے سوچا۔ سمجھتا گھر میں اکیلی ہوگی۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔

اس نے بے دلی سے ایک اور خط اٹھایا۔ یہ خط خلاصہ وچپ محسوس ہوا۔

یہ کسی بیوی کی طرف سے کسی شوہر کے نام تھا جو بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ لکھا تھا۔

تمہارے بنامیرامن سونا سونا رہتا ہے۔

رام بابو نے خط آگے نہیں بڑھا اور خود سے سوال کیا۔ آخر سمجھتا ہے مجھے کبھی کوئی خط کیوں نہیں لکھا؟

شاید یہ اسی کی کوتاہی تھی۔ اس نے عورت کو کبھی

محبت میں دی تھی۔ یہ عمروں کا فرق بھی مانع تھا۔ وہ اسے سمجھانے بھی نہیں لے جاتا تھا۔ رام بابو نے سوچا یہ تو زیادتی ہے بے چاری کے ساتھ۔

”رام بابو۔“ ”معا“ اسے پوسٹ مین کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میری مانو تو تھوڑا سا سولو۔“

رام بابو نے جواب نہیں دیا اور باہر پھیلی رات کو دیکھتا رہا۔

اس نے پرات بھا کا خط ایک طرف رکھ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ پھاڑوے؟

اس نے مشینی انداز میں ایک اور خط اٹھایا۔ اس لفافے پر لکھا پتا ایسی تحریر میں تھا جو اس کے لیے مانوس کی تھی۔

اس نے دلچسپی سے لفافے کو دیکھا۔ کچھ خدشات کے ساتھ اس نے اندر سے خط نکالا۔

یہ خط کسی پرکاش نامی آدمی کو لکھا گیا تھا۔ رام بابو آج شام کو پٹنہ جا رہا ہے میں آدھی رات والے جہاز سے واپس پہنچوں گی۔ کل صبح میں نے تیاری کے بغیر تمہارا مشورہ مان لیا تھا۔ اگر تم منگل کو پہنچیں

سے چل دو تب وہ کو اسی جگہ ہم مل سکیں گے جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ میں وہاں سے تمہیں تار بھیج دوں گی۔

اس خط کو لکھتے ہوئے مجھے لگ رہا ہے کہ میں بس تمہاری ہوں۔ صرف تمہاری۔ سمجھتا۔

ایک زور کی گرج سے بجلی چمکی اور دور تک اجالا ہو گیا۔ پانی میں ڈوبے ہیئت ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

ٹرین نے ایک زوردار سیٹی بلند کی۔

وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن سے گزری۔ اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

پانچواں رنگ۔۔۔ قصہ

کبھی موقع ملے تو ایک شام دریائے راسکی کے کنارے گزاریں۔ ادھر کچھ چھوٹی بڑی سرائیں ہیں

پل تھے۔ ایسی جگہاں کم کم ملتی ہیں۔ میں نے اے۔
 جبار میں رکھ دیا۔ لوگ بیٹے ہیں۔
 بوڑھے نے مسٹر اکرانت دکھائے پھر جی۔
 سنبھالتے ہوئے بولا۔

”اچھا سوئیو۔ میں تو چلوں گا مجھے کئی کام ہیں۔“
 اکیلے ہو کر ہم نے چھٹی کو کئی بار دیکھا۔ اسی وقت
 ایک آدمی اندر آیا یہ وضع قطع سے کوئی مزدور لگتا تھا۔
 بیٹھ کر اس نے ہمیں دیکھا ”صاحب جی ہے نا یہ
 عجیب چیز؟“ اس نے چھٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں۔“

”جب یہ پکڑی گئی تھی کیا آپ لوگ اوسر ہی تھے

”نہیں ہم تو ادھر پہلی مرتبہ آئے ہیں۔“
 ”اچھا اچھا۔“ وہ ہنسا۔ ”یہ مچھلی دراصل میں نے
 لپکری تھی۔“

”تم نے کپڑی تھی؟“ ہم نے حیرت سے پوچھا۔
 ”جی موسیو۔“ اس آدمی نے کہہ ”اس روز جمعہ کا
 تھا۔ دریا پر بند بندھا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جس
 نئے میں نے اسے پکڑا تھا اس میں چارے کے
 دو در میں نے ایک کبھی پھنسا دی تھی۔ میں نے تو
 چاچا بھی نہ تھا کہ اتنی بڑی پھلی جیسے کی۔ پورے بارہ
 روٹی ہے۔“ اس نے تانف سے کہہ ”بعد میں ایسا
 مار پھر کبھی نہیں ملا۔“

ایک ایکہ اٹھ ہزار اچھا موسیو میں چلا۔
 ذرا سی دیر میں وہاں ایک تیسرا آدمی پھر آگیا۔ اس
 نے ہاتھ میں شراب کا پالہ دیا رکھا تھا۔ اس نے کی رنگ
 رافت پھر کی اس نے کہا۔ ”موسیو ہم لوگ ادھر
 سی ہیں کل چلے جائیں گے ہمیں بتاؤ یہ پھل آپ
 کس طرح پڑی تھی؟“

آئے والا شکر کیا۔ ”چھا تو کسی نے آپ کو بتادیا کہ پھلی میں نے پکڑی تھی۔“

”نہیں۔“ ہم نے کہا۔ ”یہ تو اندازے سے کہا“

وہ خوش ہو گیا بولا ”آپ کا اندازہ تو غضب کا ہے یہ

علاوہ اچھے کرنے ہیں جن میں شراب پھیل کر چھپیں
ہیں بھری ہوئی ہے۔ یہاں آپ کو الٹ پھیرے بیٹے
الٹرا میں کے شراب کی پٹکیاں لیتے۔ تھوڑی سی
میں شل پتہ پھیرے آپ کو اتنی بہت سی کمائیاں سنا
الیں کے کہ آپ کو ہنسی کو کیا مشکل ہو جائے گا۔

در اصل مجھے ایک ایسا موقع مل چکا ہے میں اپنے ایک دوست ماننے کے ساتھ ادھر سے گزرا تھا۔ واپسی میں ہم ایک چھوٹی سی سرائے میں جا بیٹھے تھے جو دریا کے پاس نہ تھی۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہ کوئی عوامی گشت و گام کی جگہ تھی۔ ایک بوڑھا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ظاہر ہے ہماری گفتگو اس سے ہوئی تھی۔ ہمیں یہ کہہ کر اس نے کہا ”موسیو آج کا دن بہت اچھا

”دُن تو کل بھی اچھا تھا۔“ میں نے کہا۔
ماننے نے بوڑھے سے کہا ”میں نے دیکھا ہے دوسرے
خائیں اچھی ہوئی ہیں۔“

پھر کسی طرح بوزھا جان گیا کہ ہم اوسرا جنسی ہیں
 اور منج کو ہی واپس جانے والے ہیں۔
 اس بیشک میں ہم نے ایک طرف شیشے کا ایک
 انا سا صندوق نما جار کھا دیکھا جو ہاں کے آتش دان
 سے کسی قدر اونچائی پر نصب کیا گیا تھا۔ اس شیشے کے
 بار میں ایک خاصی بڑی سی پھٹی موجود تھی۔ مجھے یہ
 ٹوٹی CAT پھٹی لگی۔

بوڑھے نے مجھے ادھر دیکھتے دیکھ لیا اس نے کہا ”
 ”یو ہے نایہ عجیب سی مچھلی؟“
 میں نے کہا۔ ”کیا کوئی نایاب قسم ہے؟“
 ماننے نے کہا۔ ”کیا اس میں بھر کے اسے نمائش
 کے لیے رکھا گیا ہے۔“ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔
 ”کلازون کیا ہو گا۔“
 بوڑھا سنبھل کر بٹھ گیا۔

مچھلی واقعی میں نہ ہی پکڑی تھی اور پھر اسے سرائے کی نذر کر دیا تھا۔“

پھر اس نے تفصیل بتائی۔ کہ کس طرح ککشاں کے دوران چھڑی ٹوٹی تھی۔ اور پھر جب اس کا وزن کیا گیا تھا تو یہ پورے تیرہ سو کلو گرام کی نکل گئی تھی۔



چھٹا رنگ..... نیا مالک

بچھلے بیس برسوں سے یہ محل غیر آباد تھا۔ اور گاؤں کے آخری سرے پر موجود ایک اونچی چٹان پر بیٹا ہوا تھا۔ یہاں ہر وقت تیز ہوا چلتی رہتی تھی۔ ایک ماہ قبل مزدوروں نے اسے رہائش کے لائق بتا دیا تھا۔ اور اس کے فوراً بعد اس کے درجن بھر کمروں کے لیے درجن بھر ترک سالن کے پہنچ گئے تھے۔

اس کی دیوار سے لگے سارے ملازم یعنی چوکیدار بانی نوکرانی، باورچن، جنینیں نئے مالک نے آنے سے قبل بھرتی کیا تھا۔ ان کو آتے دیکھ رہے تھے۔ باورچن نے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے کہا ”یہ تو پوری فوج ہے۔ ترکوں کے پیچھے ایک کار بھی ہے۔ اسی میں نیا مالک ہے۔“

مالی نے کہا۔ ”مجھے یہ تو مالک کچھ بیمار لگتا ہے۔“

نوکرانی نے سر ہلایا ”خاصاً تو عمر بھی ہے ابھی۔“ مالی نے پیشانی صاف کی اور کہا ”عجیب بات ہے چہرے سے تو بوڑھا لگتا ہے۔“

”اس کے پیر میں تکلیف ہے۔“

”سادہ سا آدمی لگتا ہے۔“ چوکیدار نے کہا۔

”یہ نئے مالک کا خاص آدمی تھا۔ دن بھر کتابوں میں مگن رہتا ہے۔ بہت مہمان آدمی ہے۔“ رک کر اس نے کہا ”ایک بار میرے ہاتھ سے چائے چھلک کر اس پر گر گئی تھی۔ تب بھی اسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بہت اچھا آدمی ہے۔“

باورچن نے کولھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جب یہ گھر سواری سے لوٹا تھا تب دیکھتے۔ میں تو کہتی ہوں یہ ایک تاتاری ہے۔ وحشی اور جب اس نے مجھ سے شراب منگائی تھی اس کا لہجہ بہت برا تھا۔“

”اچھا۔“ کیدار نے کہا۔ ”بس چپ کر۔“

اس آدمی کے جانے کے بعد وہاں کا زمین دار اندر آ گیا۔ اور ہمارے پاس آ بیٹھا۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ اس علاقے کا زمین دار ہے تو ہم نے اسے یہ ساری کمائیاں سنادیں۔

وہ خوب ہنس۔

بالا خراس نے گلا صاف کیا اور یوں ”یہاں کے سارے لٹو بٹو یہی کہتے ہیں کہ یہ مچھلی انہوں نے پکڑی تھی۔ اس کے بعد اس نے اصل کمائی سنائی معلوم ہوا یہ برسوں پہلے کی بات ہے زمین دار اس وقت نوجوان تھا۔ جب یہ مچھلی پکڑی گئی تھی۔ اس میں کسی تجربے کا دخل نہ تھا۔ بس اتفاق سے یہ ڈور میں پھنس گئی تھی۔“

اس نے بتایا یہ بھی اتفاق تھا کہ اس نے ڈور کا سرا ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا تھا۔ ورنہ اتنی بھاری مچھلی ہاتھ نہ آتی۔

زمین دار نے اپنا پالہ صاف کیا اور اٹھ گیا۔

ماننے اٹھا وہ اب مچھلی کو پاس سے دیکھنا چاہتا تھا۔

”اس نے ایک کرسی چننی اور اس پر کھڑے ہو کر اس نے دیکھنا چاہا۔ غالباً زمین ہموار نہ تھی۔ اس کے کرسی پر چڑھتے ہی کرسی بری طرح ڈوٹی ماننے نے سنبھلنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ جار سے ٹکرایا اور پھر ماننے اور وہ شیشے کا جار دونوں ہی زمین پر آ گئے۔

میں اور پھر لپکا اور دیکھا کہ مچھلی کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ماننے نے بھی ادھر پریشانی سے دیکھا۔“

مچھلی کو نقصان پہنچ چکا تھا۔ وہ سیکڑوں ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بہت ہی عجیب بات تھی۔

ایک سوکھی ہوئی بمس بھری مچھلی اس طرح ریزہ ریزہ کیسے ہو سکتی تھی۔ مگر یہ بات ناقابل یقین تو اس

والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور کرسی پر نیمہ دراز تھا۔
 مایا نے دیکھا اور حیرانی سے بولا ”ہاں یہ وہی ہے نیا
 مالک۔ خاصاً کم عمر ہے ابھی۔“
 نوکرانی نے جھانکا اور سر پر دوپٹا ڈالتے ہوئے بولی۔
 ”مگر مجھے تو یہ ایک بوڑھا آدمی لگ رہا ہے۔“
 چوکیدار نے کھڑکی سے اندر جھانکا اور جلدی سے
 نیچے ہٹ گیا اس نے سینے پر کراس بنایا۔ اور سرگوشی
 کی۔ ”میرے خدا یہ بالکل شیطان جیسا ہے۔“
 ”شیطان جیسا۔“ باورچن نے تسخیر سے کہا اور
 اس نے کمرے میں جھانکا۔ وہ کچھ دیر دیکھتی رہی۔ پھر
 بولی۔ ”بھائی جی تم اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔“
 ”کیا مطلب؟“

”باورچن نے اپنی بالوں کی لٹ جھٹکی اور رومانی
 لہجے میں بولی۔ ”کیسا شاندار جوان ہے۔ سنہرے بالوں
 والا۔ گورا چٹا۔“

گاؤں کا پولیس والا جوان چاروں کے پیچھے کھڑا تھا۔
 ذرا سا آگے بڑھا اس نے نہایت بھونڈے انداز سے
 اپنی سالی باورچن کی آستین کھینچی اور خود آگے بڑھ گیا۔
 پھر اس نے اسٹڈی کی کھڑکی سے اندر جھانکا کچھ دیر
 تک وہ غور سے ادھر دیکھتا رہا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے
 بعد بڑی ناگواری سے اس نے سب پر نگاہ ڈالی اور
 غرایا۔

”میں بے حد حیران ہوں تم لوگوں پر۔۔۔ آخر تم
 لوگ وہاں کسی چیز کو دیکھ رہے ہو؟ وہاں اندر تو کوئی بھی
 نہیں ہے۔ سوائے میز اور اس کے پیچھے خالی کرسی
 کے۔“



ساتواں رنگ۔۔۔ ٹاپ فلور

ابھی میں لفٹ میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس میں پہلے
 سے موجود پچھڑے آدمی نے میری طرف مسکرا کر
 دیکھا اور بولا۔ ”کیا تم میری مدد کرو گے؟“ میں اسے
 پہلے بھی لفٹ استعمال کرتے دیکھ چکا تھا۔ تاہم ہماری
 کوئی بات چیت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ ٹاپ فلور پر جاتا تھا۔

”وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔“ مایا نے کہا۔ ”کسی
 نے پیچھے اس کی برائی اچھی بات نہیں۔“
 ”لو ان کی سنو باورچن چنکی۔“
 ”اچھا بس اب ختم کرو۔“ مایا نے کہا۔ ”وہ بوڑھا
 میں صرف سیال سفید ہو گئے ہیں۔“
 نوکرانی نے قسم کھائی اور کہا ”کسی انڈین کی طرح
 کالا ہے۔“

پھر تو مایا اور نوکرانی میں تو تباہ ہوتے ہوتے رہ گئی
 لہرائی نے مزید کہا ”وہ صرف کالا نہیں گنجا بھی ہے۔
 اس کے ہال کہاں سے آگئے؟“

نہایت ادا نے مایا نوکرانی اور باورچن کو گھور کر دیکھا
 وہ مالک کا خاص آدمی تھا۔

اس نے کہا۔ ”کیسی عجیب بات ہے کیا تم لوگوں کو
 نظر نہیں آتا۔ کوئی کہہ رہا ہے وہ گنجا ہے کوئی کہہ رہا
 ہے اس کے بال ہیں۔ کوئی اسے تانڈی کہہ رہا ہے
 کوئی انڈین بتا رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہم سب نے
 اسے بس ایک ہی بار دیکھا ہے۔ یہی جب وہ پہلے پہل
 آیا تھا۔ اس روز اس نے پوسٹین پن رکھی تھی۔ جس
 میں وہ ریچھ کی طرح لگتا تھا۔ اس گھر میں تین افراد
 ایسے ہیں جو بالکل بے بنیاد عموں کے رہے ہیں۔ اس
 قدر تضاد بیانی۔۔۔ حد ہو گئی۔“ چوکیدار نے انہیں
 گھورا۔ وہ ایک چھوٹا سا دانش ور بھی تھا۔ اس نے
 ایک تجویز دی۔ ”ایسا کرتے ہیں ہم لوگ اسی وقت
 چل کر اسے دیکھتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے مطالعے کے
 کمرے میں ہے وہ کار سے اتر کر سیدھا ڈوھر گیا ہے۔“
 باورچن نے اختلاف کیا۔ اس نے کہا وہ چاہتی ہے
 کہ پہلے اپنے بہنوئی کو گاؤں سے یہاں بلا لے وہ ایک
 پولیس مین ہے وہ چاہتی تھی کہ یہ کام پولیس مین کے
 سامنے ہو۔

جب گاؤں کا پولیس مین جو باورچن کا بہنوئی تھا آ
 گیا۔ تو طے ہوا وہ پانچوں مل کرنے مالک کی اسٹڈی کی
 کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھیں گے جدھر وہ میز پر
 بیٹھا ہوا تھا۔

نیا مالک اپنی اسٹڈی میں تھا۔ وہ اپنی میز کے سامنے

میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میرا ایک مسئلہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو ذرا میرے ساتھ چلو عمارت کے گوشے پر میں نے دعوت قبول کر لی اور سوچنے لگا پتا نہیں اس کا مسئلہ کیا ہے۔ میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔“ میرا نام ہیر ٹکٹن ہے۔ میں بیسج کمپنی میں کام کرتا ہوں۔“

مجھے حیرت کتنی ہے۔ میں کارڈ بورڈ والے کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اب ہم عمارت کے گوشے میں واقع کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ آٹے سامنے۔

”اب میرا مسئلہ سنو۔“ مختصر سے آدمی نے کہا۔ ”یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ بلڈنگ والے بھی نہیں جانتے۔“ رک کروہ مسکرایا۔ ”مسٹر جی حقیقت یہ ہے کہ میری کمپنی کو پینڈ ہوئے تین برس ہو چکے ہیں۔ یہ افسوس ناک بات تھی میں اس میں چالیس سال سے ملازم تھا۔ تم کو چھتیس تو ہو گا پھر میں روزانہ ٹاپ فلور پر کیوں جاتا ہوں؟“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”کیا کوئی اور اسٹاف میں نہیں؟“

”نہیں بات یہ ہے کہ میں نے یہ بات اپنی بیوی سے چھپا رکھی ہے کہ میری فرم پینڈ ہو گئی ہے۔ انہوں نے مجھے پشیم دی تھی اور کچھ رقم بھی۔ ابھی میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا تھا۔ اس نے کافی کی چسکی لی اور بولا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ مزید تین سال بھولی ملازمت کرتا رہوں گا اس کے بعد میری مدت ملازمت ختم ہو جاتی میری بیوی سے یہ بات اسی طرح چھپی رہ سکتی تھی۔“

”مگر کیوں؟“

”دیکھو میری بیوی بالکل پسند نہیں کرتی کہ میں سارا دن گھر میں رہوں۔ بس اسی لیے میں نے اس عمارت کا ٹاپ فلور کا ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے اور روزانہ یہاں آتا ہوں۔“

”آپ سارا دن یہاں کرتے کیا ہیں؟“

”کچھ پڑھتا ہوں۔ آرام کرتا ہوں۔“

”اور مسئلہ کیا ہے؟“

”میں بیوی کے لیے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ میرے تین سال پورے ہو گئے ہیں۔ میری بیوی کو امید ہے میرے ریٹائرمنٹ پر میری فرم مجھے کوئی الوداعی پارٹی دے گی اور کوئی یادگار تحفہ بھی۔“

”اور میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے کپ خالی کیا۔ ”تمہیں اور تمہارے اسٹاف کے دوستوں کو ایک شام میرے لیے رکنا ہو گا اور والے کمرے میں ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کروں گا اس میں میری بیوی بھی شریک ہو گی یہ بتاؤ کہ تم میرے لیے اتنی زحمت اٹھا سکتے ہو؟“

بڑی عجیب سی درخواست تھی۔

”ہم۔۔۔ مگر۔۔۔ میں بھلا یا۔“

کوئی اگر مکر نہیں۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بننے پلانے کا سامان مفت ملے گا۔ میرے پاس ایک کھانا ہے۔ اس کو تم مجھے تحفے میں دے دینا۔ ”رک کر اس نے کہا۔“ ہاں تمہیں ایک مختصر سی الوداعی تقریر بھی کرنا ہوگی۔“

”میں نے جب یہ باتیں اپنی سکریٹری شیلہ کو بتائیں تو اس نے منہ ہاتے ہوئے کہا۔ ”عجیب آدمی ہے۔ میں نے اسے کبھی غور سے نہیں دیکھا۔ اور وہ یہاں تین سال سے آ رہا ہے۔ کرتا ہے کیا آخر؟“ میں نے کہا۔ ”میں اس کے کمرے میں جا چکا ہوں۔ آرام دہ جگہ ہے۔ وہاں کتابیں بھی ہیں۔ ایک سیٹی بھی ہے۔“

شیلہ ہنسی ”دلچسپ آدمی ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ قطعاً ”دلچسپ آدمی نہیں۔“

پارٹی ٹھیک ٹھاک ہوئی۔ ہیر ٹکٹن کی نکھی تقریر میں نے یاد کر لی تھی۔ پھر وہاں مسز ہیر ٹکٹن بھی آئی۔ وہ ایک چوبیسویں عورت تھی۔ لباس اچھا تھا۔ میں نے رتی ہوئی تقریر کی اور ہیر ٹکٹن کو کھانا کا تحفہ دیا۔ پھر تقریب ختم ہو گئی اور وہ دونوں میاں بیوی رخصت ہو گئے۔

چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود حاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیاں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ بنا سکتے ہیں۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 مالک مفت

قیمت - 300/- روپے
ڈاک خرچ - 50/- روپے

ہندوستان کا عظیم ترین
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216381

”میں ایک دو روز میں اگر حساب صاف کروں گا“
ہائے سے قبل ہیر ٹکٹن نے مجھ سے کہا ”یہاں الماری
میں بہت سی اچھی کتابیں ہیں۔ تم کو کوئی پسند آئے تو
لے لیتا۔“

جب سب چلے گئے تو شیلہ کے ساتھ نیچے اترا۔
چلتے چلتے وہ کھلکھلا کر رہی۔

”کیا خوب ساری تھی؟“ اس نے کہا۔ ”اس کی بیوی
کی قدر خوش تھی۔“

”مرد جانتے ہیں کہ عورتوں کو کس طرح خوش رکھا
جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

جب ہم دو سری منزل پر تھے تو شیلہ نے کہا۔
”بے شک مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ ہیر ٹکٹن
انہی میں سے ایک تھا۔“ اس نے تائید کی پھر بولی۔

”مگر آپ کیا جانیں آپ تو لفٹ سے جانے والے آدمی
ہیں۔ البتہ میں نے اسے متعدد بار دیکھا تھا۔ وہ راز
داری کے سبب لفٹ کے بجائے بیٹھ زینوں سے اوپر
جاتی تھی۔“

”کون؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم کس کی بات کر رہی
ہو؟ کیا اس کی بیوی کی بات کر رہی ہو؟“

”نہیں۔“ میں ایک سرخ بالوں والی عورت کی
بات کر رہی ہوں۔ پہلے میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ ہمارے
ٹاپ فلور پر واقع کسی آفس میں ٹائپسٹ وغیرہ ہے۔
مگر میں اب اصل بات سمجھ گئی ہوں۔“

”اصل بات؟ کیا سمجھ گئی ہو تم؟“ میں نے تعجب
سے پوچھا۔

”وہی جو حقیقت تھی۔“ شیلہ نے کہا۔ ”آپ کا کیا
نیال ہے یہ شخص ہیر ٹکٹن اوپر ٹاپ فلور کے کمرے
میں تین برسوں تک کیا کتابیں پڑھ پڑھ کر وقت گزارتا
رہا تھا؟“



انتھائے عشق

صائمہ عروج

ایک لڑکی کے حب الوطنی کی کہانی مٹی سے اس کا رشتہ پرانا تھا۔ اس وقت کا جب وہ گانوں جاتی تھی۔ مٹی کا پیار سب وطن سے محبت ایک ایسا فطری جذبہ ہے جو ہر انسان بلکہ ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے۔ کہیں یہ تعمیر اور کبھی غریب کاری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک لڑکی کی کہانی مٹی سے اس کا رشتہ پرانا تھا۔ مٹی کا پیار سب سے عظیم تھا۔ اس مٹی کی لاج اس کے ہم وطن نے بڑی محبت سے قائم کی تھی۔

دو پیار کرنے والوں کے حب الوطنی





دینا کے اس جنون کی ابتدا کھار کی طرح برتن بنانے کے شوق سے ہوئی تھی۔ بچپن میں اماں کی چھٹیوں میں انہیں لے کر گاؤں چلی جاتی تھیں۔ یہ دادا جان کا حکم بھی تھا اور امی کی خواہش بھی اور وہیں رحیمو کا کا کو چکر پر برتن بناتے دیکھتی تھی۔ بابا گوندھی ہوئی مٹی کا پڑا چکر پر رکھ کر چلاتے اور اس کے ہاتھوں کی جنبش مٹی کے بے ڈھب پڑے کو شکل عطا کرتے، وہ نکلتی ہاندھے ان کے ہاتھوں کا جادو دیکھتی۔ اس کا خیال تھا کہ رحیمو چاچا بھی کمانیوں والے جادوگر ہیں۔ کمانیوں والا جادوگر تو زندہ شزدادی کا مجسمہ بنا دیتا تھا، لیکن رحیمو بابا اچھے جادوگر ہیں۔ جنہیں گیلی مٹی سے برتن بنانے کا جادو آتا ہے۔ پھر ایک دن اس نے بابا سے کہہ دیا۔

”بابا! مجھے بھی برتن بنانے والا جادو سکھا دو۔“ اور رحیم بابا ہنس پڑے۔

”ابھی نہیں بیٹا۔ ابھی تم چھوٹی ہو۔ جب بڑی ہوگی تو سکھاؤں گا۔“

”اتنی بڑی تو ہوں۔“ دینا نے بچوں پر اٹھتے ہوئے رحیمو بابا کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”جب میٹرک پاس کر لو گی تب سکھاؤں گا۔“ اور دینا کی امیدوں پر پانی پھیر گیا۔ وہ اس وقت پانچویں کلاس میں تھی۔ گویا اسے مزید کئی سال انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ چارہ بھی کوئی نہیں تھا کہ پورے گاؤں میں ہی جادو صرف رحیمو چاچا کو آتا تھا اور شہر میں ان چیزوں کا کوئی رواج نہ تھا۔ جو رحیمو بابا بناتے تھے۔ اس لیے مبرہی کرنا پڑا۔ گاؤں میں کسی نہ کسی طرح اس کے جذبات کو سکون مل جاتا تھا۔ چکر پر جادو چلاتے ہاتھ اسے اطمینان دایتے تھے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب وہ مٹی کو خود بخود دے سکے گی۔ لیکن چھٹیاں ختم ہونے کے بعد شہر واپس آئے تو اس سے یہ سکون چھن گیا۔ اب اسے پھر سے اگلے سال تک انتظار کرنا تھا۔ دادا جان چاہتے تھے کہ تایا کی طرح حویلی میں رہیں، زمینیں سنبھالیں، لیکن بابا کے اندر شہر کی روح تھی۔ انہیں بھائی دوڑتی زندگی اور تیز

شارق کے لیے اس وقت مانگ لیا تھا، جب وہ پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ کلاس میں تو وہ ہر سال کی طرح پھر فرسٹ آئی ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ کیا جان کو اطمینان ہوا۔

جتنی دیر یہ باتیں ہوئی رہیں وہ رحیمو چاچا کے ہاں پہنچ چکی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ باہر سے چینی

ہوئی جائے۔ ”کہہ بابا میں آگئی۔“ لیکن پھر خاموشی سے

جانے کا ارادہ کیا۔ جب اچانک وہ اسے سامنے دیکھیں

ٹکے تو کتنا خوش ہوں گے۔ وہ اس سے پیار بھی تو بہت کرتے تھے۔

رحیمو کھار کا یہ دکھ تھا کہ ان کے چاروں بیٹوں

میں سے کوئی بھی اپنا آبائی پیشہ اختیار کرنے کو تیار نہ

تھا۔ پہلی بغاوت بڑے بیٹے اقبال عرف بالے نے کی۔

وہ میٹرک پاس اپنے آبائی پیشے کو حقارت کی نگاہ سے

دیکھتا تھا۔

”بابا مجھ سے ایک ایک آنے کے ٹکے نہیں بنائے

جاتے۔“ ایک روز جب رحیمو کی برداشت ختم ہوئی

تو اس نے بچ بول دیا۔

”نہیں بنائے گا تو کیا کرے گا۔“ اس کی سمجھ میں

نہیں آیا تھا کہ اس کا بیٹا اتنا باغی کیوں ہو گیا ہے۔

”کچھ بھی کر لوں گا۔ بڑھا لکھا ہوں۔“ شہر جاکر

ملازمت کر لوں گا۔ لیکن یہ گھٹیا کام نہیں کروں گا۔“

بیٹے کے الفاظ رحیمو کے دل میں نشتر بن کر اتر گئے۔

اسے لگا کہ بالے کے اس جملے نے اسے اس کے اجداد

کے سامنے ننگا کر دیا ہے۔ وہ غصہ اور رنج کی شدت سے تڑپ اٹھا۔

”جس کام کی وجہ سے تو اس مقام تک پہنچا ہے،

اسے گھٹیا کہہ رہا ہے۔ کیا اس سے بھی گھٹیا بات کوئی

ہو سکتی ہے۔“ اس نے کانپتے ہوئے کہا، لیکن بالے

کے سر پر شہر جانے کی دھن سوار تھی۔ گاؤں کے بہت

سے لڑکے شہر جاکر کما رہے تھے۔ پھر وہ تو دس بجائیں

پاس تھا۔ اس کی کامیابی یقینی تھی۔

اس ابتدائی بحث کے بعد بھی رحیمو نے کوشش

کی۔ کوئی پہچانتا تو وہ خوش ہو جاتی کہ اس کی انگلیاں

جلد سیکھ رہی ہیں۔

پورا ایک سال گزر گیا اور وہ خوش تھی کہ وہ گاؤں

جاری ہے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک بات تھی

کہ وہ انٹر کیمپو چاچا کے پاس پہنچ جائے۔ وہ انہیں

بتلاتا چاہتی تھی کہ جس جلدو کے لیے وہ اسے انتظار

کرتے کو کہہ رہے تھے۔ وہ اس کے ابتدائی جتن منتر

سیکھ آئی تھی اور یہ سب کچھ اس نے اپنے طور پر سیکھا

تھا۔ کسی ہدایت کے بغیر۔ حوبلی پہنچ کر وہ رکے بغیر باہر

نکل گئی۔ اسی نے اسے روکنے کی کوشش کی، لیکن ”وہ

ابھی آئی“ کہہ کر باہر نکل گئی۔

سب جانتے تھے وہ کہاں جاری ہے۔ ایک سال

پہلے بھی یہی سب کچھ ہوتا رہتا تھا۔ دینا کو تلاش کرنے

زیادہ دور نہیں جانا پڑتا تھا۔ برابر میں رحیمو کھار کا گھر

تھا۔ وہ وہیں مل جاتی تھی۔ چپ چاپ بیٹھی۔ رحیمو

چاچا کو چکر پر جلدو جگاتے دیکھتی رہتی تھی۔

”مہی خانی۔“ کہتی وہ باہر کی جانب بھاگی تو سب ہی

زہن بڑے۔

”معلوم نہیں اس بڑھے کھار نے اس پر کیا جلدو کیا

ہے کہ وہ اس کی دیوالی ہو رہی ہے۔“ اس نے باہر

جاتے دادا جان کے الفاظ سنے۔ لیکن یہ کہنے کے لیے

نہ رکی کہ ”جلدو انہوں نے نہیں مٹی کی سوندھی خوشبو

نے کیا ہے۔ جس کی پکار پر وہ اپنے آپ کو روک نہیں

پاتی۔“

وہ چلی گئی تو امی بتانے لگی کہ کس طرح دینا آئے کی

اشیاء بنانے لگی ہے۔

”سچ کہتی ہوں ابا جان۔ اب تو مجھے اور حیات کو

حیرت ہونے لگی ہے کہ وہ کس طرح چھوٹی سی بچی یہ

سب چیزیں بناتی ہے۔ سارا سارا دن کمرے میں بند

رہتی ہے۔ کسی ہیل میں حصہ نہیں لیتی۔“ امی جان

نے بتایا۔

”اور بڑھائی۔ اسکول بھی جاتی ہے یا۔“ یہ بتایا

جان تھے بہن کو ان باتوں سے تشویش ہو رہی تھی، آخر

کو وہ ان کی ہونے والی ہو تھی۔ انہوں نے دینا کو اپنے

پوتے کے ساتھ ٹٹلنے نکلے تھے۔ وہ بھی یہی سوال کرچکا تھا۔

”بس آج کل میں آتی ہوں گی۔“ بڑے زمیں دار نے جواب دیا تھا۔ ایک سال پہلے ہونے والی رحیمو بابا اور رونا کی ہونے والی دوستی سے وہ بھی واقف تھے۔ اپنے بیٹوں کے ستائے ہو رحیمو کہار سے ان کو ہمدردی تھی، لیکن وہ مجبور تھے۔ بیٹے نئے روشنی کے لیے بھاگ رہے تھے اور روایت پسند رحیمو کا دکھ وہ سمجھتے تھے۔ حیات کی طرح نیاز بھی شہر چلا جاتا تو شاید ان میں اور رحیمو میں کوئی فرق نہ رہتا۔ لیکن شکر تھا کہ نیاز نے گاؤں میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔

کہاں تو وہ روزینا کے بارے میں پوچھتا تھا اور کہاں وہ پہنچی تو وہ غائب تھا۔ مکان کے باہر والے حصے میں جہاں رحیمو بیٹھ کر کام کرتا تھا، ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ کھلی مٹی کے بنے ہوئے تازہ پڑے اسی طرح رکھے تھے۔ بس ذرا وہ خود کسی کام کو اندر گیا تھا کہ رونا وہاں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر تو وہ ہر چیز کو حیرت سے دیکھتی رہی، لیکن پھر اندر سے ابھرنے والی۔

خواہش کو روک نہ سکی۔ بڑی خاموشی سے وہ رحیمو کی جگہ پر آکر بیٹھ گئی، دائیں ہاتھ سے اس نے رحیمو کی طرح پڑا اٹھایا اور بائیں ہاتھ سے بابا کی طرح ہی چکر چلانے لگی۔ کبھی رونا خود کو تصور میں بابا بننے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بالکل بابا والے ڈھنگ اپنا لیے۔ گزشتہ چھٹیوں میں وہ سامنے بیٹھ کر رحیمو بابا کی حرکات و سکنات دیکھتی تھی۔ چکر کو چلانے میں اس کو مشکل پیش آرہی تھی۔ لیکن جب اس کے تھے منے ہاتھوں کی جنبش سے مٹی کے پڑے کی وضع قطع بدلنے لگی تو اس کے اندر مسرت کی سیڑیوں پھلجڑیاں سی چھوٹ گئیں، خود رحیمو اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ باہر آئے تو یہ عجیب منظر ان کا منظر تھا۔ وہ مبہوت بنے اس بھی جاوہر گرنی کو دیکھتے رہے۔ جس دن سے ہالے نے ان کے کام کو کھٹایا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک دھن سی چھا گئی تھی۔ لیکن اس تازہ دھوپ نے وہ تمام دھند

کی کہ وہ شہر جانے کا خیال دل سے نکل دے۔ لیکن اس پر کسی چیز کا اثر نہ ہوا۔ نہ غصے کا نہ درخواست کا۔ جوان اولاد جب ایک بار فیصلہ کر لے تو بوڑھے والدین اسے کسی طور روک نہیں سکتے۔ اس وقت جب بالا بھر گیا تھا رحیمو اتنا بوڑھا نہیں تھا۔ لیکن جب ایک ایک کر کے باقی تینوں بھی شہر چلے گئے تو وہ بوڑھا نظر آنے لگا۔ بیوی اس کی مرچکی تھی۔ زمانے کی گردش نے اعصائے پیری بھی چھین لی۔ تو اس کے پاس صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ بیٹوں کے پھڑکنے سے زیادہ اس کو یہ غم ستاتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد یہ فن بھی ختم بھی ہو جائے گا۔ اس چکر کو چلانے والے یہ ہاتھ اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ جو اس کو صدیوں پہلے نسل در نسل منتقل ہوئے تھے۔

رینا کی صورت میں ان کو اپنے کام کا پہلا مداح نصیب ہوا۔ اب تک وہ لاکھوں پٹکے اور برتن بنا کر فروخت کرچکا تھا، لیکن جیسی ستارش اس زمین داری پوتی کی معصوم آنکھوں میں دیکھی تھی۔ اس طرح کی داد تو آج تک کسی بڑے نے بھی اسے نہیں دی تھی۔ عام طور پر لوگ دکان میں اس طرح کی گفتگو احتیاطاً ہی نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس طرح دکان داری کی جانب سے منہ بولی قیمت لگانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ لیکن سال چھ مہینے بعد کوئی گاہک کوئی ایسا جملہ کہہ دیتا تھا کہ رحیمو کے فنکارانہ جذبے کی تسکین ہو جاتی، اس کی اتنا کی تسکین کے لیے تو یہ ہی کافی تھا کہ صرف اس گاؤں کے ہی نہیں کہ آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ بھی اس سے برتن خریدنے آتے تھے۔

رینا کے اس فقرے نے ”بابا مجھے بھی برتن بنانے کا یہ جادو سیکھا دنا۔“ رحیمو کی زندگی میں اس نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جس فن کو سیکھنے کے لیے اس کے اپنے خون نے حقارت سے انکار کر دیا تھا۔ اس کو سیکھنے کے لیے زمیں داری کی بیٹی پوتی نے اقرار کر کے اس کا سرخسرے اونچا کر دیا تھا۔

رینا کے شہر جانے کے بعد وہ کئی بار بچپوں کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ تین روز پہلے بھی جب وہ اپنے

صاف کردی تھی۔ پایا اسی طرح اسے دیکھتے رہے اگر وہ
نہ اس کو دیکھ کر چیخ نہ ماری۔

”بکھیں رحیمو پایا۔ میں نے برتن بنانے والا
جادو سیکھ لیا ہے۔“

رحیمو پایا اور تو کچھ نہ کر سکے، صرف آگے بڑھ کر
انہوں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ ان کی آنکھوں سے
آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے مٹی میں سنے ہوئے
اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے گالوں پر رکھ لیے۔
”کاش میں اپنا وقت ان حماقتوں میں ضائع نہ کیا
ہوتا تو آج یہ دن نہ کھنڈرتا۔“ دینا نے خیالات کی رو
سے پلٹتے سوچا یہ پہلی بار تھا کہ اس کی سوچ نے یہ دائرہ
اختیار کیا تھا۔ ورنہ آج سے پہلے اس نے جب بھی
سوچا تھا اس کے دل میں ایک میس سی ابھری تھی۔



پایا جانی کی اچانک موت نے ان کے تمام خواب
حقیقت کی دھوپ میں جلا دیے تھے۔ کہاں تو وہ خود
مائیکل انجیلو، روسو، زربو، مرینی اور دیو ناتیلو کی صف
میں کھڑا دیکھنے کے خواب دیکھ رہی تھی اور کہاں یہ
حالت ہوگی تھی کہ آٹھ سال گزرنے کے بعد بھی اس
نے حقیقت تو کیا خواب میں بھی کوئی مجسمہ نہیں بنایا
تھا۔ جن دونوں اس پر جنون تھا اس نے سیکڑوں بار اس
خواب کو چشمِ تصور سے دیکھا تھا کہ ایک بڑا سا ہال ہے
جو پورا عظیم مجسموں سے بھرا پڑا تھا اور گائیڈ سیاحوں
سے اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

”یہ ہے مائیکل انجیلو کا مجسمہ۔ تاریخ کے سب
سے بڑے مجسمہ سانس اٹلی میں اس فن نے بڑے
بڑے نام پیدا کیے ہیں۔ لیکن انجیلو ان بڑے ناموں
سے بھی بڑا نام ہے۔ ان کے برابر۔ اور آخر میں یہ
پاکستان کی ویٹا حیات ہیں۔ ان کے بارے میں۔“
دینا نے بند آنکھوں سے یہ منظر سیکڑوں بار دیکھا
تھا۔ لیکن پایا کی اچانک موت نے اس کے سارے
خواب چھین لیے تھے۔ پایا تیز ڈرائیو گ کے شوقین
تھے اور اسی شوق نے ان کی جان لے لی تھی۔ پایا کا سایہ

سر پر تھا تو اس کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لیکن ان کے
بعد ہر جانب سے بڑھتا اندھیرا انہیں اپنی پلیٹ میں
لے رہا تھا۔ علی ابھی بہت چھوٹا تھا۔

”فرزادہ اور طیبہ بھی ابھی کالجوں میں تھیں۔ سوئم
تک جو بحث و جدوجہد لفظوں میں ہو رہی تھی سوئم کی
رات اچانک بلند آواز میں ہونے لگی۔ تایا جان امی کو
لے کر گاؤں جانا چاہ رہے تھے۔ جبکہ ماموں کا خیال تھا
کہ اس طرح جے جمائے برنس کو بچ دینے سے اچھی
رقم نہیں ملے گی اور نہ ہی بچوں کے لیے اچھا ہوگا۔
ان کے خیال میں کاروبار ایسا تھا کہ نوکروں کی مدد سے
بھی چلایا جاسکتا تھا۔ اپنے اپنے مشوروں میں دونوں
مخلص تھے۔ لیکن ان کے اپنے اپنے خدشات بھی
تھے۔ تایا جان کو خدشہ تھا کہ ماموں جان شرمیں ہیں
اس لیے کاروبار جاری رہنے کی وجہ سے بہتر پوزیشن
میں ہوں گی۔ جبکہ ماموں جان کا خیال تھا کہ گاؤں
جانے کے بعد ان کی بہن اور اس کے بچے بالکل تایا
جان کی زیر نگرانی چلے جائیں گے۔“
رات کی بحث کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو صبح ناشتے کی میز پر
دینا نے اپنا فیصلہ دے دیا۔

”پایا کا سارا کاروبار میں سنبھالوں گی۔“ اس کا فیصلہ
جس نے بھی سنا حیران رہ گیا۔ کہاں اپنے حال میں
مست رہنے والی اور کہاں کاروبار کے جھمیلے۔ کوئی
مسکرا کر رہ گیا اور کسی نے اس کو سمجھانے کی کوشش
کی۔

”دیکھو دینا یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا تم
سمجھ رہی ہو۔ اس راستے میں بڑے پیچ و خم ہیں،
جنہیں تم عبور نہیں کر سکتیں۔“ تایا جان نے اسے
سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر جمی رہی،
ہر کسی کو اس کی کامیابی پر شہ تھا۔ سوائے امی کی جن کو
اس کی کامیابی کا یقین تھا۔

اس نے اگلے دن دفتر جانا شروع کر دیا۔ شام
امریکہ سے اپنے چچا کی موت پر آیا تھا۔ دینا اپنے اور
اس کے رشتے سے آگاہ تھی اور اس نے اسے ذہنی طور
پر قبول بھی کر لیا تھا۔ ”اگر زندگی میں کسی سے شادی

اکیلے تو ہوں گے نہیں، میرے والدین ان کے لیے غیر تو نہیں۔ وہاں امریکہ میں ایک شاندار مستقبل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جو سونتیں تمہیں یہاں میسر نہیں وہاں مل سکتی ہیں۔ تم ایک ورلڈ فیم مجسمہ ساز بن سکتی ہو۔ یہاں رہو گی تو بدنامی کے اندھیروں میں بھٹکتی رہو گی۔ وہاں کامیڈیا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔“ شارق نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

”یہ بات تو کسی طور ممکن نہیں ہے، کہ میں اپنی دھرتی اپنی مٹی سے ناطہ توڑ لوں اس معاملے میں کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ چاہے تم مجھے دادا جان اور رحیمو چاچا کی طرح ہونے کا طعنہ دو۔ میں اپنی مٹی اپنی ہوا سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ ادھے دھڑ سے تنگ، مدقوق چروں والے یہ فہمکے، اللہ دتہ کی میری پہچان ہیں۔ ان کے سینے سے مجھے اس مٹی کی مہکار آتی ہے۔ جن سے میں خودی ہوں۔ ان کو چھوڑ کر وہاں اور سور کے گوشت کی بو داتے ہوئے تیز پرفیومز والے بدن والے مجھے اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان سے مجھے کراہیت آتی ہے۔“ شارق کے پاس اپنی بات منوانے کا کوئی راستہ نہ بچا تو اس نے مردوں کے روایتی طریقے سے کام لینے کی کوشش کی۔ ”تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“ اس کا لہجہ بہت تلخ تھا، جسے اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ”آخری نہیں قطعی۔۔۔ آج نہیں تو کل۔۔۔ سال بعد۔۔۔ پانچ سال بعد تمہیں یہ احساس ہو جائے گا کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا اور جب تمہیں یہ احساس ہو جائے تو میں تمہاری منتظر ہوں گی۔ اسی جگہ۔۔۔ اسی مقام پر تمہیں خوش آمدید کہوں گی۔“



اس آخری گفتگو کے بعد شارق نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ایسا گیا کہ اپنے باپ کی موت پر بھی پلٹ کر واپس نہیں آیا۔ کبھی کبھار اس کے کارڈ آجاتے جو ای کے نام ہوتے تھے۔ فری اور طیبہ کی

کرنی ہے تو شارق میں کیا برائی ہے۔“ وہ ان کا اپنا تھا امریکہ میں اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا اور سب سے بڑی بات پیلا جالی کی پسند تھا۔ مزاج کے متضاد کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ شارق پر ہنگامہ زندگی پسند کرتا تھا۔ لیکن اس نے بھی ویٹاگو اپنی محفلوں میں شرکت کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ ہر روز کا فیصلہ وہ اسے بتا دیتے تھے، لیکن شرکت کا فیصلہ اس کا اپنا ہوتا تھا۔ لیکن وہ ان کی محفل میں خاموش بیٹھ کر بھی خوش ہوتی تھی۔ جسے سب نے ہی نوٹ کیا تھا اور فری منہ پھٹنے لگے کہ یہ بھی دیا تھا کہ وہ شارق بھائی کی کمپنی کو انجوائے کرتی ہے اس کے چرے پر لالی آجاتی ہے۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جب شارق امریکہ جانے سے پہلے ان کے گھر رہنے آیا تھا۔

”مرے فری تم کیا جانو، ہم کسانوں کی زندگی ایسے ہی بسر ہوتی ہے۔ بادل دیکھ کر چرے پر رونق آجاتی ہے۔ ورنہ مصلیٰ بچایا اور دعائیں شروع کر دیں۔ بس ابر کرم کے دو پھینٹنے میرے مولا۔“ شارق نے کہا تو سب ہنس پڑے، لیکن وہ شرمائی۔

شارق نے ویٹا سے براہ راست کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن وہ اس کے جذبات سمجھتی تھی۔ ان دنوں اس کے دل میں وہ کلیاں چٹکنے لگی تھیں جن کے پھولوں کی خوشبو سے ایک عالم مہک اٹھتا تھا۔ پیلا کے بعد وہ دوسری ہستی تھی جو اس سے اپنی بات منوالیتا تھا۔ لیکن آخری بات جو اس نے منوانے کی کوشش کی وہ ویٹا کے لیے کسی طور قابل قبول نہ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب دونوں نے کھل کر باتیں کی تھیں۔

”آخر تم مجھے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں ان حالات میں اپنے گھر والوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔“ بیا کے بعد میری بہنوں اور بھائی کا میرے علاوہ ہے گون۔“ شارق اس سے ملنے دفتر آیا تھا اور ویٹا کی خالی کرسی پر بیٹھی دکھ سے بولی۔

لیکن شارق اس کی بات نہ سمجھنے کا عزم لے کر آیا تھا۔

”دنیا میں ہر ایک کو اپنی زندگی جینا ہے، پھر یہاں وہ

کھول اٹھا۔

”اب یہ کہیں مجھے حکم دے گا۔“ اس نے سوچا، کیا نہیں کہ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بولا۔
 ”میری درخواست کو حکم مت سمجھ لیجئے گا۔ ایسا اس لیے کہ جہاں غلط فہمی کے بادل ہوتے ہیں، وہاں دوست دشمن کی تمیز نہیں رہتی۔“ وہ اپنی گفتگو میں وقفہ نہیں دے رہا تھا۔ ورنہ وہ اسے کہتی کہ جس بات کو وہ غلط فہمی سمجھ رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ ”مزید یہ کہ لاہور میں مظفر اور اطہر اور لندن میں علی خیریت سے ہیں۔ میں نے ان کی حفاظت کے لیے بندوبست کر دیا ہے۔ بانی اللہ مالک ہے۔“ فہیم اسے یوں بتا رہا تھا جیسے معمولی ساسو دیا گیا ہے۔

”مثلاً“ ایک ذرا سا وقفہ ملا تو اس نے پوچھ لیا۔

”علی لندن میں اپنے اپارٹمنٹ میں سو رہا ہے، لیکن جب وہ صبح کالج جائے گا تو اس کے ساتھ گاڑی چلیں گے اور اس کو علم نہیں ہو گا۔ یہی صورت حال آپ کے لاہور کے رشتے داروں کے ساتھ ہوگی۔“

”اس کے باوجود آپ کا اصرار ہے کہ آپ وہی ہیں جو نظر آتے ہیں، ایک بے ضرر بزنس مین۔ اپنی حماقت سے آپ نے خود اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ مسٹر فہیم ایک عام بزنس مین کی اتنی پہچان نہیں ہوتی کہ وہ نیو یارک سے لاہور تک سارے انتظامات کر لے، اعتراف کر لیں کہ مجھے بلیک میل کرنے کی کوششوں میں آپ پوری طرح شریک ہیں۔“ وہ اس کی بات کے درمیان میں بول پڑی۔

”بلیک میلنگ ہی کیا۔ آپ جو الزام لگائیں۔ گلی دیں، میرا تو وجود ہی گلی ہے، لیکن آج نہیں آج سے تین روز بعد۔ جب میں آپ کے مجرم آپ کے سامنے پیش کرنے میں ناکام رہوں۔ یہی ہمارا معاملہ ہے۔ میں شریف نہ سہی، آپ تو ایک شریف خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ آپ کو اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہیے۔“

”کیا چاہتے ہو۔“ اس کے لہجے کی تلخی کم نہیں ہوئی تھی۔

شادی پر ان کو کتنے بھی پیچھے تھے، لیکن ان تمام پر کبھی بیچنے والے کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ آنے والے لفافوں پر جسکی امریکہ کے ٹکٹ ہوتے اور کبھی یورپ کے۔ معلوم نہیں یہاں کی خبریں اسے کون دیتا تھا۔ دینا کے نام اس کا صرف ایک لفافا آتا تھا جس میں اس نے اپنی تمام آبائی جائیداد دینا کے نام کر دی تھی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی، لیکن تباہی کے انتقال کے بعد اس نے یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ وہ خود کو شارق کی امانت سمجھتی تھی اور نقطہ نظر کے اختلاف کے باوجود وہ آج بھی شارق کی منتظر تھی۔ اس کی یادوں کے نہال خانوں میں اگر کسی مرد کی یاد سے خوشبو کھرتی تھی تو وہ شارق تھا اس کی پہلی اور آخری محبت۔ سرہانے رکھے فون کی کھنٹی بجی تو وہ ماضی کے سمندر سے نکل آئی۔

”جی دینا حیات ملک۔ میں فہیم ہوں۔“ ہیلو کی آواز کے ساتھ ہی دوسری طرف سے کہا گیا تھا۔
 دینا کو ایسا لگا کہ اس آواز کے ساتھ اس کے رگ و پے میں کرواہٹ کھل گئی ہو۔ وہ خاموش رہی کہ بولنے کی صورت میں یہ کرواہٹ زبان پر آنے کا اندیشہ تھا۔ ”شاید رات کی تیغیوں نے ابھی تک آپ کے اعصاب پر قبضہ کر رکھا ہے۔“ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے فہیم دوبارہ بولا۔
 ”اب میں آپ کے موڈ کے بارے میں بھی آپ کی محتاج رہوں گی۔“ وہ اپنے لہجے کی تلخی چھپانے میں ناکام رہی تھی۔

”میں بھی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ لیکن ساتھ ہی آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلا دینا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ پر عائد الزامات کے بارے میں صفائی دینے کا موقع دیے چکی ہیں۔“

وہ تلخ بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے خاموش رہی۔ فہیم نے اس کی خاموشی کو رضامندی جانا۔
 ”آپ آج دفتر نہیں جائیں گی۔ بلکہ ڈاکٹر کو طلب کر کے وہ تمام علامات بتائیں گی جو بولڈ پریشہ شر کے مریض میں ہوتی ہیں۔“ فہیم کے انداز پر اس کا خون

درمیان ہوگی اور وہیں سے چوکیدار کو لے کر آپ تک پہنچے گی۔“ فہیم نے کہا تو وہ ایک بار پھر خوف زدہ ہو گئی۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ اس کے اللہ حافظ کے جواب میں خدا حافظ ہی کہہ دے۔ فہیم کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے اس نے بھی انتظار نہ کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جو شخص معمولی معمولی چیزیات پر نظر رکھتا ہے وہ عام آدمی کیسے ہو سکتا ہے جس طرح اس نے اقدامات کیے تھے، اسے اس کی پہنچ کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔

”میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، آج تک سب کی باتوں کو نظر انداز کر کے ایک بین الاقوامی مجرم کو معصوم سمجھتی رہی ہوں۔“

اس کی سوچ ایک بار پھر بھٹکنے لگی تھی۔ ایک ایک کر کے اسے وہ باتیں یاد آنے لگی تھیں جو لوگ اس کے بارے میں کہتے تھے۔ اسٹگر، شاطر اور فراڑ سے لے کر غیر معمولی ایجنٹ تک کہتے تھے۔ لیکن اس نے کبھی ان الزامات کی پروا نہیں کی تھی۔ کیونکہ لوگ تو اس کے بارے میں بھی نہ جانے کیا کچھ کہتے تھے۔ شروع شروع میں وہ چند پرنس مینوں کے کہنے پر محتاط ہو گئی تھی، لیکن بعد میں فہیم کے رویے کی وجہ سے یہ احتیاط ختم ہو گئی تھی۔ وہ اس کے مشورہ پر کسی حد تک عمل بھی کرتی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ فہیم سے ملاقات کے بعد کے چھ سال میں اس نے اتنی ترقی کی تھی کہ لوگ اس کو رشک سے دیکھتے تھے۔ لیکن وہی فہیم اب ایک مختلف روپ میں اس کے سامنے آیا تھا۔ شبہ تو اسے پہلے بھی ہوا تھا کہ فہیم کے رابطے ”انڈر ورلڈ“ سے ہیں، لیکن یہ کوئی اتنی معیوب بات نہیں تھی۔ اس لیے کہ جس پیمانے پر وہ کاروبار کر رہا تھا اس میں اس طرح کے تعلقات رکھنے پڑتے ہیں۔

”اب سے پہلے اس نے کبھی کوئی نازیبا بات نہ کوئی ناروا سلوک کیا جو تم اس پر الزام لگا رہی ہو۔“ اس کو اپنے اندر سے ابھرنے والے اس سوال پر حیرت ہوئی۔ اس نے اپنے سوال پر جتنا غور کیا اس کا شک اتنا ہی ٹوٹا۔ ان چھ سالوں میں اس نے اسے بے حد اچھا

”صرف تعاون چاہتا ہوں۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔ آپ صرف اتنا کریں کہ بیمار بن جائیں اور دو گھنٹے بعد آپ کے گھر میں جو مہمان آئیں آپ ان کا تعارف اپنے ملازمین سے اپنی پرانی دوست کی حیثیت سے کروائیں۔ آپ کی دوست جو کالج میں آپ کے ساتھ تھی۔ پھر شادی کے بعد امریکہ میٹھل ہو گئی۔ ایک نام میں بتا دیتا ہوں، آپ مناسب سمجھیں تو اسے وہی نام دیں۔“

”بولو۔“ اس کے انداز میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ اس کا دل اس پر اعتبار کرنے کو چاہتا تھا۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ وہ جب فہیم کے گھر سے اٹھی تھی تو کسی حد تک مطمئن تھی، لیکن جب اپنے ساتھ آنے والے واقعات اس نے دوبارہ دہرائے تو اس کا شک فہیم پر گیا۔

”آپ کی ایک دوست عمرانہ تھی۔ جسے آپ گڈو کہتی تھیں۔“ فہیم نے کہا تو وہ اس کی ملاقات پر حیران رہ گئی۔ گڈو شادی کے بعد امریکہ چلی گئی تھی جہاں اس کا شو پروڈاکٹر تھا۔

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”رات میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں اور وہ بھی نہیں ہوں جو دنیا سمجھتی ہے۔“ فہیم کی آواز سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”اس طرح تم ہر لمحہ مجھ پر نگرانی رکھنا چاہتے ہو۔“ ”نہیں، اس سے میں باقاعدہ نفیض کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ آنے والی خاتون یہ دیکھیں گی کہ آپ کے گھر میں وہ کون سا گھر کا بھیدی ہے جس نے آپ کے تراشے ہوئے جہتوں کے ساتھ آپ کی اور میری تصویر بھی فراہم کی ہے۔ بلکہ اس کے بعد بھی آپ کی سرگرمیوں کی اطلاع اس بلیک میلر کو دیتا رہا ہے۔“ دینا کا دل چاہتا تھا۔ اس کی باتوں پر آمنا ہو۔ نہ لگا تھا۔ اس نے اس کی بات نہ لی۔

”ٹھیک ہے، آپ میری اس خاتون سے بات کروا دیں، میں راضی ہوں۔“ اس نے رنڈا منڈی دی۔

”اس وقت وہ آپ کے پرانے نگہ اور فیکٹری کے

”اور قاسم سے کہہ دیں مجھے چائے پیس دے
وے۔ امی کا فون آئے تو میری طبیعت کے بارے میں
مت بتائیے گا۔“

”اب میں اتنی بھی پاگل نہیں ہوں۔ لی بی پہلے ہی
فری کی بیماری سے پریشان ہیں، اوپر سے ان کو میں یہ
بات بتا دوں۔ ویسے آپ چائے کے بجائے دودھ۔“
لیکن دینا کے چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر ان
کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غلطی کر رہی ہیں۔ اس لیے اپنی
بات اوصوری پچھو ذکر میں دلاتے ہوئے باہر نکل گئیں۔
”جانے آئے والی خاتون کیسی ہوئی۔“ اس کے
خیالات کی روایک بار پھر بھٹک گئی۔ اس کے تصور میں
نہیم سے ہونے والی پہلی ملاقات تازہ ہونے لگی۔ اس
وقت اس کا لیدر کار منشن کا برنس بالکل ابتدائی حالت
میں تھا۔ اور اوپر تلے کچھ نقصانات ایسے ہوئے تھے کہ
وہ اس پر بھروسہ نہیں دے پا رہی تھی۔ نہ کام آگے
برہانے کے لیے اس کے پاس سرمایہ تھا۔ ایسے پریشان
کن دونوں میں سے ایک دن چوکیدار نے اس کو ایک
کارڈ آکر دیا جس پر ”نہیم الزماں“ لکھا تھا۔

”ایک صاحب ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“
”بی بیج دو۔“ وہ فارغ تھی۔ اس لیے اس نے کہا۔
پھر جتنی دیر میں وہ صاحب آئے اس کے ذہن میں وہ
سب خبریں تازہ ہو گئیں۔ اسی نام کے شخص کا چرچا
آج کل اونچے طبقے میں بہت ہو رہا تھا۔ نہ جانے وہ
کہاں سے آیا تھا، لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے
باس دولت کی بڑی فروانی ہے۔ وہ بڑی تیزی سے
تخلف کاموں میں ٹانگیں پھنسا رہا تھا۔ کچھ لوگ اس کی
تیزی سے آگے بڑھنے، اس کی قوت فیصلہ اور مشاہدہ
کے معترف تھے۔ لیکن اکثر کا خیال تھا کہ وہ کوئی لبا فروا
کر رہا تھا۔

”لیکن وہ میرے پاس کرنے کیا آیا ہے۔“ دینا نے
سوچا، کیونکہ ابھی تک یہی سوچنے میں آیا تھا کہ وہ لے
کاموں میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔ جبکہ اس کا شمار درمیانے
درجے کے ناموں میں ہوتا تھا۔ وہ کمرے میں آیا تو دینا

دوست پایا تھا۔ وہ کئی بار اس کے ساتھ بزنس کے سلسلے
میں دوسرے شہروں میں گئی تھی، لیکن اس نے معیار
سے گمراہی ہوئی بات کبھی نہیں کی تھی۔ چھ سال کا
عرصہ کسی کو جاننے کے لیے کم نہیں ہوتا۔ اس نے
اپنی ہوسٹل کو رد کر دیا۔

”کیا بات ہے بی بی؟ کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
آپ ابھی تک باہر نہیں آئی۔ بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا،
ہم نے کہہ دیا بیٹیا سوئی ہوئی ہے۔“ ناصرہ کمرے میں
داخل ہوئی تو دینا کو جاکتے دیکھ کر بولی۔ وہ پیلا کے زمانے
سے یہاں تھی۔ سب بچے اس کے ہاتھوں پل کر جوان
ہوئے تھے۔ لیکن اس کی بری عادت تھی کہ وہ بولنے پر
آتی تو تان شاپ بولتی۔

”کچھ نہیں طبیعت ٹھیک نہیں۔“
”مجھے تو زیادہ ہی خراب لگ رہی ہے۔ چہ تو دیکھو
بلدی کی طرح ہو رہا ہے۔ تم اٹھو، میں ابھی دودھ میں
گلو کوڑ گھول کر لاتی ہوں۔“

”خالہ کونہ جانے یہ پٹی کس نے اور کب پر بھائی
تھی۔ کوئی بھی بیمار ہوا تو گلو کوڑ گھول کر اسے پلانے
لگتی۔“ لپا کہتے تھے۔ ”شکر ہے کہ خالہ ڈاکٹر نہیں
ہے، ورنہ شکر کے مریضوں کو یہی گھول گھول کر پلا کر مار
دیتی۔“ یہ بات یاد کر کے وہ مسکرا دی۔ یادیں بھی عجیب
ہوتی ہیں، کبھی ذہن کے اسٹور روم سے لگتی ہیں، تو
کبھی روتے کو ہنسا دیتی ہیں اور کبھی ہنستے کو رولا دیتی
ہیں۔

”رہنے دیں خالہ، میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں،
اسپتال جاتے مجھے چیک کر لیں گی۔“
اس نے نہیم کی بات ماننے اور اس پر عمل کرنے کا
فیصلہ کر لیا تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ اور پھر میرے
پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی تو
نہیں۔“ اس نے سوچا۔

”میں باہر والے فون پر بات کر لیتی ہوں۔ اس پر
شاید بیگم صاحبہ فون کریں کہہ رہی تھیں کہ انکمیج
جا رہا ہے۔“

آچکے تھے، لیکن دینا کو ابھی تک اپنے رول کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

”نہیم صاحب لیدر تو میری فیلڈ ہی نہیں۔ لیکن یہ ضرور سوچا تھا کہ اس میں ٹرائی کی جائے، کیونکہ خاصا اسکوپ نظر آیا تھا۔ لیکن بات ابتدا سے آگے نہیں بڑھی۔ ہمارا تو بہت چھوٹا یونٹ ہے۔ بلکہ ایک تجرباتی سا ماڈل پلانٹ کہہ لیں۔ جس کو کئی بار بند کرنے کا سوچا، لیکن صرف اس لیے رک گئی کہ اس سے کئی اور گھر بے روزگار ہو جائیں گے۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں آپ کے آرڈر کو میٹ کر سکتی ہوں۔“

دینا نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
 ”نہیم جیسی مچھلیوں سے ڈیل کرتے ہوئے مکمل طور پر ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کرتے۔ ہر اخلاقی قدر کی پامالی کر کے وہ صرف ایک جیلے میں مکالمہ بننا دیا کرتے تھے۔“ یہ تو بزنس ٹیکٹس ہیں۔“ اور بانی لوگ مری ہوئی مچھلیوں کا نوہ بڑھنے کی بجائے اس کی حماقت پر لعن طعن کرتے تھے کہ وہ بڑی مچھلی کے قریب گئی ہی کیوں۔

”ہیں اس سے واقف نہیں ہوں، یہ ابتدا شاید آپ نے اس لیے کی تھی کہ کچھ شدہ بدھ ہو جائے۔ تو بات آگے بڑھ جائے۔ لیکن کسی مجبوری کے تحت بات آگے نہ بڑھائی جاسکی۔“ اس کے اندازے حیرت تک ٹھیک تھے۔ شاید دینا کی آنکھوں سے اسے مثبت جواب ملے تھے۔ اس لیے وہ دوبارہ بولا۔

”میری نظروں سے آپ کی تیار شدہ کچھ چیزیں گزری ہیں۔ جن کا معیار حیرت انگیز تک اعلا ہے۔ اس لیے میں آپ کے پاس یہ آفر لے کر آیا ہوں اس کی آمد کا مقصد دینا کی سمجھ آ گیا تھا لیکن ابھی تک اس آفر کی وضاحت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ تذبذب کا شکار تھی۔ فی الوقت اس نے خاموش رہ کر ہی اس کا منصوبہ سمجھنے کو ہی غنیمت سمجھا۔“

”اپنے اس کام کو آگے بڑھانے میں آپ کو کافی مالی مشکلات درپیش آ رہی ہوں گی۔ ہم یوں کر لیتے ہیں کہ آپ کو جتنی بھی رقم درکار ہو وہ میں فراہم کر دوں گا۔

نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ بہر حال وہ ایک بڑا آدمی تھا۔ عمدہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس وہ خاصا سمارٹ لگ رہا تھا اس عمر میں اتنی ترقی قابل رشک تھی۔
 ”آپ نے نہیم صاحب۔“ اس کی مسکراہٹ کا ردیاری تھی۔

”مجھے نہیم کہتے ہیں۔ اور میرا تعلق بھی کاروباری حلقے سے ہے۔“ وہ خاصا محتاط تھا۔ اس نے پہلا تاثر اچھا چھوڑا تھا۔ وہ دینا کے بیٹھنے کے بعد اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی۔ میں آپ سے واقف ہوں۔“ اس نے غیر رسمی باتوں سے گریز کرتے ہوئے کہا۔

”دراصل میں آپ کے پاس ایک آفر لے کر آیا ہوں۔ مجھے آپ کے دس پندرہ منٹ چاہیے۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو ابھی ورنہ آپ جب مناسب سمجھیں۔ فی الحال آپ سے تعارف حاصل کرنا بنیادی مقصد ہے۔“

”تمہارے بارے میں صحیح سنا ہے کہ تم بہت تیزی سے کام کرتے ہو۔“ اس نے سوچا، لیکن کہا نہیں۔
 ”اول تو کوئی مصروفیت ہے نہیں۔ اگر ہوئی تو کینسل کر لیتی۔ آپ جیسے بڑے لوگ کب ہمارے دفاتروں میں آتے ہیں۔ گفتگو سے پہلے آپ بتائیں کہ کیا لینا پسند کریں گے۔“ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں اس سے ملنے آیا تھا، لیکن آداب میزبانی تو نبھانا تھا نا۔ وہ اپنی جگہ مکمل ہوشیار بیٹھی تھی۔

نہیم نے چائے کی فرمائش کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیا تھا اور چائے کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے مقصد کی طرف آ گیا تھا۔

”میرے پاس لیدر گارمنٹس کی ایکسپورٹ کے چھ آرڈرز ہیں۔ پر اہم یہ ہے کہ میں پہلے ہی اتنے جھگڑوں میں ٹانگ پھنسا چکا ہوں اور مزید یہ کہ ایسے کام میں جو پوری توجہ چاہتا ہو اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ کہ اس آرڈر کو ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، کیونکہ اس کے ساتھ اور بھی بہت سی چیزیں منسلک ہیں۔“ اس دوران چائے اور بسکٹ

نہیں بیٹھتا تھا۔ ابھی کراچی، کل لندن اور پربول اسلام آباد۔ نہ جانے اس نے کن کن چکروں میں پاؤں پھنسانے ہوئے تھے۔

پورے ایک سال وہ اس بات سے خوف زدہ رہی کہ نہ جانے کب فہیم اس سے ان عنایتوں کے صلے کا مطالبہ کر دے۔ لیکن وہ تو جیسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ پروڈکشن شروع ہوئی تب بھی اس نے کچھ زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کے ماتحتوں سے البتہ وہ رابطے میں تھی۔ جن آرڈرز کے بارے میں فہیم نے پہلی بار ”کچھ“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ اتنے تھے کہ دینا کو ان کو پورا کرتے کرتے دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ جتنی رہی۔ اس کی اس دوران فہیم ت بات ہوئی تب بھی اس نے ”بزلس“ کی بات سے گریز کیا۔ پہلے تک کہ پہلا سال گزر گیا۔ دینانے اپنے نئے بزلس سے خوب کمایا۔ فہیم کے قریبی کی پہلی قسط ادا کرنے وہ پہلی بار اس کے آفس گئی تھی۔ بزلس کی دنیا میں اس کی آمد ایڈوٹائزنگ کی فرم سے ہوئی تھی۔ اور اب بھی جب وہ بہت آگے نکل گیا تھا۔ لیکن جب بھی وہ کراچی ہوتا اپنے اس پہلے دفتر میں ہی ہوتا۔ یہ الگ بات کہ یہاں بیٹھ کر بھی وہ دوسرے معاملات پنہاتا۔

اس کے عالی شان دفتر میں آکر وہ خاصی متاثر ہوئی تھی۔ ایسے شان دار آفس اس نے کم ہی دیکھے تھے۔ استقبال میں اپنا نام بتا کر ابھی وہ بیٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ وہ داخل ہوتا نظر آیا۔ وہ خود باہر اسے ملے آیا تھا۔

”زہ نصیب۔ آج آپ نے اس طرف کا رخ کیسے کر لیا۔“ خوشی اس کے لہجے سے ظاہر تھی۔ پھر وہ اسے لیے اپنے آفس کی طرف بڑھا۔ اس کا یہ دفتر ایک وسیع و عریض گونجی میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کے آخری کمرے میں اس کا دفتر تھا۔

”بہت اچھا ہوا آپ آگئیں۔ ورنہ شاید مجھے آنا پڑتا۔ ایک الجھن درپیش تھی اور اس کا حل آپ کے پاس ہے۔“ اس نے دفتر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”تو اب یہ حضرات اپنے خول سے باہر آ رہے

آپ سارا مال اپنے پاس مکمل کروائیں اور پھر ہمیں فراہم کر دیں۔“

”اور اس فراہم کردہ رقم کے عوض مجھے کیا کرنا ہو گا۔“ اس کے لہجے میں درشتی اتر آئی۔ وہ ان بڑے لوگوں کے بظاہر عام سی پیش کشوں میں چھپے مقاصد کو بڑی اچھی طرح سمجھتی تھی۔

”کچھ نہیں، یہ رقم اصل میں آپ کو قرض دی جائے گی۔ لیکن اس کی کوئی کمکت بڑھت نہیں ہوگی۔ آپ چاہیں تو اس رقم کو ہڑپ کر جائیں۔“ وہ جانتی تھی ان لوگوں کی رقم آسانی سے ہڑپ نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے وہ مسکرا دی۔

”آپ کو اندازہ ہے کہ فٹنگ تک کتنے پر اس ہیں اور ان پر کتنا خرچ ہو سکتا ہے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق یہ دو کروڑ کا کھیل ہے۔“ وہ ناشاید اسی لیے مسکرائی تھی کہ جس رقم کو وہ بنا خرچ کر دینے کی بات کر رہا ہے۔ اسے اس کا اندازہ نہیں ہے۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کے سارے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

”میرے اندازے کے مطابق یہ بہت کم ہیں۔ بات دس کروڑ کے درمیان جا کر رہے گی۔ اس میں وہ رقم بھی شامل ہے جو سٹے سیزن میں اسکن خریدنے میں ہلاک ہو جاتی ہے اور ایک مخصوص طبقے نے اپنے سرمائے کے زور پر اس فیلڈ میں اجارہ داری بنائی ہوئی ہے۔“



اس روز کے بعد بھی ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر بار وہ اس کے دفتر میں آتا تھا۔ اسے دلائل دینے اور مخالف کو رد کرنے کا ہنر آتا تھا۔ دینا کو اس نے بروجیکٹ کے لیے تیار کر ہی لیا تھا۔ پھر جب اس پر کام شروع ہوا تو دینا کو اس کی اصل طاقت کا اندازہ ہوا۔ جو فائنل محکموں میں مبینوں دھکے کھاتی رہتی تھیں۔ ان کو فہیم کے ایک فون کے ساتھ ہنس لگ جاتے۔ اس کے ساتھ صرف ایک مسئلہ تھا کہ وہ کہیں بھی نکل کر

ہیں۔ ”وینا کے ذہن میں نے اسے خبردار کیا۔ وہ ہر قسم کی گفتگو کے لیے خود کو تیار کرنے لگی اور اس دوران وینا ایسے اقدامات کرتی رہی تھی کہ اگر اچانک فہیم سے رابطے منقطع کرنے پر اس کو زیادہ نقصان نہ ہو۔ مارکیٹ میں اس کی ایک ساکھ بھی اور اب تو بینک بھی اس کو بخوشی قرضہ دینے کو تیار تھے۔ ایک خطیر رقم کا چیک تو اب بھی اس کے پرس میں موجود تھا۔ دفتر داخل ہوتے ہی اس کے مالک کی امارات اور اعلا فونی کی نشاندہی کر رہا تھا۔

”آپ یہاں تشریف رکھیں۔“ اس نے نئے اسٹائل کے دبیز صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ انٹرکام کی طرف برہما۔ ”یا سیمین۔۔۔ درانی صاحب سے کمو مینٹنگ جاری رکھیں۔ میرے مہمان ہوئے ہیں۔“ اس نے پائوس مچا اور اسٹیم اور امجد صاحب کو اندر رینگا اور باہر آگئی۔

انٹرکام پر ہدایات دینے کے بعد وہ وینا کی جانب متوجہ ہوا۔ ”میں تمہارے جال کو کاٹنے کے انتظامات کر چکی ہوں فہیم الزماں تم خواہ مخواہ کی اینٹنگ سے مجھے بہلا رہے ہو۔“ اپنے دفتر سے چلتے ہوئے وہ بہت خوش تھی اور اب یہ خوش زائل ہو چکی تھی۔

”جی اب فرمائیں۔ کیسے زحمت کی۔“
 ہمیشہ کھلنے والی مسکراہٹ اب بھی اس کے ہونٹوں پر تھی۔ وینا نے سوچا اس سے پہلے کہ وہ بات شروع کرے مجھے بات کو پٹی چلا ہے۔

”آپ کو شاید یاد نہیں، لیکن آپ کی ایک بڑی رقم میری جانب نکلتی ہے۔“ وینا نے اپنے جملے کا تاثر دیکھنے کے لیے اس کی جانب دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

”اچھا کوئی محرر ہے آپ کے پاس۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ وینا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔

”میرا مطلب ہے کہ یہ رقم مجھے دینی ہے۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

”اتنی اردو تو مجھے بھی آتی ہے اس لیے پوچھ رہا

ہوں۔“ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔
 ”مذاق سے قطع نظر میں آپ کی رقم کی پہلی قسط ادا کرنے آئی ہوں اور باقی کی رقم بھی جلد ادا کروں گی۔ میں نے بینک سے بات کر لی ہے لون منظور ہوتے ہی آپ کی بقیہ رقم آپ کو پہنچا دوں گی۔“ وینا نے پوری سنجیدگی سے کہا، لیکن آواز اس کے حلق میں دب گئی۔
 ”آپ بینک کو سود بھی ادا کریں گی۔“ وہ مسکرایا۔
 ”ظاہر ہے۔“ اس نے کہا حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس طرح تمہارے چنگل سے تو نکل جاؤں گی۔ بلاوجہ اس طرح کے لوگوں سے دشمنی نہیں لی جاسکتی۔
 ”ویسے سود لینے اور دینے والے دونوں جسمی ہیں۔“ اس نے تو مذاق کے انداز میں بات کی، لیکن وینا ہنس نہ سکی۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس طرح کی ہو رہی تھی۔

”ویسے ہمارے پلان کے مطابق آپ کو مزید رقم کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ آپ کا نیا برنس ہے۔“ فہیم نے کہا۔

”کاش اس دن میں فہیم کی رقم واپس لوٹا کر اس سے قطع تعلق کر لیتی تو اس دلدل میں نہ پھنستی۔“ ٹیلی فون کی گھنٹی کے ساتھ ہی وہ یادوں کے بھنور سے نکل آئی۔ اب سے پہلے وہ آخری موقع تھا جب اس نے فہیم پر رشک کیا تھا وہ رقم واپس کرنے گئی تھی اور فہیم نے اسے پرنٹنگ پریس کے چکر میں پھنسا دیا تھا۔

”ہمیں ایڈورٹائزنگ کے لیے کل وقتی پریس چاہیے۔ تم کال تو وہم مختلف جگہوں میں بھٹکنے سے بچ جائیں گے اور کام بھی ہمارے معیار کا ہوگا۔“ اس روز فہیم نے اسے پہلی بار تم کہا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود اسے روک نہ سکی۔ وہ پہلے ہی اپنے خیالات پر شرمندہ تھی پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا ایک کے بعد ایک نیا منصوبہ۔ جو بھی ٹیل پر اس نے فون اٹھایا۔ کچھ عجیب سا موڈ تھا رات بھر جانے کی تھکن اور کسی انجانے خوف کا احساس۔

”نجانے ان باتوں کا کیا انجام ہونے والا ہے۔“ اس نے ریسور رکھتے ہوئے سوچا۔ اب وہ چند سال پہلے والی

غیر معروف سی برنس دو من نہیں تھی بلکہ ایک مشہور و معروف صنعت کار تھی۔ پورے ملک میں جیمبر آف کامرس منتخب ہونے والی واحد لڑکی۔ اس کا نام منصوبوں کی کامیابی کی دلیل تھا۔ خواتین کے موضوع پر ہونے والا کوئی بھی سیمینار اس کی شرکت کے بنا مکمل نہیں تھا۔ ایسے میں یہ ایک آفت آگئی تھی جس کا کوئی سرا سے نہیں مل رہا تھا کہ وہ اس کو حل کر سکتی۔

”ہیلو۔“ اس نے بالکل خالی الذہن کہا، لیکن دوسری جانب سے امی کی آواز سن کر سنبھل گئی۔ وہ ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور پھر یہ عذاب اس نے ان پیاروں کے لیے ہی تو بھیجے تھے۔

”خیر بہت بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ امی اس کی ذرا سی پریشانی سے پریشان ہو جاتی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں فری کیسی ہے۔“ اس نے بات بدل دی۔

”ٹھیک ہے اب پہلے سے بہتر ہے۔“ پھر وہ کچھ دیر بات کرتی رہی امی سے بات کرنے کے بعد اسے ایک نیا جو صلہ ملا تھا۔ جیسے کی نئی امنگ پیدا ہوئی تھی۔

”میں دینا حیات ملک ہوں۔ وہ بلیک میلر کوئی بھی ہو۔ میں اس کا مقابلہ کروں گی۔“ اور اس احساس کے ساتھ ہی اس کے اندر توانائی سی بھر گئی۔ اک نئے عزم کے ساتھ وہ ناصرہ خالد کی لالی گئی چائے پینے لگی۔

چائے پیتے ہوئے اچانک اسے ایک خیال آیا۔

”خیرم نے لاہور سے نیویارک تک حفاظتی اقدامات کی بات کی تھی۔ تو کیا میرے لیے اس نے کچھ نہیں کیا ہوگا۔“ اس نے بیٹھے بیٹھے پردہ سر کیا۔ دور تک سڑک صاف تھی۔ صرف ایک گاڑی بجلی کے تاروں کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھی۔

”یہاں بھی جھوٹ بول گیا۔ نیویارک اور لاہور کا جھوٹ ہی سے ظاہر ہے جب یہاں کچھ نہیں ہے تو وہاں کیا ہوگا۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ احقر مبارک کو بھی اسی موقع پر جانا تھا۔ وہ واحد آدمی ہیں جن پر وہ بھروسہ کر سکتی تھی، لیکن جو مشورہ انہوں نے دیا تھا وہ

اس کے لیے ناقابل عمل تھا۔ سوچتے ہوئے وہ بیڈ سے اتری۔ پردہ ابھی تک رات والی جگہ سے ہٹا ہوا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ سیلپر پن کر سیدھی ہوئی گیٹ سے ایک ٹیکسی اندر آئی دکھائی دی۔ پہلے اس میں سے فیکٹری کا چوکیدار برآمد ہوا اس کے پیچھے جینز میں ملبوس ایک خاتون اتری جس کے کندھے پر سفری بیگ لٹکا ہوا تھا۔

”تو فہیم نے ان محترمہ کو بھیجا ہے۔“ اس نے سوچا۔

چوکیدار وہیں کھڑا رہ گیا، لیکن خاتون تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔ اس کے انداز میں ایسی گرجوشی تھی جیسے کسی اپنے کو عرصے بعد ملنے میں ہوئی ہے، ”معلوم نہیں اس نے نوکروں کو کیا کہا ہوگا۔“ دینا نے سوچا کہیں اس کا ٹکراؤ ناصرہ خالد سے نہ ہو جائے۔ وہ گڈو کو پچا پتی تھی۔ وہ ابھی تک بے یقین تھی کہ اسے اس عورت سے تعلقان کرنا چاہیے یا نہیں۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی جب دروازے پر پہلی دستک ہوئی اور کھل گیا۔ قاسم آنے والی خاتون کے پیچھے کھڑا تھا۔ دینا کو دیکھتے ہی وہ اس کی جانب بڑھی۔

”ہیلو سنہرے۔“ وہ دوڑتی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور دینا ساکت کھڑی رہ گئی وہ اس طرح بے تکلفی سے اس کو پکارا جیسے کالج میں لڑکیاں اس کو سنہرے بالوں کی وجہ سے پکارتی تھیں۔

”ارے بھئی۔ حیران کیوں ہو پچانا نہیں۔“ وہ یوں بولی جیسے دوپے تکلف سے سہل سہلا۔

”کیا بات کرتی ہو۔ نہ پچانے کا سوال۔ لیکن یوں اچانک۔“ اس نے اس سے لپٹتے ہوئے کانڈ کی ایک گولی دینا کو تھما دی۔

”بس سکندر قاہرہ جا رہے تھے۔ میں یہاں آگئی۔ سوچا کہاں بدلو ماری دو آؤں کے نام سن کر بور ہوئی رہوں گی۔ تو میں اپنے سنہرے کے پاس آگئی۔ پورے تین دن کے لیے آئی ہوں۔ پورے بہتر کھنٹے۔ کو کیسا رہا۔“ وہ اس کے بستر پر دراز ہوتے ہوئے بے تکلفی سے بولی۔

دینا نے قاسم کو ابھی تک دروازے پر کھڑا دیکھا۔

”شاید وہ دو سیلیوں کا ملاپ دیکھنے کے لیے رک گیا تھا اس نے قاسم کو کچھ کہنا چاہا پھر آنے والی سے پوچھا۔
”چائے پیو گے۔“ وہ چاہنے کے باوجود گڈو جیسی بے تکلفی پیدا نہ کر سکی تھی۔

”چائے تمہیں ناشتا۔ اور اس سے پہلے میں واش روم جاؤں گی۔“ اس نے اپنا نیک پکڑتے ہوئے کہا۔
”قاسم اچھا سانا ستائیا رکرو۔ میری دوست عرصے بعد امریکا سے آئی ہے۔“ قاسم کو ہدایات دیتے ہوئے اس کا دھیان اس پرچی کی طرف تھا جو اس کی منہ کی تھی۔ پھر جیسے ہی قاسم گیا اس نے گول ہوئی پرچی کو کھولا۔

”تمہارا لمبہ بگڑا بھی دے رہا ہے اس لیے احتیاط کرو۔“ اس نے پرچی پڑھ کر گڈو کو دیکھا جو سگریٹ کے پیکٹ جتنی کوئی سیاہ چیز پکڑے بیٹن دبائے مختلف سمتوں میں گھمرا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دینا کی جانب متوجہ ہوئی تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

”تمہارا کمرو گڈو نہیں ہے۔ اب پوچھو کیا پوچھنا ہے۔“ اس نے اطلاع دینے کے ساتھ سوال کیا۔

”تم کون ہو اور تمہارا مقصد کیا ہے۔“ اس کا کہنا سخت تھا۔

”تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا لیکن اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے ناصرہ خالہ کو میرے بارے میں کیا بتایا۔“ حیرت کا ایک اور جھکا اسے لگا۔ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ حیرت کی زیادتی سے وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔

”شاید تم نے نہیں بتایا، حالانکہ تمہیں نے تمہیں کہا بھی تھا۔ اس لیے میں احتیاط اس وقت آئی جب خالہ سودا لینے جاتی ہیں۔“ دینا کے لیے کھڑا نہ محال تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ فہیم اسے کے بارے میں اتنا جانتا ہے۔
”میں صاف اور کھل کر بات کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو۔“ وہ تلخ ہوئی۔

”تو کیا میں اور فہیم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔“ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

”ہر بات جھوٹ۔ نیویارک حفاظتی اقدام کیا کرو اتنا ایک آدمی یہاں تو بھیج نہ سکا۔“ اس کے منہ سے پھسلا۔

”یہ الیکٹرونک والوں کی گاڑی کیا میری بارات میں آئی ہے۔ سامنے والے صاحب کی چھت پر جو آدمی ہیں وہ کیڑی کھیل رہے ہیں اور پچھلی کھلی میں جو مزدور مکان کو رنگ کر رہے ہیں وہ میری ساس کے ہنی مون کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پلیز ہم سے تعاون کرو۔“ بولتے بولتے وہ رکی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔

”یہ معاملہ تمہاری سوچ سے زیادہ سنگین ہے۔ اتنا سنگین کہ میں نے اپنی کینسر زدہ ماں کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ ایک دو دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ لیکن میرے لیے میری جنم دینے والی ماں سے زیادہ اہم دھرتی ماں کی حرمت کی بات ہے۔ میں اس پاک مٹی کا واسطہ دے کر کتنی ہوں جس میں ہم دونوں کے باپ ہیں کہ ہم پر شک نہ کرو ہمارے ساتھ تعاون کرو۔“

اس کی باتوں میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ دینا کو اپنا خون گرم ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے آنے والی کے ساتھ مکمل تعاون کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جو واسطہ اس نے دیا تھا اس کے لیے وہ سو بار بے وقوف بننے کو تیار تھی۔ شاید اس کے چہرے کی مثبت تبدیلی تھی کہ گڈو نے فرمائش کی۔

”اس سے پہلے کہ ناصرہ خالہ آئیں تم مجھے اپنا پورا گھر دکھاؤ اور اس طرح جیسے کسی دوست کو دکھا رہی ہو اور جو کچھ میں کروں اس پر حیرت کا اظہار مت کرنا میں تمہارے گھر کو بگڑا کرنے جا رہی ہوں۔ مجھے سروٹ کارٹر بھی دیکھنے ہیں۔“

دینا کچھ کے بناس کے ساتھ چل دی۔ لیکن جانے سے پہلے گڈو ہاتھ روم میں گئی اور تولیہ اٹھالائی اور اس میں اس آلہ کو چھپا دیا۔ اپنا چہرہ پوچھتے ہوئے اس نے صائمہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”ناشتا لگا دیا ہے۔“ وہ جیسے ہی گھر دیکھ کر لوٹی۔ قاسم

باربٹن دہانے سے آواز صاف ہو گئی۔ پہلے ناصرہ خالہ کی آواز آئی۔ ”تجھے بڑی کھوج رہتی ہے کون آیا ہے کیوں آیا ہے۔۔۔ چل جا کر اپنا کام کر۔“

”میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔۔۔ آپ تو ناراض ہو رہی ہے۔“ یہ چونکدار قدر تھا۔

قاسم کو چائے لاتے دکھ کر اس نے جلدی سے کوئی بٹن دبایا اور رییموٹ کو تیلیے کے نیچے رکھ کر یوں باتیں کرنے لگیں جیسے کوئی بہت پرانی بات یاد کر رہی ہو۔

”سچ کہتی ہوں سنہرے۔ ایک مدت بعد کھانے کا لطف آیا۔ وہاں تو پابندی سے کھانا پڑتا ہے کہ ہر نوائلے میں کنکر سے آٹے محسوس ہوتے ہیں۔“ قاسم نے چائے رکھ دی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی متوجہ نہ ہوا۔

”اور کچھ چاہیے بی بی۔“ قاسم نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”نہیں تم جاؤ۔“ دینا نے اسے ٹالا۔ قاسم بولتا تو اردو تھا لیکن اس کا لہجہ بنگالیوں جیسا تھا اصغر مبارک نے بتایا تھا کہ اس کے والدین بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی بنگلہ دیش نہیں گئے اور دینا اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

قاسم کے جاتے ہی اس نے آلہ دوبارہ نکال لیا۔ اب اس نے کوئی ایسی کارروائی نہیں کی کہ آواز دوبارہ آنے لگتی۔ لیکن چار بتیاں بد دستور روشن تھیں۔ دینا کپوں میں چائے انڈیلنے لگی وہ اس سے کسی حد تک متاثر ہو گئی تھی۔

”کسی حد تک تو مجھے تمہارے حالات کا علم ہے لیکن وقت گزاری کے لیے تم اپنی زبان سے بتاؤ۔“ اس کا انداز فرما سکتی تھا۔

دینا اس پر بھروسہ کرنے لگی تھی ویسے بھی واقعات دہرانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر بستر کے ساتھ والی دراز کھولی پھر ایک تصویر پر بھاتے ہوئے بولی۔

”یہ آج سے آٹھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ میرے دفتر پر کوئی صاحب ایک لفافہ دے گئے تھے اس تاکید

نے کہا۔ ”تم ایسا کرو ناشتا بیڈ روم میں لگاؤ۔“ دینا نے گڈو کی ہدایت کے مطابق کہا۔

”کیوں گڈو۔ پرانی یادیں تازہ کی جائیں بستر بیٹھ کر کھانے کی۔“ یہ ہدایت بھی اسے گڈو نے دی تھی۔ واپس آتے ہوئے گیٹ سے خالہ ناصرہ آتی نظر آگئیں تھیں۔ ابھی ان کو اعتماد میں لینے کا مرحلہ باقی تھا۔

”تم ناشتا لگو او میں شاور لے لوں۔“ وہ اچانک ناصرہ خالہ کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی کہ کہیں وہ کچھ کہہ نہ دے اور سارا کھیل ختم ہو جائے۔ انہوں نے دونوں کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ یقیناً اوپر ہی آئیں گی۔ پورے گھر میں بارہ مقامات پر اس نے کوئی گول نکلیے نما چیز چپکائی تھی۔ ہاتھ روم سے وہ خاصی دیر بعد نکلی۔

”ہو گئی بات۔“

”ہاں۔“ دینا نے کہا لیکن وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔ اب کی بار بھی اس نے تولیہ میں کوئی چیز چھپا رکھی تھی۔ دینا نے دروازہ بند کیا ہوا تھا لیکن اس نے آتے ہی دروازہ کھول دیا۔

”زیادہ احتیاط شکوک پیدا کرتی ہے۔“ وہ بستر پر اس انداز سے بیٹھ گئی کہ دروازہ اس کے سامنے رہے پھر اس نے تولیہ کی آڑ سے وہ چیز بھی نکالی جو ابھی تک چھپائی ہوئی تھی۔ دینا نے غور سے دیکھائی دی کہ رییموٹ جیسی کوئی چیز تھی۔

”ہو ناشتا کریں۔“ اس نے دینا کو یوں بلایا جیسے وہ مہمان ہو۔

”یہ کیا ہے۔“ دینا نے اس رییموٹ کی جانب اشارہ کیا جس کے بارے بنشوں میں سے چار پر سرخ بتی جل رہی تھی۔

”یہ جاو کی ڈیا ہے۔ دیکھو گی اس کا جاؤ۔“ پھر اس نے اس کے جواب کا انتظار کیے بنا سرخ بتی والا بٹن دبایا۔

”دینا سے پہلے ہلکی سی منمنہاٹ ابھری پھر دو تین

کی سنگین کا مجھے پہلی بار احساس ہوا۔ وہ پھر بولا۔ آپ اپنی تصویر کو بھی غور سے دیکھ لیں۔ گردن کے نیچے ہلکے رنگ کے شیڈ سے ہم نے جس طرح آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہے اگر یہ شیڈ ہٹ جائے تو آپ کا خاندان خود کشی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ”غم اور غصے سے میری حالت خراب ہو گئی۔ ”تم کیسے ہو“ میں صرف اتنا کہہ سکی اور وہ مکڑہ ہنسی ہنس دیا۔

”صرف مکینہ نہیں بہت ہی مکینہ۔“ آپ کے تصور سے بھی زیادہ۔ فی الحال آپ میری پیش کش پر غور کریں۔ ہم آپ کو چوبیس گھنٹوں کی مہلت دیتے ہیں۔“ اور اس کے ساتھ ہی رابطہ کٹ گیا۔

وینا کی گفتگو ابھی یہی تک پہنچی تھی کہ گڈو نے اس ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اور خود اس ٹین کو دبائے لگی جس کی سرخ بتی روشن ہوئی تھی۔ آواز اتنی اونچی تھی کہ دونوں سن سکیں۔ آواز قاسم کی تھی لیکن لہجہ اس کا نہیں تھا اس کا لہجہ بالکل صاف تھا۔

”میں عاطف بول رہا ہوں۔“ وینا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں لیکن گڈو کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

”خبر یہ ہے کہ وینا کی کوئی سہیلی آئی ہے امریکہ سے۔۔۔ جی اچانک ہی۔۔۔“ پھر قاسم نے اسے پوری بات کہہ کر سنائی۔

”جی سر وہ وینا کو سنہرے کہہ کر بلا رہی ہے۔“ کسی سوال پر اس نے کہا۔

”نام تو معلوم نہیں سر لیکن وینا ان کو گڈو کہہ کر بلا رہی ہے۔“ آپ فکر نہ کریں سر۔۔۔ میں اور قدیر دونوں مستعد ہیں۔ پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہیں ان پر۔ ٹھیک ہے سر موقع ملے ہی ایک گھنٹہ بعد فون کروں گا۔“ پھر آواز آئی بند ہو گئی۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وینا ساکت جبکہ گڈو کی آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ اس نے بیک سے کوئی چیز نکالی اور ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی وہ جتنی دیر ہاتھ روم میں رہی وہ اپنا خون جلائی رہی اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر جائے اور اس نمک حرام کا

کے ساتھ جیسے ہی مس دینا آئیں یہ لفافہ ان کو فوراً ”پہنچا دیا جائے۔۔۔ لفافہ چونکہ سیل تھا۔ اس لیے میری سیکریٹری کو لگا کہ اس میں کوئی اہم کاغذات ہوں گے۔ جب میں نے لفافہ کھولا تو اس میں سے یہ بے ہودہ تصویر نکلی۔ تصویر پر نہ کوئی نام تھا اور نہ پیغام۔۔۔ اور نہ کوئی اور بات جس سے میں پریشان ہوتی لیکن دو باتیں قابل توثیق تھیں۔ ایک تو تصویر کا ڈرامائی انداز میں مجھ تک پہنچنا اور دوسرا اس کا غیر معمولی ہونا۔ غیر معمولی اس لیے کہ یہ مختلف تصویروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ لیکن اس مہارت کے ساتھ کہ وہ ایک ہی تصویر لگتی تھی۔ میری اور فہیم کی تصویر کے علاوہ اس میں نظر آنے والے مجھے میری ہی تخلیق تھے۔ اور اب بھی میرے اسٹوڈیو میں موجود ہیں۔ میں اسی اوڈیو رن میں تھی کہ مجھے فون آیا۔ دوسری طرف کوئی مرد تھا۔ لیکن اس کی آواز سے ایسا لگا جیسے وہ رومال رکھ کر بول رہا ہے یا جان بوجھ کر اپنی آواز بدل رہا ہو۔

”مس حیات۔ تصویر پسند نہیں آئی۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

گڈو سن تو مجھے رہی تھی لیکن اس کی نظر کبھی آلہ پر اور کبھی دروازے کی جانب تھیں۔

”میرا جو حال ہو گا آپ اس کا اندازہ لگا سکتی ہیں لیکن میں نے برواشت کرتے ہوئے کہا۔“

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔“

”یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کون ہوں لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ کیا چاہتا ہوں۔“ میں چونکہ معاملے کی یہ تک پہنچنا چاہتی تھی اس لیے خاموش رہی اس نے پھر کہا۔

”ہمیں آپ سے ایک معمولی کام آن پڑا ہے اس کے لیے ہم آپ کو معقول معاوضہ دینے کو بھی تیار ہیں۔ اب کام تو آپ کو ہی کرنا ہے معاوضہ لے کر گریں یا بنا معاوضے کے۔“

”اور اگر میں انکار کر دوں۔“

”آپ نے شاید تصویر کو غور سے نہیں دیکھا۔ اگر ہم آپ کی تصویر بے جان مجسموں کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکتے ہیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ معاملے

”ہم تو میرا عمرانہ ہے ڈاکٹر۔۔۔ سہیل بار سے گڈو کتنی ہیں۔“ اس کے انداز میں خاصا تکلف تھا رسی سا۔۔۔ جیسے اسے ڈاکٹر کی بات پسند نہ آئی ہو۔

”آپ جب تک چپک کر رہیں میں آپ کے لیے چائے کا بندو بست کرتی ہوں۔۔۔ وہ جواب کا انتظار کیے بنا باہر نکل گئی۔

”تمہاری یہ دوست کچھ مغرور سی نہیں ہے۔“ ڈاکٹر ثروت اس کی بے مروتی سے کچھ کبیدہ خاطر ہو گئی تھیں۔ لیکن دینا سمجھ گئی تھی کہ یہ رویہ کیوں اپنایا گیا ہے۔ وہ جلد از جلد وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی اور غلوں کے بدلے غلوں کا جواب دینے میں تامل تھا۔

”نہیں ڈاکٹر۔۔۔ کچھ کریک ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ماحول کی کشاف کو کم کیا۔

”تمہاری دوست جو ہوئی۔۔۔“ ڈاکٹر بھی ماحول کو سنجیدہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اس لیے مسکرا کر کہا۔

ڈاکٹر اسے آخری ہدایات دے رہی تھیں جب گڈو دوبارہ کمرے میں آئی اس کے سپاٹ چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا وہ کیا سوچ رہی ہے لیکن دینا جانتی تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جو ناکام لوٹتے ہیں۔ لیکن جب ڈاکٹر جانے لگی تو کہا۔

”میں چائے کے لیے کہہ آئی ہوں آپ تشریف رکھیں۔“ ڈاکٹر رکنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن خالہ کو آتے دیکھ کر اسے رکنا پڑا۔

ڈاکٹر ثروت کے جاتے ہی وہ ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اب کی بار اس نے اپنے بیگ سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر اس کے آلہ کے ساتھ جوڑ دیا جس سے وہ سارے کمروں کی آوازیں سن سکتی تھی۔ دینا حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی کہ بظاہر سیدھی نظر آنے والی یہ تمام کام کر رہی ہے۔ اور پوری تیاری کے ساتھ آئی ہے۔ اس نے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر دینا کو دیکھا جیسا کہ دیکھ رہی تھی۔

مہ تو زدے۔ تو کیا مبارک صاحب بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ لیکن اس کا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اس کے پیلا کے دور کے دوست تھے اس نے ہمہ سازی ان سے سیکھی تھی۔ اور جب اس نے ہمہ سازی چھوڑی تو سب سے زیادہ افسوس ان ہی کو ہوا تھا۔ دو سال سے اس کی ان کے ساتھ ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ دو سال پہلے وہ خود اس کے پاس آئے اور اس نے مشغلہ کے طور پر کام دوبارہ سے شروع کیا۔

”کن سوچوں میں تم ہو۔۔۔ خود پر کنٹرول کرو۔“ دینا نے اسے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

دینا کو اس کا حاکم انداز پسند نہیں آیا تھا لیکن اس نے اسے ایک دوست کا مشورہ مانا تھا۔

”بیٹا وہ ڈاکٹر ثروت آئی ہیں۔“ ناصر نے آکر اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے بھیج دیں۔“

”خالہ ایک کام اور کریں۔۔۔ گڈو نے کہا۔

”ہاں بولو۔“

”جب تک میں کچن میں نہ آؤں قاسم کو وہاں سے ہٹے نہ دینا۔ اسے کسی کام میں مصروف رکھیں۔“ اس نے کہا تو خالہ نے دینا کو دیکھا جس نے سر ہلا کر انہیں اجازت دی۔

”کریس گی یہ کام۔“ اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا۔

گڈو نے بقیہ چیزیں تیزی سے بیگ میں ڈالیں اور اندر سے کوئی چھوٹی چیز نکال کر جیب میں رکھ لی۔ وہ اب تک صبح والی جینز پہنی ہوئی تھی۔

”ہیلو کیا حال ہے۔“ ڈاکٹر نے کمرے میں آتے ہی کہا۔ پھر ایک نیا چہرہ دیکھ کر دینا کی طرف دیکھا۔ وہ ان کی فیملی ڈاکٹر تھی اور سارے خاندان کو جانتی تھی۔

”یہ گڈو ہیں۔۔۔ ہم کالج میں ساتھ تھے۔ پھر یہ شادی کے بعد امریکہ چلی گئی۔ صبح ہی آئی ہیں۔“ دینا نے تعارف کروایا۔

”یہ گڈو عجیب سا نام نہیں نہیں۔ اتنی بڑی لڑکی اور نام گڈو۔“ وہ حیرانگی سے بولی۔

نے سوال اٹھایا۔

یہ جو تصویر جو تم ابھی دیکھ چکی ہو اس میں فہیم اٹی چھری پکڑے اس انداز میں کھڑے ہیں جیسے کسی سے مقابلے کے لیے تیار کھڑے ہوں۔ انہوں نے چٹلون اور ٹائی پسن رکھی ہے۔ لیکن جو دوسری تصویر آئی تھی اس میں۔۔۔ ”وینا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔“

”میں سمجھ گئی وہ تصویر کیسی ہوگی۔۔۔“
”اور فہیم نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ تصویر چھ سال پرانی ہے اور انہوں نے کبھی کلائنٹ کے لیے کسی پر ڈاکٹ کے لیے ماڈلنگ کی تھی۔“

”دراصل اس دوسری تصویر نے انصر میرے حوصلے پست کر دیے بلکہ مجھے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔“ اس نے اپنی غلطی تسلیم کی۔

”فہیم یہاں نہیں تھے۔ تم نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ یہ پہلا موقع تھا درنہ دنیا میں کہیں بھی ہوں تم سے رابطہ کر لیتے ہیں۔ اور شک کی اس آگ پر مبارک صاحب نے پٹیولر چھڑک کر کہیں اس حد تک بھڑکایا کہ تم کل رات ان کو قتل کرنے چلی گئیں۔“ وینا نے سر جھکا لیا۔

”وہ تو شکر ہے کہ فہیم جاگتے ذہن کے آدمی ہیں۔ رات گیارہ بجے تمہاری آمد سے کھٹک گئے۔ درنہ اپنا کام دکھا دیتیں۔“

”لیکن تمہاری اس حرکت سے بہت سے پروں اٹھ گئے۔ کل رات تک ہم بہت کچھ جاننے کے باوجود اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہے تھے۔ پھر جب تم نے فہیم کو مارنے کی ناکامی کے بعد اس کو مورد الزام ٹھرایا تو بہت سی گھنٹیاں سلجھ گئیں اور ہمیں تیزی سے آگے بڑھنے کا راستہ مل گیا اب کامیابی ہم سے چند قدم دور ہیں۔“

وینا کی سمجھ میں اس کی بات نہ آئی لیکن اس نے اپنے شک کی وضاحت کرنا ضروری سمجھا ”دراصل مجھ سے یہ کہا گیا تھا کہ اس طرح کے کام ایڈورٹائزنگ والے بال آسانی کر لیتے ہیں۔ پھر فہیم کا اچانک غائب ہوجانا اور فہیم کا بازو واضح طور پر دکھنا اور سب سے بڑے

”فکر نہ کرو۔ تمہاری پراہم تو شاید اگلے دو تین گھنٹوں میں ختم ہو جائے۔“ اس نے وینا کے دیکھنے سے یہی مطلب نکالا۔

”تمہاری گفتگو کے بعد مجھے اپنی فکر ہے بھی نہیں۔ میرا شمار بھی تم ان لوگوں میں کر سکتی ہو جو وطن کے نام پر بے وقوف بننے کے بعد سو بار پھر بے وقوف بننے کو تیار ہیں۔۔۔“ وینا نے اس کے شک پر جواب دیا۔

”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی یہ بتاؤ کہ قاسم کو تم نے اصغر مبارک کی سفارش پر رکھا تھا۔“ گڈو نے پوچھا۔
”ہاں اور شاید وہ بھی اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔“ اس کا ذہن اب بھی مبارک صاحب پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔

”تمہاری فطری روانیت تمہیں لوگوں کے گھناؤنے چروں سے نقاب ہٹانے سے روکتی ہے۔ ورنہ بات تو بہت صاف ہے۔ کبھی تم نے سوچا کہ اصغر مبارک کے ذرائع کیا ہیں۔ بین الاقوامی معیار تو دور کی بات ہے، اس کا شمار ہمارے ملک کے پہلے دس مجسمہ سازوں میں بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ گزروں پٹیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے اور یہ باتیں گزشتہ آٹھ نو سالوں سے۔“

اس کی معلومات حیرت انگیز طور پر درست تھیں۔ وینا کو یاد تھا کہ ابتدائی سالوں میں اس کے پاپا اپنے اس دوست کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔

”پھر بڑی بات کہ اس بلیک میل نے تم سے کہا کہ تم اس کی ہدایت پر تم جو مجسمہ بناؤ گی اس کی ہدایات تمہیں اصغر مبارک دے گا۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن وہ اس بات پر کافی افسردہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دس سال پہلے انہیں بھی اسی طرح بلیک میل کیا گیا تھا اور وہ ایک ٹھو کھلا مجسمہ بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور شاید لاشعور میں چھاپی گناہ ان کے ہاتھوں میں رعشہ کا سبب بنا۔“ وہ ان کی صفائی دے رہی تھی۔

”فہیم صاحب سے تم کو متفرکس نے کیا۔۔۔“ گڈو

عمرانہ ہے جسے وہ گڈو کہتی تھی۔ شادی کے بعد امریکہ چلی گئی تھی۔ ”مبارک صاحب کی آواز پہچانی جاسکتی تھی۔“

”جی سر۔ میں نے سوچا آپ کو معلوم ہوتا چاہیے۔“

”تم نے سنہرے نام بتایا تھا نا جو گڈو اس کو کہہ رہی تھی۔“ مبارک نے کہا۔

”جی صاحب۔“ قاسم نے کہا۔

”پاس نے کہا اس لڑکی کے گڈو ہونے کا یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔ کالج میں صرف دو لڑکیاں اسے سنہرے کہہ کر پکارتی تھیں۔ ایک عفت جو آج کل آسٹریلیا میں ہے اور دوسری گڈو۔“ اصغر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”مگر سر۔ اگر یہ یہاں رک گئی تو کام تو لیٹ ہو جائے گا۔“ قاسم کی آواز ابھری۔

”یہی میں نے پاس سے کہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی جلدی نہیں۔ ابھی وہ چن یہاں پہنچی ہی نہیں ہے جو اس جھگڑے کے ذریعے ٹرانسفر کرنی ہے۔“ اصغر کی بات سن کر گڈو کی آنکھیں چمکنے لگی۔

”سر وہ کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔“ وہ جھجھکتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے شام کو فلیٹ سے آکر لے جانا۔ اب تم جاؤ اگر تم زیادہ دیر غائب رہے تو اندر کی رپورٹ نہیں ملے گی۔“ انداز تنبیہ کا تھا۔

”وہ جی کل کارپورام ہے میرا وہاں جانے کا۔ اور وہ بھی موقع دیکھ کر جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے شام کو سات بجے کے بعد آنا۔ ابھی میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔“ اصغر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

گفتگو ختم ہو گئی لیکن دینا کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگی۔ گڈو نے اس کے سامنے کوئی نمبر ڈائل کیا اور پھر کسی اور زبان میں گفتگو کرنے لگی۔

دینا اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن بالکل

کربھے کہا گیا تھا کہ اس کی شہرت ماضی میں اچھی نہیں رہی وہ ایک ”بلیک میلر“ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔“

”اور یہ تم کو بتایا اصغر مبارک نے۔“ گڈو نے کہا ”ہاں تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔“

”کسی مرحلے میں تم اس بلیک میلر کی بات ماننے پر رضامند ہوئیں؟“

”ہاں میں مبارک صاحب کے پاس گئی تھی انہوں نے بڑے دکھ سے مجھے سمجھایا کہ یہ مجھے کس طرح بنے گا پہلے میں سمجھتی رہی کہ اسے ہیروئن کی اسمگلنگ کے لیے استعمال کرنا ہے۔ لیکن جب مجھے پتا چلا کہ اسے نمائش میں رکھا جاتا ہے تو یہ کام تو میں مرکر بھی نہیں سکتی۔ مجھے اس معاملے میں کوئی اور ہی رنگ نظر آ رہا تھا۔“

”ان کی بات نہ ماننے کے نتائج پر غور کیا۔؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔

”نکل رات میں خود کشی کرنے کے بارے میں سوچتی رہی۔ لیکن شاید نہیں کے وعدے پر بھروسہ کر بیٹھی۔ ہر چند میرا شک پوری طرح دور نہ ہو سکا۔“ دینا نے سوچا تھا کہ وہ موقع ملے ہی پوچھے گی کہ وہ کمرے سے باہر نکل کر کیا کرتی ہے۔ لیکن گفتگو میں موقع نہ ملا۔ مگر جیسے ہی وہ نمبر ایسارک کرنے لگا۔ جس پر انہوں نے قاسم اور قدیر کی گفتگو سنی تھی۔ اسے یاد آ گیا۔ گڈو نے اسے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ پر وہ پلٹی تو آلہ میں سے گھنٹی کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر اس نے ”ہیلو“ کی آواز سنی تو حیران رہ گئی۔

”تو مبارک صاحب کی آواز ہے۔“ اس نے سوچا لیکن وہ تو لندن گئے تھے۔ میں خود ان کو سی آف کر کے آئی تھی۔ پھر اس کی توجہ دوبارہ آلہ کی جانب توجہ ہوئی۔

”سر میں بول رہا ہوں عاطف۔“ قاسم کی آواز بھری۔

”ہاں عاطف سب ٹھیک ہے۔ میں نے بگ پاس کو برکڈی گئی ہے۔ دینا کی کالج کی دوست ہے اس کا نام

خالی تھا۔ جانے کب گڈو نے اسے جھنجھوڑ کر پرکارا۔

”ہوش میں تو ہو۔“

”یہ سب کیا تھا۔“ وہ بمشکل بولی حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روے۔

”کچھ نہیں۔ ڈاکٹر کی موجودگی میں جب میں غائب ہوئی تھی یہ اس کا مکمل ہے۔“ قاسم صاحب دراصل موبائل فون استعمال کرتے ہیں۔ اس کا موبائل بگڈ کر کے آئی تھی۔ اب اس کیسٹ میں ان دونوں کی آوازیں موجود ہے۔“ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

”میں مبارک صاحب کے بارے میں کہہ رہی تھی ان پر تو میں اتنا اعتماد کرتی تھی لیکن وہ ہی مجھے اس جال میں پھاس رہے تھے۔“ وہ بے حد دکھی تھی۔ ”تمہیں اب تک معاملے کی سنگینی کا علم نہیں اس لیے یہ بات کر رہی ہو۔ میری جان یہ تو وہ بے غیرت لوگ ہیں جو اپنی ماں کا سودا کر رہے تھے۔ اپنے وطن کو بیچ رہے تھے۔ مگر اب ان کے پٹاک ارادے پورے نہیں ہوں گے۔ بہت جلد ہم ان کو کیفر کر دار تک پہنچا دیں گے۔“ دینا خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ چند لمحوں بعد اسے ہوش آیا۔ وہ کچھ کہنے لگی تھی کہ گڈو بول اٹھی۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے سپاٹ کچے میں مسکراہٹ سجائی۔

دینا فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کا اصلی چہرہ کون سا ہے۔ وہ جس پر ٹھٹھکتے گلاب جیسی مسکراہٹ یا وہ جذبات سے عاری پتھر پلا چہرہ۔ ”تمہارا اسٹوڈیو انیکسی میں ہے نا۔“

صائمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور وہ ساؤنڈ پروف ہے۔!“

”ہاں۔“ دینا ان سوالوں کا مطلب سمجھ نہیں پائی تھی۔

”ذرا مجھے اسٹوڈیو تو دکھاؤ۔“

دینا کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اسے لیے اسٹوڈیو میں آگئی۔

تھوڑی دیر اور دھڑکھڑاتی رہی پھر کہنے لگی۔ ”پہلے گیٹ سے قدر کو یہاں بھیجو۔ اور پھر اس کے پانچ منٹ بعد قاسم کو بھیج دینا۔ اس دوران خیال رہے وہ اپنے کواٹر کی طرف نہ جاسکے۔ ویسے وہ جانے گا بھی نہیں کیونکہ اب اسے مبارک صاحب سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر تم چاہو تو خود بھی آجانا اور ہاں آتے ہوئے قاسم کے کواٹر سے ٹرنک میں موجود موبائل ضرور لے آنا۔ گڈو اسے بالکل ہاؤس کی طرح ہدایات دے رہی تھی۔

لیکن اس وقت دینا اور بچوں میں فرق تھا وہ حریفہ حرف اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی قاسم کے کمرے سے موبائل نکالتے ہوئے اس نے سوچا۔

”کیس ان دونوں نے مشتعل ہو کر اس پر حملہ نہ کر دیا ہو۔“ پھر خود بھی اپنی سوچ پر ہنس دی کہ اس لڑکی کا ایک ایک انداز اس کے کون ہونے کی گواہی دے رہا ہے پھر بھی میں اس کے بارے ایسا سوچ رہی ہوں۔

وہ اپنے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو اسے لگا وہ کہیں اور آگئی ہو۔ تمام مجتہدے کونوں میں تھے سوائے ان دو مجتہدوں کے جو اس کو موصول ہونے والی تصویر میں بھی تھے گڈو نے وہ روشنی بھی روشن کر رکھی تھی جو تصویر میں تھی۔ گہرے سبز رنگ کے اسٹوڈیو میں وہ سرخ روشنی عجیب سی لگ رہی تھی۔ قاسم اور قدر بندھے ہوئے ایک کونے میں پڑے تھے۔ ان کے منہ پر ٹیپ لگی ہوئی تھی۔

”اب تم اپنی مخصوص جگہ پر چلی جاؤ اور مجتہدوں کی طرح ساکت ہو جانا۔“ اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر مجتہدوں کے درمیان اشارہ کیا۔ ایک سحرزدہ معمول کی طرح وہ اس کی بتائی ہوئی جگہ پر آکر رک گئی۔

”یہ تو وہ آواز نہیں جو میں صبح سے سنتی آرہی ہوں ایک شوخ لڑکی کی آواز یہ تو کسی درندے کی دہشت ہے۔“ ایک خوف کی لکیر اسے اپنی رگوں میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”کون ہے تو۔“ گڈو نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے ٹیپ اتاری اور پھر اس کے بال کھینچ کر منہ

اوپا کر کے کسی ناگن کی طرح پھنکاری۔
 ”عبدالقدیر۔۔۔“ اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں
 ایک زوردار پھٹکی کی آواز گونجی۔ دینا اپنی جگہ کانپ
 اٹھی۔ قدر کے ہونٹوں سے خون کی لکیری ابھری۔
 ”یہ چھ کوٹوں والا نشان تیری حقیقت تو بتا ہی چکا ہے
 اب اپنے منہ سے اپنا شجرہ بھی بتادے۔۔۔“ وہ چھ کوٹوں
 والا ستارہ اس کے سامنے لہرا کر بولی۔

”یہ تو اس روز مبارک صاحب کی جیب سے گرا
 تھا۔ میں نے اس لیے اٹھا لیا کہ وہ آئیں گے تو کہہ دوں
 گا۔۔۔“
 ”یہ تمہارے پاس جانتے ہو کیا ہے یہ ایک تنظیم کا
 نشان ہے، ایک بین الاقوامی تنظیم۔“ ایک لمحہ کو قدیر
 کی آنکھوں میں حیرت اتری۔

تم بڑی طاقتوں کے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہونے
 والی ناجائز اولاد۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ تیسری دنیا کا غیر ترقی
 یافتہ ملک ہے۔ جہاں تم جو چاہو گے کر لو گے۔ تم نے
 ہمیں کیا سمجھا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے شعلے برس
 رہے تھے۔

”بے بس کر کے مارنے پر اتنا نہ اڑ۔ کھول کر
 دیکھ پھر میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔۔۔“ وہ
 غرایا۔

”میرا کچھ بگاڑنے کی حسرت میں تیرا باپ میرے
 اس پاؤں کے نیچے اپنی گردن تروا بیٹھا تھا۔۔۔ تو کیا چیز
 ہے کہتے۔۔۔“ اس کی ہنسی سانپ کی پھنکار سے مشابہ
 تھی۔

”پھری ناگن۔۔۔“ خوف کی پرچھائیاں اس کی
 آنکھوں میں لہرائی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”ہاں یہ نام مجھے تیرے اس باپ شیروپ کے ہی دیا
 تھا۔“ میں نے طارق کی لاش پر قسم کھائی تھی کہ اسے
 کتے کی موت ماروں گی۔ تم نے دیکھا میں نے کس
 طرح اپنی قسم پوری کی۔“ اس کی آنکھوں میں فحش کی
 ہلک تھی۔ ”سنو کہتے۔ طارق سے میرا نکاح ہوا
 تھا۔ ابھی ہم نے اپنے ازدواجی زندگی بھی شروع نہیں
 کی تھی کہ ہمیں جدا کر دیا گیا۔ اور میں نے جوابی

دے سکتے ہیں۔ وطن سے غداری نہیں کر سکتے۔ میں

کارروائی میں اس کا یہ انجام کیا۔ بتاؤ میں تمہارا کیا
 حشر کروں گی۔ تم نے میری پاک دھرتی کی طرف ہاتھ
 بڑھایا ہے۔ اس کی حرمت کی طرف گندی نگاہ ڈالی
 ہے۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے بال ہینچ رہی
 تھی۔ آج میری کامیابیوں کا دن ہے۔ تم لوگ میرے
 ہاتھ لگے ہو۔ یہی کہتے ہو نا تم اپنے ایجنٹ کو۔ اس
 ستارے کے درمیان کا یہ ستارہ بھی ظاہر کرتا ہے۔
 سیکرٹ ایجنٹ جو غیر ملکیوں میں کارروائی کر کے واپس
 ہیڈ کوارٹر آتا ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔۔۔“ اس نے
 سوال کیا۔ لیکن وہ بہت سختی سے دانتی پروانت جمائے
 خاموش رہا۔ ”چلو ہم ایک سودا کر لیتے ہیں۔ یہ کہہ کر
 اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب باہر نکالا تو اس میں
 دو چیزیں برآمد ہوئیں۔ ایک چھوٹا سا قلم تراش۔ اور
 ایک سرخ رنگ کے سفوف ڈبیا۔

دینا اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ بالکل خالی
 الذہن۔ اس کی ساری حساسیت نے کام کرنا چھوڑ دیا
 تھا۔ اس کے کان سن رہے تھے لیکن وہ کچھ بھی سمجھنے
 سے قاصر تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں لیکن
 جو دیکھ رہی تھی وہ اس پر یقین کرنے سے قاصر تھی۔ وہ
 چاہ کر اس لڑکی پر نظر نہیں جماسکتی تھی جو صبح سے اس
 کی دوست بنی بیٹھی تھی۔ دینا کو اس کی لال آنکھوں
 میں موت ناچتی دکھائی دی۔

اس کی منکوحہ اس کے رازوں سے واقف تھی۔
تمہارے کتوں نے اس کے فلیٹ کی ایک ایک چیز تباہ
کردی۔ ہر چیز تباہ کر کے بھی وہ اس رمل کو تلاش نہ
کر سکے جس میں تمہارے کالے کرتوت تھے اس
نے تمہارے ہاتھوں مرنا گوارہ کیا لیکن اپنے راز
میں شریک نہ کیا۔ انہوں نے فریج کی بھی تلاشی لی
لیکن اگر وہ جی ہوئی برف توڑ لیتے تو شاید انہیں اپنے
مقصد میں کامیابی ہو جاتی۔ لیکن تمہارے نزدیک تو ہم
کنڈوزن لوگوں کے دماغ میں کوئی ترکیب بھلا کب
آسکتی ہے۔ کہ مائیکرو قلم کو پوٹی تھفن میں لپیٹ کر
آکس پاٹ میں رکھ دیا جائے۔

وہ رکی تو دیتا ہے سوچا اس لڑکی کے اور کتنے روپ
ہیں۔ وہ ہر لمحہ ایک نئے سروپ میں سامنے آ رہی
ہے۔

”میں بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ بھی تم
مجھ سے ایک سودا کر کے اپنی قوم کی ایک خدمت انجام
دے سکتے ہو۔“ بھری ناگن کی آواز گونجی۔

قدر کی آنکھوں میں امید کے سائے لہرانے لگے۔
سوئے کے لفظ نے شاید اس کے دل میں جان بخشی کی
نئی کلیاں کھلا دی تھیں۔ ”تم اگر کامیاب ہو گئے تو میں
وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری قوم کی برتری تسلیم کرتے
ہوئے تمہاری قوم کی غلامی کر لوں گی۔ ناکامی کی
صورت میں تم ایک ایک بات جو تمہیں معلوم ہے
اگلتے چلے جاؤ گے۔“ وہ بالکل ایسے گفتگو کر رہی تھی
جیسے دکن پر کھڑی اپنی پسند کی کوئی چیز خرید رہی ہو۔

”طارق نے تین سو اٹھارہ تینے اپنے جسم پر سجائے
تھے۔ تم اس سے کوئے زخم بھی اپنے جڑی زندہ جسم پر
بنالو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گی۔ ورنہ تم سب سے
پہلے یہ بتاؤ کہ گنگ باس کون ہے۔“ اس نے بھنکارتی
ہوئی آواز میں کہا۔ تو زندگی کی امید کے جھللاتے
چراغوں میں ایک بار پھر موت کا دھواں نکلنے لگا۔ لیکن
وہ رکے بغیر بول رہی تھی۔

”وصل کی حسرت لیے میں نے طارق کی منکوحہ
ہونے کی حیثیت سے اس کی لاش وصول کی تھی۔ اس

کی لاش پر بنے ہوئے ہر زخم پر آنسو بہائے تھے آج
بھی ہماری ہوں۔ اور جب تک زندہ ہوں آنسو بہائی
رہوں گی۔ لیکن تمہاری لاش پر کوئی آنسو بہانے
نہیں آئے گا۔“

”تم کچھ بھی کر لو۔ مجھ سے کچھ نہیں
کہلا سکتی۔“ موت کو سامنے دیکھ کر اس نے لڑنے
کا عزم کر لیا تھا۔
”منہ کی رکھی زبان کو تکلیف نہیں دو گے تو تمہارا
جسم زبان بن جائے گا۔“

”اس نے اپنا چھوٹا سا چاقو اس کے سامنے لہراتے
ہوئے کہا۔ اس کی گال پر ہلکی سی خراش ڈال دی۔ زخم
بلکا ضرور تھا کہ لیکن چہرے پر رستا خون اس کے چہرے
کو اور بھی بھیا نک بنا رہا تھا۔ ایک ہلکی سی سسکاری
کے ساتھ وہ کینہ تو ز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن
وہ خاموش رہا۔

”شبابش ایک عظیم قوم کے عظیم سپاہی کو اسی
طرح ہونا چاہیے۔ بلکہ اس وقت بھی نہیں چلانا
چاہیے جب اس کے زخموں پر مرحلوں کا چھڑکاؤ کیا
جائے۔“ دینا کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑی ڈٹی پر
پڑی جسے وہ کھولتے ہوئے بالکل استانیوں والے انداز
میں بات کر رہی تھی۔

”تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ قدر خوف زندہ ہو کر
چلایا۔

”کیوں نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں جواب دہ ہوں یا
تمہارے کسی باپ کو۔ جس کے پاسپورٹ پر تم یہاں
داخل ہوئے ہو۔ ابھی تو پہلا زخم لگا ہے ایسے بجائے
اور کتنے زخم برداشت کرنے پڑیں گے۔“ اس نے زخم
پر مرحلوں کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔

اسٹوڈیو اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ وہ اسے
چلیاں دے رہا تھا جسے بوے اطمینان سے سن رہی
تھی۔

”گنگ باس کون ہے۔“ اس نے تڑپتے ہوئے
ایجنٹ کو بالوں سے پکڑتے ہوئے کہا، لیکن اس نے
جواب دینے کے بجائے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اس کے منہ پر پھر شپ لگادی گئی۔

”اب بولو قاسم۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”میرا نام قاسم نہیں عاطف ہے۔ چودہ سال پہلے میں دہلی کے ایک ہوٹل میں پلورچی تھا میری ایک ہی بہن تھی جو لاہور میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک بار میں دہلی سے آیا تو مجھے کراچی سے لاہور کی فورا سیٹ نہ مل سکی۔ میری بہن نے میری شادی طے کی تھی۔ مجھے لاہور کی دو دو بعد کی سیٹ ملی میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ میں اس دوران اپنے دوستوں سے مل لوں گا۔ میں سالن لے کر ایک سٹے سے ہوٹل میں آگیا۔ کراچی میں ان دنوں ہنگامے ہو رہے تھے، لیکن میرا ان سے کیا واسطہ۔ لیکن اسی رات ہوٹل میں چھلپا رہا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میرا اسباب میرے سامنے ہی آپس میں بانٹ لیا گیا اور مجھ پر مقدمات بنا کر پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ میری پیشی نہ ہو سکی کیونکہ پیشی کے لیے ان کے ”مقدم“ کو پیسے دینے ضروری تھے۔ جو میرے پاس نہ تھے پھر جانے کیا ہوا کہ پانچ سال بعد اچانک میری ضمانت ہو گئی اور ہمیں سے میرا اور مبارک صاحب کا ساتھ ہوا تھا۔ میں انہیں نیک آدمی سمجھا تھا، لیکن رفتہ رفتہ ان کے خلوص کا راز مجھ پر کھلتا گیا۔ اپنے ہر عمل کا ان کے پاس جواز موجود تھا۔ میں پوچھا کھانا تھا۔ ان کی باتوں سے متاثر ہو جاتا۔ جلد سے جلد انہوں نے مجھے امیر بننے کی راہ دکھائی تو میں اس راہ پر چل پڑا۔ پھر مجھے جوئے کی ایسی لت پڑی کہ میں ہر غم سے بچنے نہ ہو گیا۔ بہن جانے کہاں کھو گئی تھی۔ جیل میں کئی زبانیں سیکھی تھیں۔ مبارک مجھے مختلف گھروں میں ملازم رکھوا دیتے اور میں ان کو ان گھروں کے راز فراہم کرتا، لیکن آج مجھے معلوم ہوا آپ کی باتوں سے کہ میں ہیروئن کے پیچاری یا بلیک میلر کا ملازم نہیں تھا بلکہ ایک غدار وطن کا آلہ کار تھا۔“ اس کا چہرہ آنسو سے تر تھا۔

”اس ہٹ کے بارے میں کیا بارے میں کیا کہ

کا نغیاز اسے اپنے جسم پر کیے بعد تین زخموں کی صورت میں بھگتنا پڑا وہ بڑی مہارت سے اس کی کھال پھیل رہی تھی۔ ہر زخم پر وہ چلا اٹھتا، لیکن پھر بھی ناگن رحم کے نام سے نا آشنا تھی۔

بچپن کی آواز میں کوئی وقفہ نہیں تھا اور بتا سوچ رہی تھی کہ پیانے یہ اسٹوڈیو ساؤنڈ ٹریف بنوایا تھا تو ان کے خیال و خواب میں بھی نہیں ہو گا کہ ایسا کوئی دن آسکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے سازی میں دینا کو کوئی آواز پریشان نہ کرے۔ اس کی اچانک نظر گڈو پر پڑی جو مچھوں کی ڈیسے لے کر اینجنٹ کی جانب گھومی۔ اینجنٹ کی پچیس خاموش ہو گئی تھیں۔ صائمہ سمجھی شاید وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔

”متی جلدی نہ تم بے ہوش ہو سکتے ہو نا مہرکتے ہو۔ اس لیے ڈرامہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اگر بے ہوش ہو بھی گئے تب بھی میں پانی سے نہیں تمہاری آنکھوں میں مرچیں ڈال کر تمہیں ہوش میں لاؤں گی۔“ اس کی آواز میں سرد مہری تھی۔

اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ سب کچھ جاننے کے باوجود دینا اس بات سے ڈر گئی تھی۔ اس کے اندر کا فنکار اس بات سے ترپ اٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے ان اینجنٹوں کے ظلم اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔

”گھر جائیں بی بی۔“ ایک قدم کا فاصلہ باقی تھا جب قاسم چلا یا۔

”مجھے تو میں بعد میں پوچھوں گی کہتے۔“ وہ قاسم کی جانب پلٹی جسے وہ اب تک نظر انداز کر چکی تھی۔

”مجھے کتنا نہ کہو بی بی۔ کتنا تو بڑا وفادار ہوتا ہے۔ میں تو ذلیل جانور ہوں جو آج تک انجانے میں ہی سہی اپنی دھرتی کا سودا کرتا رہا ہے۔ آپ اس حرام زلوے پر وقت ضائع کرنے کی بجائے بگ باس کی ہٹ ممبر۔“ وہ درہا تھا۔

”مزید ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو کتے کی موت مارا جائے گا۔“ بے ہوشی کی ایک ٹنگ کرنا ہوا تیر ہوش میں آیا۔

لیکن بیڈ روم میں جانے کی ہمت نہ ہوئی تو باہر شعلتی رہی۔ کوئی دس منٹ بعد وہ بیڈ روم سے باہر نکلی۔
”آؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ پہلے ناصروہ خالہ سے کہہ کر چائے بناؤ۔“ اس کے لہجے میں جھکن تھی۔

چائے کا کہہ کر وینا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ اسٹوڈیو سے اس کا چاقو اور مرچیں اٹھالائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کھتی گڈو اس سے مخاطب ہوئی۔
”وطن کی سالمیت کے نام پر میں تم سے درخواست کرنا چاہتی ہوں وینا حیات۔“ اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔

وینا نے کوئی جواب نہ دیا طرف منتظر نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”تم نے آج جو کچھ بھی دیکھا سنا۔ تمہیں اس میں سے ایک ایک بات بھولی جانے کا وعدہ کرنا ہو گا بالکل ایسے جیسے تم وہاں موجود نہیں تھیں۔“ اگر وہ یہ بات نہ بھی کہتی تب بھی وینا جانتی تھی، لیکن اس کے کہنے پر اسے اپنے اندر کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ غنیمت ہوا اسی وقت ناصروہ چائے لے کر آئی وہ اٹھ کر یکب شاپٹ کی طرف آگئی۔ خالہ چائے رکھ گئی تو پھر بھی ناگن چائے بنانے لگی۔ ابھی وہ چائے انڈیل رہی تھی کہ وینا اس کے سامنے آگئی۔ اس نے اس کے سامنے اپنی ہتھیلی کر دی۔

”یہ دیکھو میرا جواب اور میرا وعدہ۔“ اس نے اپنی ہتھیلی پر چارکٹ لگائے تھے اور ان پر مرچیں ڈال دیر تھیں۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے دانت اتنی مضبوطی سے جمتے تھے کہ گردن کی رکیں تن گئی تھیں۔ اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا، لیکن اس کی ہتھیلی کا زخم چرچ کر کہہ رہا تھا ”تم کیا سمجھتی ہو وطن کی حفاظت صرف تمہارا کام ہے۔ اس میں ہمارا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی اور کا ہو سکتا ہے۔“ ہتھیلی سے بننے والا خون نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا اور خاموشی سے یہ دیکھنے والی جانے کی راستی رہی اور پھر ایک دم تڑپ کر

رہے تھے۔ گڈو اس کی باتوں سے متاثر ہونے کے باوجود اپنا مقصد نہیں بھولی تھی۔

”پ تک اصغر ہی باس ہے، لیکن پندرہ روز پہلے ایک نیا باس آگیا ہے جسے مبارک ”ہنگ باس“ کہہ کر پکارتے ہیں، میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا، لیکن پچھلی جمعرات کو میں نے اصغر مبارک کو ”ہاگس بے کی ہٹ نمبر سی بارہ میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ ہم جواریوں کے لیے محفوظ جگہ ہے۔ جہاں پولیس بھی آتے ہوئے گھبراتی ہے۔ جمعرات کی رات ہم نے جس ہٹ میں ڈیرہ لگایا تھا اس کا مالک اچانک آگیا۔ چونکدار ہمیں ایک جگہ انتظار کا کہہ کر دوسری ہٹ کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ تب ہی میں نے اصغر کو سی بارہ میں جاتے دیکھا۔ جنتس سے مجبور ہو کر میں اس کمرے تک پہنچ گیا جہاں وہ اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں ٹیٹھ بند ہونے کی وجہ سے سن تو نہ سکا، لیکن پرہ سائیز پر ہونے کی وجہ سے ان کو مودب کھڑے دیکھا تھا۔ چونکدار سے پتا چلا کہ وہ ایک معذور آدمی ہے اور ہمت والا بھی وہ دونوں ناگنوں سے معذور ہونے کے باوجود اپنے سارے کام خود کرتا ہے، لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے اس شخص کو دونوں ناگنوں میں گھڑا دیکھا تھا۔“

”اس کا حلیہ بتاؤ۔“
”میں غور سے نہیں دیکھ سکا، مگر وہ پاکستانی تھا پھر اسے کچھ یاد آیا تو بولا۔ اپنے فہیم صاحب سے اس کی شکل بہت ملتی تھی۔ پہلی نظر میں میں نے اس کو فہیم ہی سمجھا، لیکن وہ عمر میں زیادہ تھا، لیکن جب اس کا پورا چہرہ میرے سامنے آیا۔ تو میں نے دیکھا اس کا دایاں کان کٹا ہوا ہے۔“ قاسم کی بات پر وہ چونک اٹھی۔
”نیچے کی طرف سے آدھا کان۔“ اس نے پوچھا تو قاسم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ ”میں تمہارے کمرے میں جا رہی ہوں۔ قاسم کے منہ پر ٹیپ لگا کر تم آجانا اور کسی کو اس طرف مت آئے۔“ وہ خواب کا انتظار کیے بنا ہوا چلی گئی۔
وینا اس کی ہدایت کے مطابق گھر میں داخل ہوئی،

اٹھی۔ وہ جو کچھ دیر پہلے ایک زندہ انسان پر زخم لگاتے ہوئے نہ ہچکچائی تھی جس نے بڑے فخر سے یہ دعا کیا تھا کہ ایک دشمن کی گردن اس نے اڑی سے توڑ دی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
 ”تم پاگل لڑکی ہو۔ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔“
 خود کو ہر جذبہ سے عاری کئے والی کی آواز بھی جذبات سے گنگ تھی۔ پھر شاید اس نے ناصرو خالہ کو آواز دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وینا نے اسے روک دیا۔

”کسی کو مت بلانا۔ مجھے ان زخموں سے راحت ہو رہی ہے۔“

”راحت کی بچی۔ یہ ہاتھ اس لیے نہیں کہ ان کو زخمی کیا جائے۔“ اس کی آواز میں دلارتھا۔ وینا کو اس کا دھکا دے کر بیڈ روم میں لانا برا لگانا نہ بند توج کرتے ہوئے پھنکارنا برا لگا۔ تکلیف کا احساس تو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو سے ختم ہو گیا۔

ناصرہ خالہ فرسٹ ایڈ باکس دے کر گئی تو واپس پلٹ کر نہ آئی۔ سب سے زیادہ حیرت وینا کو ان کے طرز عمل سے تھی۔ ایک عام سی بات سو بار دہرانے والی اتنے خاص واقعات پر کچھ نہیں بول رہی تھیں۔ صبح سے ان کو ایک جیب سی لگ گئی تھی اس کے باوجود ان کے چہرے پر تشویش کے آثار نہیں تھے۔

”مگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہ کر سکتی۔ خیر یاد تو اب بھی آؤ گی، لیکن ایک پاگل کے طور پر۔“ دونوں دوبارہ ڈرائنگ میں آگئیں۔ گڈو کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔
 ”تمہارا نام کیا ہے۔“

”گڈو۔“ اس نے کہا تو دونوں ہنس دیں۔ وینا جان گئی تھی کہ وہ اپنا نام نہیں بتانا چاہتی۔

خالہ دوبار چائے لاپچی تھی اور دونوں اس سے پورا پورا انصاف کر رہیں تھیں۔ انہیں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مالی بیاہد جوان فوجیوں کے ساتھ تھے۔ وینا ان کے کندھوں پر لگے نشانات سے ان کے عمدوں کا اندازہ لگا چکی تھیں۔ پھر انہوں نے گڈو کو

سیلوٹ کیا۔

”اب میں چلوں گی۔“ وہ اس کی جانب دیکھنے بنا بولی۔

وینا نے چابی بڑھادی۔

”بابا آپ پلیز اس کی اسٹوڈیو تک رہنمائی کریں گے۔“ وہ ملتانجیہ انداز میں بولی تو بابا خوشی خوشی ان کے ساتھ چل دیے۔

”آپ یقیناً لیفٹیننٹ ریاض عالم ہوں گے۔“

”جی۔“ اس نے فوراً اڑیاں ملا کر ایشن کیا۔

”آپ یقیناً کرنل مسعود کے اعتماد پر پورا اتریں گے۔“

”آپ مجھ پر اور میرے جوانوں پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔“

پھر اس نے ”اللہ حافظ“ کہا اور وینا کو دیکھے باہر نکل گئی۔ وینا کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر ایک بار اسے دیکھے اور گلے لگائے، لیکن وہ ایسی بے مروت نکلی کہ تیزی سے باہر جا کر جیب میں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے آئی تھی، لیکن اپنا بھرپور تاثر چھوڑ گئی۔ اس رات بھی وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ پھر اسے نیند آئی۔ اگلادن بھی گزر گیا۔ لیفٹیننٹ نے مختلف جگہوں پر اپنے ساتھیوں کو اس طرح تعینات کروایا کہ باہر سے آنے والے کو پتہ نہ چلتا کہ اندر کس طرح کے انتظامات ہیں۔ لیفٹیننٹ نے خود کو انیکسی تک محدود کیا ہوا تھا۔ گڈو طوفان بپا کر کے جا چکی تھی اور وہ اس کے سامان کو قبضے میں لے رہا تھا۔ ناصرو خالہ نے بتایا کہ وہ مختلف جگہوں سے کچھ چیزیں نکال کر لے گیا ہے۔ وینا سمجھ گئی وہ کیا چیزیں ہوں گی۔ اگلا پورا دن گزر گیا۔ شام کو لیفٹیننٹ اس کے پاس آئے۔ ”مس ملک۔ ہمیں اجازت دیں۔“ اور وینا نے سر ہلادیا۔

ان کے جانے کے بعد گھر ویران سا ہو گیا۔ پھر رات دس بجے کے قریب اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ سمجھی شاید قہیم ہوگا، لیکن دوسری جانب کوئی اجنبی ”مس دینا حیات ملک۔ میں کرنل مسعود بات کر رہا

ہوں۔“ جی کرئل صاحب کہیں۔ کوئی حکم۔“ وہ مودب ہوئی۔

”آپ کے تعاون کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا، لیکن دینا تو اس کا انداز اچھا نہ لگا۔

”میں بھی اسی وطن کی بیٹی ہوں۔ اس کی حفاظت مجھ پر اتنی ہی واجب ہے جتنی آپ پر۔“ وہ سختی سے بولی۔

”آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔ آپ کا فرض تو شاید ہم سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ آپ اس مٹی کو زبان دیتی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب تھا کہ میں اور میری ساھی آپ کے جذبے کو سلام کرتے ہیں۔ مس حیات نشان حیدر سے لے کر ٹیلی فون تک یہ سب اعزاز ہوتے ہیں ان کا برا نہیں مانتے۔ فخر کرتے ہیں میری بہن۔“ ان کی بات پر وہ شرمندہ ہو گئی۔

”آئی ایم سوری کرئل۔ آپ کی بات کا میں غلط مطلب سمجھی تھی۔“ دوسری جانب کرئل نے توجہ نہ لگایا۔

”غلطی تمہاری نہیں میری ہے، ہم اکھڑ لوگ کہنا کچھ چاہتے ہیں منہ سے نکل کچھ جاتا ہے۔“ دینا کو ایک بھولی بات یاد آئی۔

”آپ کو فہم الزماں کے بارے میں کچھ پتا ہے۔“ انہوں نے شاید آپ سے رابطہ نہیں کیا اس لیے آپ پریشان ہیں۔ آپ یقین رکھیں وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ میں ان کے کارنامے کی تفصیل بتا کر ان سے یہ حق نہیں چھیننا چاہتا۔ میں تو دعا کرتا ہوں کہ اگر میں نے کبھی کوئی نیکی کی ہو تو اس کے بدلے میں ہر گھر میں وطن کی محبت رکھنے جیسا محب وطن فہیم پیدا ہو۔“ دینا کے منہ سے بے اختیار آمین نکلا تھا۔

کرئل سے بات کرنے کے بعد یہ اعتماد ہو گیا تھا کہ فہیم خیریت سے ہے۔ وہ فہیم سے مل کر معافی مانگنا چاہتی تھی۔ ہر گز رالحمہ اسے یقین دلا رہا تھا کہ فہیم اس سے ناراض ہے۔ اگر وہ ناراض نہ ہوتا تو فون ضرور کرتا۔ چاہے طنز کرنے کے لیے ہی سہی۔ اس نے ہر

جگہ فون کر لیا جہاں سے اس کے ملنے کی امید تھی، لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ اسی ادھیڑن میں رات کے دو بجے گئے۔ ایک ہی فقرہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ اسے برا بھلا کہا۔ چور کہا۔ فراڈ اور بلیک میلر بنا دیا۔“

نیند آج کی رات بھی اس سے تھا تھی۔ اک بے نام سی امید پر اس نے گیٹ کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے پردہ ہٹا دیا تھا۔ جانے کیا وقت تھا جب اس نے گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز سنی۔ اس نے دیکھا وہ گندو تھی۔ مائی بابا نے گیٹ کھول دیا تھا وہ شگے پاؤں بھاگتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ گندو نے اندر آنے سے انکار کرتے ہوئے ایک کیسٹ اس کی جانب بڑھائی۔

”یہ فہیم صاحب نے دیا ہے۔“ دینا پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ خود کہاں ہیں اور تم رات کے اس وقت۔۔۔ لیکن اس کے پوچھنے سے پہلے وہ بول پڑی۔

”ان کی ہدایت تھی کہ یہ کیسٹ میں تمہیں کل صبح آٹھ بجے دوں۔ میں نے ان کو بہت تلاش کیا، لیکن جب وہ نہ ملے تو خود تمہیں دینے آگئی۔ میری مجبوری تھی کہ مجھے اپنی ماں کی لاش لے کر گاؤں روانہ ہونا ہے۔ فہیم صاحب کے ساتھ ملاقات ہو تو ان سے معذرت کر کے میری مجبوری بتا دینا۔“ اس کے لہجے میں چھپے عزم کو دیکھ کر دینا کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ تعزیت کر لے۔ وہ جانے کے لیے پلٹ گئی۔ پھر پلٹی۔

”تم نے میرا نام پوچھا تھا نا۔۔۔“

”ہاں۔“ اس نے انہایت میں سر ملایا۔

”میں عذر اسلطانہ ہوں۔“ اور دینا کا دل چاہا کہ کہے کہ تم واقعی سلطان ہو، لیکن وہ جاچکی تھی۔ وہ جلدی سے اندر آئی تاکہ کیسٹ سن سکے۔

”جانے اس نے رابطے کے لیے یہ انوکھا طریقہ کیوں ڈھونڈا تھا۔“ اس نے فی وی ٹرائی کو بیڈ روم میں دھکیلتے ہوئے سوچا۔

”اللہ کرے اس میں ایسی کوئی بات نہ ہو جسے سن کر اسے افسوس ہو۔“ اسے اس خیال سے ہی وحشت ہونے لگی تھی کہ فہیم نے شارق کی جگہ لین چاہی

اڑائے گی، لیکن اس کے خوابوں کی بھیاں ایک تعبیر کی صورت میں آجود طور میں آیا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی چند سالوں کی اگر کوئی بات یاد ہے تو وہ ماں کی نفرت اور شانی ماموں کی شفقت۔ وہ دنیا کے لیے بد معاش غنڈے ہو سکتے تھے، لیکن میری لیے وہ باپ جیسے تھے۔ جن کی وجہ سے گھر میں کھانا بھی مل جاتا تھا اور مٹی کے لوگ دھکے بھی نہیں مارتے تھے کیونکہ میں بد معاش کا چیمٹا بھانجا ہوتا تھا۔ شانی ماموں کے بعد جس شخص نے مجھے پیار دیا وہ بشارت بابا تھا۔ اپنی جوانی میں وہ ایک نامی گرامی جیب کترے تھے، لیکن جب انہوں نے ایک نامی گرامی غنڈے کی جیب کٹی تو اس نے ان کے ہاتھوں کی دودھ انگلیاں کاٹ دیں۔ بابا اپنی ساری کمائی کسی طوائف پر لٹاتے تھے، لیکن جب اس کی روزی بند ہوئی تو اس نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور بشارت بابا ہمارے پاس آگئے۔ وہ سیڑھیوں کے ساتھ خالی کھولی میں پڑے رہتے اور بازار سے سودا لادیتے۔ ان کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ میں باؤں پاؤں چلتے لگاؤ ان کی گود میرے لیے دارا سکون تھا۔ انہوں نے مجھے ایک ہی سبق پڑھایا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت دولت ہے۔ مجھے ان باتوں کی تیز نہ تھی، لیکن جب انہوں نے مجھے جیب کاٹنا سکھائی اور پھر شامیاش دی تو مجھے حوصلہ مل گیا۔ شکار وہ دکھاتے اور ہاتھ میں صاف کرتا۔

دنیا والوں کے لیے میں فہیم الزماں ہوں۔ جو والدین کے مرجانے کے بعد وطن آیا تھا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے جو میں نے اپنی دولت کے بل پر پھیلائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان گلیوں میں جنم لیا جہاں کسی کے گھر بننا پیدا ہو تو لوگ اسے پرہ دینے آتے ہیں جس طرح کسی کے مرنے پر آتے ہیں۔ میں ان گلیوں میں پیدا ہونے والا پہلا لڑکا نہیں تھا، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح میری ماں نے غم منایا ویسے کبھی کسی نے نہ منایا ہوگا۔ میری پیدائش کی خبر سن کر پہلے تو وہ بے ہوش ہو گئی پھر ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے میرا گلا گھونٹنے کے لیے لپکی۔ اس وقت شامی ماموں نہ ہوتے تو میرا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ دراصل یہ میری ماں کی نفرت تھی۔ میرے باپ کے عمل کے جواب میں رد عمل۔ انہوں نے میرے باپ سے سب کی مخالفت مول لے کر شادی کی تھی، لیکن جیسے ہی میرے دادا کو خبر ہوئی انہوں نے میرے باپ کو جانبدار سے بے دخل کرنے کی دھمکی دے کر قابو کر لیا۔ وہ بزدل میری ماں کو بھری دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت تک میں اپنی ماں کے بدن میں جنم لے چکا تھا میری ماں روتے ہوئے دوبارہ اپنے مقام تک آگئی۔ بھنورارس چوس کر اڑ چکا تھا۔ اب پھول کی فریاد کون سنتا۔ میری ماں نے سوچا تھا بیٹی پیدا ہوئی تو کوٹھے پر بٹھا کر میرے باپ دادا کے اوتھے سٹکے کا مذاق

دینا کی نظر میں یہ بے ضرر باتیں تھیں پھر بھی وہ اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔
 ”بیس سات سال کا ہوا تو اچانک میرے وجود سے نفرت کرنے والی ماں مجھ پر مہمان ہو گئی۔ بارش میں بھگینے اور علاج نہ ہونے کی وجہ سے مجھے نمونیہ ہو گیا۔ میری ماں نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ تڑپ اٹھی۔ اس نے جی جان سے مجھے سنبھالا۔ میرا بخار بھی اتر گیا اور ماں بھی مل گئی۔

اس نے مجھے اسکول بھیجا اور تاکید کی کہ کسی کونہ بتاؤں کہ میری ماں کون ہے۔ اس وقت جرم کی راہ پر چلتے مجھے کئی سال ہو گئے تھے۔ میں فطرتاً ذہین تھا۔

علم ہوا۔ اس سے پہلے وہ صرف میرے لیے ایک نام تھا۔ اس روز میں اس سے پوری طرح آگاہ ہوا تھا۔ آپ یقیناً ”میرے باپ کے نام پر چونکیں گی۔“ آپ کے تایا اور شارق کے والد میرے باپ تھے اور شارق میرا بڑا بھائی ہے۔“

نہیم کا انکشاف ایک دھماکے کی طرح اس کے سر پر ہوا تھا۔ بہت سے بہت سے اسے اپنے سامنے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ بت جن کو وہ ایک عرصے سے پوچتی آئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ نہیم دوبارہ مخاطب ہو چکا تھا۔

”مجھے اپنی زندگی کا مقصد ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس دوران مجھے اس بین الاقوامی مجرم رائیل نے سارا دیا۔ وہ ایک مجرم تھا اور اچھے مجرم کی طرح انسان کی نفسیات کو سمجھتا تھا۔ عمروں کے فرق کے باوجود ہم میں دوستی تھی۔ اس کے کہنے پر میں نے جرم کی دنیا میں خود کو پارس کہہ کر متعارف کروایا۔ پھر اس نے مجھے اپنے لواحقین کو بتا کر کہنے کی راہ بھائی۔ اب میرا مقصد تھا اب میں سیٹھ نہیم الزماں کے روپ میں سامنے آیا اور میرے منصوبے میں سب سے پہلے آپ کو بتا کر تھا اور اگر تمہیں بچانے شارق آتا تو اسے بھی بتا کر تھا۔ تمہارے قریب بھی اسی لیے آیا ہ تم سے ایک بڑا کاروبار کروا کر پہلے خفیہ اداروں کو تمہاری راہ پر لگواتا اور پھر تمہارے مال سے منشیات برآمد کروا کر تمہیں گرفتار کروا دیتا، لیکن تم سے ملنے کے بعد مجھے ایک نیا احساس ہونے لگا۔ میری نفرتوں نے اس طرح مجھے گھیرا کہ میں محبت کے تصور سے نا آشنا تھا۔ دل کا یہ چور دروازہ کھلا تو مجھے اب تک کی زندگی کی رائیگاں معلوم ہونے لگی۔ وہ سال ہر لحاظ سے میرے لیے ہنگامہ خیز سال تھا۔ پہلے میری ماں کی وفات ہوئی پھر میری شارق سے ملاقات ہوئی، لیکن یہ شارق نہیں تھا جو تم سے چھڑ کر گیا تھا بلکہ ایک سپر پاور کا ایجنٹ تھا۔ معلوم نہیں کیسے وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس کے باوجود خوش تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات وہ میرے وجود سے لاعلم نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ سے بھی نفرت

اسکول کے ماحول نے اسے اور جلا بخشی۔ میں اپنی ماں کی آنکھوں کا تادم بن گیا، لیکن میرا اور شارت کا معاملہ اپنی جگہ رہا۔ میں اب بڑے ہوٹلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ میری کمائی ہوئی تمام دولت کا حق دار بشارت بابا تھا۔

بات طویل کرنے کے بجائے میں بتاؤں گا کہ جب میں نے میٹرک کیا تو دنیا کا سب سے چھوٹا لکھ پتی بن چکا تھا۔ لی اے تک بشارت نے مجھے عملی میدان میں نہیں جھونکا، لیکن اپنے تئیں انہوں نے میرے نام پر برائی کے بہت سے اڈے شروع کر دیے تھے۔ جن پر کنٹرول ان کا تھا۔ عملی طور پر کرتا دھرتا بابا ہی تھے۔ اپنی ماں سے میری محبت کو بھی انہوں نے خوب استعمال کیا۔ وہ کہتے تھے کہ اپنی ماں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ میرے سوا کوئی نہیں لے سکتا، میں انتقام کی کس ہوس میں جل رہا تھا میری ماں بے خبر تھی۔ لی اے کے بعد بابا مجھے عملی میدان میں لانا چاہتے تھے، لیکن ماں مجھے مزید پڑھانا چاہتی تھی۔ بابا اب بڑے صاحب کے چہرے سے پردہ ہٹانے کے لیے بے چین تھے۔ ماں اور بابا کی خواہشوں کی درمیانی راہ میں نے یہ نکالی کہ ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا اور اپنے طور پر دھندوں میں قدم جمائے لگا، لیکن یہاں بھی پس پردہ بڑے صاحب کا تصور باقی تھا۔ میری لائیں اسمگلنگ کا سامان ادھر ادھر کرتی رہیں اور میں دونوں ہاتھوں سے دولت بنوڑتا رہا۔ میں بلیک میلنگ کے میدان میں اتر آیا کوٹھے پر آنے والے شریف زادوں کو خوف زدہ کر کے ان سے دولت بنوڑنے لگا۔ اسی دوران میرا فکر ایک بین الاقوامی مجرم سے ہو گیا۔ اسے وقت اور حالات نے مجرم بنایا تھا جب کہ میں تو پیدا ہی مجرم ہوا تھا۔ پھر ایک بار اس نے مجھے بتایا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے اپنے باپ کی موت سے زیادہ اپنے انتقام کے ادھر سے رہ جانے کا دکھ تھا، لیکن میری بے وقوفی اس کی موت پر ماتم کر رہی ہے جو اسے زمانے کے قدموں میں پھرنے کا چھوڑ گیا تھا۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے پوری طرح اپنے باپ کے بارے میں

آگئیں۔ جرم کے جنگل میں بھٹکنے والوں کی قوت شاید بہت تیز ہوتی ہے۔ تمہارا پرس پکڑنے کا اشارہ بھی مجھے ہوشیار کر گیا۔ تمہاری اطلاعات سے بہت سی کم گرہیں بھی کھل گئیں، لیکن اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ تمہارا انک مجھ پر تھا۔ جس کے دل میں نفرت کے اندھیروں کو تمہاری محبت نے دور کیا تھا۔ میں جب تمہیں تباہ کرنے تمہارے قریب آیا تو تم نے اعتماد کی دولت سے مجھے مالا مال کر دیا۔ میں جو تمہارا سب سے بڑا محافظ تھا تم نے مجھے شک کی نظر سے دیکھا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔

اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے میں تمہیں کوئی اچھی خبر نہیں دے رہا ہوں جس وقت تم گڈو کے ساتھ اپنے اسٹوڈیو میں مصروف تھیں۔ اس وقت مجھے مبارک نظر آیا۔ تم نے کہا تھا کہ وہ لندن گیا ہوا ہے، لیکن وہ یہاں موجود تھا۔ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس ہٹ تک پہنچ گیا۔ جہاں شارق ایک اپانچ کے بہروپ میں موجود تھا۔ اس وقت تک ہمارے سامنے تمام حقائق آچکے تھے۔ صرف ایک گتھی تھی جو حل ہونی تھی اور وہ ہو گئی۔ رب کریم کا شکر اس نے مجھے اپنے اس امتحان میں پورا اتارا اور مجھے سرخرو کر کے دشمن کو منہ کے بل گرایا۔ شارق نے مجھے دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کی اس کے بعد میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا کہ میں اسے قتل کر دوں۔

فہیم کی تصویر اب بھی ٹی وی پر موجود تھی، لیکن وہ خاموش تھا دینا کی حالت دیکھنے والی تھی اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ فہیم کی خاموشی پر اسے اور زیادہ وحشت ہو رہی تھی، لیکن اتنا کچھ کہنے کے باوجود وہ بھی جذباتی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے بولنا شروع کیا دینا کو لگا کہ وہ کسی گھرے کنویں سے بول رہا ہو۔

میں تمہارا مجرم ضرور ہوں، لیکن اپنے اس جرم پر شرمندہ نہیں۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ تمہارا واسطہ دیا، لیکن اس نے میرا مذاق اڑایا، میری اس مٹی

راتا تھا کہ اس نے ایک طوائف سے شادی کیوں لی۔ لیکن میں اس وقت نفرت کے گرداب سے نکل رہا تھا۔ میری اس سے ملاقات رائفل کے قید خانے میں ہوئی۔ وہ اس کا مجرم تھا، لیکن رائفل نے اسے ابھی تک نہیں مارا تھا۔ اسے میری نفرتوں کا اندازہ تھا۔ وہ یہ نہ مجھے پیش کرنا چاہتا تھا تاکہ میں اپنے ہاتھوں سے اس کو مار کر اپنی نفرت کی تسکین کر سکوں۔ لیکن میں نے اس کی جان بخشی کی ہدایت کی۔ اس نے میری بات تو مان لی اور اس کا آدھا کان کاٹ دیا گیا تاکہ اس کا آدھا کان اسے ہمیشہ اپنی شکست کی یاد دلاتا رہے۔ میرے سامنے وہ کھوئے ہوئے رشتوں کے مل جانے پر خوش ہوتا رہا، لیکن جیسے ہی قید خانے سے نکلا اپنی اوقات میں آگیا۔ اس کے لیے میں ایک طوائف زادہ تھا، لیکن ان تمام نفرتوں کے باوجود میں اس سے نفرت نہ کر سکا۔ تمہارے لیے جو میرے جذبات تھے ان کا گلا اس دن گھونٹ دیا تھا جب مجھے تمہارے شارق کے بارے میں جذبات کا پتہ چلا تھا۔ تم میرے بڑے بھائی کی منگیت تھیں اور میرا فرض بنتا تھا کہ میں تمہاری ان کی غیر موجودگی میں حفاظت کروں۔ میرا اور رائفل کا معاملہ تھا کہ وہ میرے ملک کے علاوہ ہر جگہ کارروائی کرے گا اور ممکن ہو تو میرے ملک میں ہونے والی کارروائیوں کی خبر گیری بھی کرے گا۔ وطن کی محبت میرے دل میں سب سے بڑی تھی۔ اس دوران مجھے رائفل نے کچھ ایسی کارروائیوں کی خبر دی جو اگر ظہور پذیر ہو جائیں تو میرا نقصان ہوتا۔ وہی اطلاع پہنچانے کے لیے میرا ان حلقوں سے رابطہ ہو گیا جن کے ذمے ملکی سلامتی کی بھاری ذمہ داری تھی۔ وہ میرے ماضی سے آگاہ تھے، لیکن میرے حال کو اس لیے فراموش کر دیا تھا کہ اس طرح میں ملک کی بہتر خدمت کر سکتا تھا۔ تم سے اچانک رخصت کی وجہ یہ تھی کہ مجھے رائفل پر اچانک قاتلانہ حملے کی اطلاع ملی تھی۔ وہ شاید موت سے پہلے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی دی ہوئی اطلاعات اگرچہ نامکمل تھیں، لیکن اتنی بولناک تھیں کہ میں بنا وقت ضائع کیے واپس آگیا۔ پھر اسی وقت تم

سے محبت کا مذاق اڑایا کہ مجبوراً ”مجھے یہ گولیاں اس کے سینے میں اتار لی ہیں۔“

اس زمین پر وہ میرا واحد رشتہ تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیا۔ تمہاری آنکھوں میں شک بھری نفرت میں دیکھ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ البتہ میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کر کے جا رہا ہوں۔ کہاں اس کا علم مجھے بھی نہیں۔ پہلے میں اپنے دوست کی قبر پر جاؤں گا۔ جس نے مرتے وقت بھی اپنا وعدہ نبھایا۔ اصغر مبارک سمیت کئی لوگ گرفتار ہو چکے ہیں اور اپنی زبانیں بھی کھول چکے ہیں۔ تمہارے یہاں سے گرفتار ہونے والا ان میں اہم ترین تھا۔ آئندہ کسی مشکل میں کرنل مسعود سے رابطہ کر سکتی ہو۔ وہ میرے بھی محسن ہیں۔

اللہ حافظ

اسکرین سادہ ہو گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا۔

فہیم نے تو اس خیال سے مجھ سے باتیں کی ہوں گی کہ مجھے کیسٹ صبح ملے گی۔ اس نے سوچا اور تیزی سے گھتھیاں سلجھانے لگی۔ عذر رائے کہا کہ آٹھ بجے کے بعد کیسٹ پہنچانی ہے اور فہیم نے کہا چار گھنٹے کا عرصہ گزر چکا ہو گا۔ اس کا مطلب وہ چار بجے کی فلاٹ سے جائے گا۔ اس نے گھبرا کر گھڑی دیکھی چار بجتے میں دس منٹ تھے۔ ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے ایر پورٹ انکوائری فون کیا۔

”آپ نے بہت دیر کر دی خاتون یہ بیرون ملک جانے والی آخری فلاٹ ہے۔“ وہ شخص خاصے خوش گوار موڈ میں بولا۔

”مجھے باہر نہیں جانا۔ اطلاع دینی ہے۔“

”کیسی اطلاع۔“ وہ تشویش سے بولا۔

”اس فلاٹ میں ہم موجود ہے جو ٹھیک پانچ بجے پھنسے گا جب طیارہ فضا میں ہو گا۔“

”آپ کون ہیں۔ کہاں سے بول رہی ہیں۔“ لیکن دوسری طرف فون بند ہو چکا تھا۔ دوسری طرف وینا ایر پورٹ کے لیے نکل چکی تھی۔ گاڑی میں چابی

لگی چھوڑ کر وہ کاؤنٹر تک آئی تھی۔ ایک بوکھلائی ہوئی لڑکی کو اپنی جانب آنا دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

”چار بجے والی فلاٹ۔“ اور وہ لڑکی سمجھ گئی۔

”جی آپ اطمینان رکھیں۔ سب مسافر خیریت سے ہیں۔“ لیکن وینا وہاں رکی نہیں تھی۔ لڑکی اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

وہ مسافروں کے تبصروں سے بے نیاز فہیم کو تلاش کر رہی تھی، لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ مایوس ہو چلی تھی جب کسی نے بتایا کہ کچھ مسافر لاؤنچ میں بھی بیٹھے ہیں۔ وہی ایک تاریک گوشے میں سر جھکائے فہیم بیٹھ

نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آئی۔ کسی کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے فہیم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک لمبے کو اس کے چہرے پر شوق کے سب رنگ بکھر گئے، لیکن پھر اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم یہاں۔ اس وقت۔“ وہ حیران تھا۔

”ہاں اس وقت۔ میں یہاں تمہیں دس مرتے ہوئے۔“ اس نے کہا تو دھنک کے رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔

”تم سے شکایت کرنے آئی ہوں۔“ اس نے محبت سے کہا۔ اپنے انداز پر وہ خود حیران تھی۔

فہیم نے کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ہر شکایت دور کرنے کو تیار ہے۔

”تم نے مجھے مجھنے میں غلطی کی تھی۔“ فہیم نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

”یہ مٹی تم پر فخر کرتی ہے۔ یہاں کے لوگ اگر یہ بات جان گئے تو تم پر فخر کریں گے۔ تم نے میرے بارے میں۔ میرے لوگوں کے بارے میں میری مٹی کے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں تم پر

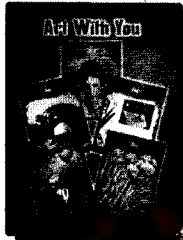
کیوں نہ فخر کروں میرے تم سے کئی رشتے ہیں۔ مٹی کا۔ خون کا اور۔۔۔ اوسے۔“ وہ رک گئی، لیکن رک کر بھی وہ سب کچھ کہہ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ مشرقی بیٹیوں کی

جب زبان لڑکھڑانے لگے تو ان کی آنکھیں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی سنہری

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of 6 Painting
Books in English



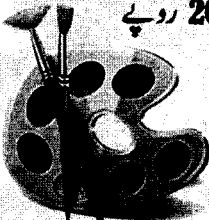
Art With You

کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

فی کتاب 150/- روپے

نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ
200/- روپے



بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہم والی اور بھوری آنکھوں والی اس کزن کو گلے سے لگائے، لیکن وہ اس ضمن کی روایات کی پاسداری رکھنا ہانا تھا۔

”آپ کہیں نہیں جائیں گے۔“ دینا نے خاموشی کے طویل وقفے کو توڑا۔

”آپ نہیں تم۔“ فہیم ہنس پڑا۔
”ہم لاہور جا رہے ہیں۔ ائی آپ سے مل کر نوش ہوں گی۔“

”اور امی کی بیٹی۔“ وہ خوشی سے بولا اور دینا شرما گئی۔

فہیم نے سوچا کہ وہ اسے کہہ دے کہ وہ امی سے مل چکا ہے، لیکن اس لیے خاموش رہا کہ جس حیثیت سے دینا ملواری بھی اس حیثیت سے نہیں ملا تھا۔

لندن کا ٹکٹ ٹکٹ کینسل کروانے اور لاہور کا ٹکٹ لینے کے بعد تک ان میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ وہ

بولنے سننے کی حقیقت سے نکل آئے تھے خاموشی باتیں کرنے لگی تھی۔ لاؤنج میں فلائٹ کا انتظار کرتے

دونوں متضاد سوچوں کا شکار تھے۔ فہیم اپنے ماضی کی ایک یاد کو گلے لگا کر خست کر رہا تھا اور دینا سوچ

رہی تھی کہ اپنی اور فہیم کی اس تصویر کو اٹاراج کروا کر اپنے بیڈ روم میں لگوا لے جس کے ذریعے شارق نے

اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی۔ فہیم کا ساتھ بھی تو اسی کی بدولت ملا تھا۔ فلائٹ کی انائنسمنٹ

ہوئی تو دونوں طیارے کی جانب بڑھ گئے۔ طیارہ اڑتے ہی فہیم ٹیک لگا کر سو گیا۔ اس نے خبریں دیکھنی شروع

کیں جس میں کل کی گرفتاریوں کی سسٹنی خیز خبر تھی۔ اللہ تیرا شکر تو نے میرے ملک کو ایک عظیم حادثے

سے محفوظ رکھ کر دشمن کے رانت کھٹے کیے یقیناً اس مٹی سے رشتہ بھی اس کا بہت پرانا تھا اس وقت کا جب

وہ گاؤں جاتی تھی۔ مٹی کا پیار سب سے عظیم تھا واقعی اس مٹی کی لالچ اس کے ایک ہم وطن نے بڑی محنت

سے قائم رکھی تھی اور دینا کو اس پر بے انتہا فخر تھا۔

☆ ☆

جرم ہے محبت

اجے ورما

ہر لڑکی بچپن میں بھولی اور معصوم ہوتی ہے ، جنوں جوں بڑی ہوتی سپنے بند لگتی ہے اور اکثر پھولوں کی خواہش میں کانٹے چنتی ہے اور عورت اپنی پہلے محبت نہیں بھولتی اور کبھی کبھی اس کا بڑا ہولناک نتیجہ نکلتا ہے۔

کھر کو بر باد کرنے والے ایک لڑکے کے نادانی

جھونپڑے میں جا چھپی تھیں۔
بنواری نے یہ آوازیں سنیں کہ کوئی لڑکی مدد لیے چیخ رہی ہے تو وہ اپنی سائیکل وہیں چھوڑ کر ندی آ طرف بھاگا۔ اس نے قریب جا کر پریتما کو دیکھا؛ ڈکیاں کھا رہی تھی۔ وہ چپل اتار کر ندی میں کود گیا۔ پھسل جانے کے سبب پریتما جھج جھج کر گرے پانی میں جا پڑی تھی اور ڈکیاں کھانے لگی تھی جھونپڑی میں چھپی لڑکیوں کو بھی احساس ہو گیا کہ پریتما ٹھیل؛ ٹھیل میں اپنی زندگی خطرے میں ڈال چکی ہے۔ اس کے چہرے اسی وجہ سے پیلے پڑ گئے تھے۔ انہوں۔ بنواری کو آتے دیکھ لیا تھا اس لیے انہیں یقین تھا پریتما جھج جائے گی۔ وہ سب اب ندی کنارے آ گھیں اور پریتما کو کنارے لانے والے بنواری طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پریتما کو کنارے لانے میں بنواری کو بڑی محنت پڑی تھی اسی لیے وہ ہانپ رہا تھا۔ پریتما کے نوجوان خدیں جسم کو جھیکے کپڑوں نے جسم سے چپک کر اور نمایاں کر دیا تھا۔ چند لمحے تو بنواری پریتما کو دیکھتا ہی پھر اسے کچھ خیال آ گیا اور وہ چونک اٹھا۔ دوسرے لمحے وہ ہلکی پھلکی پریتما کو پیروں کے بل ٹانگ کر کے پیٹ میں چلے گئے پانی کو نکالنے کی کوشش کر

اشوک ترویدی کی بہن پریتما نے جب لڑکیوں گوں کا ٹھیل کھیتے کھیتے جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تو گاؤں بھر کے نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ یہ اس کی زندگی کا سواہواں بسنت تھا۔ وہ اس کے باوجود اب بھی اپنی سیہیلوں کو لے کر کھیت کھلیاں نکل جاتی اور کافی دیر تک ان سے آنکھ پھولی کھیتی رہتی۔ اس کا بچپن ابھی گھیا نہیں تھا۔ ندی نالے میں من چلے ڈھنگ سے نہانا ابھی بھی اس کی عادت تھی۔

تب ہی ہولی کا رس رنگ بھرا تیوہار آپہنچا۔ پریتما اور اس کی سیہیلوں نے گاؤں کے نوجوانوں کو چھٹکانے کا پروگرام بنالیا۔ گاؤں کے تمام نوجوان تو ان سے ہار کر اپنی درگت کرا چکے تھے مگر بنواری انہیں نظر نہیں آیا تھا۔

شام کو جب سبھی سیہیلیاں ندی کنارے اپنے رنگ برنگے کچھڑے پٹے صاف کرنے میں جٹی تھیں تو اچانک پریتما کو بنواری آتا دکھائی دے گیا۔ اس نے سیہیلوں کو بتایا کہ کس طرح بنواری کو بے وقوف بنانا ہے پھر وہ کنارے ہی پر ندی میں ڈوبنے کا ٹانگ کرنے لگی۔

”بچاؤ۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔“ پریتما چیخنے لگی۔ اس کی سیہیلیاں قریب ہی پھوس کے بنے ایک

لگا۔ پیٹ سے پانی نکال دینے کے بعد بنواری نے پریتما کو زمین پر لٹا دیا۔ پھر کچھ ہی دیر میں پریتما کو ہوش آگیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کھولیں اور آس پاس نظریں دوڑائیں۔ سبھی سہیلیاں اسے گھیرے کھڑی تھیں۔ بنواری بھی پالی میں پورا بیٹھا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لمحہ بھر میں وہ منظر پریتما کی آنکھوں میں گھوم گیا جب وہ ندی میں ڈوب رہی تھی اور بنواری اسے ڈوبنے سے بچا رہا تھا۔

اب پریتما کے حواس پوری طرح ٹھکانے آچکے تھے اور وہ اٹھنا چاہ رہی تھی۔ بنواری یہ محسوس کرتے آگے بڑھا اور اسے سارا دے کر اٹھایا۔ سہیلیاں بھی اسے گھیر کر بیٹھ گئی تھیں۔
”کیسی ہو پریتما؟“ ایک سہیلی نے اس سے

پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ کافی ہمت کرنے کے بعد ہی پریتما بنواری کے سامنے بولنے میں کامیاب ہوئی۔ ”مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دو بنواری“ اس نے بنواری سے کہا۔

”معاف کر دوں۔“ بنواری حیرت سے بولا ”تم نے قصور کیا کیا ہے؟“

”میں نے تمہیں چھکانے کی سوچی تھی، پر خود ڈوب گئی۔ وہ تو کو تم نے مجھے بچالیا نہیں تو؟“ پھر پریتما اور اس کی سہیلیوں نے بنواری کو سب کچھ بتا دیا۔

سب کچھ سن کر بنواری کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ آگئی اور اس نے کہا ”تو یہ کہو اپنے بنائے



جال میں تم خود ہی پھنس گئیں۔ اب پھر کبھی ایسی شرارت تو نہ کرو گی؟“
 ”نابالبا!“ پریتما کان پکڑ کر بولی۔

بنواری نے پریتما کی جان کیا پچائی کہ اس کے من میں بنواری دیوتا بن کر داخل ہو گیا۔ بنواری جب بھی پریتما کے سامنے سے گزرنا، وہ اسے دیکھ کر کہیں کھوسی جاتی۔ بنواری بھی پریتما کے اس لگاؤ سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ بھی کسی نہ کسی طرح پریتما کے قریب آنا چاہتا تھا۔

ایک دن بنواری شہر سے لوٹ کر گاؤں آ رہا تھا۔ کانپور سے آنے والی پیٹنجر ٹرین اس روز لیٹ ہو گئی تھی۔ گاؤں کے قریب پہنچتے پہنچتے ہر طرف اندھیرا پھیلنے لگا۔ راستے ہی میں اسے پریتما نظر آ گئی۔ بنواری نے اسے آواز دی۔ ”پریتما! کہاں سے آ رہی ہو؟ ذرا رکو۔“

پریتما بنواری کی آواز پہچان کر رک گئی۔ پھر بولی ”گھر ہی چلوں گی۔ پڑوس کے گاؤں سے آ رہی ہوں۔ اندھیرا ہو گیا تھا اور رام لال چاچا کو اپنے گاؤں واپس جانا تھا اس لیے وہ مجھے یہیں تک چھوڑ کر لوٹ گئے۔“
 ”تو آؤ تھوڑا کہیں بیٹھ کر چلتے ہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے بنواری نے پریتما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پریتما کچھ بولی نہیں۔ بنواری کے ہاتھ کا لمس پا کر وہ کچھ کھوسی گئی اور پھر عام راستے سے ہٹ کر دوار ہر کے ایک کھیت کے کنارے جا پہنچے۔ کھیت کے درمیان ایک ہموار جگہ دیکھ کر بنواری نے اپنا تو لیا بچھا دیا اور بیٹھ گیا۔ پریتما بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ یہ پہلے پہلے پیار کا پہلا پہلا ملن تھا۔ دونوں جہاں اس ملن پر خوش تھے وہاں دونوں کے دل بھی زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

وہ دونوں ڈی دیر تک ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے اور محسوس کرتے رہے، پھر پریتما ہی نے خاموشی توڑ دی۔ ”بنواری! تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟“
 ”کیا بولوں؟“ بنواری نے یہ کہتے ہوئے پریتما کو

خود سے اور قریب کر لیا۔ پھر وہ بولا ”جو پیار کی کچھ بوندوں ہی کا پیسا ہوا ہے پورے کا پورا سا کر مل جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔“

”مریم کی پیاس تو میرے من میں بھی ہے بنواری!“ پریتما کی آواز خواب ناک سی تھی۔ ”تمہارا پیار کیسے پاؤں گی یہ سوچ ہی نہیں پاری تھی جس دن تم نے میری جان پچائی تھی اسی دن کے بعد سے میرا دل تم سے ملنے کو ترس رہا تھا۔“

ایسی ہی بھولی اور معصوم باتوں کے نشے میں وہ دونوں دیر تک بیٹھتے رہے۔ پھر جب اندھیرا گہرا ہو گیا اور بنواری کچھ زیادہ ہی بہکنے لگا تو پریتما سہم سی گئی۔

”اب۔۔۔ اب مجھے جانے دو بنواری؟“ پریتما نے خوف زدہ سی آواز میں کہا۔

”بس تھوڑی دیر اور۔“ بنواری کی نشیلی سی آواز ابھری۔

”نہیں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ پریتما کسمسہ لے گئی۔

”میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔“ بنواری کی آواز پریتما کو جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

جو ایک بار پیار کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے پھر نہیں ابھرتا۔ یہی حال پریتما اور بنواری کا تھا۔ پریتما کے مکان کا کچھلا کمر صرف مہمانوں کے لیے بنوایا گیا تھا۔ ایسے مہمان جن کا گھر کے اندر آنا جانا نہیں ہوتا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ پیچھے کھلتا تھا۔ پریتما اسی کمرے میں رات کو آ کر لیٹ جاتی۔ پھر وہ ایک خاص اشارہ کر کے اپنے پریمی بنواری کو بھی اسی کمرے میں بلا لیتی۔ پھر تو وہ کئی کئی گھنٹے ایک دوسرے سے اپنے اپنے من کی ان کہی باتیں کہتے سنتے رہتے۔

کہتے ہیں کہ عشق اور محبت چھپائے نہیں چھپتے۔ بنواری اور پریتما کی داستان محبت بنواری کے بڑے

بھائی رام سنہیہ کو بھی معلوم ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر بنواری کو کسی بہانے گاؤں سے باہر بھیج دیا جائے تو یہ معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ رام سنہیہ کے نزدیک یہ

جلد ہی پرہتما کی شادی کر دی جائے۔ اپنے اس فیصلے پر اشوک ترویدی نے عمل کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اس نے کانپور میں رہنے والے ایک نوجوان سے پرہتما کی شادی کر دی۔

شادی ہونے باوجود پرہتما کے دل سے بنواری کی محبت ختم نہ ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہو گیا۔ سسرال میں رہتے ہوئے بھی وہ بنواری سے ملنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال ہی لیتی تھی۔ ادھر یہ ہوا کہ اشوک ترویدی کو ملازمت مل گئی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر رائے بریلی چلا گیا۔ ہر چند کہ وہ اب رائے بریلی میں قیام پذیر تھا مگر بنواری اور پرہتما کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ ان دونوں کے تعلقات سے متعلق ہر خبر اسے ملتی رہتی تھی۔ یہ خبریں پہنچانے والا بنواری کا ایک دوست اور رازدار نارائن تھا۔ جب نارائن سے اشوک کو یہ معلوم ہوا کہ اب بھی بنواری نے اس کی بہن پرہتما کا پیچھا نہیں چھوڑا تو وہ سخت پیش میں آ گیا۔ اسی غصے میں ایک دن اس کی زبان سے یہ بات بھی نکل گئی کہ میں بنواری کو قتل کر دوں گا، چاہے مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے اس دن وہ اپنے گاؤں آیا ہوا تھا۔ پرہتما ان دنوں اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس نے بھائی کے خطرناک ارادوں کو محسوس کیا تو فکر مند ہو گئی۔ ایسی صورت میں بنواری کو اشوک کی طرف سے چونکارنے کی ضرورت تھی۔ پرہتما نے اسی خیال سے بنواری کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس نے وفا نبھانے کے عہد کے ساتھ ہی کئی جگہ خط میں صاف صاف لکھا تھا کہ بھیا سے ہوشیار رہنا ان کے ساتھ کبھی بھی کہیں اکیلے نہ جانا وغیرہ۔

یہ خط بنواری کو ملا تو وہ پرہتما کے بھائی کی طرف سے ہوشیار ہو گیا۔

انعام کی آگ میں جلنے والے اشوک ترویدی نے بنواری کو اپنے جال میں پھنسانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ بنواری اب چونکا ہوا چکا تھا۔ اس نے اب احتیاط کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے گاؤں جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ دیکھ کر اشوک نے

معاملہ کبھی بھی کوئی خطرناک نوعیت اختیار کر سکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچ کر اس نے بنواری کو کانپور کے ایک پریس میں کام سیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح دن میں اب ان دونوں کو ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور رات کے وقت بھی بنواری کا بھائی اس پر نظر رکھتا تھا۔ اس کے باوجود بنواری رات میں بھی بکھار پرہتما سے ملنے کا موقع نکال ہی لیتا تھا۔

بات کچھ اور پھیلی تو پرہتما کے بھائی اشوک ترویدی تک بھی پہنچ گئی۔ اشوک ترویدی ایک غیرت مند نوجوان تھا۔ پھر بھی اس نے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا اور بنواری ہی کی موجودگی میں اس کے بھائی رام سنہیہ سے شکایت کی۔ اس کے بعد بنواری کا روز اس کے گھر آنا جانا بند ہو گیا۔ رام سنہیہ نے اس کی سکونت کا بندوبست کانپور ہی میں کر دیا تھا مگر وہ وہ گاؤں میں ہو گا اور نہ پرہتما سے مل سکے گا۔ اب وہ ہفتے میں بس ایک بار سنبھری رات کو گاؤں آتا تھا۔ اس نے پرہتما سے راز و نیاز کی ایک اور راہ نکال لی تھی۔ اس نے پرہتما سے خط و کتاب شروع کر دی تھی۔ پرہتما اس کے محبت ناموں کا جواب دیتی تھی۔ بنواری کا ایک دوست شیام اس سلسلے میں اس سے تعاون کر رہا تھا۔ وہ باندی سے پرہتما کو بنواری کی خط پہنچاتا رہتا تھا۔ شیام بنواری کے ساتھ ہی شہر میں کام سیکھ رہا تھا۔ وہ روزانہ گاؤں جاتا تھا۔ اس کے ذریعے پرہتما محبت ناموں کے جواب بھیجا کرتی تھی۔ شیام نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود بھی پرہتما سے تعلقات استوار کر لیے تھے مگر اس کا علم بنواری کو نہیں تھا۔ شیام نے پرہتما سے کہا تھا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں راز کھول دوں گا۔ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے پرہتما مجبور ہو گئی تھی کیوں کہ ایک طرف تو وہ بنواری کو نہیں چھوڑ سکتی تھی دوسری طرف اپنے بھائی اشوک ترویدی سے وہ بہت ڈرتی تھی۔

پرہتما کے بھائی اشوک ترویدی نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ تمام احتیاطوں کے باوجود معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس نے سوچا کہ اب بس ایک ہی راستہ ہے کہ

پرتھما سے بھی مل لوں گا اور کسی کو اس ملاقات کی خبر
نہی نہ ہوگی۔

بنواری کے بڑے بھائی رام منہی کی سرسال
ایک گاؤں سیندور پور میں تھی۔ نارائن نے دوسرے
روز وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔

7 جنوری 85ء کی صبح بنواری اور نارائن، کلکٹر
سرج کے بس کے اڈے پر پہنچ گئے۔ سیندور پور، اناؤ
ضلع کا ایک گاؤں ہے جو فتح پور کی سرحد سے لگا ہوا
ہے۔ وہاں جانے کے لیے پہلے دو ندیاں پاندو اور گنگا پار
کرنا پڑتی ہیں۔ گنگا ندی پار کر کے لگاڑیاں ایک شخص
کشن کے پاس تھا جو کشتی کے ذریعے مسافروں کو دریا
پار کرتا تھا۔

دوپہر ہوتے ہوئے وہ دونوں سیندور پور گاؤں پہنچ
گئے۔ رام منہی کے سرسج تھا ایک ضروری کام
سے شہر (اناؤ) گئے ہوئے تھے۔ اس کی ساس گھر میں
ہی تھی۔ اپنے داماد کے چھوٹے بھائی اور اس کے چچا
کے بیٹے کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے بڑی
محبت سے دونوں کو کھانا کھلایا، پھر آرام کرنے کے لیے
ایک کمرے میں بھیج دیا۔

دوسرے دن 8 جنوری کی دوپہر کو آرام کرتے
کرتے چارپائی پر لیٹے ہوئے بنواری نے نارائن سے کہا
”آج تو میرا دل چاہ رہا ہے جی بھر کے سولوں۔“

نارائن معنی خیز انداز میں ہنس پڑا۔ پھر بولا ”میں نے
تمہیں پرتھما کے بارے میں بتایا تھا نا وہ آج کل قریبی
گاؤں میں آئی ہوئی ہے۔ یاد ہے نا تمہیں؟“

”ہاں ہاں یاد کیوں نہیں۔“ بنواری بے چین سا
ہو گیا اور لیٹے لیٹے ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”کیا وہاں
اس گاؤں میں تمہاری اس سے ملاقات ہوئی تھی؟“

”رسوں جب میں اپنے گاؤں گیا تھا تو خود پرتھما
نے مجھے بلا کر یہ بات کہی تھی۔“ نارائن نے جواب دیا
”وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ میں دیکھ بغیر اسے چین
نہیں آ رہا اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا تھا کہ دیکھو
بنواری سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ اس بار تو بہت دن
ہو گئے ہیں۔“

بنواری کے رازدار اور دوست نارائن کو اپنے منصوبے
میں شامل کر لیا۔ نارائن پہلے ہی اس سے ملا ہوا تھا۔
دوستی کے علاوہ بنواری اور نارائن کے درمیان رشتے
داری بھی تھی۔ نارائن، بنواری کے چچا کا بیٹا تھا۔
بنواری اسی لیے نارائن پر بڑا بھروسہ کرتا تھا۔ مگر یہ بات
اسے خبر نہیں تھی کہ خود نارائن بھی پرتھما کو چاہتا تھا
اور اس سے رقابت محسوس کرتا تھا۔ اگر بنواری
درمیان میں نہ آجاتا تو شاید وہ اپنی دانست میں پرتھما کو
حاصل کر لیتا۔ نارائن اس سلسلے میں پیش قدمی کرنے
ہی والا تھا کہ بنواری کی وجہ سے معاملہ اتنا بگڑ گیا کہ
پرتھما کے بھائی کو فوراً ہی اس کی شادی کرنا پڑی۔
نارائن اپنی ایک طرفہ محبت کی ناکامی کا سبب بنواری ہی
کو سمجھتا تھا اسی لیے وہ بنواری سے انتقام لینے کے لیے
پرتھما کے بھائی سے مل گیا۔

بنواری، کانپور کے ایک محلے رام پانچ میں رہتا تھا۔
نارائن منصوبے کے مطابق اس سے جا کر ملا۔ ادھر
ادھر کی باتوں کے بعد بنواری نے اس سے پوچھا ”اور
کو نارائن، کئی مہینے بعد ادھر کیسے بھول پڑے؟“

”بھول کیا پڑا خود آیا ہوں۔“ نارائن بولا ”کچھ
عرصے میں رائے بریلی میں رہا اس لیے نہیں آ سکا۔
اب کانپور آیا تو سوچا تم سے مل لوں۔ دراصل میرا ارادہ
تمہارے بڑے بھائی رام منہی کی سرسال جانے کا
ہے۔ بہت دن سے وہاں نہیں گیا۔ تم چلنا چاہو تو چلے
چلو میرے ساتھ، تمہاری محبوبہ پرتھما بھی ان دنوں
ایک قریبی رشتے داری میں وہیں ایک قریبی گاؤں میں
گئی ہوئی ہے۔“

پرتھما کے بارے میں نارائن سے یہ سن کر بنواری
کا محبت بھرا دل تڑپ اٹھا۔ اسے پرتھما سے ملنے کا
عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی
نارائن کے ساتھ بھیا کی سرسال ہو آؤں۔ اس طرح
شاید پرتھما سے ملاقات کا موقع مل جائے۔ پرتھما کئی
ماہ سے اپنے میکے میں تھی، مگر بنواری میں اتنی ہمت نہ
تھی کہ وہ پرتھما سے ملنے گاؤں کا رخ کر سکتا۔ وہ
سوچنے لگا کہ بھائی کی سرسال جانے کے بہانے میں

چلی گئی۔ جب اس نے بیگ کھولا تو اندر پڑا ہوا ایک بڑا سا گرامی وار رامپوری چاقو دیکھ کر کسی خیال سے وہ کانٹا اٹھی مگر کچھ بولی نہیں۔

بیگ میں شکر قندیاں رکھ کر وہ واپس آئی اور بنواری سے بولی ”تیس کو کتنی ہوں لالہ“ آج تم رک ہی جاؤ۔ شام ہونے والی ہے۔ راستے میں جنگل پڑتا ہے جہاں رات کے وقت خطرہ ہو سکتا ہے۔“

بنواری کا دل تو پریتما میں اٹکا ہوا تھا اس لیے اس نے اپنے بھائی کی ساس کے کہنے پر کوئی دھیان نہیں دیا اور بولا ”آپ اس کی فکر نہ کریں ماما جی! ہم دو ہیں، نارائن بھی تو میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں رات سے پہلے ہی گھر پہنچ جائیں گے۔“

اسے بہ ضد دیکھ کر رام سنہیہ کی ساس نے پھر کچھ نہ کہا۔ ان دونوں سے کچھ دیر رکنے کو کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور اپنے بیٹے کو در دھن سے بولی ”تم ان دونوں کو اپنے سامنے ندی پار کروا کر لوٹ آنا۔“

اس وقت دن کے ساڑھے تین بجے تھے۔ چلتے وقت جب نارائن اپنی جیکٹ بیگ سے نکالنے لگا تو اچانک بیگ کے اندر رکھا ہوا رامپوری چاقو نکل کر باہر گر پڑا۔ چاقو دیکھ کر گو در دھن نارائن سے پوچھ بیٹھا۔ ”یار نارائن، تمہیں اس چاقو کی کیا ضرورت آپڑی؟“

نارائن نے جواب دینے میں دیر نہیں کی، وہ بولا ”تم تو جانتے ہو آج کل زمانہ بہت خراب ہے۔ آدمی کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے لیے کچھ تو ہونا ہی چاہیے موقع پر یہ چاقو بھی بہت کام دے سکتا ہے۔“

پھر گو در دھن کچھ نہ بولا، مگر اس کے دل سے شک دور نہیں ہوا۔ بہر حال وہ بنواری اور نارائن کو ساتھ لیے گھر سے چل دیا۔ وہ تینوں ہی اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ اس لیے راستے میں کوئی کسی سے کچھ نہ بولا اور پھر وہ ندی کے کنارے آ پہنچے۔

کشن کی کشتی وہاں موجود تھی۔ گو در دھن نے ان دونوں کو کشتی میں بٹھایا اور خود کھیتوں کی طرف سے گزرتا ہوا گھر کی طرف لوٹ گیا۔

ادھر تو وہ لوگ روانہ ہوئے ادھر تین تاتھ گھر پہنچ گیا۔

یہ جان کر کہ پریتما اس سے ملنے کو بے چین ہے، رامی کے دل میں آتش عشق اور تیز ہو گئی۔ وہ بھی پریتما سے ملنے کو بے چین ہو گیا۔ اس نے نارائن سے کہا ”وہ گاؤں یہاں سے کتنی دور ہو گا؟“

”ارے بس ندی پار کرنے کے بعد سامنے وہی گاؤں دکھائی دیتا ہے۔“ نارائن نے جواب دیا ”اس گاؤں میں کچھ جان پہچان والے بھی ہیں۔ وہاں رات کو رک جا سکتا ہے۔ تم چاہو تو جہاں پریتما ٹھہری ہوئی ہے، رات کو وہیں رک جانا۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ وہ ممکن پکا بنا ہوا بھی ہے اور اس میں کئی کمرے بھی ہیں۔ تمہاری رات وہاں اچھی گزرے گی۔“

بنواری کا دل اب صرف پریتما میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ جلد سے جلد پریتما کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ”وہ کچھ سوچ کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے بھائی کی ساس سے کہہ رہا تھا ”ماما جی! اب ہم لوگ چلیں گے۔“

رام سنہیہ کی ساس بولی ”ارے لالہ ابھی کل ہی تو تم لوگ آئے ہو۔ آج چلنے کو کہہ رہے ہو دو ایک دن رک کر جانا۔ تب تک تمہارے چاچا جی بھی شہر سے لوٹ آئیں گے۔ ان سے بھی تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ اگر انہیں معلوم ہوا کہ تم آئے تھے اور میں نے جانے دیا تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گے۔ دیکھو نا روز کون اور کب آتا۔“

بنواری اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تیا تو دو ایک دن رکنے کے لیے ہی تھا، پر اب دھیان آیا کہ کل صبح ایک گاؤں کو ضروری سامان دینا ہے اسی لیے ماما جی میرا جانا ضروری ہے۔“

”مگر یہ بات ہے تب تو ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔ ”کچھ شکر قندری بھنی رکھی ہے، وہ میں تمہیں راستے کے لیے دے دیتی ہوں اپنا جھولا دے دو اس میں ڈال دوں۔“

بنواری کے پاس تو بیگ تھا نہیں۔ وہ نارائن کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ بھائی کی ساس سے کیا بات ہوئی ہے اس نے بنواری کو اپنا بیگ دے دیا۔ رام سنہیہ کی ساس بیگ لے کر گھر کے اندر دینی تھیں

ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تاپنے لگیں۔ وہ نارائن سے اپنا بازو چھڑا کر ایک طرف بھاگ اٹھا۔ نارائن تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اسے پکڑ لیا۔ بنواری نے حیرت سے اپنے چچا زاد کی طرف دیکھا۔ نارائن کی نظریں بھی اب اسے بدلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

”بنواری! اگر تم مجھ سے چھوٹ بھی گئے تو اشوک ترویدی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔“ نارائن بے رحمی سے ہنستے ہوئے بولا ”اس کی بہن کو تو تم نے کہیں کا نہیں رکھا۔ وہ بھی اب تمہیں کہیں کا نہیں رکھے گا۔“

اس وقت تک اشوک ترویدی بنواری کے بالکل قریب آ پہنچا تھا۔ پھر اس کا چاقو بنواری کے جسم میں گھساؤ بنانے لگا۔ بنواری چلاتے ہوئے اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا اور اشوک ترویدی اس کی فریادوں پر کان دھرے بغیر اس کے جسم کو چاقو سے گود رہا تھا۔ نارائن اسے پکڑے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے خون کے چھینٹے نارائن کے کپڑوں پر بھی پڑ رہے تھے۔

یہ سب کچھ ہندی کے کنارے سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہو رہا تھا۔ بیچ ہاتھ جب چندر کا کے ساتھ دوسرے کنارے پر کشتی سے اترا تو دور ہی سے اس نے وہ منظر دیکھ لیا۔

”پکڑو پکڑو!“ بیچ ہاتھ چیخا اٹھا۔ ”بھاگنے نہ پائے۔“ بیچ ہاتھ کی چیخ پکار سن کر لوگ اس طرف دوڑنے لگے جہاں وہ خطرناک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

اشوک اور نارائن نے جب لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ دونوں ہی بنواری کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بنواری لہو لہان زمین پر پڑا تھا۔

اشوک تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر نارائن راستہ بھول گیا۔ وہ راہ بھٹک کر پانڈو ہندی کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے خون سے سنے پکڑے دھوئے اور اپنے جسم پر لگا ہوا خون صاف کرنے کے لیے نہانے لگا۔ اسی دوران میں ایک شخص ہنسی لال ادھر سے گزرا تو اسے اس وقت نارائن کو ہندی میں نہاتے دیکھ کر ہڑا

وہ شہر سے واپس آ گیا تھا۔ بیچ ہاتھ کی بیوی نے اسے نارائن کے بیگ میں چاقو پائے جانے کے متعلق بتایا۔ یہ سن کر بیچ ہاتھ کو بھی تشویش ہوئی۔ اس نے سوچا کہ کہیں بنواری اور نارائن کے درمیان کوئی جھگڑا نہ چل رہا ہو۔ پھر وہ اپنے ایک پڑوسی چندر کا پر شلو کو ساتھ لے کر ان دونوں کو واپس بلانے کے لیے گھر سے چل دیا۔

اس دوران میں بنواری اور نارائن کشتی کے ذریعے دوسرے کنارے پر اتر چکے تھے۔ اب وہ دونوں ایک ریتیے میدان کو پار کر رہے تھے۔ راستے میں بنواری کو امروہوں کا ایک باغ نظر آیا تو اس کا جی لپکا گیا۔ نارائن نے بھی بنواری کے چہرے سے اندازہ کر لیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے ہنس کر کہا ”کیوں بنواری! کیا امروہ کھانے کو من کر رہا ہے؟ اور کچھ نہیں تو اپنی پریتما کے لیے امروہ ہی لے لو۔ اس پیغمبر کا مالک میری جان پہچان والا ہے۔“

بنواری فوراً ”راضی ہو گیا۔“ باغ میں ان دونوں نے امروہ کھانے اور اکٹھے کرنے میں تقریباً ”آدھا گھنٹا گزار دیا۔ اب شام کے پانچ بجنے والے تھے اور دھند لکا سا چھانے لگا تھا۔ باغ سے نکل کر وہ دونوں پھر آگے بڑھنے لگے۔

اچانک آگے بڑھتے ہوئے بنواری ایک دم چونک پڑا۔ اس نے ایک پتلے دبلے شخص کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ شخص ذرا اور قریب آیا تو اس کی لال لال چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بنواری جانے کیوں کانپ اٹھا۔ اس کے جسم میں ایک سرد لہری دوڑ گئی تھی۔ اس نے بھاگنے کے لیے پیچھے کی طرف دیکھا تو نارائن نے اس کا بازو تھام لیا۔

”ڈرتے کیوں ہو میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔“ نارائن نے اس سے کہا۔

آنے والا شخص پریتما کا بھائی اشوک ترویدی تھا اور بنواری نے اب اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ اب کافی قریب آچکا تھا اور اس نے اپنی جیب سے لمبے پھل والا چاقو نکال کر بھی کھول لیا تھا جب بنواری نے اسے چاقو نکال کر کھولتے دیکھا تو وہ اور بھی خوف زدہ

لہجہ ہوا۔ اس نے نارائن کو س جاڑے میں اور ایسے
الٹ نمائے پر ٹوکا بھی، مگر نارائن نے کوئی جواب نہ
دیا۔ وہ اس طرح نہاتا رہا جیسے اس نے ہنسی لال کی بات
سنی ہو۔ ہنسی لال آگے بڑھ گیا۔

ادھر جائے حادثہ پر پہنچ کر بیچ تاتھ اور چند رکائے
دیکھا کہ شدید زخموں اور زیادہ خون بہہ جانے کے
سبب بنواری دم توڑ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر بیچ تاتھ نے
چندر کا کو بنواری کے گھاؤں خبر کرنے بھیج دیا اور خود
بنواری کی لاش کے پاس بیٹھ کر اشوک بڑھنے لگا۔

وہ لوگ جو لاش کے پاس جمع ہو گئے تھے، کچھ دیر بعد
چلے گئے اور بیچ تاتھ وہاں اکیلا رہ گیا۔ چند رکاب جب کالی
دیر ہو جانے پر بھی واپس نہ آیا تو بیچ تاتھ نے اس
سنسان جگہ اکیلے رکنامناسب نہیں سمجھا۔ وہ بنواری
کی لاش کو وہیں اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے گھر چلا
گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے سب کو بنواری کے قتل سے
آگاہ کیا۔

دوسرے دن بیچ تاتھ صبح نو بجے محلے کے کچھ لوگوں
کو ساتھ لے کر جائے حادثہ پر پہنچ گیا اور بنواری کے
گھروالوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جب کالی دیر انتظار
کرتے گزر گئی تو اس نے کچھ لوگوں کو لاش کے پاس
چھوڑا اور خود قتل کی رپورٹ درج کرانے کلین پور
کے تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیچ تاتھ تھانے پہنچا تو معلوم ہوا کہ تھانے کا انچارج
ایک مقدمے کے سلسلے میں فتح پور پہنچ گیا ہوا تھا۔
جب وہ واپس آیا تو اس نے بڑی توجہ سے بیچ تاتھ کا بیان
سنا۔ پھر اس نے ہیڈ محرر کو رپورٹ لکھنے کا حکم دیا۔ اس
وقت تک شام کے چار بج چکے تھے۔

پولیس نے پنجایت نامہ بھرنے کے بعد بنواری کی
لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کا بندوبست کیا۔ پھر
مفروز قاتلوں کی تلاش میں پولیس نے مختلف جگہوں
پر چھاپے مارنا شروع کر دیے۔ بعد میں ملنے والی
اطلاعات کی روشنی میں پولیس نے نارائن کو گنگا کمری
ہی میں ایک جگہ دبوچ لیا، پھر اس کا بیان لے کر اسے
ذیل بھیج دیا۔

نارائن نے پولیس کے سامنے بیان دیتے ہوئے
اس قتل کی وجہ بیان کی۔ اس نے بتایا کہ مقتول بنواری
اور پریتما کے درمیان تعلقات تھے جنہیں پریتما کا
بھائی اشوک ترویدی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ
بنواری کا دشمن ہو گیا تھا۔ اشوک ترویدی نے اسی
سبب نارائن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور یہ کہ اشوک ہی
نے بنواری کو قتل کیا ہے۔

پولیس نے تمام کارروائی مکمل کر کے یہ کیس
عدالت میں پیش کر دیا۔
تفتیش کے دوران میں اشوک ترویدی نے خود کو
قطعی بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا
کہ جس روز بنواری کا قتل ہوا میں رائے بریلی میں
تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک ثبوت بھی پیش کیا کہ
اس دن وہ اپنے دفتر کی جانب سے سرکاری آؤٹ افسر
کے آفس میں تھا۔ اس ثبوت کے سبب پولیس نے
اشوک ترویدی کے متعلق فائل رپورٹ لگا دی اور
صرف نارائن کو ملزم گردان کر یہ معاملہ عدالت کے
سپر د کر دیا۔

پولیس کی اس کارروائی کے خلاف مقتول بنواری
کے بھائی رام سنہی نے فتح پور کے سی جے ایم کی
عدالت میں ایک درخواست دی۔ اس درخواست کے
ساتھ اس نے وہ محبت نامہ بھی منسلک کیا جو اشوک
ترویدی کی بہن پریتما نے بنواری کو لکھا تھا۔ یہ وہی
محبت نامہ تھا جس میں پریتما نے بنواری کو اپنے بھائی
کی طرف سے ہوشیار رہنے کے لیے لکھا تھا۔ اس
محبت نامے کے چند جملوں سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا
تھا کہ بنواری کی زندگی کو اشوک ترویدی کی طرف سے
خطرہ تھا۔

بنواری کے نام لکھے ہوئے خط کی عبارت یہ تھی۔
”جان سے بھی زیادہ عزیز، میرے پیارے! آپ کا خط
ملا۔ پڑھ کر آنسو بہنے لگے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ شاید
آپ نے مجھے بھلا دیا ہو گا، مگر آپ کے خط نے ساری
غلط فہمی دور کر دی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جیون بھر
ساتھ نبھائیں گے۔ گھر میں میری بڑی بری حالت

پہنچا تو اس نے بھی اشوک ترویدی کو شبہ سے کنبیا دہر طلب کر لیا۔

جب اشوک ترویدی عدالت کے حکم پر حاضر ہوا تو عدالت نے اسے قتل میں ایک فریق مانتے ہوئے جیل بھیجنے کا حکم دے دیا۔

سیشن جج کی عدالت میں دونوں ملزموں نے خود کو بے گناہ بتایا اور کہا کہ انہیں ذاتی دشمنی کے سبب قتل کے کیس میں پھنسا جا رہا ہے۔ نارائن کا کہنا تھا کہ مقتول بنواری کے قتل کی رپورٹ کرانے والے جج ناتھ کے خاندان ہی میں سے کسی نے بنواری کو قتل کیا ہے کیوں کہ بنواری کی بری عادتوں کو وہ لوگ ناپسند کرتے تھے۔ اپنے پہلے بیان سے وہ مکر گیا اور کہا کہ وہ بیان میں نے پولیس کے دباؤ میں آکر دیا تھا۔ مجھے پولیس خواہ مخواہ اس کیس میں پھنسا رہی ہے۔

اشوک ترویدی کا کہنا تھا کہ قتل والے دن وہ رائے بریلی میں آؤٹ افسر کے دفتر میں تھا اسے دشمنی کے سبب پھنسا جا رہا ہے۔

اس کیس سے متعلق تمام گواہوں کے بیانات بھی عدالت نے قلم بند کیے۔ ان میں لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر بھی شامل تھا اور وہ شخص جسی لال بھی جس نے نارائن کو کنویں میں نہاتے ہوئے ٹوکا تھا۔

عدالت نے جج ناتھ کے بیان کو صحیح تسلیم کیا اور اس سلسلے میں جو مزید گواہ پیش ہوئے ان کے بیانات کو بھی تسلیم کر لیا۔ بنواری کو جس جگہ قتل کیا گیا تھا وہ راستہ اس کے گاؤں کو بھی جاتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ وہ اپنے گاؤں واپس جا رہا تھا کہ راستے میں اسے قتل کر دیا گیا۔ دوم یہ کہ نارائن اسی علاقے میں پکڑا گیا تھا جہاں قتل ہوا تھا۔ اشوک ترویدی، عدالت کے دریافت کرنے پر بنواری کے خاندان سے اپنی دشمنی کا کوئی سبب بیان نہ کر سکا۔ قتل والے دن اشوک ترویدی آؤٹ افسر کے دفتر میں تھا اور یہ کہ وہاں سے واپس آکر وہ شام پانچ بجے تک اپنے دفتر میں تھا اس بات کے ثبوت میں اس نے اپنے دفتر کے کشمیر رام کو تار یا دو کو عدالت میں پیش کیا تھا۔ رام

ہے۔ کوئی میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ بہت زیادہ ہوشیار رہیں گے۔ بھیا اگر آپ سے ادھر ادھر چلنے کو کہیں تو ہرگز ان کے ساتھ نہ جائے گا۔ راستے میں بھی چوکنا ہو کر چلیے گا۔ آپ کی زندگی کو سخت خطرہ ہے۔ شام سے کہہ دیں کہ وہ آپ کا خط رات کے وقت پیچھے والے دروازے سے اندر گرا دے، مجھے مل جائے گا۔ مجھے اور آپ کو پھڑپھڑے بہت دن ہو گئے، ملنے کو بہت من کرتا ہے۔ ایک بار پھر لکھ رہی ہوں کہ راستے میں بہت ہوشیاری سے چلنا اور بھیا چاہے کچھ بھی کہیں ان کے ساتھ نہ جانا! میری اس بات پر خاص دھیان دینا! شام کو مسجد دینا کہ وہ کسی کو یہ بات بتائے نہیں۔ فقط آپ کی ڈارلنگ۔“

اپنی درخواست میں رام سنیہی نے لکھا تھا کہ پولیس اصل قاتل کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پولیس کے تفتیشی افسر کو یہ حق نہیں کہ وہ خود کسی مشتبہ شخص کو بے گناہ سمجھ کر چھوڑ دے۔ یہ کام عدالت کا ہے کہ وہ کسے بے گناہ اور کسے گناہ گار سمجھتی ہے اس لیے نامزد مشتبہ شخص اشوک ترویدی کو بغیر پس و پیش طلب کیا جائے۔

سی جے ایم وی کے جین نے اس درخواست کی روشنی میں تمام کیس کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اشوک ترویدی بھی اس کیس میں ایک فریق ہے۔ وی کے جین نے اپنے حکم نامے میں لکھا۔ ”یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اشوک ترویدی ولد منالال کی بہن پریتما سے بنواری لال کے تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے بنواری لال کا قتل ہوا۔ نارائن نے جو بیان دیا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اشوک ترویدی بھی اس معاملے میں ملوث ہے۔ ممکن ہے کہ اشوک ترویدی ہی نے بنواری لال کو چاقو مارے ہوں۔“

وی کے جین نے دفعہ تین سو چار کے تحت اشوک ترویدی کو طلب کیا اور جیل بھیج دیا۔

اس کارروائی کے بعد اشوک ترویدی نے ہائی کورٹ میں درخواست دے کر اپنی ضمانت کرائی۔ جب یہ معاملہ دوسرے مرحلے میں ضلع جج کے سامنے

کیا

میانہ روی

جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جان لازمی ہوگا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ، زمانے کا کچھ اعتبار نہیں کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو باہر سکو۔

☆.....☆

وہ اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔
وکیل صفائی نے آخر میں یہ بھی کہا کہ اس معاملے میں مقتول بنواری اور پربتھاکے تعلقات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی کے سبب بنواری کا قتل ہوا ہے۔
مقتول بنواری کے بھائی نے عدالت میں پربتھاکو جو خط پیش کیا تھا۔ اسے پربتھاکے اپنا لکھا ہوا خط ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے بنواری سے اپنے تعلقات کو غلط بتایا۔ اس نے بڑی دھڑائی سے کہا کہ بنواری سے میرے تعلقات نہیں تھے ظاہر ہے یہ بیان غلط تھا۔ وہ خط اسی کا ثابت ہوا۔ اس کی تحریر کو شناخت کر لیا گیا تھا۔

بالآخر عدالت اسی نتیجے پر پہنچی کہ مقتول بنواری سے قاتل اشوک ترویدی کے تعلقات تھے، قاتل نے انتقاماً بنواری لال کو قتل کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے نارائن کو بھی ساتھ ملا لیا تھا اس لیے نارائن بھی قتل میں برابر کا شریک تھا۔ عدالت نے ان دونوں ہی کو عمر قید کی سزا سنائی۔

اشوک ترویدی نے بنواری کو قتل تو کر دیا مگر اسے اس سے ملا کیا؟ یہی کہ وہ اپنی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار دے جیل سے باہر کی ہستی حقیقی زندگی میں وہ جب بھی لوٹ کر آئے گا تو یہ دنیا اس کے لیے بالکل بے معنی ہی رہ جائے گی۔

لہٰذا یاد دہانے اشوک کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔
اچھا بیان کے ثبوت میں اشوک ترویدی نے آؤٹ افسر کے خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی پیش کی تھی جس میں اسے واردات والے دن آؤٹ آفس میں طلب کیا گیا تھا۔ رام اوتار یاد نے یہ بھی کہا تھا کہ واردات والے دن، یعنی 8 جنوری کو چھٹی نہیں تھی۔ آؤٹ آفس اس روز بند نہیں تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ 8 جنوری کو تمام سرکاری دفاتر بند تھے کیوں کہ اس روز بارہ وفات کی چھٹی تھی۔ عدالت نے اس نکتے کو نظر انداز نہیں کیا اور کیلنڈر دیکھ کر اس بات کا یقین کر لیا کہ 8 جنوری کو واقعی بارہ وفات کی چھٹی تھی اس لیے اس دن اشوک ترویدی آؤٹ آفس نہیں جاسکتا تھا۔ جب عدالت نے اس سلسلے میں گواہ رام اوتار یاد سے جواب طلبی کی تو اس نے کہا کہ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ 8 جنوری کو چھٹی تھی یا نہیں ایک اور گواہ نے بیان دیا کہ بارہ وفات کی چھٹی لازمی نہیں تھی۔

عدالت نے ان دونوں گواہوں کے بیانات کو درست تسلیم نہیں کیا۔ آٹھ جنوری کو واقعی چھٹی تھی۔ اس کے بعد عدالت نے آؤٹ آفس کا اصل خط طلب کیا جس سے معلوم ہوا کہ خط کی سیاہی یکساں نہیں۔ آٹھ جنوری کسی اور سیاہی سے لکھا گیا تھا اور طرز تحریر بھی مختلف تھا۔ عدالت نے کہا ”اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عدالت کو فریب دینے کی خاطر ایسا کیا گیا ہے اور اس کا ذمہ دار اشوک ترویدی ہے کیوں کہ اسی نے اپنے بچاؤ میں آؤٹ افسر کے خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی عدالت میں پیش کی ہے۔“ عدالت نے مزید کہا ”سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشوک ترویدی نے یہ جعل سازی کیوں کی؟ تو عدالت کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اشوک ترویدی نے نارائن کے ساتھ مل کر بنواری کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ بعد میں اس نے اپنے منصوبے پر عمل بھی کیا۔ اس نے اس کیس سے ہٹنے کے لیے یہ جعل سازی کی تھی۔ اشوک ترویدی کی طرف سے اس سلسلے میں جو صفائی پیش کی گئی ہے،

بے وفامحے

انیل چاولہ

بے جوڑ شادیاں عموماً باعث گناہ ہوتی ہیں۔ اور ان انجام بھی بربادی ہی ہوتا ہے۔ ایک معصوم لڑکا جو نہ چاہتے ہوئے بھی گناہ کی دلدل میں پھنس گیا۔

فرسٹ ریشمنے کا شکار ایک عورت کا انجام

آج سے لگ بھگ چالیس برس پہلے کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ اب بھی یاد آجاتا ہے تو میں سر تپا کلب اٹھتا ہوں۔ اس وقت میں انسٹھ برس کا ہوں اور بڑھاپا سدا رہنے والے روگ کی طرح مجھے اپنے چنگل میں لے چکا ہے، مگر جن دنوں کا یہ ذکر ہے میری عمر صرف انیس برس تھی۔ ہمارا چل پردیش کی پہاڑیوں میں رہنے کے سبب میرا رنگ خوب نکھر ا ہوا تھا اور سارے جسم سے خون جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ میں بہت غریب تھا پھر بھی مجھے کھانے پینے کی کمی نہیں تھی، کیوں کہ میں جو گیندر نگر کے ایک بڑے رئیس بلد پور راج کے یہاں نوکری کرتا تھا۔ وہاں نوکروں تک کو عمدہ کھانا، دودھ، دہی، مکھن وغیرہ ملتا تھا۔

وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا جب بلیا کے بھانک کے سامنے مالک کی بی کار اگر رکی۔ میں سمجھا کہ بڑے مالک آئے ہیں، مگر جب بلی موچھوں والے ڈرائیور پر تپ سنگھ نے اگلی سیٹ سے اتر کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو اندر سے حسین مالک نے اپنا گورا گورا پاؤں آگے بڑھایا۔ میں نے سوچا کہ شاید ان کے پیچھے بڑے مالک بھی اتریں گے، یعنی ان کے شوہر، مگر نہیں، وہ اگلی تھیں۔ ان کے ساتھ گندی رنگ کی ٹالی نوکرائی چنبیلی بھی تھی۔

میں اس وقت بلیا کے اندر پھولوں کی ایک کیاری میں گڑائی کر رہا تھا۔ کار کو دیکھتے ہی میں نے گھبراہٹ

ایک طرف رکھ دیا اور بھانک کی جانب بڑھنے لگا۔ جب میں نے بھانک کھولا تو مالک، چنبیلی سے کہہ رہی تھیں۔ ”اچھا چنبیلی، تم اپنے گاؤں سے جلد لوٹ آنا، پانچ بجے مجھے واپس بھی جانا ہے۔“ یہ کہہ کر مالک نے اندر نرم رکھا۔

چنبیلی باہر ہی سے دوسری طرف چل دی۔ مالک نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا کندھوں پر ہلکے رنگ کی شال تھی۔ مالک کی نگاہ میری طرف اٹھی تو انہوں نے شیریں آواز میں پوچھا۔ ”کوہدو، کیا حال ہے؟“

میرا نام بدھو نہیں تھا میں اس وقت بھی مندرال تھا اور آج بھی مندرال ہوں۔ مالک نے مجھے خواہ مخوا بدھو کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مالک نہیں اس لیے میرے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ جانے کیوں کچھ دنوں سے وہ میرے ساتھ بہت بے تکلفی سے پیش آنے لگو تھیں۔ ان کا یہ سلوک میرے لیے ہر حال تعجب خیز تھا۔ چند لمحے رک میں نے دھیرے سے ان کے سوال کا جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں مالک!“

وہ رنگ گھٹیں اور اپنے کولے پر ہاتھ رکھ کر سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتی رہیں، پھر ازادوارانہ سے اندام میں بولیں۔ ”منا ہنا کٹا ہو کروں بھر تو بس ایک چھو۔ سے کھر پے سے گڑائی کرتا رہتا ہے۔ مجھ سے تو کما اور کام لیتا چاہیے۔“

کرنے لگا۔ کام کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ کئی بار بنگلیا کے برآمدے میں آئیں اور کچھ دیر بعد خود ہی لوٹ گئیں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر تقریباً "یون کھنٹے کے بعد مجھے ان کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہی تھیں۔" بدھوا! بدھوا!"

میں بھاگتا ہوا برآمدے تک پہنچا۔ برآمدے کے آگے چھوٹی سی راہداری تھی۔

مالکن کی آواز پھر آئی۔ "چلے آؤ!"

میں بڑھتا چلا گیا۔ راہداری کے دائیں بائیں کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں نے کھلے دروازے سے جان لیا کہ مالکن کس کمرے میں ہیں۔ کھلے دروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے کے اندر الماری کی آڑ میں مالکن کپڑے بدل رہی تھیں۔

"رک کیوں گئے! آجاؤ۔" انہوں نے آڑ میں ہونے کے باوجود غالباً "دروازے پر میری موجودگی کو

اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ مالکن غلط نہیں کستی تھیں، میں واقعی بدھو ہی تھا۔ میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ مالکن کا مقصد کیا تھا۔ میں بس چکرا کے رہ گیا۔ ساڑھی کے انچل کو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے سنبھالتی ہوئی وہ ایک قدم آگے بڑھیں پھر ٹھہر گئیں۔ "میں بنگلیا میں جا رہی ہوں۔" انہوں نے مڑ کر کہا۔ "تم آس پاس ہی رہنا، کیا خبر کب کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے مجھے۔"

یہ بگیا اور اس میں چھوٹی سی بنگلیا، مالک نے خاص طور پر اپنی بیوی کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ اس کی چاروں طرف اونچی پکی دیوار تھی۔ بنگلیا سے پھانک تک پھولوں کی کپڑیاں تھیں اور بنگلیا کے پچھواڑے دور تک پھیلی ہوئی بگیا تھی جس میں طرح طرح کے پھول اور پھل لگے ہوئے تھے۔ مالکن سیر و تفریح کی غرض سے مالک کے ساتھ یہاں آیا کرتی تھیں۔ مالکن بنگلیا کے اندر چلی گئیں۔ میں پھر گرائی



برے پھانک کی طرف سے مارن کی آواز سنائی دی۔
اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں وہاں سے ہٹ گیا
اور پچھواڑے کے دروازے سے باہر آگیا۔ میں
عمارت کے پہلو سے ہو کر سامنے والے حصے میں پہنچا تو
وہاں برتاپ سنگھ کو کھڑے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کچھ
پوچھنے کو تھا کہ اتنے میں مالکن آگئیں انہوں نے
برآمدے ہی سے اوچی آواز میں سوال کیا۔ ”تم سے
میں نے پانچ بجے تک آنے کو کہا تھا برتاپ سنگھ! ابھی
تین بجے ہیں۔“

”کالکا سے آپ کی بڑی بہن اپنے بچوں سمیت
آگئی ہیں۔ مالک نے کہا ہے فوراً ہی آپ کو لے
آؤں۔“ برتاپ سنگھ نے مالکن کو جواب دیا، پھر چلا
کیوں میری طرف گھور کر دیکھا۔ ڈیل ڈول میں وہ ک
پہلوان سے کم نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کی نظر
میرے آریار دیکھ رہی ہیں۔ وہ میری طرف گھور۔
ہوئے بھاری آواز میں بولا۔ ”چنبیلی سے کتنا کہ
فورا“ حویلی میں پہنچ جائے۔“

میں اپنی دانست میں فی الحال ایک بہت بڑا
مصیبت سے بچ گیا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ
میری مصیبت کی شروعات ہیں۔ اس کا اختتام کما
ہو گا یہ میں نہیں جانتا تھا۔
چار پانچ دن اور گزر گئے۔ اس عرصے میں مالک
وہاں نہیں آئیں۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جب
ان کی بڑی بہن مالک واپس نہیں چلی جاتی تب تک
بھی گھر سے نہ نکل سکیں گی۔

چھٹے روز جب میں شام کے وقت بنگلہ
برآمدے میں بیڑی بی رہا تھا تو پھانک کے سامنے پتھر
کار رکی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ظاہر ہے
وہ کار مالک ہی کی ہو سکتی تھی۔ اس میں صرف مالک
بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ سوچ کر میرا دل اور بھی گھبرا
عوماً ”مالکین دن ہی میں آیا کرتی تھیں مگر آج شا
آدھکی تھیں۔“

مالکن کے باہر نکلتے ہی مالک بھی ان کے پیچھے
سے اترے تو کچھ میری ڈھارس بندھی۔ میں بھاگ

محسوس کر لیا۔
”میں مالکن، میرے پاؤں بہت گندے ہیں
غلطیہ خراب ہو جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں ان
جانے خوف سے اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ ان کے
بست کہنے پر بھی میں اندر نہیں گیا اور کہا کہ یہیں سے
کام تیار ہے۔
اس پر مالکن غصے میں آکر بولیں۔ ”تم کہنا نہیں
مانتے۔ دیکھنا میں تمہاری کیسی گت بناتی ہوں۔ اچھا
جاؤ چائے بنا کر لاؤ۔“

میں لپک کر چھوٹے سے رسوئی گھر میں جا پہنچا۔
چائے بنانے میں میں نے بہت زیادہ وقت لگا دیا۔ اس
کی لاشعوری وجہ صرف یہ تھی کہ میں مالکن کا سامنا
کرتے ہوئے ڈر رہا تھا اسی دوران میں ایک بار پھر ان
کے چلانے کی آواز آئی۔ ”ارے بدھو کہاں مر گیا۔“
میں فوراً ”رے میں چائے کا سارا سامان رکھ کر ان
کے کمرے کی طرف لپکا۔ ان کے بگڑے تیور دیکھ کر
میں اس مرتبہ دوڑنے پر نہیں رکا۔
رے میں نے تپائی پر رکھی تو مالکن نے سخت لہجے
میں حکم دیا۔ ”اب پیالی میں چائے بناؤ۔“
میں نے چائے بنا کر پیالی ان کی طرف بڑھادی۔

انہوں نے ایک ہاتھ سے پیالی پکڑی اور دوسرے
سے میری کلائی تھامتے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھو بدھو، اگر
تم نے میرا کہنا نہیں مانا تو میں مالک سے کہہ دوں گی کہ
تم مجھ پر غلط نظر رکھتے ہو اگر انہیں یہ بات معلوم ہو گئی
تو وہ تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی کٹوا کر کتوں کو ڈال دیں
گے۔ اس لیے جو میں کہوں سو چپ چاپ کرتے
جاؤ۔“ اتنا کہہ کر وہ کمرے میں پیچھی ہوئی مسہری کی
طرف بڑھیں۔

میری ٹانگیں زور زور سے کانٹے لگیں اور مجھے لگا
کہ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑوں گا۔
مسہری پر نیم دراز مالکن میری حالت دیکھ کر مسکرا
دیں اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا
پل بھر کر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔
مجھے بچاؤ کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں

پھانک کے قریب پہنچا۔ مکن نے نظر اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ ان کے اس رویے سے مجھے دکھ ہونے کے بجائے خوشی کا احساس ہوا۔

مالک نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”پھلوں کی یہ ٹوکری اور نقن کیہڑ لے آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ بنگلیا کی طرف برہے اور میں سامان اٹھا کر ان کے پیچھے ہو گیا۔

وہ رات کے دس بجے تک تاش کھیلے رہے، پھر کھانا کھا کے کافی پی۔

بالغ کے کنارے نوکروں کے لیے کچھ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک میرے پاس تھی۔ میں کوٹھری میں گھس کر ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر لیٹ گیا اور سوئے لگا کہ آج بھلوان ہی نے میری حفاظت کی ہے۔ اگر تمہیں مالکن اکیلی آجائیں تو جانے میری کیا گت بنتی۔

رات کو جب میری آنکھ کھلی تو میں کوٹھری سے باہر نکلا میں نے دیکھا کہ بنگلے کے ایک کمرے کی جی جلی رہی تھی۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لیے میرے دل میں جستس پیدا ہوا کہ دیکھنا چاہیے معاملہ کیا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بیچوں میں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اندر شیٹوں پر پھولدار کانڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک کانڈ کا کنارہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ شاید وہاں سے کیل اکھڑ گئی تھی۔ میں وہاں سے کمرے کے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔

سارا کمرہ جگمگا رہا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا، میرے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ مالکن کے ہاتھ میں چڑے کا ایک ہنتر تھا۔ اور وہ مالک پر ہنتر ساری تھیں۔ مالک ان کے قدموں میں جھکے ہوئے تھے پھر مالکن نے ہنتر ایک طرف پھینک دیا اور پھر ہانپتے ہوئے بولیں۔

”بس اب میں بہت تھک چکی ہوں۔“

”لہذا بتا لیں!“ مالک کی عاجزانہ آواز ابھری۔

”نہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ مجھے مجھے معلوم ہے کہ یہ سب سب کچھ بے فائدہ ہے۔ تم نے آخر مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی۔ مجھے اپنی

بیوی بنا کر لانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔“ مالکن کی آواز میں دکھ بھی تھا اور احتجاج بھی۔

اچانک مالک اٹھ کھڑے ہوئے لمحہ بھر ہی میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اب ان کے چہرے سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ مالکن کو گھور رہے تھے۔ اچانک ان کے ہونٹ ہلے اور عصیلی آواز سنائی دی۔

”آج تم نے پھروہی بکواس شروع کر دی۔“

خوف کے سبب مجھے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کوٹھری کی طرف لوٹ آیا۔ کوٹھری میں آکر چارپائی پر لیٹنے کے باوجود میرا دل قابو میں نہیں تھا۔ میں اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ پھر مجھے بڑی دیر میں نیند آسکی۔

دوسرے دن صبح کی چائے پی کر مالک اور مالکن ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اپس چلے گئے۔

اس رات میں نے جو کچھ دیکھا تھا اسے بھول نہیں سکا۔ تین چار دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ مالک دورے پر چلے گئے ہیں۔ ایک دن پھر شام کے وقت مالکن وہاں آچنچیں۔ میں اس وقت بیکار میں پھولوں کو پانی دے رہا تھا۔ مالکن کے ساتھ چینی بھی تھی۔ اتنی دیر سے آنے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ مالکن رات کو بنگلیا میں رہیں گی۔

میرے قریب سے گزرتے ہوئے مالکن رک گئیں اور پھر مجھے میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”کوہد ہو کیا ہو رہا ہے؟“

”پھلوں کو پانی دے رہا ہوں مالکن!“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کافی غصے ہوتے جا رہے ہو تم پر کچھ دنوں تک مجھے کڑی نظر رکھنا پڑے گی۔ اگر میں تمہارے کام سے مطمئن نہ ہو سکی تو تمہیں یہاں سے کل پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔“ یہ کہہ کر مالکن بنگلیا کی طرف بڑھ گئیں۔

مالکن کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی چینی لمحہ بھر کو میرے قریب رکی اور آہستہ سے بولی۔ ”رات کو مالکن بنگلیا ہی میں رہیں گی۔ اگر آج بھی تم نے ان کی

خدمت کرنے میں کوئی کوتاہی کی تو تمہاری خیر نہیں۔“
پھر چنبیلی آگے بڑھ گئی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔
اس دھمکی پر میرا دل نور نور سے دھڑکنے لگا تھا۔
رات کو میں اپنی کوٹھری کے سامنے بنے ہوئے
چولے پر کھانا وغیرہ کا کرکھائی چکا تھا اور اب سونے کی
تیاری کر رہا تھا کہ مالکن نے میرا نام لے کر زور سے
آواز دی۔

میں بھاگا بھاگا بیٹنگا میں پنچا۔ مالکن کی خواب گاہ کا
دروازہ کھلا ہوا تھا۔ چنبیلی مجھے وہاں کہیں نظر نہیں
آئی۔ میں ڈرتا جھجکتا جب خواب گاہ کے دروازے پر
پنچا تو مالکن بولیں۔ ”نذر آجاؤ اور دروازہ بند کرتے
آنا۔“ ان کی آواز میں حکم تھا۔
”جج جج... مالکن؟“

”بدرہو!“ وہ اتنی زور سے چیخیں کہ میں اچھل پڑا۔
پھر اس گھبراہٹ میں، میں نے وہی کیا جو مالکن کا
حکم تھا۔

دوسرے دن میں در تک سوتا رہا۔ اگر چنبیلی مجھے
آکر گناہ دیتی تو شاید میں ابھی اور سوتا رہتا۔
”اُٹو بدھو! مالکن بلا رہی ہیں۔“ اس نے چیخ کر
کہا۔

میں مالکن کا نام سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چنبیلی
مجھے دیکھ کر ہنسنے لگی۔ میں بولا ”کیوں ہنسے جا رہی ہو؟“
”تمہارے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ دیکھ کر
ہنسی آرہی ہے۔“ وہ بولی۔ ”ارے مالکن تم سے بہت
خوش ہیں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔“

یہ سن کر میں جھینپ گیا اور شرم کے مارے میری
نظریں جھک گئیں۔ پھر میں چنبیلی کے ساتھ مالکن
کے پاس پہنچ گیا۔

انہوں نے چائے پیتے ہوئے مجھے اپنے برابر
صوفے پر بٹھایا اور چائے بھی پلائی۔ چنبیلی بھی ہمارے
ساتھ ہی تھی۔ مالکن کا رویہ میرے اور چنبیلی کے
ساتھ نوکروں ایسا نہیں تھا۔ وہ ہنس ہنس کر بڑی بے
تکلفی کے ساتھ ہم دونوں سے باتیں کر رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر گزر رہی تھی کہ چھانک کی طرف سے کار
کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ مالکن نے چنبیلی سے کہا۔
”تم چلو میں آتی ہوں۔“
لکنبیلی چلی گئی تو مالکن نے پانچ روپے کا ایک نوٹ
میرے ہاتھ میں بٹھایا۔
”یہ مالکن۔۔۔“
”رکھ لو۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس کے کچھ صاف
ستھرے کپڑے سلوا لیتا۔“

میں نے روپے رکھ لیے۔ ان دنوں پانچ روپے کافی
بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ مالکن، گیٹ کی طرف
بڑھیں، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ پر تپ سنگھ
نے مالکن کے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ جب
مالکن، کار میں سوار ہو رہی تھیں تو پر تپ سنگھ مجھے
گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پر تپ سنگھ کے پول دیکھنے سے
میرا دل بیٹھ گیا۔ اس کی لمبی اور گھنی موچھوں سے مجھے
بہت ڈر لگتا تھا۔

میری نیند کیوں کہ ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اس
لیے مالکن چلی گئیں تو میں پھر اپنی کوٹھری میں آکر سو گیا
اور گھنٹوں سویا رہا۔

اب میری زندگی کا ایک ایسا دور شروع ہو چکا تھا جسے
میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ ایک طرف تو مالکن کے
ساتھ گزرے ہوئے لمحات کا نشہ میرے ذہن پر سوار
تھا اور دوسری طرف دل میں یہ خوف بھی تھا کہ اگر یہ
راز کھل گیا تو کیا ہوگا؟ راز کھلنے کی صورت میں مجھے
اپنی زندگی بھی خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ مالکن نے مالک کو کیا پٹی پڑھائی
تھی وہ ہفتے میں تین چار بار اپنی شہری قیام گاہ سے ضرور
آتی تھیں اور رات کو رکتی تھیں۔ چنبیلی ان کے
ساتھ ہوتی تھی۔ مالکن کو اب اس کی اجازت بھی مل
گئی تھی کہ اگر مالک کے لیے دروازے پر جاسں تو وہ مجھے اور
چنبیلی کو اپنے ساتھ لے کر اپنی بہن کے گھر کا لکا جاسکتی
ہیں۔

کا لکا پہنچ کر ہم تینوں ان کی بہن کے گھر میں رہتے۔
ان کا دو منزلہ مکان تھا۔ مالکن کے بہنوئی بڑے

مسکرائیں ہی نظر آئیں، مگر میرا دل اکثر بے چین ہو جاتا تھا کہ نہ جانے کب کیا ہو جائے پھر ایک روز میرا یہ خوف حقیقت میں بدل گیا۔

اس رات میں بلیا والی بنگلہ کے ایک کمرے میں بالکن کے ساتھ موجود تھا۔ چینیلی کوٹھری میں سو رہی تھی۔ عموماً ہماری راتیں جاگتے ہی گزرتی تھیں بس کبھی کبھار ہی ہم پر نیند کا غلبہ ہو جاتا تھا اور ہم اٹھنے لگتے تھے۔ اس رات بھی ہم اٹھ رہے تھے کہ اچانک کوئی آہٹ پا کر میں چونک اٹھا۔ مجھے کسی کے قدموں کی واضح چاپ سنائی دے رہی تھی۔ وہ محض یقیناً برآمدے میں ٹھہل رہا تھا پھر قدموں کی چاپ برآمدے سے بنگلی کی دیوار کے ساتھ ساتھ اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ جہاں مالکن اور میں دونوں چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میرا سارا وجود جیسے میری سماعت بن گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی رات گئے عمارت کے باہر کون گھوم رہا تھا اور کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس کے قدموں کی چاپ کیوں رک گئی تھی؟ معاً کھڑکی پر دستک ہوئی تو میرے اعصاب جھجھکنا اٹھے میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مالکن بھی زور زور سے سانس لینے لگیں۔ ہم دونوں ہی دستک کے جواب میں خاموش رہے۔

پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے کھڑکی پر دستکیں دی جاتی رہیں۔

”دروازہ کھولو۔“ اچانک ایک بھاری آواز سنائی دی۔

میں وہ آواز سن کر چونک اٹھا۔ وہ برتاپ سنگھ کی آواز تھی۔ میں جواباً ”کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مالکن نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔“

”منڈلال!“ برتاپ سنگھ نے مجھے آواز دی، پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنے بدھو ہو۔ تم دوسرے لوگوں کو بدھو بن کر بے وقوف بنا سکتے ہو مگر میری آنکھوں میں دھول نہیں

سرکاری افسر تھے۔ انہیں ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ ہم نوکروں کی کوٹھریاں الگ تھیں۔ رات کے وقت سب تاش کھیلنے گیا رہ ساڑھے گیارہ بجے کھیل ختم ہوتا تو مالکن کے بہن اور بہنوئی سونے کے لیے اوپری منزل پر چلے جاتے۔ مالکن کچلی منزل پر سویا کرتی تھیں۔ جب عمارت کی تمام بتیاں بجھ جاتیں تو میں مالکن کے عظم کی تعیل میں ان کے کمرے میں پہنچ جاتا وہ مجھے اپنی منظر ہی ملتیں۔ پھر صبح چار بجے یا اس سے کچھ پہلے میں دیے پاؤں اپنی کوٹھری میں آکر سو جاتا۔ کالکا سے آگے شملے کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ وہاں سے شملے جانے کے لیے چھوٹی لائن کی گاڑی بھی چھوٹی ہے۔ مالکن اکثر مجھے اپنے ساتھ لے کر ان پہاڑیوں کی سیر کے لیے نکل جاتیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم ہنستے بولتے اور گپیں ہانکتے ہوئے گھومنا کرتے۔ اسی دوران میں مالکن نے مجھے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا۔

مالکن کا سلوک میرے ساتھ عجیب سا تھا۔ کبھی تو مجھے یہ محسوس ہوتا کہ وہ خود کو میری کینز تصور کرتی ہیں اور کبھی وہ مجھے بالکل اس طرح ڈانٹ دیتیں جیسے ایک معمولی نوکر کو ڈانٹا جاتا ہے۔ اس کے باوجود میری زندگی نہایت عیش و آرام اور سکون کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کھانے اور رہنے کے لیے اچھے سے اچھا ملتا، میسے بھی ملتے اور پھر مالکن کا قرب بھی۔ کبھی تو مالکن بلیا والی بنگلی میں راتیں گزارتیں اور کبھی جب مالک کچھ دن کے لیے دلی چلے جاتے تو ہم کالکا میں عیش کرتے۔

دھیرے دھیرے مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ دوسرے نوکر چاکر بھی مالکن اور میرے تعلقات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ چینیلی تو شروع ہی سے سب کچھ جانتی تھی، لیکن مجھے اس کی طرف سے زیادہ فکر نہیں تھی، صرف دوسرے نوکروں کا ڈر تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی مالک کے کان نہ بھر دے مالکن کے دھیسے سے قطعی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ انہیں بھی اس سلسلے میں کوئی تشویش یا فکر ہے وہ ہمیشہ باغ و بہار ہی نظر آتیں۔ ان کے حسین ہونٹوں پر ہمیشہ مجھے

جھونک سکتے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہاں کیا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً دروازہ کھول دو۔“

مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ پرتاب سنگھ کی بڑی بڑی نوکیلی اور گھنی مونچھیں میری آنکھوں میں گھوم رہی تھیں۔ اس کے حکم کو نظر انداز کر دینا میرے بس میں نہیں تھا۔

میں کانپتا ہوا اٹھا ہی تھا کہ مالکن نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر انہوں نے دوبارہ مجھے اپنے قریب بٹھا کر سرگوشی کی۔ ”خبردار! دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس خاموش بیٹھے رہو اس کی دھمکیوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود اس سے نمٹ لوں گی۔“

مجھے نہیں معلوم کہ مالکن بھی میری طرح اندر سے خوف زدہ تھیں یا واقعی انہیں پرتاب سنگھ کی کوئی فکر نہیں تھی حقیقت جو بھی ہو مگر انہوں نے میری ہمت ضرور بندھائی۔

”مگر مالکن، اس سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے؟“ میں نے بہ مشکل کہا۔ میری آواز بھی مدھم تھی۔

”دروست۔“ انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ”جب ہم کوئی جواب نہیں دیں گے تو وہ خود ہی مایوس ہو کر لوٹ جائے گا۔ کل دن میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

مالکن کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ کچھ ہی دیر کے بعد پرتاب سنگھ واپس چلا آیا۔ میں نے اس کے قدموں کی دور ہوتی چاپ واضح طور پر سن لی تھی۔

دوسرے دن صبح میرے ہوش گم تھے۔ پرتاب سنگھ کار لے کر آیا تو میں ایک کمر عمارت کے پیچھے چھپ گیا۔ وہیں سے چھپ کر میں نے دیکھا کہ مالکن بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ قدم اٹھاتی ہوئیں کار تک پہنچیں۔ پرتاب سنگھ نے حسب معمول ان کے لیے کار کا پھیلا دروازہ کھول دیا۔ مالکن چنبیلی کے ساتھ کار

میں بیٹھ کئیں اور پھر اگلے ہی لمحے کار آگے بڑھ گئی۔ اس واقعے کے بعد میں خوف زدہ سا رہنے لگا کہ جانے اب کیا ہو گا؟ پرتاب سنگھ نہ جانے کیا گل کھلائے گا؟ ہر دم مجھے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پرتاب سنگھ مالک کو اس راز سے آگاہ نہ کر دے، اگر ایسا ہو گیا تو پھر شاید میں زندہ نہیں بچوں گا۔

پھر ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود بھی کچھ نہ ہوا تو میری فکر قدرے کم ہونے لگی۔ دل سنبھلنے لگا۔ اسی طرح جب پورا ایک مہینہ ہو گیا تو میرے ذہن سے فکر کے بادل چھٹ گئے۔ میں نے سوچا کہ یقیناً ”مالکن نے معاملے کو کسی طرح سنبھال لیا ہے۔ ایک ماہ کے بعد مالکن نے دوبارہ آنا جانا شروع کر دیا۔ میں نے پرتاب سنگھ کے بارے میں مالکن سے پوچھا تو وہ بات کو بالائے نگین اور کہا کہ تمہیں اس کے متعلق کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ جو ہوا اسے بھول جاؤ اب ایسا پھر نہیں ہو گا۔ مالکن کی بات سن کر میں کسی قدر مطمئن تو ہو گیا، مگر اس کے باوجود پرتاب سنگھ کے سامنے آتے ہوئے مجھے اب بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ میں تو پہلے ہی اس سے ڈرتا تھا اور ابھی تو نظر ملانے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

زندگی پھر اپنے ڈھرے پر چلنے لگی۔ مجھے اسی دوران میں مالکن سے معلوم ہوا کہ مالک پھر آٹھ دس دن کے لیے دلی جا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے شوہر نے انہیں کالا جانے کی اجازت دے دی ہے۔ مالک کو یہ بات معلوم ہی تھی کہ میں اور چنبیلی، مالکن کے ساتھ ہی جاتے ہیں۔ میری توقع کے خلاف مالک نے مجھے مالکن کے ساتھ جانے سے روکا تھا اور نہ کوئی اعتراض کیا تھا۔

ہم تینوں ایک بار پھر کالا جانے۔ اس مرتبہ وہاں مالکن کے ہسٹون کے چھوٹے بھائی راکیش بھی موجود تھے۔ وہ تیس چوبیس سال کے ایک وجیہ نوجوان تھے۔ مجھے ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بمبئی میں ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں۔

میں نے تین چار ہی دن میں یہ بات محسوس کر لی کہ

کبھی حق بات کے لیے کوشش نہ کرنا اور نہ میں تمہارے
دل کے سارے کیرے بھانڈوں کی۔“
مالکن کی اس ڈانٹ پھنکار پر مجھے بھی سخت غصہ
آیا، پھر بھی میں اپنا غصہ پی گیا کیوں کہ ان کے الفاظ
کڑے ضرور تھے مگر انہوں نے جو کچھ کہا تھا، سچ تھا۔
کچھ دیر بعد مالکن مجھ سے پھر مخاطب ہوئیں۔
”جاؤ اپنی کوٹھری میں جا کر سو جاؤ۔“

میں چپ چاپ اپنی کوٹھری میں چلا آیا، مگر مجھے نیند
نہیں آئی۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی کہ کوشش
کے باوجود میری آنکھ نہیں ٹپک رہی تھی۔ جب
کرو میں بدلتے بدلتے میرا جسم کھٹکے لگا تو اسی اضطراب
کے عالم میں کوٹھری سے نکل کر میں باہر ٹپکتے لگا۔ مجھے
ٹپکتے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے
ایک سائے کو اوپری منزل کی سیڑھیوں سے اتر کر ایک
طرف جاتے دیکھا۔ میں چونک اٹھا کہ یہ کون ہو سکتا
ہے اور یہ کہ وہ اس وقت کہاں جا رہا ہے؟ ”معا“ میرے
ذہن میں راکیش بابو کا خیال آیا اور پھر جیسے ساری بات
میری سمجھ میں آئی۔ کچھ ہی دیر بعد اپنے خیال کی
تصدیق کے لیے میں دبے پاؤں اس طرف بڑھا جہاں
مالکن سوئی تھیں۔

پھر جب میں واپس اپنی کوٹھری کی طرف لوٹ رہا تھا
تو میرے قدم بہت بو بھل تھے۔ میرا خیال درست
ثابت ہوا تھا۔ اپنی کوٹھری میں اگر جب میں چارپائی پر
لیٹا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے نیچے دھتے ہوئے
انگارے نیچے ہوں۔ مالکن کتنے گھٹیا اور بہت کروار کی
عورت ہیں، کتنی بیچ ہیں یہی سب کچھ سوچتے سوچتے
جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے اندازہ نہیں کہ میں کب تک سوتا رہا۔ بس
اچانک ہی میری نیند اچٹ گئی تھی۔ میری نیند اچٹنے کا
سبب تیز چٹخیں تھیں۔ نیند سے بو بھل ذہن کے سبب
کچھ دیر میں یہی سمجھتا رہا کہ کوئی بھیا نک خواب دیکھ رہا
ہوں، لیکن جب وہ چٹخیں مسلسل سنائی دیتی رہیں تو میں
ایک دم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں تیزی کے ساتھ اپنی کوٹھری سے نکلا تو ہر طرف

مالکن اور راکیش ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نظروں
سے دیکھنے لگے ہیں۔ اس خیال سے کہ مالکن اور
راکیش باہر ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں،
میرے دل میں رقابت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ کبھی کبھی
میں بھی سوچتا کہ شاید یہ میرا وہم ہے ایسے معاملات
میں عموماً خواہ بھی آدمی شک کرنے لگتا ہے۔ میں نے
دل ہی دل میں سوچا کہ اگر واقعی یہ میرا وہم ہے تو جلد
یہ حقیقت سامنے آجائے گی۔

پانچویں روز رات کو حسب معمول مالکن، ان کی
بہنوئی اور راکیش بابو تقریباً ”گیارہ بجے تک“ تاش
کھیل رہے۔ اس کے بعد سب سونے کے لیے اٹھ
کھڑے ہوئے۔ مالکن کے بہنوئی اور ان کی بہن
اپنی منزل پر سونے چلے گئے۔ انہی کے ساتھ راکیش
بہو بھی تھے۔ ان دونوں کچھ گرمی تھی اس لیے مالکن
نے اپنا پلنگ کمرے کے باہر پر آدے میں پھونک لیا اور
وہاں پر دراز ہو گئیں۔ اب بتیال بچھ چکی تھیں اور ہر
طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ سب
ک تاش کھیل رہے تھے تو میں کسی نہ کسی بہانے ان
کے کمرے میں جھانک لیتا تھا۔ کھیلنے کے دوران میں
مالکن اور راکیش بابو کے درمیان چھیڑ چھاڑ جاری
رہتی۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے
بول رہے تھے۔ یہ سب مجھے بہت برا لگا۔ اب
مجھے یقین ہو چلا تھا کہ مالکن اور راکیش بابو کے
رہان کوئی نہ کوئی چکر ضرور چل رہا ہے۔ یہی سبب تھا
اس رات جب میں مالکن کے کمرے پر ان کے پاس
ٹپکاتے جذبہ رقابت پر قابو نہ رکھ سکا۔

”مالکن! شاید راکیش بابو آپ پر ٹوہور ہے ہیں۔“
میں نے کہا۔

”کچھ بدھو، جب پاؤں کی دھول سر کے بالوں تک
پھیلے گئے تو بہت برا لگتا ہے۔“ ان کے لہجے میں
”من“ طنز اور غصہ بھی کچھ تھا۔ ”تمہیں اپنی اوقات
میں بھولنا چاہیے! میں تمہاری بیوی نہیں ہوں اور
تمہاری کینئر ہوں۔ ہمارے تعلقات جو بھی ہوں تم
میں میرے نوکر ہو اور میں تمہاری ماتم مجھ پر

افرا تفری سی نظر آئی۔ پھر مجھے چنبیلی کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ ”یہ بدھو کی لاش ہے۔ یقیناً“ یہ اسی کی لاش ہے۔“

اب کچھ کچھ صبح اجالا پھیل گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گھر کے دو نوکر اسی برآمدے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں جہاں مالکن سوئی ہوئی تھیں۔ میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ میں زندہ سلامت اپنی کوٹھری کے باہر کھڑا ہوں اور چنبیلی میری موت کا اعلان کر رہی ہے۔ آخر وہ یہ بکواس کیوں کر رہی ہے یہی سوچ کر اور حقیقت حال جاننے کی خاطر میں بھی برآمدے کی طرف لڑکا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی چنبیلی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں اور آگے بڑھا تو مجھے ایک ایسا بھیانک منظر نظر آیا کہ دہشت کے سبب میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ برآمدے میں بچے چوڑے پلنگ پر دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن کے سر غائب تھے۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ دیواروں پر خون کے دھبے اور چھینٹے نظر آرہے تھے۔

میری سمجھ میں اب آیا کہ چنبیلی چلا چلا کر کیوں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ لاش میری تھی۔

چنبیلی اب وہاں موجود سب لوگوں کو یہ بتا رہی تھی کہ وہ دونوں لاشیں سب سے پہلے اسی نے دیکھی تھیں۔ صبح ہی صبح مالکن چائے پینے کی عادی تھیں۔ چنبیلی ان کے لیے چائے بنا کر رہی لاتی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ایسا ہولناک منظر دیکھا کہ اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ گئی۔

میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ چنبیلی نے میرے بارے میں چیخ چیخ کر جو کچھ کہا تھا یا تو کسی نے بیٹ کے زراثر سنا نہیں یا سنا تو اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔

گھر کے سب افراد اب تک لاشوں کے پاس کھڑے کھڑے عالم میں کھڑے تھے۔ ایسا دہشت انگیز منظر شاید انہوں نے زندگی بھر نہیں دیکھا ہوگا۔ ان کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کے دماغ سن ہو کر رہ گئے تھے۔

فوراً ہی پولیس کو مطلع کیا گیا۔ آدھے گھنٹے میں

پولیس کے دو افسر سایہوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ آتے ہی انہوں نے تفتیش شروع کر دی۔ یہ تو جلد معلوم ہو گیا کہ وہ لاشیں کن افراد کی ہیں مگر سوالات ایسے تھے جن کے جواب پولیس کے پاس نہیں تھے۔ ان دونوں کو کس نے قتل کیا؟ قتل کا سبب کیا تھا؟ پھر یہ کہ کئے ہوئے سر کہاں اور کیوں غائب کر دیے گئے؟

میرے دل میں چور تھا۔ پولیس الگ تفتیش کر رہی تھی اور میں الگ پریشان تھا۔ میری بھوک پیاس کم ہو چکی تھی اور نیند بھی جیسے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ نہ تو کچھ کھانے پینے کو جی چاہتا تھا اور نہ رات بھر کوٹھ میں بدلنے کے باوجود نیند آتی تھی۔ ڈر خوف تھا کہ کہیں قتل کا الزام مجھ پر نہ لگ جائے! خوف کی وجہ یہ تھی کہ چنبیلی، مالکن سے میرے تعلقات کے بارے میں بہ خوبی واقف تھی۔ اس علاوہ یہ کہ پر تپ سنگھ کو بھی مجھ پر شک تھا۔ مجھ پر ایسے یہ الزام لگ سکتا تھا کہ میں نے رقابت کے زریعہ راکیش بابو اور مالکن کو قتل کر دیا۔ وہ دونوں لاشیں انہی کی تھیں جن کی اب شناخت ہو چکی تھی۔ اب تک تو کسی نے اس طرح کی بات نہیں کی تھی! کہ باوجود میں اندر رہی اندر سہما ہوا تھا۔

اس واقعے کے تیسرے دن مالکن کا کتا ہوا سراپا گڑھے میں پڑا ہوا مل گیا۔ راکیش بابو کا سر ڈلی چاب والی ریل گاڑی کی پٹری پر کالکا سے دس گیارہ میل دوری پر ملا۔ یہ ایک اور نیا معما تھا۔

اس دہرے قتل کی خبر سارے کالکا میں پھیل گئی اسی دوران میں پولیس کو ایک ایسا پکا سراغ مل گیا کہ میرے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو گیا۔

جس مکان میں قتل ہوا تھا اس سے تقریباً دو فرلانگ کی دوری پر چائے کی ایک دکان تھی۔ دکاندار نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا کہ قتل رات ساڑھے تین بجے کے قریب اس کی دکان پر آدی آئے۔ لمبی نوکلی اور گھنی مونچھوں والے ایک دراز قد شخص نے آگے بڑھ کر چائے کا آرڈر دیا۔

نہیں کوئی اور تھا۔

جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا، اس کا علم تو مجھے بعد میں ہوا کیوں کہ پرتاب سنگھ کے بیان کے بعد فوری طور پر میری گرفتاری عمل میں آگئی تھی۔

نولیس کے سامنے میں نے کسی بات سے انکار نہیں کیا اور روز اول تا آخر تمام واقعات جس طرح پیش آئے تھے بیان کر دیے۔

قتل کے الزام میں پانچ آدمیوں کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا، یعنی ہمارے مالک، پرتاب سنگھ، کلو اور اس کے دونوں ساتھی، مالک نے اپنے لیے بڑے بڑے وکیلوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ انہی وکیلوں میں سے ایک نے عدالت میں یہ دلیل پیش کی کہ اپنی بیوی کی بے وفائی کے بارے میں جان کر مالک کو ایک دم ایسا ذہنی دھچکا لگا کہ وہ برداشت نہ کر سکے۔ اسی سبب وہ برے بھلے کی تیز کھو بیٹھے اور انہوں نے طیش میں آکر ایک غلط قدم اٹھا لیا۔ ان کا وکیل یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وقتی جوش میں ان سے یہ عمل سرزد ہو گیا ورنہ ان کی نیت اپنی بیوی کو قتل کرانے کی نہیں تھی۔

عدالت نے وکیل کی یہ دلیل تسلیم نہیں کی۔ عدالت کے نزدیک یہ معاملہ وقتی جوش کا نہ تھا اور نہ ہی فوری طور پر یہ کارروائی عمل میں آئی۔ اپنی بیوی اور نوکر کے تعلقات کا علم ہونے کے بعد کئی ہفتے تک وہ قتل کا منصوبہ بناتے رہے۔

پرتاب سنگھ، اقبال جرم کر چکا تھا۔ کلو اور اس کے ساتھیوں نے جھوٹی کمائیاں سنائیں کہ وہ اس رات کا کا میں نہیں تھے، مگر وہ اپنا یہ دعو ثابت نہیں کر سکے۔ نتیجتاً "عدالت نے ان پانچوں کو پھانسی کی سزا سنائی۔ پھر ہائی کورٹ میں بھی ان کی اپیل خارج ہو گئی۔ مجرم تو پھانسی پا گئے، مگر میں آج تک اپنے بڑھاپے میں بھی اس سنسنی خیز واقعے کے بارے میں سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔



ساتھوں والے کے تینوں ساتھی ذرا پیچھے ہٹ کر لہڑے رہے۔ چائے والے نے ان تینوں کے کپڑوں سے چھینٹے دیئے جو خون کے لگتے تھے، مگر وہ ان لوگوں سے کچھ بولا نہیں۔ مونچھوں والا چائے پینے کے دوران میں اپنے ساتھیوں سے "کا کا سے دلی جانے والی زمین کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ چائے کی وہ دکان لہوں کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی تھی اس لیے رات بھر کھلی رہتی تھی۔

پھر پولیس کو اس نتیجے تک پہنچنا بھی زیادہ مشکل نہ ہوا کہ اس دہرے قتل میں مقتولہ کے شوہر کا ہاتھ بھی ہر سکتا ہے۔

اگلے ہی روز شام کو دلی میں ہمارے مالک بلدیہ راج اور پرتاب سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے پولیس کی پانچ سوچے بڑے صاف صاف انکار کر دیا کہ اس دہرے قتل سے ان کا کوئی تعلق ہے، مگر جب چائے والے نے پرتاب سنگھ کو پہچان لیا تو اسے زبان کھولنا ہی پڑی۔ وہ مونچھوں والا پرتاب سنگھ ہی تھا جسے چائے والے نے قتل کی رات دیکھا تھا۔

پرتاب سنگھ نے سب سے پہلے میرا نام لیتے ہوئے کہا کہ مالکن کا اپنے معمولی نوکر نند لال سے عشق چل رہا تھا۔ مالک کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ جس طرح بھی ہو اس بیچ نوکر کو ختم کرنا ہو گا کیوں کہ وہ ان کے خاندان کی عزت سے کھیل رہا ہے۔ لک اپنی بد کردار بیوی سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔

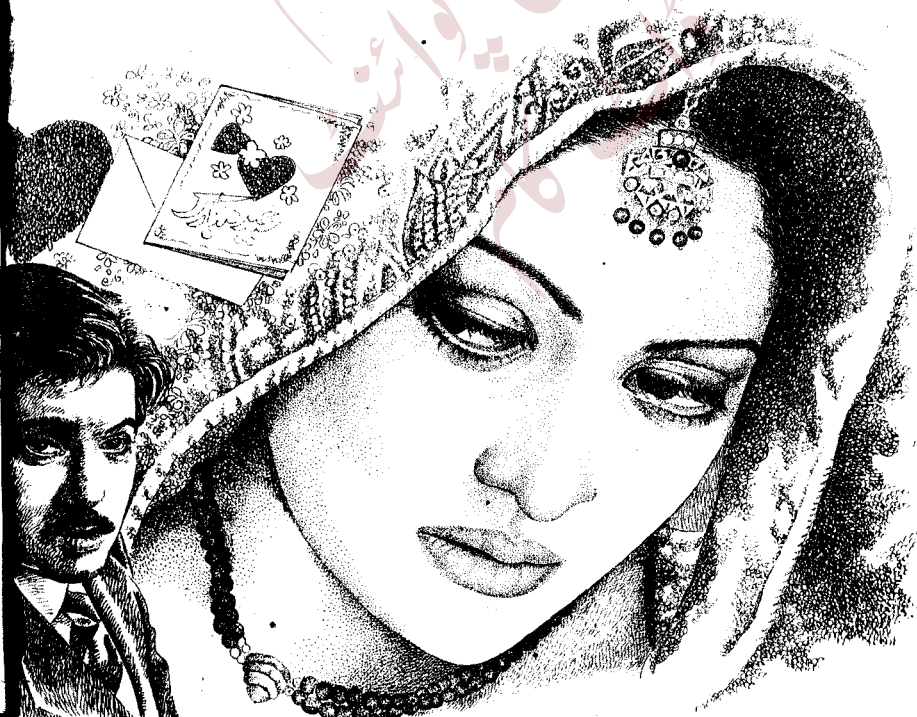
پھر پرتاب سنگھ نے اسی مقصد کے حصول کی خاطر بس بدنام غنڈے کلو کو اپنے ساتھ ملایا اور اسے مالک سے بھاری رقم دلوائی۔ اس کے بعد کلو، پرتاب سنگھ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کا کا پہنچ گیا۔ اس طرح وہ ل۔ منصوبے کے مطابق مکان کے اندر داخل ہوئے۔ پھر انہوں نے مالکن اور ان کے ساتھ موجود مہم کو قتل کر دیا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ انہوں نے لہن کے ساتھ جھگی کو قتل کیا ہے، اندھیرے، ہڑونگ، ہلدی میں وہ پہچان نہ پائے کہ مالکن کے ساتھ میں

صدائے سحر

بسمی سلمان

لالچ سے ذلت حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مال و دولت بچھوہیں جب تک ان کا منتریا نہ ہو ہاتھ مت ڈالو صد انسان زہر سے ہلاک ہو جائے گا۔ منتریہ ہے کہ ان کا دخل حلال سے ہو اور خرچ حق سے۔

انسان کا پیٹ صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے جب تک زندہ رہتا ہے کسی نہ کسی لالچ میں لگا رہتا ہے





تفصیلات جاننے اور سوالات کرنے کا نہیں تھا۔
”استاد مکرم۔ میں حکیم صاحب کو یہاں لے آتا ہوں۔“

نور الدین نے ان کو اپنے ہاتھوں سے منع کیا۔
”پہلے میرے تنکے کے نیچے سے چابی نکال۔ یہ الماری کھول اور اس میں سے کانڈ نکال دیکھ لال رنگ کی ایک فائل ہوگی۔“
”یہ کیا ہے حضور۔“ انہوں نے فائل نکال کر کانڈ دیکھا۔

”قدرت۔ اس مردود کے غاصبانہ عزائم کو ناکام بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تو مسجد اور مدرسے کا انتظام اور انصرام سنبھال لے۔ یہ ایک قانونی دستاویز ہیں، مختار نامہ۔ میں بقا کی ہوش و ہواس قدرت اللہ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔“
”جانشین۔ گستاخی معاف۔ استاد مکرم مسجد اللہ کا گھر ہے کوئی سلطنت نہیں۔“

نور الدین نے اس کی ایک نہ سنی اور مسجد اور مدرسے کے تمام امور میں کمال اختیارات تفویض کیے۔ ”اس پر میرے دستخط بھی ہیں اور یہ تحریر میں نے خود لکھی ہے۔ گواہ اپنے قاضی صاحب سیکریٹری مسجد کمیٹی ہیں اور حاجی صاحب ممبر۔ اس پر گزشتہ دن کی تاریخ ڈال دے۔“

استاد اور پیرو مرشد کے حکم سے روگردانی گناہ تھا، لیکن قدرت اللہ کو اس پر گزشتہ دن کی تاریخ ڈالنا جرم لگا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے حضور۔“

”ضرورت ہے قدرت۔ لا مجھے دے کانڈ۔ میں اپنے ہاتھ اور روشنائی سے گزشتہ تاریخ ڈال دوں۔ کسی کو شک نہیں ہو سکتا، تحریر پرانی ہے، تجھے یاد ہے کہ جب میں پچھلے سال حج پر گیا تھا تو تو نے ہی سارا انتظام سنبھالا تھا۔“ انہوں نے تاریخ ڈال کر مختار نامہ مولوی قدرت اللہ کو پکڑا دیا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

سننے میں اٹھنے والی درد کی لہر نے انہیں ہوش سے بیگانہ کر دیا۔ قدرت اللہ روتے ہوئے بڑے حکیم صاحب کو بلانے کے لیے دوڑے۔ سڑک پر آتے ہی

نور الدین ستر سال کی عمر میں بھی خوش خوراک تھے اور صحت مندی ان کی پہلوانوں جیسے ذیل ڈول سے عیاں تھی۔ مولانا کا نظام، ہضم مرغن غذاؤں کے اس انبار کو بطریق احسن ٹھکانے لگانے کا عادی تھا جو اس کے گنبد شکم میں ہر روز جمع ہو جاتا تھا اور انہیں کبھی سوائے نزلہ زکام کے کسی بیماری میں دوا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

تقریب نصف شب کے بعد جاری رہی تھی، مگر مولانا نور الدین وہاں سے طعام کے فوراً بعد ہی اٹھ آئے تھے۔ دو گھنٹے ان کی طبیعت مالش کرنے لگی اور وہ گھبراہٹ محسوس کرنے لگے۔ خدا کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر یہ نوجوان مولانا نور الدین کو چٹلم کی فاتحہ خوانی کے لیے مدعو نہ کرتا تو ان کے پاس مولوی قدرت اللہ کو بلانے کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ اتنی بڑی مسجد کا پیش امام ہونے کے باوجود انہیں فون کی سہولت میسر نہ تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر مولوی قدرت اللہ بدحواس ہو گئے۔ ”پیرو مرشد۔ میری جان آپ پر قربان۔ آپ نے مجھے کیوں نہیں بلایا۔“

”قدرت۔ وقت کم ہے۔ دم واپسی کی راہ پر ہے۔“

قدرت اللہ پر رقت طاری ہونے لگی۔ ”حضور، ایسا مت کہیں۔ میں آپ کو قبلہ بڑے حکیم صاحب کے پاس لے چلا ہوں۔“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شاید اس کے لیے میرے پاس وقت نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔“

”یہ کیا فرما رہے ہیں آپ۔“ قدرت اللہ دم بخود رہ گئے۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”کون ہے وہ مردود۔ جنہی۔“

اس کے ذہن میں کئی نام آئے تھے۔ جب نور الدین نے ان ہی میں سے ایک کا نام دیا تو مولوی قدرت اللہ کو بالکل حیرت نہیں ہوئی تاہم یہ وقت

نہ سہی کل۔ کیونکہ ان کی خوراک آج بھی وہی ہوگی جو پچاس سال پہلے تھی۔ دو دو گھنٹے بعد دے کر دیکھ لیں صبح تک۔ سو روپے نکالیں۔“ حکیم صاحب نے شربت کی ایک شیشی اور تین پڑیاں ان کو تھادیں۔ ”سو روپے۔“

”اٹھی رات کو چگیا آپ نے۔ اگر کسی اسپیشلسٹ کے پاس جاتے تو ایک ہزار سے کم نہ لیتا۔ میں کیا دو روپے والا حکیم ہوں۔“ مولوی قدرت اللہ نے سو کا نوٹ نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔ یہ دراصل یہ ان کو نیند سے جگانے کی سزا تھی۔ ورنہ وہ مطلب میں کسی مریض سے سو روپے مانگتے تو لوگ ان کی طرف کا رخ نہ کرتے۔

”مولانا کا ہاضمہ اکثر خراب رہنے لگا ہے۔“ مولوی صاحب نے اپنے دل کی نشانی کے لیے پوچھا۔ حکیم صاحب طنزہ منکرانے تھے۔ ”ملا جی جتنا رزق اللہ نے لکھ دیا ہے اس سے زیادہ کھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ممکن نہیں۔ اس عمر میں ویسے بھی سب کچھ بے کار ہو جاتا ہے۔ ہاضمے سے داغ تک۔ اپنے استاد سے کہیں بس اپنے ہاتھ کھینچ لیں۔ ورنہ ہاتھ دھو لیں گے زندگی سے۔ اپنے اعضائے رئیسہ پر ہی رحم کھائیں لواحقین تو ہیں نہیں۔“

”گویا پرہیز کریں۔ کیا نوش فرمائیں فی الحال۔“ مولوی صاحب بد مزہ اور ناخوش ہوئے۔

”بشرطیکہ زندگی سے سادہ غذا بنائیں اور ترجیحاً“ اہلی ہوئی۔ موسمی پھل اور پتی دال کے ساتھ چاول۔ اگر زندگی عزیز ہے۔ خود کھی فرماتے چاہیں تو مرغ برانی“ قورے اور حلوے کا معمول جاری رکھیں۔ فی الحال کچھ بھی نہیں۔“

مولوی قدرت اللہ نے اس انداز گفتگو کو سخت ناپسند کیا، مگر قبلہ بڑے حکیم صاحب کے ہاتھ میں شفا تھی اور مولانا نور الدین نورانی کسی اور معالج سے مطمئن نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کی دو اکوڑ سے زیادہ کڑوی کسمبلی باتیں سننے بنا چاہہ نہ تھا۔ پھر بھی کسی

ان کو ایک رکشہ مل گیا۔ رکشہ والا ان کی گریہ زاری سے متاثر ہو کر حکیم صاحب کے ہاں جانے کو راضی ہو گیا۔ حالانکہ وہ ایک فساد زدہ کھلانے والی بستی میں رہتے تھے۔ فی الحال جہاں عارضی امن کا ماحول تھا وہاں بڑکیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور گلیاں تاریک تھیں۔

عام طور پر رات کو سرکاری گاڑی میں گشت کرنے والے کسی بھی شخص کو چپک کرنے کے بہانے روک لیتے اور اس کی جیب خالی کروا لیتے، لیکن ایک باریش بزرگ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو خود ان کی سفارش بن گئے تھے، مگر افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ حکیم صاحب نے مولوی صاحب کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

”کمال کرتے ہیں ملا صاحب میں تو سمجھا تھا کہ آپ خود مریض ہیں اور تکلیف سے رو رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا تو واپس کیسے آؤں گا۔“ ”وہ میرے پیرو مرشد ہیں ان کی حالت زاب۔“ ”بھئی ہوگی ان کی حالت قابل زار، لیکن اتنی بڑی داڑھی کے ساتھ رونا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ رضائے الہی پر صبر کرنا لازم ہے۔ اگر آپ اسی رکشہ پر ڈال کر مریض کو لے آتے تو بہتر ہوتا۔“ ”لیکن نقاہت کے سبب وہ چل نہیں سکتے تھے۔ وہ بے ہوش تھے۔“

”آپ مجھے حال بتائیے، میں دوا سکتا ہوں۔ ساتھ نہیں جاسکتا مناسب ہوگا کہ آپ انہیں فوراً“ اسپتال لے چلیں۔ اگر واپسی پر وہ آپ کو زندہ ملیں۔“ ”نصیب و شتمناں۔ ان کو کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ ان کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔“ مولوی قدرت اللہ نے گہرا کر کہا۔

”تاہم۔ عمر کیا ہے ان کی۔“ حکیم صاحب نے طنز سے کہا۔

”ماشاء اللہ ستر برس کے ہیں۔“ ”مخاورے کی حد تک دعا جائز ہے مولوی صاحب ورنہ ابدی زندگی کی دعا کرنا۔ دل کا دورہ پڑنا ہی تھا۔ آج

رکشا اشارت کیا۔ ”نہ کوئی عالم نہ کوئی باعمل۔ اب دیکھ لو کیا ہو رہا ہے اسلام کے نام پر۔ صرف خون خرابہ اور کون ان کو آپس میں لڑوا رہا ہے۔ یہی مولوی تھے۔“

”یہ جھوٹ اور پروپیگنڈہ ہے بھائی۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔“

”مطلوہ کھاتے وقت ہو جاتی ہیں۔“ رکشے والا ہنسا۔ مولوی صاحب کو بڑی سبکی ہوئی۔ مگر یہ پہلا تجربہ نہیں تھا۔ اس معاشرے کی نزول پذیر اخلاقی حالت کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوئی تھی جنہوں نے مولویوں کے خلاف لپیٹے بنا کر ان کو قابلِ تمسخر مشہور کر دیا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہر روز ایسا کیا گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں دین کی راہ دکھانے والے لوگوں کے دلوں پر راج نہ کرنے لگیں۔ اس خوف سے کہ کہیں رعایا کو کلمہ حق نہ سکھا دیں اور ان کو حق کا سامنا کرنا پڑے۔ انہوں نے عالم دین کو حلوے اور حجرے تک محدود کر دیا۔ سیاست کو دین سے بالاتر کرنے کے لیے ایسا ہی سلسلہ عصر حاضر میں زیادہ شدت سے جاری ہے۔

بے شک اس صف میں کچھ وظیفہ خوار اور مفسد بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مگر اس سے مجموعی طور پر دنیا کو دین دکھانے والے اور خود دین بدنام ہو رہا ہے۔ علماء مولانا مولوی اور ملا ہو گئے ہیں۔ جب خوفِ آخرت نہ ہو تو آخرت کی بات کرنے والوں کا احترام کون کرے۔

”وہ گھر بیٹے تو استاد جی پر نیم غنودگی طاری تھی۔ ان کی حالت تشویش ناک تھی۔ وہ زیر لب کچھ کہہ رہے تھے۔ جو مولوی قدرت کی سمجھ میں نہ آیا۔ انہوں نے مولانا کو اپنے ہاتھوں کے سہارے اٹھایا اور اللہ کا نام لے کر دو اکی ایک خوراک رات دو بجے دی۔ پھر وہ ان کے سرہانے بیٹھ کر سورۃ ہسین پڑھتے رہے۔ چار بجے دو اکی دو سری خوراک دینے سے بھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ نماز فجر کے وقت ان کو تیسری خوراک دے کر مولوی صاحب نے ان کو اسپتال لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔“

خدا داد صلاحیت سے خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ زبان سے دکھ پہنچانا یقیناً ”ناپسندیدہ عادت تھی۔ دروغ بر گردن راوی۔ سنا ہے ان کی مرحومہ کے مرتبے پر فائز ہونے یا کی جانے والی زوجہ اول انتہائی سخت گیر تھیں۔ اور حکیم صاحب ہر وقت الزام و دشنام سے ہی مشغول رہتے تھے۔ بلکہ عالم غیظ و غضب میں دست درازی پر بھی اتر آتی تھیں۔ حکیم صاحب کے مزاج کی ساری کٹھن انہی کی عنایت کردہ تھی جو مجبور مریضوں پر غبار بن کر نکلتی تھی۔ مولوی قدرت اللہ پھر رکشا میں بیٹھ گئے۔ انہیں استاد محترم کی طرف سے سخت تشویش لاحق ہو رہی تھی اور اپنی کوتاہی پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان کو بے ہوشی کی حالت میں اکملا چھوڑ آئے۔ ان پر لازم تھا کہ کسی شاگرد کو ان کی خبر گیری کے لیے بلا لیں۔

شاید یہ ممکن نہیں تھا۔ طبقہ اشرافیہ کی اس پوش آبادی میں واقع ایک مسجد کے پیش امام کو ایسے خدمت گزار سعادت مند اور فرماں بردار شاگرد کہاں میسر تھے۔ جو ان سے قرآن پڑھتے تھے۔ ان کی کوٹھیوں کے چوکیدار کی منت سماجت کر کے بھی شرمندگی ہی ہوتا تھی۔

رکشا اشارت ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس کا لیور کھینچتے کھینچتے ڈرائیور ہانپنے لگا تھا۔ بالاخر اس نے سیٹ ہٹا کر انجن کا پلگ نکالا اور اسے سخت تار سے کھرپنے لگا۔

”سب تقدیر کے کھیل ہیں مولوی ہے کہ نہیں۔ ایک آپ لوگ ہیں مولوی صاحب کہ اللہ بن مانگے پلاؤ زردہ دیتا ہے اور جمعرات کے حلوے کھا کر بد ہضمی ہو جاتی ہے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ دال روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ دیکھ لو اس وقت بھی کہاں جھک مار رہے ہیں۔ مزے کرتے اگر کسی مسجد میں پیش امام ہوتے۔“

مولوی قدرت اللہ نے اس جاہل سے الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ ”اس کے لیے عالم باعمل ہونا لازمی ہے۔“ ”اے چھوٹو ملا جی۔“ اس نے ایک دھماکے سے

”سب اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔“
 ”وہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن انسان کو سب کچھ اس پر چھوڑ کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ یہی تو خرابی ہے آپ لوگوں کے عقیدے میں۔ جو کرے گا اللہ کرے گا۔ رزق بھی دے گا۔ اولاد بھی دے گا۔ صحت بھی دے گا۔ بس اس پر تکیہ کر کے بیٹھ جاؤ، خود کچھ مت کرو اللہ نے آخر عقل اور ہاتھ پاؤں کس لیے دیے ہیں۔“
 ”جی۔ میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“

”پھر مجھے بتائیں۔ یہ نوبت کیسے آئی۔ یہ سب کیا ایک دن میں ہو گیا۔ آپ نے کبھی بلڈ پریشر چیک کروایا۔ شوگر چیک کروائی۔ کولیسٹرول لیول دیکھا۔ کچھ پتا نہیں۔ صبح شام وہی ترمال، مرغ، غذا، میا، زندر، فورمہ بریائی۔ ہارٹ ایک تو ہو گا ہی۔ اور پھر یہاں آئے ہیں آٹھ گھنٹے بعد۔ آٹھ منٹ بھی بہت ہوتے ہیں ایسے مریض کے لیے مولانا۔“

”میں دوا لیا تھا قبلہ بڑے حکیم سے۔“
 ”کون حکیم صاحب۔ وہ جس کے واہیات اشتہارات دیوار پر نظر آتے ہیں۔ آپ اتنی لمبی دواڑھی رکھ کر پھر رہے ہیں، کیا آپ عقل سے پیدل ہیں۔“
 ”ڈاکٹر نے پین غصے سے میری پرچھا اور بولے۔“
 ”دراصل مولانا انہی سے علاج کرواتے ہیں۔“

انہوں نے ڈاکٹر کی ہر بات کو نظر انداز کیا۔
 ”تو پھر لے جائیں ان کو انہی کے پاس۔ اگر وہ برین ہیجوج کا علاج کر سکتے ہیں، اپنی دوا سے تو ٹھیک ہے، ورنہ انتظار کریں۔“ ڈاکٹر نے انہماکی بے عزتی کرنے کے بعد کہا۔

”انتظار۔ کس بات کا۔“
 ”یہی کہ ان کی مشکل کب آسان کرتا ہے۔ ابھی دو چار دن ان کو آئی سی یو میں رکھیں گے۔ لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ چانس کوئی نہیں۔“
 ”آپ کا مطلب کیا ہے۔“ قدرت اللہ کا دل ڈوبنے لگا۔

”یہ کوما میں ہیں اور کوما میں ہی رہیں گے۔“
 ”کب تک۔“ قدرت اللہ نے ٹھوک ٹٹکا۔

مولانا نور الدین قریب و جوار کے آٹھ دس گھروں میں مائلو قرآن پڑھاتے تھے اور ان گھروں میں ایک ان تین تین گاڑیاں سب کے پاس تھیں۔ قدرت اللہ کا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی ایک ان کو اسپتال لے گا۔

چار اعلا افسران کی گاڑیاں بچوں کو اسکول لے کے لیے تیار تھیں۔ کسی کو بیگم صاحبہ کے ساتھ تھا، کسی کی گاڑی خالی نہ تھی۔ کسی کو ناشتا سبزی بنے جانا تھا۔ چار جگہ سے مولوی صاحب کو مایوس آنا۔

اس شہر میں ایک شخص عبدالستار ایدھی بھی تھا۔ اسی کو کبھی میں نہیں رہتا تھا۔ کار میں نہیں گھومتا۔ سوٹ پہن کر انگریزی نہیں بول سکتا تھا۔ قدرت اللہ ایک فون کرتے تو ان کی ایسوی لینس آنے میں دیر نہ لے۔ وہ بلا لحاظ خلق خدا کی خدمت میں مگن تھے۔ مایوس درویش کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی۔ لیکن مولوی قدرت اللہ کو زندگی نے ہر سبق بتا ہی تھا۔ تجربات کی بھٹی میں گزار کر سکھایا تھا۔ ہر سے انکار بھی ایک تجربہ تھا اور پھر انہوں نے وہی ہوا ان کو پہلے کرنا چاہیے تھا۔ انکار کی خفت اٹھانے پہلے۔

ایسوی لینس سائزن بجاتی لائٹ چمکاتی صبح کے رش اپنا راستہ بناتی پندرہ منٹ بعد امراض قلب کے دوا دارے میں جارہی۔ نور الدین کو ایمر جنسی میں لگا گیا اور قدرت اللہ نے باہر کھڑے ہو کر دست دعا لے لیا۔

آخر کار ڈاکٹر نے مولوی قدرت اللہ کو اندر طلب کیا۔

”آپ ان کے ساتھ ہیں۔ یہ کیا کرتے ہیں۔“ اس نام اور عمر پوچھنے کے بعد کہا۔

”میرے استاد اور پیرو مرشد ہیں، پیش امام۔“
 ”گزشتہ رات بارہ بجے سے۔“

”اور آپ اب لائے ہیں۔ اتنا سخت ایک تھا۔ ان کا ہاتھای مجرہ ہے۔“

”دودن۔ چار دن۔ ہفتہ سال یا۔ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بس سانس چلے گی اور دل دھڑکے گا۔ اس وقت یہ Vegetable ہیں انسان نہیں۔ آف کورس آپ ان کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ جب تک اچانک ان کا دل بند نہ ہو جائے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ان کے پیوی، بچے کب تک خدمت کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو نہیں ہیں۔“ مولوی صاحب کا اپنا دل ڈوب رہا تھا۔

”خیر ہوتے بھی تو مشکل میں پڑ جاتے۔ نفسیاتی مریض بن جاتے اور زندگی کے بجائے موت کی دعا کرنے لگتے۔“ ڈاکٹر نے بے رحمی سے تبصرہ کیا۔

”ڈاکٹر صاحب۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کوئی علاج ممکن نہیں۔“

”سوری۔ اٹ از ٹولیٹ۔ دنیا میں کوئی ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ دماغ کی رگ پھٹ جانے سے پہلے شاید علاج سے کچھ فرق پڑتا۔ ان کا بلڈ پریشر کنٹرول ہو جاتا۔ اب آپ گھ جائیں، کیونکہ آئی سی یو میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اگر ان کو ہوش آگیا حالانکہ اس کا چانس نہ ہونے کے برابر ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ مفلوج رہیں گے ساری زندگی۔ ظاہر ہے ہم ان کو بید مستقل الاٹ نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر کھڑا ہو گیا اور مولوی صاحب سر جھکائے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی میں مولوی قدرت اللہ ہی ہوں۔ کل آپ میرے غریب خانے میں تشریف لائے تھے جی میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”میں مولانا نور الدین کی جگہ آیا ہوں۔“

”گریڈ پاء کے لیے دعا کرنے میں سمجھ گیا ایک منٹ، میں پیلا سے پوچھ لوں، پلیر ڈونٹ مہ مجھے نہیں پتا ایسا ہو سکتا ہے کہ نہیں۔ میرا ایک مولوی کی جگہ دوسرا مولوی قبول ہے کہ دراصل یہ مذہبی معاملات ہیں۔“

وہ اندر غائب ہو گیا۔ ایک سیاہ رنگ کی بڑا گاڑی مین گیٹ کے سامنے رکی۔ اس پر سر جھنڈا بھی تھا۔ سفید وردی والے شو فر نے پچھلا کھولا۔ اسکرٹ اور منی بلاؤز میں نظنہ والی عوا دیکھ کر مولوی صاحب زمین میں گر ٹھ گئے۔ وہ پاس سے گزری تو خوشبو کے ایک پہچان خیز ج نے ان پر یلغار کی۔ ان کا ضمیر ان کو کچھ کے دینے تم کہاں آگئے قدرت۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ سب کچھ شرع کے خلاف ہو رہا ہے۔ تم کس

”دودن۔ چار دن۔ ہفتہ سال یا۔ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ بس سانس چلے گی اور دل دھڑکے گا۔ اس وقت یہ Vegetable ہیں انسان نہیں۔ آف کورس آپ ان کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ جب تک اچانک ان کا دل بند نہ ہو جائے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ان کے پیوی، بچے کب تک خدمت کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو نہیں ہیں۔“ مولوی صاحب کا اپنا دل ڈوب رہا تھا۔

”خیر ہوتے بھی تو مشکل میں پڑ جاتے۔ نفسیاتی مریض بن جاتے اور زندگی کے بجائے موت کی دعا کرنے لگتے۔“ ڈاکٹر نے بے رحمی سے تبصرہ کیا۔

”ڈاکٹر صاحب۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کوئی علاج ممکن نہیں۔“

”سوری۔ اٹ از ٹولیٹ۔ دنیا میں کوئی ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ دماغ کی رگ پھٹ جانے سے پہلے شاید علاج سے کچھ فرق پڑتا۔ ان کا بلڈ پریشر کنٹرول ہو جاتا۔ اب آپ گھ جائیں، کیونکہ آئی سی یو میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اگر ان کو ہوش آگیا حالانکہ اس کا چانس نہ ہونے کے برابر ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ مفلوج رہیں گے ساری زندگی۔ ظاہر ہے ہم ان کو بید مستقل الاٹ نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر کھڑا ہو گیا اور مولوی صاحب سر جھکائے اٹھ کھڑے ہوئے۔



سڑک کے دونوں جانب جگ جگ کرتی ہر رنگ کی کار کی قطار لگی تھی۔ ان کے شو فر نو لیاں بنائے مالکوں کی غیبتیں اور گھر کے اندرونی حالات پر تبادلہ خیال بڑے نمک مرچ لگا کر کر رہے تھے۔

قدرت اللہ فاتحہ خوانی کے لیے اندر جانا چاہتے تھے لیکن گن مین نے بڑی بدتمیزی سے ان کو روکا۔

”اوسے کون ہے تم۔ ادھر باہر بیٹھو۔ تم کو کھانا

۱۔ ان کو ٹوکنے سے تمہاری اپنی بے عزتی ہوگی۔
 ۲۔ صرف ایک شہانہ ضیافت ہے جسے دادا جان کی
 ۳۔ اہل ثواب کے ذرا سے پر رکھی گئی ہے۔ کانچ میں
 ۴۔ والے ایک لڑکے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ دعا
 ۵۔ ال بھی کروا سکتا ہے۔ حد ہے اس کو مذہبی معاملہ کہتا
 ۶۔ تم غفر اللہ۔

۷۔ ”م آں مولوی قدرت۔ پاپا نے کہا ہے، اٹ از
 ۸۔ ”م اسٹنٹ امام ہو۔ مولوی نور الدین کو کیا
 ۹۔“

۱۰۔ ”من کو نارت انیک ہوا ہے۔ اسپتال میں ہیں۔“
 ۱۱۔ ”ماما۔ دس از مولوی قدرت۔ اسسٹنٹ
 ۱۲۔ ”ایکٹنگ فار مولانا نور الدین۔ پاپا سے“ چلے

۱۳۔ ”ما اپنے حسن و شباب کے ساتھ شوز کے ایک
 ۱۴۔ ”لین کے ایڈیٹر سے معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ
 ۱۵۔ ”عل پر کلر فل تصویر لگوانے کے لیے انہیں کیا کرنا
 ۱۶۔ ”گادر ایڈیٹر ان کے فوٹو چیٹک چہرے کے ساتھ
 ۱۷۔ ”رے جسم کا کیمرے کی نظر سے جائزہ لینے میں
 ۱۸۔ ”ہل تھا۔“

۱۹۔ ”پاپا نے کہا ہے تو پاپا کے پاس لے جاؤ۔“ ماما کو یہ
 ۲۰۔ ”ل انداز ہی بری لگی تھی۔“

۲۱۔ ”ماما کے پاس جا کر جونی کو زیادہ مایوسی ہوئی وہ کسی
 ۲۲۔ ”امٹ سے بڑے انہماک کے ساتھ اشاک مارکیٹ
 ۲۳۔ ”شیر و دیو پر بحث کر رہے تھے۔ انہوں نے پلٹے بنا
 ۲۴۔ ”ا۔ ”جونی“ کتنی بار تباؤ گے تم مجھے مولوی آگیا ہے تو
 ۲۵۔ ”ہیں بھاؤ انہیں۔ اینڈ ڈونٹ ڈسٹرب می اکیں۔“

۲۶۔ ”قدرت کو جونی نے ایک الگ میز پر بٹھا دیا۔ انہوں
 ۲۷۔ ”فت سبکی محسوس کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ یہاں سب
 ۲۸۔ ”مولوی نور الدین کے بارے میں پوچھیں گے اور
 ۲۹۔ ”۱۱۔ ”دعا یہ کلمات بھی کہیں گے۔ دن میں پانچ بار
 ۳۰۔ ”ال اہمیت میں نماز پڑھنے والے شاید یہاں موجود

۳۱۔ ”ہے۔ صرف دو چار نوٹس تھے جو ہر نماز میں نظر
 ۳۲۔ ”۱۲۔ ”تھے۔ مگر وہ شاید اس وقت اپنے کمروں میں قید
 ۳۳۔ ”۱۳۔ ”ال دی دیکھ رہے ہوں گے یا سو رہے ہوں گے۔“

۱۔ ایسی پارٹیوں میں ان کو اپنے ساتھ کون لاتا، مگر یہ پارٹی تو
 ۲۔ نہیں، چٹلم کی فاتحہ تقریب ہے۔ انہوں نے ہر طرف
 ۳۔ بکھرے ہوئے رنگ و نور کے سیل بے عیاں کو ہنستے
 ۴۔ مسکراتے خوشبوؤں سے بے ہوئے رنگوں کی ہمار
 ۵۔ ساتھ لیے مردوزن پورے سبزہ زار پر بکھرے ہوئے
 ۶۔ تھے۔ تقریب کچھ تو ہر صورت ملاقات چاہیے۔ ورنہ
 ۷۔ کے فرصت ملتی ہے صبح سے رات تک ابھی بس
 ۸۔ ایک موقع ہے ملنے کا۔ بے چارے دادا جان۔ کون
 ۹۔ ان کو یاد کرے۔

۱۰۔ مولوی قدرت اللہ نے محسوس کیا کہ وہ بہت سی
 ۱۱۔ نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور یہ پر جتس نظریں
 ۱۲۔ تھیں پر ستائش نہیں۔ اس پورے ماحول میں وہ قطعی
 ۱۳۔ ان فٹ تھے۔ لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتے تھے۔ مجھ کو
 ۱۴۔ عزت کیوں نہیں دی جارہی اور وہ واک آؤٹ نہیں
 ۱۵۔ کر سکتے تھے۔ استاد کرم اور پیرو مرشد فرماتے تھے کہ
 ۱۶۔ ”قدرت“ انہی کو ہدایت کی زیادہ ضرورت ہے۔ عزت
 ۱۷۔ اور ذلت دینے والا تو خدا ہے اور دولت بر غور کرنے
 ۱۸۔ والے انسانوں کے درمیان رہ کر دین کی تعلیم دینا کوئی
 ۱۹۔ آسان کام نہیں ہوتا۔ مگر بڑے بڑے اولیا اور انبیاء نے
 ۲۰۔ کفار کے درمیان رہ کر ثابت قدمی سے سب کچھ
 ۲۱۔ برداشت کیا تھا۔ ان کی تقلید ہمارا شیوہ ہے۔

۲۲۔ ”کیشنگ سروس والے بڑے مستعد تھے۔
 ۲۳۔ ”مذہب اور باوردی ویٹر ٹرے میں ہر قسم کے مشروب
 ۲۴۔ لیے پھر رہے تھے۔ لمبی لمبی میزوں پر ڈزیر ہر قسم کے
 ۲۵۔ لوازمات سجا رہے تھے کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔
 ۲۶۔ ”مہمان آرہے تھے۔ مولوی قدرت نے اپنی کلائی کی
 ۲۷۔ ”گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے ان کی
 ۲۸۔ ”خواہش تھی کہ جیسے ہی وہ فارغ ہوں ایک بار استاد
 ۲۹۔ ”محترم کو دیکھ آئیں۔ مگر ان کو یہاں جلد فراغت ہوتی
 ۳۰۔ ”نظر نہیں آ رہی تھی۔“

۳۱۔ ”بھائی صاحب۔ اور کتنی دیر ہے۔“ انہوں نے
 ۳۲۔ ”ایک ویٹر کو روک کر پوچھا۔
 ۳۳۔ ””کھانے میں۔ کیوں حافظ صاحب بہت بھوک
 ۳۴۔ ”لگی ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

مہمان تو آتے رہیں گے ان کو فاتحہ کرنے دیں۔
 ”آئیے۔ لڑے نے بڑے دوستانہ انداز میں،
 بازو تھام لیا۔ یہ میری وہ ہے۔ آئی مین فیانی۔“
 جونی انہیں اندر لے گیا، یہ ایک آراستہ ڈرائنگ
 روم تھا۔ ہر ایک چیز سے دولت مندی اور ذوق جم
 جھلک رہا تھا۔ وہ ایک صوفے پر ٹک گئے۔

”مزید ہو کر بیٹھیں، چند منٹ لگیں گے۔“
 شرمندگی اور احساسِ ذلت سے مولوی قدرت
 کے اعصاب پر دباؤ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔
 اس نوجوان کو قصور وار نہیں سمجھتے تھے۔ قصور وار
 نوجوان کے والدین تھے۔ یا ان کے ماحول تھے۔ یا
 پیسے نے ان کو سب کچھ دیا تھا۔ زندگی کی ہر آسائش
 غرور، اولیول اور سینئر کیمج اسکول، ڈش اور وی سی
 کمپیوٹر اور کلب، کلچر، کمروہ تہذیب نہیں دی
 جس میں رشتوں کا، روایات کا اور قدروں کا احترام
 دین کی روح جو انسانیت کے آداب سکھاتی ہے
 درسی کتب میں تھی، نہ گھر کی تربیت میں۔ اس کے
 ویٹروہ ٹرے لے آیا جو مہمانوں کی خدمت میں پیش
 جاتا تھا۔ مولوی صاحب کے سامنے سینئر ٹیبل پر چم
 بڑی ڈشوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ فاتحہ خوانی کے دیگر
 انتظار کرتے رہے۔ ایک ویٹروہ نے دھواں دیتی آ
 بھی ٹیبل پر رکھ دی۔

لڑکی نے برا سامنہ بنایا اور ناک پر ہاتھ رکھتے ہر
 کھڑی ہوئی۔
 ”او جونی۔ تم جانتے ہو کہ مجھے اس دھواں
 کتنی الرجی ہے، میں باہر جا رہی ہوں۔“
 ”ڈونٹ مائنٹ۔ آپ شروع کریں۔“
 دروازے کی طرف بڑھا۔
 ”کیا اور کوئی نہیں آئے گا۔“ قدرت اللہ نے
 ”اور کون۔“ جونی کے دروازے کی جانب ہر
 قدم رک گئے۔

”یہ کس کے چہلم کی فاتحہ خوانی ہے۔ آپ
 والدین یا آپ دعائے مغفرت میں شرکت نہیں
 گئے۔“

”نہیں میرا مطلب فاتحہ خوانی میں۔ جو مغرب
 سے قبل ہو جانی چاہیے تھی۔“ انہوں نے خفت
 چھپاتے ہوئے پوچھا۔
 ”یہ مسئلے مسائل ہم نہیں جانتے۔“ وہ بے رخی
 سے کہہ کر لیٹ گیا۔

مولوی قدرت نے صاحب خانہ سے بات کرنے کا
 فیصلہ کیا۔ وہ اتفاق سے اس وقت اکیلے نظر آرہے
 تھے مگر ان کے آگے بڑھنے سے پہلے ایک عورت ان
 کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنس
 رہے تھے جب مولوی صاحب ان کے پاس پہنچ گئے
 تھے خاتون کی ہنسی اچانک غائب ہو گئی۔ جیسے بجلی
 جانے سے لی وی کی تصویر غائب ہو جاتی ہے۔ ان کی
 نظر کے ساتھ ہی مولوی صاحب نے پلیٹ گر روشنی
 کے گل ہو جانے کا سبب مولوی قدرت کی صورت میں
 دیکھا۔

”بس۔ کچھ کھانا چاہتے ہیں۔“
 ”میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ابھی فاتحہ خوانی میں کتنا
 وقت ہے۔“

”کیوں۔ اب کون سی نماز کی امامت کرنی ہے
 آپ کو۔ اتنی جلدی کیا ہے۔“ ان کا موڈ آف ہو گیا۔
 ”دراصل مجھے مولوی نور الدین کو دیکھنے اسپتال جانا
 ہے۔ ان کو صبح دل کا دورہ پڑا تھا۔“

”انتظار نہیں کر سکتے آپ۔ ابھی بہت سے
 مہمان نہیں آئے۔ ان کے بغیر ہی کھانا کھلا دوں آپ
 کو۔“

”میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا۔ مجھے فاتحہ خوانی
 کے لیے بلایا گیا تھا۔ استاد محترم آئی سی یو میں پڑے
 ہیں اور آپ کو احساس ہی نہیں۔“ وہ برہمی سے
 بولے۔

”اوکے۔ اوکے۔ ڈانٹ شاوٹ۔ جونی کم
 ہیرو۔“ انہوں نے پاس سے گزرتے بیٹے کو آواز دی۔
 ”بس بابا۔“ وہ سعادت مندی سے لپکا۔

”جونی۔ ان کو مم کے پاس لے جاؤ اور ان سے
 کہو کہ ان کو فارغ کریں۔ ان کو اسپتال جانا ہے۔“

اگر حضرات کے سر پر ٹوپی یا رومال نہیں اور خواتین کے سر پر آپٹل نہیں تو کوئی بات نہیں، خدائے بخشاوندہ ان فروعات سے بے نیاز و بالاتر ہے۔“

آہستہ آہستہ مکمل خاموشی میں غصہ ٹھنڈا ہوا اور بے بسی سے مفاہمت کرتے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گئے۔ کچھ خواتین نے سر پر آپٹل ڈال لیے۔ ہر شخص اپنی جگہ ساکت تھا۔ ویدک گیت گئے تھے۔ مکمل سکوت میں قدرت اللہ کی آواز گونجنے لگی تھی۔ مجمع جو شرمسار بھی تھا اور برہم بھی، آمین کہنے پر مجبور تھا۔

”رخصت ہونے سے پہلے صرف ایک منٹ کی دعا اور۔۔۔“ انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

”اب کیا ہے؟“ صاحب خانہ نے کہا۔

”اس مسجد کے پیش امام جس کے پیچھے آپ نماز عید تو ادا کرتے ہوں گے۔ ان کو آج صبح دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ میں لگے ہیں۔ انہوں نے بھی خدمت کا معاوضہ نہیں مانگا۔ ابھی چندہ نہیں مانگا۔ آپ کے بچوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے۔ جو کمیٹی والوں نے ان کی تنخواہ مقرر کی تھی، اسی پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کا کوئی احسان کسی پر نہیں۔ مگر وہ آپ کے محلے دار تھے۔ ہمسائے تھے۔ ان کا اتنا حق ضرور بنتا تھا کہ جب وہ علیل ہوں تو آپ پڑوسی ہونے کے ناطے ہی ان کو اسپتال پہنچا دیں۔“

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شر کا کو بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ صاحب خانہ آگے بڑھے اور اشتعال سے کہا۔

”بس کریں۔ بہت ہو گیا۔“

”مگر آج ان کو وقت پر اسپتال پہنچانے کے لیے ایک کار مل جاتی تو ان کا برزخ ہی معجز نہ ہوتا۔ دیکھی نہیں شرمندہ ہو کر میں نے ہر گھر کا دروازہ بجایا۔ انسان کو اللہ کے سوا کسی سے مدد کی امید نہیں کرنی چاہیے، لیکن میں آپ کے لیے ان کی صحت کی دعا کی بھیج رہا ہوں۔ دعا کریں اللہ ان کو شفا دے۔“

”آئی ڈونٹ نوٹ۔“ جونی تذبذب میں پڑ گیا۔

مولوی قدرت نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی۔ اور گم غم نظروں سے ان چیزوں کو دیکھنے لگے۔ جو باہر باورچیوں نے بنائے تھے اور جو خود کو خانہ سال کھلانے پر برامان جاتے۔ یہ کھانے خوب صورت اور جاپانی کراکری میں سجا کر رکھے گئے تھے۔

اپنی جگہ سے اٹھے اور باہر آگئے۔ سر جھکائے دو سہانوں کے درمیان پہنچ گئے۔ صاحب خانہ کے علاوہ کچھ لوگوں نے حیرانی سے ان کو دیکھا۔ معزز سہانوں کے بیچ میں ٹخنوں سے اونچی سوتی شلوار کرتے اور ٹوپی کے ساتھ داڑھی والا مولوی یہاں کیا کر رہا ہے۔

انہوں نے ایک میز پر ہاتھ رکھ کر سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”ٹیلیڈرائیڈ جنٹل مین۔ میں چند منٹ کے لیے آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔“ انہوں نے انگریزی میں کہا۔

باتیں کرنے والے ناخوش ہو گئے۔ ہر کوئی ان کو دیکھنے لگا۔ خوش باش اور پر تجسس چہروں پر مسکراہٹ کا اعلان پڑ گیا۔

”یہ بتانا غیر ضروری ہو گا کہ آج صاحب خانہ کے والد محروم کا چلیم ہے۔ آپ سب کو یہاں فاتحہ خوانی کے لیے بلایا گیا ہے۔ مغفرت کی دعا مانگنے کا کوئی طریقہ یا وقت مقرر نہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی بھی زبان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی جاسکتی ہے کسی مولوی کا ہونا ضروری نہیں۔ خون کے رشتے اور قرابت داری کے حوالے سے یہ انہی کی اخلاقی اور معاشرتی ذمہ داری تھی کہ وہ دعائے مغفرت میں شرکت کرتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلمان کی بخشش کی دعا مانگ سکتا ہے۔“

”واٹ از دس ٹان مینس۔“ صاحب خانہ نے فہم سے کہا۔

”جی میں دعا کروانا چاہتا ہوں آپ کے والدین کی مغفرت کے لیے۔ ان سب سے جو یہاں موجود ہیں۔ جی خواتین و حضرات آپ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں۔“

وہا ایک منٹ میں ختم ہو گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھنے سے پہلے صاحب خانہ سے مخاطب ہوئے۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ دعوت سے بنا کھائے جا رہا ہوں۔ میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔“

سب کی نظروں کے سامنے وہ گیٹ عبور کر گئے۔ دعوت کی روٹی کا مڑا کر کرا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے تھے۔ پھر سائمن کی آواز آئی۔ صاحب خانہ گیٹ کی طرف ٹپکے۔ وزیر اعلا یا اسپیکر میں سے کوئی آہی گیا تھا۔ حالانکہ اس کی امید ختم تھی کہ ان میں سے کوئی آئے گا۔ پھر سب کچھ نارمل ہو گیا۔ ساری رات بارہ بجے کے بعد جاری رہی۔



مسجد کی وسعت اور رونق میں چالیس سال سے مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ شہر کے گوش علاقے میں متمول افراد کی عبادت گاہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مسجد کی وسعت اور ارد گرد آبادی بڑھنے کے باوجود نمازیوں کی تعداد نہیں بڑھی تھی۔ پرانے بوڑھے جن کی وجہ سے مسجد میں رونق تھی وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی جگہ لینے والے بوڑھے زندگی میں بہت مصروف تھے۔ ان کے پاس پانچ وقت کی حاضری کا نام نہیں تھا۔ جو نماز پڑھنا چاہتے تھے۔ وہ مسجد میں جانے کے بجائے گھر میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ تاہم اس سے کہیں زیادہ باندی سے وہ ٹریک سوٹ پہن کر گھر سے جا لنگ کے لیے نکلتے تھے۔

چالیس سال پہلے یہ مسجد ایک کمرے پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ ہی نور الدین کا گھر تھا۔ سب زمین ان کی ذاتی ملکیت تھی۔ جب یہاں کے پرانے گھروں کو بلند و زبر پھیر کرنے لگے اور سڑکیں بنانا شروع کیں اور لوگ اس جگہ کو چھوڑ کر جانے لگے تو مولوی صاحب نے اپنا گھر نہ چھوڑا۔ ان کے پاس تقریباً ”پانچ سو گز قطعہ زمین اضافی تھی۔ جیسے جیسے زمین کی قیمت سونے کے بھاؤ ہوئی گئی ان پر دباؤ بڑھتا گیا کہ وہ مسجد کا حصہ

چھوڑ کر باقی زمین کی قیمت لے لیں۔ مگر انہوں نے ہر دباؤ کا مقابلہ کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کو اصل سے چار گنا زیادہ قیمت پیش کی گئی۔ مگر وہ نہ مانے۔ خدا کا گھر اور اس کے زیر سایہ میرا گھر جہاں ہے وہیں رہیں گے۔

یہی وقت تھا جب ان کا اپنی بیوی سے اختلاف شروع ہوا۔

”آخر کیا فائدہ ایسی ضد کا۔“

”مخد میں کر رہا ہوں یا مجھے بے دخل کرنے والے بد معاشی کر رہے ہیں۔ میں اس گھر میں پیدا ہوا تھا اور میرا اب بھی اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔“

”تو کیا ضرورت ہے اکلے سات نسلیں بھی اسی جگہ پیدا ہوں پھر اس میں بد معاشی کی کون سی بات ہے۔ جو زمین لے رہے ہیں وہ پیسے دے رہے ہیں۔“

”ہر چیز پر رائے فروخت نہیں ہوتی۔ انسان کے پاس دنیا میں اور کیا ہوتا ہے۔ گھر۔ خاندان۔ عزت اور ایمان۔“ انہوں نے کہا۔

”اسے تم ایک گھر کہتے ہو۔ ایک کمرے کو۔ جس میں ہم سب جانوروں کی طرح رہتے ہیں۔ کھاتے اور سو جاتے ہیں۔ اس پاس کے گھروں کو دیکھو۔ ان کے سروٹ کو اور اس گھر سے زیادہ بڑے ہیں۔“

”ہوس نہ کر اسے بد بخت۔ خدا کا حکم ہے کہ مقابلہ کرو تو تقویٰ اور ربیز گاری میں۔ تجھے کیا معلوم یہ محل انہوں نے کیسے گھر کیے ہیں۔“

”میں محل کی بات نہیں کر رہی۔ یہ ہوس نہیں ہے۔ ہر شخص ترقی کرنا چاہتا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے تمہارے اولاد کی بہتری کے لیے کرتا ہے۔ تمہارے دادا اسی کل کو ٹھری میں عمر قید کر کے فوت ہو گئے اور جائیداد اپنی اکلوتی اولاد کو سونپ گئے۔ یہی تمہارے باپ نے کیا۔ لیکن ہمارے دو بچے ہیں۔“

”ہم ایک کمرہ اور بنالیں گے۔ جگہ تو ہے۔“

”میں کہتی ہوں جب منہ مانگی قیمت مل رہی ہے تو یہاں رہنے سے فائدہ۔ اس قیمت میں ہم کہیں بھی تین کمروں کا گھر بنالیں گے۔ ایسی جگہ جہاں اپنے جیسے

دارالعلوم ہوتا۔ خیر وہ توبہ بھی بن جائے گا۔
”تم دارالعلوم بنانے کا سوچ رہے ہو۔“ بیوی نے
حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔ ایک جدید دارالعلوم۔ جہاں دین کے
ساتھ سائنس کی تعلیم بھی دی جائے گی۔“
”یہ شیخ صلی کا خواب ہے۔ اگر صرف خواہش سے
سب کچھ ہو تا تو میں آج برطانیہ کی ملکہ ہوتی۔ نقشہ
بیس سال سے نقشہ ہی ہے۔ اس سے عمارت کہاں
تغیر ہوگی۔ سرمایہ کہاں سے آئے گا۔“

”خدا بڑا مسیب الاسباب ہے۔ یہاں بہت سے
صاحب ثروت لوگ رہتے ہیں۔ میں سب کے آگے
جھولی پھیلاؤں گا۔“

”شرم تو نہیں آئے گی مانگتے ہوئے۔“
”میں نے کون سا اپنے لیے ہبک مانگی ہے۔ نیک
کام کے لیے مجھے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانہ
پڑے تو دریغ نہیں کروں گا۔“
”یعنی بابِ داوا کی عزت بھی داؤ پر لگاؤ گے۔ چندہ
حانے والے ملاؤں میں اپنا نام لکھواؤ گے۔“ وہ طنز
سے بولی۔

”جل از وقت تمہمت کیوں لگاتی ہو۔ یہ میں جانوں
اور میرا کام جانے۔ میں پیسے شے کا حساب لکھوں گا۔
امانت میں خیانت کرنے والے پر خدا کی لعنت۔“ وہ
بھڑک اٹھے۔

”ایسی ہی کہتے ہیں سب۔ تم کس کس کی زبان پکڑو
گے۔ اور یہاں تمہارا دارالعلوم بنے گا تو گھر خریدنے
کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔“

”گھر خریدنا ضروری ہے۔ کرائے پر مکان مل
جاتے ہیں۔“

”اب ہم کرائے دار بن کر رہیں گے۔“ بیوی نے
اپنا سر پیٹ لیا۔

”اس شہر کی آرمے سے زیادہ آبادی کرائے کے
گھروں میں رہتی ہے۔ کیا وہ بے عزت ہیں۔“
مولانا اپنے ارادوں میں اٹل تھے۔ اس زمین کو کبھی
انہوں نے اپنی ذاتی جاگیر نہیں سمجھا۔ ان کے بزرگوں

لوگ رہتے ہیں۔ اس کے بعد بھی پیسہ بچ جائے گا۔
اس گھر کا فریج آجائے گا۔“

”اس سے عیش خوشی اور خواہشات نفسانی کا آغاز
نہ ہے۔ ہر ضرورت ایک مجبوری بن جاتی ہے اور ان
لوہانے کے لیے بھاگتے بھاگتے موت آجاتی ہے۔“

”تم بلاوجہ رائی کا ہمارا بناتے ہو۔ آرام سے رہنے
کی کوشش کرنا، کوئی گناہ نہیں۔ کیا پہلے لوگ آرام
سے نہیں رہتے تھے۔ پھر میں نے کب کہا ہے کہ مجھے
پس چاہیے۔ میں تو اسی رقم کو ڈھنک سے استعمال
کرنے کی بات کر رہی ہوں۔ جو زمین بدلے میں مل
رہی ہے۔ میں اسے زیور، کپڑا بنانے کے استعمال
نہیں کرنا چاہتی۔ تین کمروں والا گھر ہو گا تو زندگی آرام
سے گزرے گی۔“

”بلاوجہ کی بحث مت کرو۔“

”تم بتاؤ کیا غلط بات ہے۔ کیا تمہارے بچوں کو
عزت سے جینے کا حق نہیں ہے۔ تم محسوس نہیں
کرتے، دیکھو وہ بچے کن اسکولوں میں جاتے ہیں۔
وہاں تمہارے بچے جاسکتے ہیں۔“

”تمہیں کیا معلوم ان اسکولوں میں کیا پڑھا جاتا
ہے۔ اس تعلیم سے ڈگری ضرور ملتی ہے، لیکن انسان
نہیں بنتا۔“

”ہاں۔ اس پوری سوسائٹی میں صرف تم انسان
ہو۔ باقی سب یا گل رہتے ہیں۔ نہ ہم کسی کے گھر
جاسکتے ہیں۔ نہ کوئی ہم سے ملنے کے لیے یہاں آتا
ہے۔ میں چاہتی ہوں، ہم وہاں چلیں جہاں ہم جیسے
لوگ ہوں۔“

”اچھا۔ اچھا یہی ضد ہے تمہاری تو میں تمہارے
لے گھر کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”وہ نقل ادا کروں گی، جس دن اس خاندانی حجرے
سے نجات ملے گی۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”مجھے بھی اضافی جگہ مل جائے گی۔ مسجد کی توسیع
لے لیے۔ والد مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ یہاں شہر
کا سب سے بڑا دارالعلوم بنے۔ اس وقت شہر بھی چھوٹا
تھا۔ دارالعلوم بن جاتا تو شاید شہر کا سب سے بڑا

نے اسے راہ خدا میں وقف کر دیا تھا۔ اسے بیچ کر وہ ان کی ریحوں کو شرمندہ نہیں کر سکتے۔ وہ پابند تھے کہ ان کے خوابوں کو تعبیر دیں۔ انہیں یقین تھا کہ اس کا ریح کے لیے لوگ ان کی مدد ضرور کریں گے۔

یہی ہے ان کو بہت سمجھایا کہ وقت بدل گیا ہے۔ اگر دارالعلوم بن بھی گیا تو طلبہ کہاں سے آئیں گے۔ اس علاقے کے لوگ بچوں کو دینی تعلیم دینا ہی باعث شرمندگی سمجھتے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں سے کون آئے گا۔ ہر محلے کی مسجد کے ساتھ مدرسہ ہے۔ بڑے مدارس میں باہر سے علما آکر پڑھاتے ہیں۔ ایسے مدارس گرانٹ اور ٹرسٹ سے چلتے ہیں۔ وہاں اس مدرسے کی کیا وقعت۔۔۔

ایسی باتوں سے مولانا نہ تو حوصلہ ہارے اور نا ہی ارادہ بدلا۔ انہوں نے دو نوک لفظوں میں یہی سے کہا۔

”اگر میری خوشی مطلوب ہے تو اسی گھر میں صبر اور قناعت کے ساتھ رہو۔ ہم ایک کمرہ اور بنوائیں گے۔“

”میں ان لوگوں کے درمیان نہیں رہ سکتی جہاں مجھے اور میرے بچوں کو احساس کمتری ہو۔“

”تم بڑھی لکھی عورت ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو۔“

”یہی تو بد قسمتی ہے میری۔ جاہل ہوئی تو اس ذلت کی زندگی کو بھی اپنا نصیب سمجھ کے قبول کر لیتی۔ اپنے مجازی خدا کے فیصلے کو خدا کا فیصلہ مان لیتی۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”یہ ظلم ہے۔ تمہارے پاس کچھ نہ ہوتا تو میں خاموش رہتی۔ مگر تم بچوں کا حق چھین کر دوسروں کو دے رہے ہو۔“

”میں کسی کو دینے والا کون۔ میں صرف خدا سے کیا ہوا بزرگوں کا عہد پورا کر رہا ہوں۔ دارالعلوم تو ایک صدقہ جاریہ ہے۔“

”اس صدقہ جاریہ سے میرے بچوں کو کیا ملے گا۔ ان کے پاس ڈھنگ سے رہن کی جگہ نہیں۔ کھانے پینے کو نہیں۔ ان کی عزت نہیں مستقبل نہیں۔ یہ

کس کتاب میں لکھا ہے کہ دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی فکر کرو۔ تم بچوں کا حق غضب کر رہے ہو۔ یہ کس شرع میں فرض ہے کہ دین کے لیے گھر۔ یا دوست مٹاؤ۔“ وہ چیخ پڑی۔

”پامیں بچا اٹھیل رہا ہوں۔“ وہ چراغ بھا ہو گئے۔

”میری بات سنو۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ میں کافر نہیں ہوں کہ تمہیں دین کے کسی کام سے روکنے کا گناہ کروں۔ تم دارالعلوم ضرور بناؤ۔ لیکن چندے مانگ کر نہیں۔“ یہی نے پیتہ تریا بدلا۔

”اور کیا کر سکتا ہوں میں۔“

”تم وہی کر سکتے ہو جو انبیاء نے کیا۔ تجارت۔ تم بھی پیسہ کماتو۔ پھر اس منافع سے گھر اور دارالعلوم بناؤ۔“

”میں کیا بزنس کر سکتا ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”دیکھو۔ لوگ کیا کر رہے ہیں۔“

”مگر میں مسجد کے معاملات کسی اور کے سپرد نہیں کر سکتا۔“

”تم کسی کو ملازم رکھ لو۔“

”لاحول ولا قوۃ۔ میں نماز پڑھانے، قرآن کی تدریس کے لیے ملازم رکھ لوں اور خود بزنس میں بن جاؤں۔ کہاں سے آتے ہیں تمہارے دماغ میں ایسے خیالات۔“ وہ پھر بھڑک اٹھے۔

”چلو تم خود کچھ نہ کرو۔ اپنا پیسہ کسی کے ساتھ لگا دو۔ اس دوران ہم کرائے کے گھر میں روئیں گے۔“

اس نے پیتہ تریا بدلا۔

”آج کل اپنا پیسہ کسی کے حوالے کرتے ڈر لگتا ہے۔“

”پیسہ مت دو۔ اپنا مال کسی کے سپرد کرو۔“

”دیکھتے ہیں سوچتے ہیں۔“

اس وقت وہ خاموش ہو گئیں۔ لیکن بد قسمتی سے اسی شام ایک ایجنٹ کی پارٹی کو لے آیا۔

”مولانا۔ صرف ایک بار میری عرض سن لیں۔“

”گھر سے مہمان کو بے عزت کر کے رخصت کرنا خلاف تہذیب نہ ہوتا تو میں تمہیں دھکے دے کر گھر

سے نکال دیتا۔ بہتر ہے شرافت سے چلے جاؤ۔ میں
لین کے موضوع پر بات نہیں کر سکتا۔ یہ زمین مسجد
اور دارالعلوم کے لیے وقف ہے اور میں اسے کسی
قیمت پر فروخت نہیں کروں گا۔“

”مولانا آپ کا جذبہ قابل دید ہے اور بلاشبہ راہ حق
میں ایسی قربانی دینا باعث فخر ہے۔ اور ایسا حوصلہ بہت
کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہم تو اس کار خیر میں آپ کی
مدد کرنا چاہتے ہیں۔“

”چلو کوئی تو سمجھا میری بات کو۔“
”ہم آپ کی اجازت سے یہاں دارالعلوم بنائیں
گے۔“

”پہلی بات یہ کہ میں یہ سب اپنی محنت اور جدوجہد
سے بنانا چاہتا ہوں۔“

”لیکن اس کے لیے آپ کو مخیر حضرات کے پاس
جاننا پڑے گا۔ ان چند بنگلہ بازے گا۔ بالفرض آپ
بنا بھی لیتے ہیں تو وہ ایسا شاہکار نہیں ہوگا جو ہم بنائیں
گے جسے سارا شہر دیکھنے آئے گا اور یہ تعمیر کا شاہکار
ہوگا۔“

”بجا فرمایا۔ اگر آپ راہ خدا میں یہ کام کرتے تو
اس کا اجر بھی بارگاہ ایزدی سے ملتا۔ میری کیا وقت کہ
میں کچھ کر سکوں۔ خدا نے آپ کو توفیق دی ہے۔ مگر
آپ یہ سب کچھ اپنے لیے کر رہے ہیں۔ اپنے
فائدے کے لیے سب کچھ بنانے کے لیے میری
اجازت ہی مطلوب نہیں ہوگی۔ آپ مجھ سے
اشامپ پیپر پر دستخط بھی کریں گے جس میں آپ بقیہ
پانچ سو گز زمین کی ملکیت اپنے نام حاصل کریں گے۔
خریدار بھی آپ۔ ٹھیکدار بھی آپ۔“

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”میں آپ کی باتوں کا بوا نہیں مانوں گا۔ کیونکہ
آپ بزرگ ہیں۔ لیکن آپ کو احساس ہونا چاہیے کہ
آپ اپنی ضد اور انا میں غلط فیصلہ کر رہے ہیں۔ جس
میں نقصان ہی نقصان ہے۔ آپ کے لیے بھی اور
آپ کے بچوں کے لیے بھی۔ اور دنیا کا بھی۔“

”دنیا کا نہیں۔ آپ کا نقصان۔“

”جی نہیں۔ شاید اس زندگی میں آپ کا خواب
پورا نہ ہو سکے، اگر مسجد چندے سے بنی تو جانے کتنے
سال لگ جائیں۔ اس کے بعد دارالعلوم کی باری آئے
گی، جس کے لیے آپ کو چندہ بھی نہ ملے۔ بالفرض
دس سال میں آپ نے دونوں کام کر بھی لیے تو لوگوں کو
وہ شان دار مسجد نہیں ملے گی، جو ہم بنا کر دیتے۔ میرا
ثواب عذاب چھوڑیں۔ اگر میں اپنا فائدہ بھی کر رہا
ہوں تو آپ کا نقصان نہیں ہو رہا۔ مسجد آپ کی ہوگی۔
پیش امام آپ اور شان دار مسجد کے الگ بھی آپ۔“

ایک لمحہ کو مولانا کو لگا کہ وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔
انہوں نے چشم تصور سے خود کو اس چار منزلہ مسجد میں
گھومتے دیکھا۔ استادن کو ہدایت دیتے اور شاگردوں
کو اپنے احترام میں کھڑے ہوتے دیکھا۔ شہر کے
معززین ان کو اس کام کے لیے مبارک دے رہے
ہیں۔ الیکٹریک اور پرنٹ میڈیا میں ان کی کورتج ہو رہی
ہے۔ دوسری مساجد کے امام ان سے حسد کر رہے
ہیں۔ فخر غرور سے ان کا سر بلند ہے۔

پھر ان کو احساس ہوا کہ ان کا سرواقتی غرور سے تن
گیا ہے۔ انہوں نے اللہ سے توبہ کی۔ گمراہ کن
خیالات نے ان کو وقتی طور پر مغلوب کر لیا تھا۔ خدا وہ
وقت نہ لائے کہ وہ مسجد کی تعمیر میں غرور میں مبتلا
ہوں۔ زمین خدا کی نگہ اللہ کا اس میں شان و شوکت کا
کیا سوال اس نماز میں جو ریگ صحرا ادا کی جائے،
پہاڑوں کی چٹانوں پر یا کسی پارک میں اور اس میں جو دو
گروڑ کی خطیر رقم سے بنائی مسجد میں ادا ہو۔ خدا کے
نزدیک کیا فرق ہے۔ نہ کہیں ثواب زیادہ ہے، نہ
نمانہ۔

”میرا خیال ہے آپ آرام سے میری تجویز پر غور
فرمائیں۔ میں اپنا کارڈ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“ وہ مولانا کو
سوچ میں ڈوبادیکھ کر بولا۔

”آپ نے میرے استغراق کو دیکھ کر غلط نتیجہ
نکالا۔ آپ نے دوبار کہا۔ مسجد میری ہوگی، اللہ آپ کو
معاف کرے۔ مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ میں
تو اس زمین کا بھی مالک نہیں۔ مجھے تو اس میں دو گز کا

کلوا بھی نہیں ملے گا۔ ساتھ صرف میرے اعمال جائیں گے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو یہ تعمیر ہو جائے گی۔“

”خدا کو تو منظور ہوتا، مگر آپ کو منظور نہیں۔“

”میری نامنظوری بھی خدا کی مرضی ہے۔“

”بعض اوقات شیطان کا خیر میں حائل ہو جاتا ہے۔“

”وہ ایسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ شیطان نے آپ کو مجھے

برکانے کے لیے بھیجا ہے۔ آپ کو طمع لالچ کا جال

دے کر مگر اللہ نے مجھے بچالیا۔“ وہ ضبط کرتے ہوئے

بولے۔

ان کی یہ ساری باتیں مولانا نور الدین کی بیوی نے

دروازے کے پیچھے رہتے ہوئے سنی۔ مولانا ان کو

رخصت کر کے آئے تو ان کی بیوی سے سخت جھڑپ

ہو گئی۔ بیوی کو یہ فظیر رقم کسی مدفون خزانے کی طرح

لگتی تھی۔ جو اس کی دسترس میں تھا۔ مگر اس پر مولانا

سانپ بن کر بیٹھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایسی کوئی

لاٹھی نہیں تھی۔ جس سے سانپ مر جائے اور لاٹھی

نہ ٹوٹے۔ سانپ مر سکتا تھا، لیکن مگر لاٹھی کی سلامتی

ناممکن تھی۔ نہ وہ اپنے سناگ کو بچا سکتی تھی نہ خود

کومت۔

مولانا نہ غصے سے قائل ہونے والے تھے نہ دلیل

سے۔ اس نے آنسو بھی بہائے اور دھمکی بھی دی۔

انہوں نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ اپنے بچوں

کو لے کر کہیں چلی جائے گی۔ زندگی جیسی میاں گزر

رہی ہے، کہیں اور بھی گزر جائے گی۔ جس باپ کو اولاد

کا خیال نہ ہو اس باپ کے ہونے نہ ہونے سے کوئی

فرق نہیں پڑتا۔ تم بڑھاؤ نمازیں۔ اور سونا روں اپنی

عاقبت زمین سنبھال کر رکھو اور چندے مانگ کر خواب

دیکھو اس کی تعبیر کا وقت آنے سے پہلے تم بھی اسلاف

میں شامل ہو جائے گے۔

مولانا ایک حد تک بحث کرتے تھے۔ وہ بھی

معقولیت کے دائرے میں رہتے ہوئے قائل کرنے

کے لیے عورت کی بدکلامی، روانہ ہونا اور پاگل پن ان

سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ یوں خاموشی سے مسجد میں جا بیٹھے تھے اور علم دین پر کوئی کتاب پڑھنے لگتے۔ یا اپنے سب سے ہونمار شاگرد اور دست راست قدرت اللہ کو بلا بھیجتے۔ ان سے باتیں کر کے ان کا دل ہلکا ہو جاتا۔ حسب دستور مولانا کے واک آؤٹ کر جانے کے بعد ان کی بیوی نے وہ کارڈ لکھا جو فرش پر پڑا تھا۔ انہوں نے وہ کارڈ سنبھال کر رکھ لیا تھا جس پر نمبر لکھے تھے۔ آرٹیکلٹ کا نام جعفر تھا۔

غصے، رنج اور احساس ظلم و بے بسی نے اس کو پاگل

کر رکھا تھا۔ وہ رات بھر جاگتی رہی اور کڑوئیں بدلتی

سوچتی رہی کہ آخر اسے کیا کرنا چاہیے۔ صبح ہوتے ہی

اس کے شیطانی دماغ نے ایک حل ڈال دیا تھا۔ ان

حالات میں اس کا مددگار شیطان ہی ہو سکتا تھا۔ مولانا کا

معمول تھا وہ نماز فجر کے لیے جاتے تھے تو درس کے بعد

نوبتے ناشتا کے لیے آتے تھے۔ پھر دو گھنٹے بعد جاتے

تھے۔ تو نماز ظہر کے بعد آتے ہی کھانا کھا کر قیلولہ

کرتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد وہ مصروف رہتے

تھے۔ بیوی نے عصر کے بعد کسی کو بھی میں جا کر فون

کرنے کو ترجیح دینے کی بجائے پی سی او جا کر فون کیا۔

جہاں عورتیں فون کرنے آتی تھیں۔ پی سی او کے

مالک نے نمبر ملا کر اسے فون تھما دیا۔

”جعفر صاحب۔ میں نور الدین کی اہلیہ بول رہی

ہوں۔“ وہ بولی۔

”جی۔ جی فرمائیے۔“ اسے سمجھنے اور سنبھلنے میں

کچھ دیر لگی۔

”کل آپ مسجد کی تعمیر کی تجویز لے کر آئے

تھے۔“

”آئے تھے۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ وہ بے حد

گستاخ۔ اور بد لحاظ انسان ہیں۔ خیر چھوٹیے۔

آپ بتائیں کیسے یاد کیا۔“

”میں نے آپ کی ساری گفتگو سنی تھی۔ آپ کا

کام ہو جائے گا۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔ وہ میری

بات نہیں ٹال سکتے۔ ہر بیوی کے پاس اپنے شوہر کو

منانے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔“

ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ شیطان لعین بڑے بڑے اولیاء۔ انبیاء کے ایمان اور ایقان میں خلل اندازی کرنے میں کامیاب ہوا۔ شرع سے نہ سہی کہیں اور اسے مجبوری کو جواز مل ہی جاتا ہے اور پھر عورت ذات۔ اللہ اس کے چلتر سے بچائے۔ جس نے آدم کو جنت سے نکلوا یا۔ تب سے عورت اپنی قوتِ تخیل سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

”جعفر شاہ کو اب اپنے شکار کے دام میں آجانے کا یقین آ گیا تھا۔ یہ معمولی تاخیر بھی اسی لیے ہوئی تھی۔ اس نے خود پھینکا تھا۔ اس سے شکار بدگ گیا۔ جال ایک عورت پھینکا رہی تھی۔ جو خالی ہاتھ ہو اور تب بھی اچھے بھلے آدمی کی عقل کو گھاس چرانے کے لیے روانہ کر دیتی ہے۔ وہ ناز و ادا کے چکر سے یا مخصوص زنانہ جنگی حکمت عملی اختیار کر کے مولانا کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہ کرے تو اس کا نام عورت نہیں۔“

زمین کے سارے کانڈات ایک فائل میں تھے۔ اس فائل میں سو سال پرانے کانڈات بھی اپنی اصلی خستہ حالت میں موجود تھے۔ ان کا کنڈ براؤن ہو گیا تھا اور موڑنے سے ٹوٹا تھا۔ نسل در نسل یہ زمین قانونی وارثوں کو منتقل ہوتی آئی تھی اور اس کا ریکارڈ متعلقہ دفاتر میں موجود تھا۔ آخری انتقال دس سال پہلے مولانا کے نام پر ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی اور وہ غیر شادی شدہ تھے۔ بھاپے اور بیماری کے باعث ان کے ابا نے یہ کام اپنی رحلت سے پانچ سال پہلے کیا تھا۔ مولانا کی شادی سے چند ماہ بعد ہی وہ وفات پا گئے تھے۔

یہ فائل پلاسٹک کے جزدان جیسے تھیلے میں احتیاط کے ساتھ بند تھی۔ اور بہت سے نوادرات کے ساتھ اس خاندانی صندوق میں دفن تھی۔ جو خود نادر روزگار ہو چکا تھا۔

مولانا کی بیوی نے قفل کھول کر فائل نکالی اور اس کا بطور مطالعہ کیا۔ وہ میٹرک پاس تھی اور انگریزی بڑھ سکتی تھی۔ اس نے آخری حصے کی دستاویزات کو دیکھا جن کا تعلق مولانا کی اراضی کی منتقلی تھا۔ اسے کئی جگہ

”ب سے موثر ہوں گے آپ کے آنسو۔ جو شوہر کے دل پر تیزاب کا کام کرتے ہیں۔ میں خود بھی ایک شوہر ہوں۔ مجھے تجربہ ہے کہ بیوی غلط بات بھی مجھ سے کہے منواتی ہے۔“ وہ ہنسا۔

”یہ کوئی غلط بات بھی نہیں۔ بس فرق آپ کے اور میرے طریقے کا ہے اور رشتے کا۔ بچوں کی وجہ سے ان کا رویہ کچھ بدلا ہے۔“

”پھر میں کیا کروں۔ حکم فرمائیں۔“

”آپ قانونی کارروائی مکمل کریں۔ کچھ دنوں تک میں فون کر کے آپ کو بتا دوں گی۔ کہ معاملات کہاں تک پہنچے۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ وہ سب کچھ دیا ہی ہو جائے گا۔ جیسا آپ چاہتے ہیں۔ شاید اس منصوبے کو تھوڑا بہت بدلنا پڑے۔ مولانا شاید آپ کو ٹھیکہ دینے پر راضی نہ ہوں۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ میں یہ کام ان کی آسانی کے لیے کر رہا ہوں۔ خیر جیسے ان کی مرضی۔ مجھے یہ زیادہ بہتر لگے گا کہ میں ان کو نقد رقم ادا کروں وہ جیسے چاہیں کریں۔“

”اس میں غلط کیا ہے۔ زمین کے مالک وہ ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کے منصوبے میں ایسے شریک ہو۔ کہ ان کی حیثیت محض ایک تماشائی کی رہ جائے۔ ان کو کبھی پکائی سے بہتر وہ خود کی محنت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تاکہ ان کو اطمینان رہے کہ صرف سرمایہ ہی نہیں محنت بھی ان کی ہے۔“

جعفر جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اس نے بڑے بڑے دعوے کرنے والوں کو مایا جال سے بچنے کی شعوری کوشش میں لاشعوری طور پر گرفتار ہوتے دیکھا تھا۔ مولانا جیسے مفتی اور بہیز نگار بھی اپنے ضمیر کو بچانے کے لیے عقل کے دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر کسی عذر اور مجبوری کے جواز کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جس کی آڑ میں رند کے رند رہے جنت نہ گئی۔ والی بات سچ ہو گئی۔ الزام ان پر نہ آئے۔ بچوں پر آئے۔ جنہوں نے انہیں تحریریں گناہ کی جانب جذباتی دباؤ سے دھکیلا۔ بلکہ میل کیا اور فائدہ اٹھایا۔ انسان کمزور اور شیطان ضرور

مولانا کے دستخط نظر آئے۔ جواتنے سہل اور واضح تھے کہ کوئی بچہ بھی ان کی نقل کر سکتا تھا۔ اس نے پریکٹس کی تو ایک صفحہ بھرنے سے پہلے ہی اس میں روانہ لگئی۔

اگلے دن جعفر کو اس کا فون اسی وقت موصول ہوا۔ وہ صبح سے اس فون کال کا منتظر تھا۔

”بیگم صاحبہ مجھے آپ کی سمجھ بوجھ پر مکمل بھروسہ تھا۔ ماشاء اللہ آپ فہم فراست میں اپنے شوہر سے بہت آگے ہیں۔“

مولانا کی بیوی کے لیے یہ الفاظ اجنبی تھے۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ خوش آمد بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ ”بہت شکریہ شاہ صاحب“ میں نے یوں ہی تو دعوا نہیں کیا تھا۔“

”احسان ہے آپ کا۔ اگر آپ چاہیں تو میں کمیشن سے دگنی رقم ابھی آپ کو مل کر پیش کر دوں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ میں خود مشکل سے فون کرنے نکلے ہوں۔“

”کیا یہ ممکن ہے بیگم صاحبہ کہ آپ میرے دفتر میں بالمشافہ ملاقات۔“

”میں ایک گھر بیو خاتون ہوں۔ پردہ نشین۔ دفتر آنا میرے لیے ناممکن بھی ہے اور غیر محفوظ بھی۔“

”آپ کمال کرتی ہیں۔ آپ میرے لیے ہشیرہ سے زیادہ واجب الاحترام ہیں۔“

”میں سمجھتی ہوں۔ لیکن فائل وہاں نہیں آسکتی۔“

”آپ تو آسکتی ہیں۔“

”میرا آنا کیوں ضروری ہے۔ آپ یوں کریں کہ بھیمانہ کی رقم کے ساتھ تشریف لائیں۔ سیل ایگریمنٹ اور رسید مجھے دے جائیں۔ میں دستخط کروا کے رکھوں گی۔“

”کرا کے رکھیں گی۔ دستخط تو سامنے ہونے چاہیے۔ جب باقی کی رقم کی ادائیگی ہوگی تو مولانا کو ہمارے ساتھ جانا پڑے گا رجسٹرار آفس۔ وہاں دستخط رجسٹرار کے سامنے کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اصل میں

شناختی کارڈ دیکھتا ہے۔ ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے پرنٹ بھی لیتا ہے۔ رجسٹری تو بعد میں ہوتی ہے۔ بقیہ رقم کی ادائیگی رجسٹرار کے آفس میں ہوگی۔“

”یہ سب بھی ہو جائے گا۔ پہلے ایگری منٹ اور سیل کی بات کریں۔“ مولانا کی بیوی کو یہ سب معلوم نہیں تھا، لیکن وہ اطمینان سے بولی۔

”ساری رقم یکمشت ادا کر دی جائے تو ایگریمنٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ سب وہاں ہوتا ہے جہاں جائیداد خریدنے والا کچھ مہلت مانگتا ہے۔ اس میں مہینہ دو ماہ کی مہلت دے کر بھیمانہ پکا کر لیا جاتا ہے۔ کوئی اپنا مکان بیچے تو دوسری جگہ شغف ہونے کی مہلت مانگتا ہے۔“

”یہ سب معلوم ہے مجھے۔“

”آپ کا پانچ سو گز کا مکان خالی ہے، پھر کیا مسئلہ ہے۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ پورا پلاٹ نو سو ساٹھ گز کا ہے۔ اس میں سے آپ کو پانچ سو الگ کرانے ہوں گے، ہم خود لکیر کھینچ کر نہیں دے سکتے۔ یہ آپ کا اور یہ ہمارا۔ محکمے میں پوری ضابطے کی کارروائی ہوگی۔“

”کمال ہے یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔ حالانکہ ایسے معاملات سے ہمارا واسطہ چلتا رہتا ہے۔ آپ کو وکیل ہونا چاہیے تھا۔“ جعفر نے سر پر ہاتھ مارا۔

”بنا تو بہت کچھ چاہتی تھی۔ انٹر کے بعد شادی ہو گئی۔ بی اے تک نہ کر سکی۔ خیر یہ بتائیں بھیمانہ کتنا دیں گے۔“

”دس فیصد ہی ہوتا ہے عام طور پر۔“

”اگر آپ کچھ زیادہ کریں۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جتنا گڑبڑائیں گے اتنا بیٹھا ہوگا۔ مولانا بڑی مشکل سے نیم رضامند ہوئے ہیں۔ سامنے ہوں گے تو اثر کچھ کم ہوگا۔“ وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

”اوکے، ہم ایک چنדרہ فیصد دے دیں گے۔“

”اوکے کل شام عصر کے بعد رقم اور سیل ایگری منٹ لے آئیں۔“

ہو۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہے۔ ڈاکوؤں کو کیا معلوم ہوگی۔“

”میں مذاق کر رہا تھا۔“ اس نے خفت سے کہا۔
اسے بالکل احساس نہ ہو کہ جعفر صاحب سے کب اس عورت نے اسے شاہ صاحب شاہ جی۔ حضور۔ اور ڈاکو بتا دیا ہے۔ لیکن اسے ایک گھر بلوہ روہ نشین عورت کے تکلف کو بے تکلفی میں بدلنے کا پتا نہ چلا۔

اس نے برو کر سے مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ برو کر اسے بے ایمان سمجھتا کہ کمیشن بچانے کے لیے اس نے براہ راست سودا کر لیا۔ حالانکہ اسے مولانا کی زمین اور ان کی فطرت کے بارے ساری معلومات اسی نے پہنچائی تھیں اور اسی نے اس کے منصوبے کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بھی کہ وہ پہلے والے خریداروں کے ناکام لوٹنے کا سبب کیا تھا۔

اگلے دن اس نے میسے اپنے بینک سے نکلائے۔ باقی دن اسے کام کے لیے آنے والوں سے فرصت نہ ملی۔ مگر غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ وال کلاک پر تھی۔ اس نے سب کام مکمل کر لیے تھے اور ایک ماہ کی مہلت مانگی تھی جس میں وہ محکمے سے پلاٹ کی تقسیم کے احکامات حاصل کر لے گا۔

اسے افسوس تھا کہ مولانا نے اس کا اتنی محنت سے تیار کیا ہوا منصوبہ قبول نہیں کیا۔ خیر اس کا اصل مقصد پلاٹ حاصل کرنا تھا۔ اب وہ ان کا پڑوس ہو گا۔ ممکن ہے وہ بعد میں مولانا کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور اگر وہ اپنی آواز سے زیادہ حسین ہوئی تو۔۔۔ اپنے خیال کی کمینگی پر اسے خود بھی شرم آئی۔

وہ چھ بجے سے پہلے ہی مولانا کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مولانا مسجد میں ہیں اور ان کے گرد آٹھ دس افراد کا حلقہ ہے۔ وہ درس و تدریس میں مصروف تھے۔

”کون ہے؟“ اس نے آہستہ سے دروازہ بجایا۔

”شام۔“ جعفر نے کہا۔

”اندر آجائیں۔“ اس نے دروازہ کھولا۔

”یہ بہت بڑی رقم ہے۔ ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔“

”ابھی تو آپ دگنی رقم دینے کو تیار تھے۔“ جعفر نے سوچا عورت کا رو بار میں ہوشیار ہے۔ اس سے بگاڑ لینے کا مطلب سودا خراب کرنے والی بات تھی۔ اور وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔ آخر وہ مولانا کی بیوی تھی۔ رقم لے کر کہاں جاسکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ رقم واپس۔ فی الحال تو وہی سب کچھ کر رہی ہے۔“

”کس سوچ میں پڑ گئے شاہ جی۔“
”کچھ نہیں۔ یہ بتادیں کہ رقم نقد میں چاہیے یا چیک کی صورت۔ اور کاغذات پر دستخط کروانے کے لیے کتنا وقت چاہیے۔ کتنے دن میں ہو جائے گا یہ کام۔“ وہ بولا۔

”کتنے دن۔۔۔ شاہ جی نقد رقم دیں۔ مغرب کی نماز کے بعد مولانا گھر آتے ہیں۔ میں دستخط کروالوں گی۔ عشاء کی نماز سے پہلے آپ آئیں اور دستخط کیا ہوا ایگری منٹ لے جائیں۔“ وہ ہنسی۔

جعفر ایک عورت کی آواز سے مار کھا گیا۔ اس کی آواز میں پڑی خود اعتمادی اور دل کو بے بس کر دینے والی کوشش تھی۔ اس نے سوچا ایک دو گھنٹے کی کوئی بات نہیں۔ میں اتنا وقت باہر ٹھل کر دروازے پر نظر رکھ کر گزار سکتا ہوں۔

”بہت بہتر بیگم صاحبہ۔ میں چھ بجے آ جاؤں گا اور پھر آٹھ بجے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ادائیگی کیسے ہوگی۔“

”کیش۔۔۔ نوٹ دیکھ کر ہی آدمی کا ارادہ بدلتا ہے۔ یہ چیک اور ڈرافٹ تو کاغذ کے پرزے ہوتے ہیں۔“

”دیکھ لیں۔ زمانہ خراب ہے۔ رات کو اتنا کیش گھر میں رکھنا ڈاکوؤں کو دعوت دیتا ہے۔“

وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی۔ جعفر کے کانوں میں نغمہ سازن کر اتری تو حلق میں شمدن کر پھیل گئی۔

”حضرت کیا آپ ڈاکوؤں کو مطلع کر کے آئیں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آپ کی پارٹ ٹائم جاب

”مجھے اسی لیے سامنے آنا پڑا۔ آپ کے اندیشے بے جا نہیں تھے، کوئی بھی عقل مند آدمی اس طرح سودا نہیں کرتا۔“ اس نے کاغذات کی فائل بستر کے نیچے سے نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

”آپ اطمینان کر لیں میں چائے لاتی ہوں۔“ وہ دس منٹ بعد آئی تو جعفر فائل کے آخری صفحات دیکھ کر مطمئن ہو چکا تھا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے جعفر نے اس کی گلابی ہاتھوں کی سبک انگلیوں کو دیکھا۔

اور اس کے اندر ان کو چھونے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ چائے لینے جاتے ہوئے وہ ہونٹوں پر لب اسٹک لگا آئی تھی اور آنکھوں میں کاجل کی سلاخی دیکھنے کے علاوہ اپنے بال کھول چکی تھی۔

”خاتون۔۔۔“ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں کانپی۔

”میرا نام زینب ہے۔“ وہ سامنے بال سمیٹ کر بولی۔

”اس وقت اچانک آپ کے شو ہر آجائیں۔“

”آج تک تو نہیں آئے۔ شادی کو چار سال ہو گئے، لیکن اگر آگئے تو آپ کو بھاگنا پڑے گا۔ جو مجھ پر بعد میں بستے گی، وہ میں بتا نہیں سکتی۔ حالانکہ میں یا آپ کوئی غلط کام نہیں کر رہے۔ اس میں ان کا اپنا ہی فائدہ ہے۔ لیکن کوئی اور صورت نہیں تھی یہ سودا ہونے کی۔ مجبوری میں آپ کو اندر بلایا۔ چائے پیئیں ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”چائے پیوں کہ آپ کو دیکھوں۔“ وہ بے اختیار بولا۔

”مگر منٹ کہاں ہے۔“

”میں اپنے رویے پر معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ ہی محسوس کرتا جو میر کر رہا ہوں۔ میری تعریف میں بدنتی شامل نہیں۔ آپ کا حسن آدمی کو بے بس اور یا گل کر دیتا ہے۔ بات اگر کسی اور نے اب تک نہیں کہی تب بھی آپ کو معلوم ہونی چاہیے۔“

”آپ چائے پیئیں گے۔“ اس نے جواب نہ دیا۔

”جی نہیں۔ بس آپ بیٹھی رہیں۔ آپ کے بچے کہاں ہیں۔“

”وہ سو رہے ہیں۔“

”کیا عمر ہے ان کی۔“ جعفر شاہ نے بریف کیس نیچے رکھ دیا۔

”ایک دو سال کا ہے۔ دو سہراچہ ماہ کا۔ میری سترہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔“ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

سمٹی سمٹائی اور لجائی ہوئی۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان دبائے۔

”یہاں آنے سے پہلے میں تذبذب کا شکار تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ جانا چاہیے یا نہیں۔ آپ نے خود بھی کہا تھا کہ آپ پردہ نشین ہیں۔ گھر میں کوئی اور نہ ہوا تو آپ کے اور میرے درمیان ڈیل کیسے ہوگی۔“

”اسے تذبذب نہ کہیں۔ آپ ڈر رہے تھے شاہ جی۔“

”سچ بھی یہی ہے۔ دھوکا ہوتا تو میں کس کا نام لیتا“

کیسے پہچانتا کہ میں نے پیسے کس کو دیے تھے۔“

جعفر کی نگاہیں اسے دیکھ کر چکا چوند ہو گئیں۔ وہ اس کے تصور سے کہیں زیادہ خوب صورت اور کم عمر تھی۔ واجبی کپڑوں میں بنامیک اپ کے بھی وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے سر پر دوپٹا نہیں تھا۔ جعفر نے اس کے سیاہ لمبے بال مل کھاتے دیکھے۔ اب اس کے چہرے پر حیا کی سرخی نمودار ہوئی تھی۔ اس نے دوپٹا سر پر ڈال کر کہا۔ ”تشریف رکھیں۔“

”دیکھئے۔ میرے اس طرح دیکھنے کا برا مت مانئے گا۔۔۔ دراصل میرے وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ مولانا کی بیوی اتنی حسین اور کم عمر ہوگی۔“

”کس اعتبار سے۔۔۔“ اس کا چہرہ لال پڑ گیا۔

وہ واضح الفاظ میں سننا چاہتی تھی کہ وہ کتنی حسین ہے۔ ”اور کچھ تو میں جانتا نہیں۔ آپ کے سراپے کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ پیش امام کی بیوی ایک عمر رسیدہ اور جاہل خاتون ہوگی۔“ وہ ہمت کر کے بولا۔

”آپ چائے پیئیں گے۔“ اس نے جواب نہ دیا۔

”جی نہیں۔ بس آپ بیٹھی رہیں۔ آپ کے بچے کہاں ہیں۔“

”وہ سو رہے ہیں۔“

”کیا عمر ہے ان کی۔“ جعفر شاہ نے بریف کیس نیچے رکھ دیا۔

”ایک دو سال کا ہے۔ دو سہراچہ ماہ کا۔ میری سترہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔“ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

سمٹی سمٹائی اور لجائی ہوئی۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان دبائے۔

”یہاں آنے سے پہلے میں تذبذب کا شکار تھا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ جانا چاہیے یا نہیں۔ آپ نے خود بھی کہا تھا کہ آپ پردہ نشین ہیں۔ گھر میں کوئی اور نہ ہوا تو آپ کے اور میرے درمیان ڈیل کیسے ہوگی۔“

”اسے تذبذب نہ کہیں۔ آپ ڈر رہے تھے شاہ جی۔“

”سچ بھی یہی ہے۔ دھوکا ہوتا تو میں کس کا نام لیتا“

کیسے پہچانتا کہ میں نے پیسے کس کو دیے تھے۔“

”ایگری منٹ کہاں ہے شاہ جی۔“ وہ اس کی بات کا جواب دیے بنا بولی۔

”اس میں رقم اور ایگری منٹ دونوں ہیں۔ باقی کام آپ کا ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ دستخط تو کیا قلم بھی کروا سکتی ہیں۔ کسی بھی مرد سے۔ ایک دو گھنٹے میں کام ہو جائے گا۔“ اس نے بریف کیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”امید تو ہے۔“

”کیا مولانا آپ سے رقم اور ایگری منٹ کا نہیں پوچھیں گے کہ یہ آپ تک کسے آیا۔“

”پوچھیں گے۔ میں بتا دوں گی کہ جعفر صاحب کے ساتھ کوئی خاتون آئی تھی۔ ان کی یو یا سیکرٹری۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

”نبوی کا نام مت لیتا۔ اس کے کانوں میں بھنک بھی بڑ گئی تو مصیبت پڑ جائے گی۔“

”کیا اتنی بد صورت ہے۔“

”بد صورت نہیں بد سیرت۔“

”مبالغے کی انتہا کرو ی آپ نے۔ آخر آپ گزارہ کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔“

”گزارہ تو آپ بھی کر رہی ہیں مولانا کے ساتھ۔ میں دو گھنٹے بعد آ جاؤں گا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا گیا۔

”کوشش تو میں کروں گی کہ آپ کا کام ہو جائے۔ اور بالفرض کسی وجہ سے فوراً نہ ہوا تو صبح لازماً ہو جائے گا۔ تاہم آپ پریشان نہ ہوں۔ دو گھنٹے بعد یہ رقم واپس بھی کر سکتی ہوں کہ آپ کل پھر یہ رقم لے آئیں۔“

”ایک اور بھی صورت ہے کہ اگر کسی وجہ سے لیٹ ہو تو کل آپ کے آفس آکر خود بھی یہ ایگری منٹ آپ کے حوالے کر سکتی ہوں۔“

”آپ خود۔ لیکن آپ کا گھر سے نکلنا۔ کیا یہ ممکن ہے۔“ اس کے دل میں چنگاریاں سی جلنے لگی۔

”میں صبح مولانا سے کہوں گی کہ مجھے میکے چھوڑ آئیں۔“

”آپ کو آفس کا پتا معلوم ہے۔“

”میں آپ سے فون کر کے پتا پوچھ لوں گی۔“

”میں صبح گاڑی بھیج دوں گا یا خود آکر لے جاؤں گا۔“

اب تو خدا سے دعا ہے کہ میرا کام جلدی نہ ہو۔ وہ بہت ہوشیار عورت تھی اور ہر خوب صورت عورت کی طرح جانتی تھی کہ اس نے اپنے حسن کا استعمال کب اور کہاں کرنا ہے۔ رقم جیتنے کے لیے اسے جعفر کے شوق کو ہوا دے کر شعلہ بنانا پڑا۔ وہ شریف۔ بزدل اور احمق تھا، ورنہ تھوڑا سا آگے بڑھ جاتا۔ اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ گلے لگا لیتا یا چوم لیتا تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھی۔ وہ صرف اتنا تھا ہونی چھتا آخری حدود عبور کرنے کے لیے اسے روکنا ضروری ہوتا۔ ایک لاکھ وصول کرنے کے لیے اس کے دل میں امید اور کامیابی کو زندہ رکھنا ضروری تھا۔

جعفر ہر نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا جو ان کے گھر سے سو گز دور تھی۔ یہاں سے وہ در جانان پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا۔

وہ کار میں بیٹھا رہا۔ مغرب کے بعد گہری تاریکی ہو گئی تو وہ گاڑی آگے لے گیا۔ وقت گزارنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اچانک اسے بیدار کیا کہ زینب نے جانتے بوجھتے اسے جام بدوش کرنے کے لیے بلایا تھا۔ تاکہ ایک لاکھ دینے سے پہلے اس کی مزاحمت دم توڑ جائے۔ اس کا انداز گفتگو کسی اجنبی کو اندر بلا لیتا۔ بچوں کو اس کے آنے سے پہلے سلا دیتا۔ اس کی کسی بات کا برانہ ماننا۔ تیار ہو کر حسن کی غارت گری کے اسباب کو ہلاکت خیز بنا دیتا۔ یہ سب اس کی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اب وہ آج دستخط نہیں کروائے گی۔ وہ جانتی ہوگی کہ یہ کام اس کے لیے ناممکن ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ ایک لاکھ کا کیا کرے گی۔ کوئی عورت جو اتنی حسین، اتنی جوان و عیار ہونے کے ساتھ ناسودہ حال اور اپنی ازدواجی زندگی سے ناخوش ہوگی۔ وہ ایک لاکھ کے پر لگا کے نہیں اڑ جائے گی۔ آزادی کے اس آسمان کی طرف جہاں خوشی کا ہر ستارہ

مولانا باریک ہوا تھا اور وہ مفلوج پڑے تھے۔ اس داغ رسوائی کو انہوں نے بڑی ہوشیاری سے چھپایا تھا۔ مگر ان کے دل کا داغ صرف موت ہی دھو سکتی تھی۔

مولوی قدرت کو شک تھا کہ مولانا زینب کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ اسی شہر میں کسی اور کی بیوی بن کر رہ رہی ہے۔ مگر یہ اندازہ کیسے کر سکتے تھے کہ وہ اسی علاقے کی ایک کونجی میں ہے۔ اپنے پرانے ایک کمرے کے گھر سے آدھا میل کے فاصلے پر۔

مولوی قدرت کو اپنے رویے کے لیے مسجد کمیٹی کے علاوہ معززین پر مشتمل ایک احتساب کمیشن کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ وہ خود کمیٹی کے صدر تھے اور ان کی معاونت کے لیے حاجی صاحب اعزازی طور پر سیکرٹری اور خان صاحب خازن کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مولانا نور الدین کے مسجد کے صدر ہونے کا سبب یہ تھا کہ مسجد ان کی ذاتی زمین پر قائم تھی، دوسری وجہ ان کی علمیت۔ عمر اور عمدہ تھی۔ وہ مسجد کے پیش امام اور نکاح رجسٹر تھے۔

اس مسجد کے آس پاس کوئی دوسری مسجد نہیں تھی۔ یہاں آبادی کے بڑھنے کی توجہ اور بہت ست تھی۔ یہ مسجد گرد و نواح کے لیے کافی تھی۔ اگر آبادی میں اضافہ ہوا تھا تو کوئی نمازی کم ہوئے تھے۔ عام نمازیوں کے لیے ہل کافی تھا اور جمعہ کی نماز کے لیے دالان بڑھ جاتا تھا۔ اس لیے دوسری مسجد کی فی الحال ضرورت نہیں تھی۔ آج بھی وہ اپنے ارادے پر قائم تھے۔ کوئی مسجد کی توسیع ضرور ہوگی۔ ان کی چندہ جمع کرنے کی مہم بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ لوگوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ جب ہم براہ مسجد کی ضرورت کے لیے رقم دیتے ہیں تو پھر چندے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ بے تحاشا کماتے تھے، لیکن خرچ صرف اپنی ذات پر کرتے تھے۔ دوسرے کو دیتے وقت جواز ملتے اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے تھے۔ ضرورت مسجد بڑھانے کی نہیں، نمازی بڑھانے کی تھی۔

حاجی صاحب کو شکایت براہ راست ملی تھی کہ

اس کی دسترس میں ہوگا۔

یہ حقیقت پسندانہ اور منطقی خیال آرکیٹیکٹ جعفر کو بڑی دیر سے آیا تھا۔ بدبختی اور کس کا نام ہے کبھی دو چار ہاتھ بام ہوں تو کمند ٹوٹ جاتی ہے۔

جعفر نے مولانا کو دروازہ بجاتے دیکھا۔ وہ بہت دیر دروازہ پینے کے بعد دوسری طرف گئے۔ اس کو خطرے کی گھنٹی اب سورا سرائیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ وہ بے بس تھا، وہ ان سے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ان کی بیوی دروازہ کیوں نہیں کھول رہی۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ سو رہی ہے گھر میں بچے بھی ہیں اور شور سے مرہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ اگر وہ اندر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے۔ کیا پچھلی طرف سے بھی باہر کا کوئی راستہ ہے۔

اس کا خدشہ اس وقت درست ثابت ہوا جب مولانا دروازہ کھول کر باہر نکلے اور دروازے کو باہر سے تالا لگانے لگے۔ وہ تیز قدموں سے روانہ ہو گئے تھے۔ جعفر نے ان کا پیچھا کیا۔ وہ ٹیکسی کو روک رہے تھے۔ اور پھر شاید وہ اس کے میکے گئے تھے۔ وہاں سے بھی وہ مایوس واپس آئے تھے۔

جعفر کے آنے سے پہلے اس نے اپنے بچوں اور کچھ ضروری سامان کو اپنی قبیلے کے سیونٹ کوارٹریں رکھ دیا تھا۔ جو اس کی رازدار بھی تھی۔ ایک لاکھ وصول کرنے کے بعد اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

اگلے دن جعفر نے مزید زلت اٹھائی۔ اس نے مولانا کو بلایا اور اپنے ساتھ ہونے والے فرائض کا بتایا۔ مولانا نے ان کو مشورہ دیا کہ میری طرح خاموش میں ہی اس کی بھلائی ہے۔ اس کے پاس نہ رسید ہے ناگوار۔ تھانے دار اسے پاگل خانے بھیج دیں گے۔



یہ تیس سال پہلے کی بات ہے۔ جعفر اسے ڈھونڈ نہ سکا تھا۔ حالانکہ وہ اس شہر میں موجود تھی۔ وہ ہارٹ فیل ہونے سے مر گیا۔ یہ دو سال بعد کا واقعہ ہے۔ اب

قدرت اللہ نے چہلم پر میزبان کو مہمانوں کے سامنے براہ راست ذلیل کیا ہے اور خازن خود وہاں موجود تھے۔ ”میں نے کسی کو بے عزت نہیں کیا۔“ وہ پائریشانی کے بولے۔

”آپ نے کہا کہ مرحوم کی روح کو اور اللہ کو پلاؤ“ زروے اور قورے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا یہ غلط تھا۔“
”سوال غلط صحیح کا نہیں۔ آپ نے سب کے سامنے میزبان کو فضول خرچ کہا۔“

”اور بے وقوف بھی۔ جسے اتنی سی بات کا علم نہیں۔“ خان صاحب نے کہا۔

”اس کے علاوہ آپ نے غلج پسندی سے کام لیا، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جلدی شیطان کا کام ہے۔“

”جی ہاں۔ تاخیر کی بھی حد ہوتی ہے۔ ہر کام وقت پر ہونا چاہیے۔ بلاوجہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کا کیا حکم ہے۔“

”میزبان نے کہا کہ آپ نے مہمانوں کے آنے انتظار بھی نہیں کیا۔“

”اور کتنے مہمان آنے تھے رات دس بجے کے بعد میں نے کسی کو آتے نہیں دیکھا۔“

”سیکر اور وزیراعلا کے آنے سے پہلے ہی آپ نے چہلم کی فاتحہ پڑھ لی تھی۔“

”چہلم۔ کیا چہلم۔ وہ ایک دعوت تھی۔ تقریب تھی۔ خود ان کے بچے اسے تقریب کہہ رہے تھے سب ہنس کھیل رہے تھے مرنے والے کا کسی نے نام لیا۔ میں نے کسی کو تعزیت کرتے نہیں دیکھا۔“

”دیکھئے۔ آپ جس لیے بلوائے گئے تھے۔“

”میں اس لیے بلوایا گیا تھا کہ میں ملاؤں کے سووہ لطفے سنوں۔ حلوہ خواری کے طعنے سنوں۔ مجھے چندہ کھانے والا کہا جائے۔ آپ دیر کی بات کرتے ہیں۔

دیر سے میزبان کو سروکار نہیں تھا۔ اس نے کھانا ایک کمرے میں رکھ کر کہا کہ فاتحہ کرو اور جاؤ۔ جیسے میں مہمان تھا ہی نہیں۔ ایک اجرتی ملا تھا۔ مجھے مولانا کی

فکر تھی۔ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان لوگوں کو دین سے کیا اور عالم دین سے کیا۔ اس سے ان کی دنیا داری کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخرت کا ثواب کمانے کے لیے مسجد کو چندہ دے دیتے ہیں۔ جمعے کے جمعے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ فرض نماز کے لیے وقت نہیں۔ عید کی واجب نماز کے لیے دوڑتے ہیں۔

عمرے حج کرتے ہیں۔ باپ مرجائے تو کرائے پر مولوی لے آتے ہیں۔ فقیروں میں دیگ تقسیم ہو جاتی ہے۔ اگر کسی منسٹر کو دل کا دورہ پڑنا تو پولیس کا پہرہ بٹھا دیتے کہ کوئی ملے نا۔ کارڈ پر گیٹ ویل سون لکھ کر دعا دیتے ہیں۔ اور مولانا نور الدین مرتا ہے تو مرے اس کی جگہ لینے والا قدرت اللہ ہے نا۔ یہ ہے عالم دین کی وقعت۔“

سب نے ان کی بات غور سے سنی، لیکن وضاحت تسلیم نہ کی۔ ”یہ ایک الگ بحث ہے اس وقت مسئلہ آپ کے رویے کا ہے، جس کو ناپسند کیا گیا۔“

”میں کیا اور میری اوقات کیا یہ لوگ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ فعل کی پروا نہیں کرتے۔ آپ کا عقیدہ اپنی جگہ مگر محترم۔ کیا ایسی دعوتوں سے تجشش ہو جاتی ہے۔ یہ

کون سا شرعی طریقہ ہے۔ آپ مغفرت کے لیے دعا کریں۔ قرآن پاک ختم کریں۔ ایصال ثواب کریں۔

دن رات کریں، سارا سال کریں۔ مجھے بتائیں وہاں کتنے لوگوں نے ایک بار پڑھا۔ چالیس سال سے جس شخص کی حیثیت دینی رہنما کی ہے کیا کسی نے اس کی عیادت کی۔ حق ہسائیگی ادا کیا۔“

مسجد کمیٹی نے خود کو بے عزت محسوس کیا۔ وہ خود بھی اس علاقہ کے معزز لوگ تھے اور قدرت اللہ براہ راست ان کو بے عزت کر رہا تھا۔ ملزم اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے جج پر الزام عائد کر رہا تھا۔ یہ تو بین عدالت جیسا سنگین جرم تھا معاشرے نے رفتہ رفتہ مولویوں کے حقوق و فرائض محدود کر دیے تھے۔ یہ

مولوی اس حد سے گزر رہا تھا۔ مولانا نور الدین مصالحت کرنا جانتے تھے۔ ان کے رویے میں لچک

میں اپنی موت کی دعا بھی مانگتے ہوں گے۔ جس سے ان کی اور قدرت کی زندگی آسان ہو جائے۔ چار ہفتے جو مولوی قدرت نے اسپتال کے چکر لگتے تو امانت کرتے گزارے تھے وہ بہت سخت تھے۔ ان کو امید تھی کہ مولانا کے صحت مند ہونے کے بعد ان کی ذمہ داریوں کا بھار کچھ کم ہو جائے گا۔ لیکن اب اس بوجھ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اسپتال میں یہ کام نرسیں اور ڈاکٹر کرتے تھے، جبرے میں یہ کام بھی مولوی قدرت کو کرنا پڑتا۔

مولوی قدرت نے دو دن ان کے لیے رقیق غذا گھر سے تیار کروا کر ان کو کھلائی۔ انہوں نے ان کا جسم اسفنج کے ساتھ صاف کر کے ان کو صاف کپڑے بدلوائے۔ صبح سے شام تک مولانا کو سنبھالنے کے لیے ان کو کوئی نہ کوئی مددگار مل جاتا۔ اصل مسئلہ رات کا تھا۔ رات کو قدرت اللہ سوئے اور کئی گھنٹے سوتے رہے، آنکھ کھولی تو ان کو بڑی شرم آئی کہ اگر وہ اسی طرح رات بھر سوتے رہے تو مولانا کو بیک سوزر ہو جائے گا۔ لیکن ایک شخص جو دن کو مصروف رہتا۔ وہ رات کو کیسے جاگ سکتا تھا۔ یہ سوال پریشان کن تھا۔ انہوں نے رات کے لیے رضا کار مانگے۔ لیکن یہ بہت مشکل تھا۔ کون ان کے لیے اپنا گھر یا چھوڑ کر آسکتا تھا۔



”بس اب میرا تمہارے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے طلاق دو۔“ تیسرے دن ان کی بیوی نے شور ڈالا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو نیک بخت۔ کچھ اندازہ ہے۔“

”اندازہ نہ ہوتا تو خاموشی سے بھاگ جاتی کسی آشنا کے ساتھ۔ جسے نور الدین کی بیوی بھاگی تھی۔“ وہ چلا کر بولی۔

”اس کی بات نہ کرو۔ مجھ سے کیا شکایت ہے تمہیں۔“

”کیا تم اندھے ہو یا پاگل۔ کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا

تھی۔ وہ کہتے تھے قدرت، دین کے لیے تند و تلخ سب سننا پڑتا ہے۔ بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاشرہ ایک دن میں نہیں سدھر سکتا۔ لوگ برائی کی طرف جارہے ہیں تو انہیں روکنا ہمارا کام ہے۔ اپنی بساط کے مطابق اپنا کام ایمان داری سے کرتے رہنا۔ ہر بات ڈنڈا مار کے کہنا مناسب نہیں۔ اسلام محبت سے پھیلا ہے۔ طاقت اور جبر سے نہیں۔ لوگوں کو پیار اور آسانی سے سمجھاؤ۔ دیکھو یہ بدی کی مسموم فضا میں رہنے والے کو تم نیکی کے کیا مواقع فراہم کر سکتے ہو جس سے ان کو فائدہ ہو۔

چار ہفتے بعد مولانا کو اسپتال سے جواب مل گیا۔ ”اپنے مریض کو گھر لے جائیں اور ان کا علاج جاری رکھیں، یہاں رکھنے سے ان کو کوئی افادہ نہیں ہوگا۔“ ایک ڈاکٹر نے کہا۔

”لیکن یہ تو جبرے میں اکیلے رہتے ہیں ان کی دیکھ بھال۔“

”یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ ہم دوائیں لکھ دیں گے۔ آپ ان کا علاج جاری رکھیں۔“

”لیکن کب تک۔“

”جب تک یہ زندہ ہیں۔ ان کو نہ ملانا دھلانا۔ کپڑے بدلوانا۔ اور ہر پندرہ منٹ بعد کروٹ بدلوانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ زخم پڑ جائیں گے۔“

”ان کی حالت میں بہتری کی امید۔“

”اللہ شفا دینے والا ہے۔ بہتری ہوئی تو براہ نام۔ یہی کیا کم ہے کہ ان کو ہوش آگیا۔ یہ دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ ان کا دماغ بھی ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اگر آپ محنت کریں گے۔ ان کو ورزش کروائیں گے۔ تو شاید یہ ہاتھ ہلا سکیں۔ کھانا خود چبا کر کھالیں۔ ابھی تو ایسی خوراک چلے گی جو ان کو چچے سے دی اور حلق میں اتر گئی۔“

سخت افسردہ اور مایوس قدرت اللہ اپنے استاد کو واپس لائے تھے۔ مولانا کی نگاہیں چھت پر ٹکی رہتی تھی۔ اور ان کے خود بخود آنسو جاری ہو جاتے۔ شاید ان کو اپنی بے بسی کا احساس تھا اور شاید وہ دل ہی دل

کہ اس گھر میں ایک ماہ سے کیا ہو رہا ہے۔

”یہ ٹھیک ہے کہ مولانا کی علالت کی وجہ سے میں زیادہ مصروف ہوں۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔
 ”نہیں تم گھر سے لا تعلق ہو گئے ہو۔ تم بیوی بچوں کو بھول گئے ہو۔ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ گھر میں کھانا پکاتا ہے تو کیسے پکاتا ہے ایک پیسہ بھی تم نے اس پورے ایک ماہ میں دیا۔ میں نے سوچا تھا کہ بڑھا مرے گا تو۔“

”خاموش جاہل عورت۔ اس کے بعد ایک لفظ بھی اور نہیں۔“ وہ دھاڑے۔

”کیا کرو گے۔ گلا کاٹ دو گے۔ جان سے مار دو گے۔ طلاق دے دو گے۔ اب مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ بہت دن تمہارے ساتھ صبر و شکر سے گزار لیے۔ اب اور نہیں۔ تمہاری آمدنی ختم ہو گئی۔ جو بچے تم سے بڑھتے تھے اب ان کو کوئی اور پر دھا رہا ہے۔ اپنا حال دیکھو۔ ان سے زیادہ بیمار لگتے ہو۔ پہلے دن کو ان کے پاس رہتے تھے۔ اب رات کو بھی گھر آنے کی فرصت نہیں۔ نہ تم میرے شوہر ہو۔ نا ان بچوں کے باپ۔ تم صرف مولانا کے مرید ہو۔ پیش امام۔ وہ بھی قائم مقام۔ لوگوں نے تمہیں چٹلم، جنازے، نکاح پر بلانا چھوڑ دیا ہے۔ ہم کیوں تمہارے ساتھ بھوکے مرے۔ وہ تو پڑا ہے لاش کی طرح۔ اللہ کا عذاب ہے کہ جان نہیں نکلتی۔ اعمال اچھے ہوتے تو نزع کی تکلیف کیوں اٹھاتا۔ اپنی دنیا بھی خراب کی اور عاقبت بھی۔ تم بھی اب وہی کرنا چاہتے ہو۔“ وہ رو رہی تھی۔

مولوی قدرت اللہ نے ایک جھانپڑ سپرد کیا اور وہ گری اور بے ہوش ہو گئی۔ بچے رونے لگے تو ان کو ہوش آیا۔ آدی دیل سے لاجواب ہو تو طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ انہوں نے بیوی کو بستر پر لٹا کر پانی چھڑکا اور بچوں کو چپ کر دیا۔

”مار ڈالو، ہم سب کو اور سکھ کے ساتھ اس کے ساتھ رہو۔ اس کے اعمال کی سزا ہمیں نہ دو۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ لوں گی۔ سمجھ لوں گی میں بیوہ

ہوں۔ بچے اب جیسے ہیں اس سے اچھا نہیں۔“
 ”خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ جہاں اتنا گزارہ کیا وہاں کچھ دن اور صبر کر لو۔ میں مسجد کی کمیٹی سے بات کرتا ہوں۔“

”اس کے بعد کون سا ہمارے دن پھر جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی تنخواہ تمہیں ملے گی۔“

اس دن قدرت استاد مكرم کو ناشتہ بنا بھی بھول گیا۔ ورنہ وہ فجر کے بعد گھر آتے تو ساگودانہ تیار ملتا تھا۔ جو وہ ان کے منہ میں ڈالتے تھے۔ دوپہر میں دلیا اور شام کو حریرہ کھا کر وہ سیر ہو جاتے۔ ان کی نگاہوں میں قدرت اللہ کے لیے احسان مندی اور تشکر کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ قدرت کی سمجھ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ادھر مولانا توجہ کا رلوں مالتے تھے۔

دوسری طرف بیوی بچے تھے۔ نہ وہ مولانا کو چھوڑ سکتے تھے۔ نہ بیوی بچوں کو۔

مسجد کے اراکین نے مولوی قدرت کی بات غور سے سنی اور اتفاق رائے سے مسترد کر دی۔ ”آپ بلاشبہ آزمائش سے گزر رہے ہیں۔“

”میں چاہتا تو کہ اس ذمہ داری میں دوسرے بھی شریک ہوں میں اس بھار کو اکیلے نہیں اٹھا سکتا۔“
 ”کسی بیماری کی تیمارداری کرنا کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں۔ چھوڑ پیش امام ہیں۔“

”پیش امام وہ سب کے تھے۔ آپ سب نے بھی برسوں ان کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ کیا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں حاجی صاحب۔“

”جیسے میں کب سے مسجد کمیٹی کا سیکرٹری ہوں۔ میری اپنی بھی کاروباری اور گھریلو ذمہ داریاں ہیں۔“
 ”گھر تو میرا بھی ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ ان کا گزر اوقات کیسے ہو گا یہ بھی سوچانے آپ نے۔“

”اس کے لیے سب کا کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش ہوتا ہے۔ تمہارا بھی تھا، لیکن تم نے وہ گنوا دیا، اپنے غلط رویے کی وجہ سے۔ اب ان بچوں کے والدین تم سے ناراض ہیں جن کو تم قرآن پڑھاتے تھے۔“

”سبحان اللہ۔ قرآن پڑھانے کے لیے ضروری

گئے۔ حالانکہ انہوں نے ایک غیر قانونی حرکت کی۔
لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے سوائے مولانا کا
فیصلہ ماننے کے۔ لیکن اس میں تنخواہ کا مسئلہ کہیں
نہیں ہے۔“ خان صاحب نے کہا۔

”کمینی مجھے فئزز سے تنخواہ دینے کی مجاز ہے۔“
”ہاں اس کے لیے صدر کی توثیق چاہیے اور مولانا
کی ایسی حالت نہیں کہ وہ اجلاس کی صدارت
کریں۔“

اس رات قدرت اللہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ
نماز عشاء کے بعد سجدے میں سر رکھ کر بہت روئے۔
”یا اللہ میری مدد فرما۔ میری مشکل حل کر۔ اور میری
پرو مشر کی مشکل آسان فرما۔ ان کو شفا نہیں دے
سکتا تو میرے معبود ان کو اپنے پاس بلا لے۔“

اس دعا کے بعد بہت روئے پھر مولانا کو دعا دے کر
رخصت ہو گئے۔ ان کی ہمت نہ تھی کہ کہتے کہ بیوی
حق زوجیت مانگتی ہے تو میں کیسے انکار کروں۔ مولوی
قدرت کی بیوی بلاشبہ شاکر اور صابر خاتون تھی۔ اس
نے تنگی، ترشی، ہر حال میں اپنے شوہر کا ساتھ نبھایا۔
مگر جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے تھے ان کی معاشی
ضروریات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کو معاشرے میں
رہتے ہوئے احساس کمتری اور محرومی کا احساس ستانے
لگا تھا۔ مگر نور الدین کے ہوتے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان
کی سوچ کا معیار بدلے۔ جس قناعت کی تعلیم وہ دیتے
تھے مولوی قدرت کے حالات۔ وہ مطابقت نہیں
رکھتے تھے۔ وہ اکیلے تھے، ان کی ضروریات محدود
تھیں۔ مگر مولوی قدرت اللہ صرف ان کے گھر کے
نائب ہی نہیں سربراہ بھی تھے۔ مگر مذہب داریوں کے اس
پہلو میں ان کی توجہ کم تھی۔

رات کو مولوی قدرت اللہ بیوی کو اپنی مجبوریوں کا
حال سناتے ہوئے رو پڑے۔ مرد اس وقت روتا ہے
جب اندر سے ٹوٹ پھوٹ جائے اور اس کی قوت
فیصلہ، قوت ارادی۔ اور قوت عمل پر کسی کا اختیار
نہ رہے۔ انہوں نے بیوی کو کمینی کے فیصلہ سے بھی
اگلا کیا۔

ہے کہ میں اللہ کی خوشنودی کو بھول کر ان کی خوشی کا
خیال رکھوں۔“

”پھر ایک ماہ تم انہیں پرہانے بھی نہیں گئے۔“
”کیسے جاتا خان صاحب، میں پانچ وقت مسجد میں رہ
کر باقی وقت اسپتال گزارتا تھا۔“
”تم ان کو یہاں کیوں لائے۔“

”میں نہیں لایا۔ اسپتال والوں نے فارغ کیا ہے۔
یہ کہہ کر ان کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔“
”اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”آپ تنخواہ مجھے دیں۔ امامت میں کروانا ہوں۔
اس سے میرا کچھ گزارہ ہوگا۔“

”یہ تو ایک انتظامی مسئلہ ہے۔ آپ کی امامت اپنی
جگہ ہے۔“ خان صاحب نے حاجی صاحب کو دیکھا اور
کہا۔

”معاوضہ صرف مسجد کا مقرر کردہ پیش امام ہی لے
سکتا ہے۔ خود مولانا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے، وہ
کمینی کے صدر تھے اور یہ فیصلہ وہ لے سکتے تھے۔“
”وہ فیصلہ کر چکے۔“ انہوں نے مختار نامہ ان کے
سامنے رکھا۔

”یہ کب کی بات ہے۔ یہ تو پرانا مختار نامہ ہے۔ سچ
والا۔“

”اس پر ہمارے بھی دستخط ہیں۔“ خان صاحب
نے کہا۔

”لیکن یہ ایک ماہ پہلے کا ہے۔“
”جی ہاں۔ اس پر دستخط اور تاریخ انہوں نے اس
دن ڈالی تھی جس دن وہ بیمار تھے۔“

”یہ تو بڑی غلط حرکت کی انہوں نے۔ یہ کوئی
بلنٹیک چیک نہیں تھا کہ جب چاہا بھریا۔“

”تاریخ ڈالنے سے پہلے ہم سے ہی مشورہ
کر لیتے۔“ حاجی صاحب نے کہا۔

”ان کے پاس وقت کہاں تھا۔ ان کی حالت
مسلل بگڑ رہی تھی۔ آپ لوگ ہوتے تو ضرور مشورہ
کرتے۔“

”چلو ٹھیک ہے، ہم یہ بات کسی کو نہیں بتائیں

”شاید مینوں یا سالوں۔ اللہ ان کو اس عذاب سے بچائے۔“

”مجھے تو نہیں لگتا وہ زیادہ دیر جنیں۔ مولانا تو خیر مسجد کی زمین کے مالک تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں۔“

”اولاد ہے۔ لیکن ان کے لیے تو مر گئی ہے۔“

”تو بعد میں کون اس زمین کا مالک ہو گا۔“

”حکومت لے لے۔ یا پھر ٹرسٹ۔“

”مگر حقارت نامہ تو تمہارے نام ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ان کے بعد پیش امام تم ہی رہو گے۔ نکاح رجسٹرار بھی تم ہو گئے اور ہر اس جگہ جاؤ گے جہاں ان کو بلایا جاتا تھا۔ تم صدر رہو گے مسجد کے۔“

”شاید۔“

”شاید کیوں۔ یقیناً۔“ اور کون ہے تمہارے سوا۔ سب جانتے ہیں کہ تم ان کے والی وارث ہو۔ ورنہ وہ ساری ذمہ داری تم کو کیوں سونپتے۔“

”مگر یہ کوئی سخت یا گدی نشینی کا مسئلہ نہیں ہے۔“

”مگر یہ حق ہے تمہارا۔ ایک قانونی کاغذ پر کی تحریر ہے۔ اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ بس تم اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔ یہاں کوئی مانگے سے حق نہیں دیتا حق کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔ اگر تم تیار ہو تو مجھے بتا دو۔“

”میں تیار ہوں۔ مگر تم کیا کر لو گی۔“

”میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ بس تم سو جاؤ اعتماد سے۔“

مولوی صاحب سو گئے۔ سکون کی ایسی نیند جواب

ایک حسرت بن گئی تھی۔ انہیں مولانا کا خیال بھی آیا۔

آج وہ ایک کروٹ پڑے رہیں گے۔ مگر ایک رات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک رات میں زخم پیدا نہیں ہوں گے۔ ہر رات ان کو نیند کی دوا دی جاتی تھی اور صبح تک وہ سوتے تھے۔ اس کے باوجود جب قدرت ان کی

کروٹ بدلتے تو ان کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج ان کو

اس کی غیر حاضری محسوس ہو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ

سمجھ لیں کہ میں آگیا ہوں۔ دو مہینے یا دو سال خدمت

کرنی پڑی تو اخلاقی تعلیم کے سارے سبق بھول

”شرم بھی نہیں آتی ان لوگوں کو۔ یہ حاجی صاحب کس لیے کمیٹی کے سیکرٹری بنے ہیں۔ صرف اس لیے تاکہ ہر سال مسجد کے رنگ و روغن اور مرمت کا خرچ اٹھاتے ہیں۔ سرکاری ٹھیکے دار ہیں۔ سرکاری ٹھیکے دار ہیں۔ لاکھوں جو ہر مہینے کماتے ہیں۔ سب بے ایمانی کی کمانی ہے۔ جس سے کروڑوں بنا لیتے ہیں۔ دو شاویاں کر رکھی ہیں۔ گاڑی ہے۔ لیکن کسی کو حق کی کمانی دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اور یہ جو خان صاحب ہیں شرم کی کمانی ہے۔“

”چھوڑو بیگم، کس کس کو رو نہیں گے۔“

”کیا ان کو خیال نہیں آتا کہ ایک آدمی نماز پڑھا کر کیسے اپنے اخراجات پورے کرے۔ سب تو مولانا نہیں ہو سکتے۔“

”تنخواہ کم سے کم میرا حق ہے۔ میں مولانا کی ہدایات پر کام کر رہا ہوں۔ اخراجات پوری کرنے کرنے کے لیے مجھے اتنی رقم دی جائے کہ میں یکسوئی سے اپنی ذمہ داریاں نبھاسکوں۔“

”مولانا تو نکاح رجسٹرار بھی تھے۔“

”مگر میں ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔“

”کیا تم نکاح نہیں پڑھا سکتے۔“

”نکاح کیا ہے صرف قبول و ايجاب۔ لیکن مجھے کوئی بلائے گا نہیں۔ کیونکہ میں رجسٹر نہیں ہوں۔“

”تو تم رجسٹریشن کروالو۔“

”مولانا کے ہوتے۔“ انہوں نے افسوس سے

کہا۔

”میں کہتی ہوں اگر کل کو ان کا انتقال ہو جائے۔“

”میں نے آج بھی دعا کی تھی، اللہ ان کی مشکل آسان کرے۔ ان کو شفا نہیں دے سکتا تو موت دے دے۔“

”کیا واقعی ان کے شغلیاب ہونے کا چانس

ہیں۔“

”ڈاکٹر تو یہی کہتے ہیں۔ لیکن اللہ کی رحمت سے

ایس نہیں ہونا چاہیے۔“

”آخر کب تک ایسے رہیں گے۔“

جانب بڑھی اور پلٹ کر دیکھا۔ اصل مسئلہ باہر قدم رکھنے کا تھا۔

باہر اندھیری رات کا سناٹا ہر طرف محیط تھا۔ اس نے چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی۔ مسجد کے حجرے کے لیے پندرہ بیس منٹ کا راستہ تھا اور کسی بھی عورت کے لیے اس وقت باہر نکلنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ بلا ضرورت گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور تیز قدم اٹھاتی رہی۔

معمول کے مطابق صبح کاذب سے پہلے ہی مولوی صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے کلمہ پڑھا اور اٹھ گئے۔ ان کی بیوی بے سدھ سو رہی تھی۔ اس کا لباس بے ترتیب تھا اور سانس بھی تیز تھی۔ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے سر رٹولی رکھی اور دروازہ کھول کر نکل گئے، ان کی بیوی فجر کے وقت اٹھتی تھی۔ وہ مسجد پہنچ کر ہی وضو کرتے تھے۔ لیکن آج ان کو پہلے غسل کرنا تھا۔ لیکن انہیں آج پیرو مرشد کی جانب سے غفلت شرمندگی میں مبتلا کر گئی۔ وہ اپنی غیر حاضری کی کیا وضاحت پیش کریں گے۔ کیا وہ سچ بولے بنا اپنی کوتاہی کی معافی مانگ لیں۔ وہ غسل جنابت کے بنا مولانا کو چھونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ جب آدم کو حوا کے بنا جنبت بھی قید تنہائی لگتی تھی پھر ابن آدم بنت حوا کے بنا دنیا میں کیسے رہ سکتا تھا۔

وہ حجرے میں پہنچے تو مولانا جاگ رہے تھے۔ مولوی صاحب کے پاس وقت کم تھا۔ چند منٹ بعد ان کو اذان دینی تھی۔ اس لیے پہلے وہ مولانا کی کراٹ بد لانا چاہتے تھے۔ رات بھر سیدھے لیٹے رہنے سے ان کی کمر بند آگ بھڑگنی ہو گئی۔ وہ ان کو پاؤں لگا کر اذان دے لیں گے۔ پھر پانی کا کام کریں گے۔

جب مولوی صاحب نے ان کی کراٹ بدلوانے کو کوشش کی تو انہیں مولانا کا وزن بھاری لگا۔ مولانا لپکے بھی نہیں جھپک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی خشک تھیں۔ صبح اٹھتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے۔ جب وہ عام لوگوں جیسے تھے تو کلمہ پڑھ کر

جاتے استاد کا درجہ کیا ہے۔ اس کی خدمت کا اجر کیا ہے اور سعادت مندی کے تقاضے کیا ہیں۔

لیکن مولانا جہاں دیدہ اور عالم ہیں۔ وہ قدرت کی مجبوری کو سمجھ لیں گے۔ آدمی بشریت کے تقاضے کے ساتھ بے بس ہے۔ وہ مشین نہیں ہے۔ اس کے لیے ہر بات کی ایک حد ہے۔ وہ کتنی مدت بھوکا رہ سکتا ہے۔ کتنے دن جاگ سکتا ہے۔ کتنا عرصہ ایک شادی شدہ مرد بیوی سے دور رہ سکتا ہے۔

ایک ماہ بعد ان کو لگا جیسے وہ راہ سے ہٹک گئے ہیں۔ صحرائی کڑی دھوپ کے بعد اپنا گھر کسی نخلستان سے کم نہیں۔ بچے مسکرا رہے تھے اور بیوی کے بدن کی درد آشنا مہمان قرمت نے ان کے دل میں وہ سکون بھر دیا تھا جس سے محرومی کی سزا وہاں ایک ماہ سے بھگت رہے تھے۔

ان کی بیوی جاگتی رہی۔ آنکھیں بند کر لینے کے بعد بھی اس کی کیفیت جاگتی ہوئی تھی اور سوچتی رہی کہ مولوی صاحب نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ مولانا کی اذیت ختم کرنے کے لیے ان کی موت کی دعا مانگ چکے ہیں۔ موت کے سوا ان کی اذیت کا خاتمہ کوئی مسیحا نہیں کر سکتا۔ مولانا کی زندگی دو سروں کی زندگی کا عذاب بن گئی تھی۔ اگر وہ زندہ رہے تو شاید ایک گھر ٹوٹ جائے۔ اگر وہ زندہ ہی رہی تو سہاگن ہو کر بھی بیوہ بن کر رہ جائے گی۔ طلاق کا لفظ تو اس نے محض ان کو ڈرانے کے لیے استعمال کیا تھا اور حیران تھی کہ اس میں اتنی جرات کہاں سے آئی کہ اس نے یہ منحوس لفظ استعمال کیا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو آج غصے میں بولے جانے والا یہ لفظ اس کی ضد نہ بن جائے اور اگر کسی دن وہ بھی غصے میں یا زنج ہو کر میرا مطالبہ پورا کر دے تو کیا ہو گا۔ صرف ایک مہینہ میں اس کے گھر میں تلخی بھڑگنی۔ سکون غنقا ہو گیا۔ اس کا اثر بچوں پر پڑے گا۔

رات دو بجے وہ آہستہ سے اٹھی۔ مولوی صاحب کی نیند میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر ان کی آنکھ کھل گئی تو وہ پیاس کا مہمان بنا دے گی۔ وہ بے پاؤں دروازے کی

ان کا جسم تڑپنے سے قاصر تھا، ورنہ وہ بھرپور مزاحمت کرتے۔ کوئی عورت تو کیا، کوئی مرد بھی ان کی جان اتنی آسانی سے نہیں لے سکتا تھا۔

مولانا کا جسم تھر تھرا یا ضرور تھا۔ اس نے ایک خفیف سی لرزش محسوس کی تھی۔ مگر انہوں نے حلق سے کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ وہ ان کے نزاع کے عذاب کے طول نہیں دیتا چاہتی تھی۔ جانے اس کے نازک ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے پوری قوت سے تکیہ دیا دیا تھا۔ اس پر جنون سوار تھا۔

”مجھے معاف کر دینا مولانا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ تمہارا وجود باعثِ رحمت تھا، لیکن اب باعثِ زحمت بن گیا تھا۔ تمہارا اپنا جینا کوئی جینا نہیں تھا۔ لیکن تم نے دوسروں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے آج تک ایک چوبی کو بھی نہیں مارا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں خود کو اور اپنے بچوں کو اذیت میں نہیں دیکھ سکتی تھی اور میرے خیال میں تمہارے لیے بھی اس عذاب چھٹکارا ضروری ہو گیا تھا اب تو تمہارے شاگرد رشید اور مرید قدرت بھی تمہاری موت کی دعا مانگ رہے تھے۔ میں نے تو صرف سب کی مشکل آسان کی ہے۔“

وہ اپنے آپ سے ایک یزدانی کیفیت میں باتیں کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے مولانا کے منہ پر تکیہ رکھے، تنقیہ دی ہوئی ہے۔ مولانا کب کے مر چکے ہیں۔ وہ ایک لاش سے باتیں کر رہی تھی۔

”تکیہ ہٹاتے ہی اسے پہلی بار خوف اور دہشت کا احساس ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مولانا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔ اسے لگا کہ ان کی آنکھوں میں ملامت نہیں تشکر تھا۔“

وہ تکیہ پھینک کر بھاگی۔ اس کے ہاتھوں کی کئی چوڑیاں زور لگانے سے ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ ان کا بچے کے غزلوں کو سمیٹتی۔ اسے تو یہ بھی خیال نہیں رہا کہ وہ تکیہ دوبارہ ان کے سر کے

اٹھتے تھے۔ پھر وضو کر کے اذان دیتے اور جھومتے ہوئے امامت کرتے۔ اب وہ اشاروں سے بھی نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔

قدرت اللہ کا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے مولانا کی نبض چیک کی۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ اس کی سانس کی تریل نہ ہونا دیکھ چکے تھے۔ وہ اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کا تکیہ پلنگ سے کچھ دور پڑا تھا۔ انہوں نے روتے ہوئے ان کی آنکھیں بند کر دیں۔ ان کے انتقال کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ان کا جسم ابھی اکڑا نہیں تھا اور نہ ہی ٹھنڈا ہوا تھا اور بالآخر مولانا کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ مولوی قدرت کی دعا قبول کر لی تھی۔ اچانک مولوی قدرت کی نظریں چوڑیوں پر پڑیں۔

مولوی قدرت کے جاتے ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی سانس ابھی تک پھولی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں تھے۔ اس لیے لیٹ کر سونے کی ایگٹنگ کر رہی تھی۔ مگر اس کے سانس کا مدو جزر کو روکنا اور کپکپاتے بدن کو سکون دینا آنا دشمن بن گیا تھا۔

وہ ابھی تک اس خیال سے لرز رہی تھی کہ اگر اسے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو کیسی قیامت آئی۔ اس وقت بہانہ بھی نہ چلا کہ وہ کسی کتے بلی کو بھگانے لگی تھی۔ اس کی حالت اس کا جرم فاش کر دیتی۔

مولوی قدرت سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی ہوی ان کے پاس سے اٹھ کر مولانا کا قصہ پاک کرنے لگی تھی۔ انہیں قید حیات اور قید غم سے نجات دلانے اپنا گھر اور شوہر کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ وہ یہی سمجھتے کہ بدکردار عورت کسی پار کو ملنے لگی تھی اور روز ملنے جاتی ہے، آج پکڑی گئی تھی۔ وہ مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دیتے اور اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیتے۔

اس نے بستر سے اتر کر پانی پیا۔ اس کا حلق اب بھی خشک تھا۔ اس کے لیے سانس لینا محال تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے مولانا کے لیے ہو گیا تھا۔ اس نے ان کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال کر ان کے منہ پر رکھ دیا تھا۔

نیچے رکھ دے۔ اسے اب اپنی بدحواسی کی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ حجرے سے نکلی تو اس کو ٹھنڈا ایسینہ آ رہا تھا۔ اب وہ زیادہ محتاط تھی، جاتے ہوئے کوئی بھی پوچھتا تو وہ کہہ دیتی کہ شوہر بیمار ہے، ڈاکٹر کو لینے جا رہی ہے، لیکن اب واپسی پر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بر سکون رہتے ہوئے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولنا ناممکن تھا، اس کی حالت خود اس کے جرم کی وکالت کرتی۔

اسے یقین تھا وہ تین بجے واپس آ جائے گی۔ مگر اچانک ایک کتا اس کے پیچھے لگ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہ تھا۔ اگر وہ بھاگتی تو کتا اس کے پیچھے بھاگتا۔ وہ بلا ارادہ ایک لین میں مڑ گئی۔

کتا واپس مڑ گیا۔ وہ باہر نکلی تو راستہ بھول گئی۔ اپنے گھر سے سیدھا مسجد جانے والے راستے کے سوا اس نے کوئی راستہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور خوف کا عفریت اسے گھیرتا جا رہا تھا۔ کس مولوی صاحب اس کے پیچھے سے پہلے نہ جاگ جائیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو شوہر کو دیکھ کر اپنا ڈر اور خوف بھول گئی۔ وہ خاموشی سے بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ ابھی اس نے سانس اور جسم کی کپکپی پر قابو نہیں پایا تھا کہ مولوی صاحب کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ اس نے سانس بھی روک لی۔ جب وہ کمرے سے باہر چلے گئے تو اس نے لمبی گہری سانس لی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس نے بچوں کو دیکھا اور پر سکون ہو کر سو گئی۔

اسے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا خیال آیا تو اس نے جلدی سے چوریاں اتار کر الماری میں رکھ لیں اور دوسری نکال کر پہن لیں۔ نماز فجر پڑھ کر اس نے چوہے پر چائے کا پانی رکھا اور خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرنے لگی۔

عام طور پر مولوی صاحب نماز پڑھ کر چائے پینے آتے اور ساگودانہ لے کر چلے جاتے۔ آج وہ آئیں گے یا نہیں یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اب تک ان کو

مولانا کی موت کا پتا چل چکا ہو گا۔ نماز کے بعد وہ اعلان کریں گے اور پھر تجیز و تکفین میں لگ جائیں گے۔ ایسے صدمے کی کیفیت میں ان کو چائے کا خیال کہاں آیا ہو گا۔

اس کے باوجود یہ ضروری تھا کہ وہ تیار رہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب اسے اس حادثے کی خبر سنانے آجائیں۔ چائے بنا کر اس نے ساگودانہ نکالا ہی تھا کہ مولوی صاحب ایک دھماکے سے اندر داخل ہوئے۔

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہاتھوں میں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے۔
”کیا ہوا جی۔ خیریت تو ہے۔“ اس کے ہاتھ سے ساگودانے کی پلیٹ گر گئی۔

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں رہا ہمارے پاس۔ ہم لٹ گئے۔ یتیم ہو گئے۔ برباد ہو گئے۔ مولانا صاحب۔“

”کیا ہوا۔ کیا ہوا انہیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔

”ہاں۔۔۔ وہ اللہ کے پاس چلے گئے۔ اس دنیا کو چھوڑ کر۔۔۔ میں نے ایک بار ان کی خدمت میں کوتاہی کی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اس دنیا سے حیات ابدی ہی بہتر ہے۔“

”اللہ وانا الیہ راجعون۔“ وہ بولی اور شوہر کو دلا سا دینے لگی۔ خدا کی رضائی تھی۔ تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ خود کو الزام مت دو، یوں سمجھو اللہ نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔

”میں بس یہی بتانے آیا تھا۔“
”یہ چوڑیاں کیسی ہیں۔“
”ان کو کچرے میں پھینک دو۔ مولانا کے بستر پر پڑی ملیں۔“

”ہائے اللہ۔ ان کے بستر پر۔۔۔“
”ہاں۔۔۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔“ انہوں نے بیوی کے پھیلے ہاتھوں پر ٹکڑے رکھ دیے۔
اس کی بیوی نے چوڑیاں پکڑتے ہوئے اپنے ہاتھ

کی چوڑیوں کو اس طرح سامنے کیا کہ وہ رنگوں کے فرق کو ٹھیک سے دیکھ لیں۔ ”کہیں یہ چوڑیاں ان کی بیوی کی تو نہیں۔“
 ”اب تو یہ وہ ہی کہلائے گی۔“
 ”کیوں۔۔۔ یہ وہ کیوں کہلائے گی۔ کیا نکاح باقی ہے ان کا۔“

”مولانا نے اسے طلاق کہاں دی تھی۔ لیکن اس کا یہاں کیا کام۔“
 ”کیا پتا مولانا نے اسے سنبھال کر رکھا ہونشانی کے طور پر۔“

”تو ناممکن۔۔۔ ایسی چوڑیاں ان کے بستر پر کیسے آئیں۔ وہ خود اٹھ نہیں سکتے۔ کچا صندوق سے کوئی نشانی نکالنا۔۔۔ بہر حال رات ان کے پاس کوئی عورت آئی تھی۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانے سے کیا حاصل۔۔۔“

”گندے لوگوں کی گندی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ تم سارے کلمے اٹھالائے تھے نا۔“ اس نے کلمے کوڑے میں ڈالے۔

”ہاں۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔۔۔ اعلان کر دیا ہے۔ باقی کے انتظامات کر لوں تو پھر ظہر کے بعد ان کی تدفین کر دی جائے گی۔“ انہوں نے آنکھیں صاف کیں اور باہر نکل گئے۔ چور جوان کی بیوی کے اندر چھپ کر بیٹھا تھا باہر نکل گیا۔ ”پاگل کی بچی، شکر کربال بال بیچ مٹی۔ ورنہ نہ یہ شوہر رہتا، نہ بچے اور نہ گھر۔“ بھانسی کا بھندہ الگ تیار رہتا۔ سوچ مولوی صاحب یہ کلمے گھر کیوں لائے تھے۔ وہ یہ راستے میں بھی پھینک سکتے تھے۔ پھر نہیں لاکر کیوں دیے۔“

اسے چکر سا آیا اور وہ اٹھ بیٹھی۔ ”کہیں ان کو شک تو نہیں ہو گیا۔“

چور بولا دنیا کے ہر شخص کے اندر ایک قاتل چھپا بیٹھا ہے۔ اکثر وہ تمام عمر سامنے نہیں آتا۔ مگر جب بقا کا مسئلہ اتنا شدید ہو جائے اور اس کا کوئی حل نہ ہو تو پھر ایک پزیر اور کم ہمت، کمزور اور شریف آدمی کے اندر کا قاتل وہ سب کچھ کرتا ہے جس کے بارے دنیا سوچ

”مولانا کا انتقال کب ہوا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں ملازم سے پوچھا۔

”آخر کون تھی وہ۔ مولانا کی ایک بیوی ضرور تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ تیس سال پہلے کی بات اس چوکیدار کو معلوم ہے۔ چوہا بھی خود تیس کا نہیں ہے۔ جیسے انہوں نے سنی تھی ویسے کتنے سوں نے سنی ہوگی۔ شاید باپ نے بھی سنی ہوگی۔ کچھ لوگ مولانا کے بارے میں ایسی باتیں ضرور کرتے ہوں گے۔ کرتے رہے ہوں گے۔ اور ایسا پھر کریں گے۔“

”خیر۔۔۔ اس سے اسے کیا فرق پڑتا ہے، وہ نجمہ ہے۔ شاہدہ نہیں جو مولانا کی منکوحہ تھی۔ جو ایک دن ان کی نقد رقم لے کر فرار ہو گئی۔ وہ یقیناً بہت سوہنی تھی۔ جب ہی تو جعفر شاہ کا اس پر دل آیا تھا اور دل نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس عورت سے دھوکا کھا گیا۔“

شاہدہ نے اسے بڑی ہوشیاری سے اسیر کیا تھا۔ اپنی معصومیت سے اس نے اسے یہ تاثر دیا تھا کہ وہ بہت پاک باز اور پردہ نشین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کے نکاح میں زینب نام کی کوئی عورت نہیں تھی۔ وہ کسی زینب کو جانتے نہیں تھے۔ لیکن شاہدہ نے جعفر کو یہی نام بتایا تھا۔ جعفر کی بات کسی نے بھی نہیں سنی۔ وہ اس کے میکے بھی گیا۔ لیکن وہاں بھی اس کی بات کسی نے بھی نہیں سنی۔ اس نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی چاہی۔ لیکن اس کے پاس اپنی بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا، لیکن وہ یہ بات بھیلانے میں کامیاب رہا تھا۔ مولانا کے حق میں گواہی دینے والے ایک نہیں دس تھے کہ مولانا اس زمین کو بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے جعفر کو بے عزت کر کے گھر سے نکال

دیا تھا اور اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ ان کو بے عزت کر کے لیا تھا۔

شاہدہ کو معلوم تھا کہ بعد میں یہی ہوگا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ساری تیاری پہلے کر لی تھی۔ جعفر اگر رقم نہ لایا تو کوئی بات نہیں۔ یار زندہ محبت باقی۔ وہ پھر کوشش کرے گی کہ وہ اعتبار کر کے چلا جائے اور اگلے روز پر شوق جذبات کے ساتھ دیدہ دل فرش راہ کے اپنے آئس میں اس کا انتظار کرے۔ مگر اس کے لیے جتنی کشش ایک عورت کے حسن شباب میں تھی، اتنی ہی رقم میں۔ چنانچہ وہ دو مخالف مگر مساوی قوتوں کی رسمہ کسی میں جہاں تھا وہاں کھڑا تھا۔

وہ پچھلی طرف صحن میں گئی۔ بریف کیس کو دو بار پر رکھا اور گلی میں اتر گئی۔ رات کے اندھیرے میں کسی نے بھی اسے چوروں کی طرف فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ گلیاں اور سڑکیں جہاں دن میں سنسان رہتی تھیں۔ رات کے وقت ان کی ویرانی اور بڑھ جاتی تھی۔ چوکیدار ایک مشینی مستعدی کی طرح رات کو گزرتا دیکھتے رہتے تھے۔ جیسے اسٹیٹ لائٹ اور فون کے کھمبے۔ ان کی اہمیت بھی اس سے زیادہ نہیں تھی۔ شاہدہ نے دوسری کو بھی کے سروٹ کو ارٹھر سے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور اس مالی کی بیوی کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے اس کا رخبر میں اس کی بیوی کی بھی۔ وہ خود تقریباً اسی حالت سے گھر سے نکلی تھی اور ایک جنم سے نکل کر اس نے اپنے خوابوں کی جنت پالی تھی۔ یہ اس کا خیال تھا۔

شاہدہ نے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر معلوم کیا تو پشاور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ مسافروں کا رش دیکھ کر اس نے ایک قلی سے رابطہ کیا اور اسے اضافی پیسے دے کر فرسٹ کلاس میں دو ٹیٹس مل گئیں تھیں۔ اس کا سارا اثاثہ ایک بریف کیس اور ایک سوٹ کیس تھا۔ اس نے بریف کیس کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا اور اسے یقین تھا کہ جعفر نے اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

شاہدہ نے مسٹر اور مسز منصور کے نام سے ریزویشن حاصل کی تھی۔ مگر وہ اگلے دن شام لاہور میں اتر گئی۔ اسے ڈر تھا کہ جعفر پولیس کے ذریعے اسے ریلوے اسٹیشن پر ضرور ڈھونڈے گا۔ اس کا سارا سفر چار برتھوں والے کپار ٹمٹ میں ہی گزرا۔ باقی دو برتھوں پر ایک بوڑھی عورت اور اس کا جوان بیٹا تھا۔ شاہدہ نے اسے اپنا نام مجھ بتایا تھا۔ یہ کہا کہ لاہور میں اس کامیکا ہے اور وہ واپس لاہور جا رہی ہے۔ جہاں اس کا شوہر لاہور کالج میں لیکچرار ہے۔

چار سال پہلے جب اس کی شادی مولانا سے زبردستی کی گئی تھی تو باہر بھی لیکچرار ہی تھا۔ وہ سائنڈ ایئر میں تھی جب اس کا اچانک احساس ہوا کہ باہر کو پسند کرتی ہے۔ وہ کلاس یا لیکچر کے دوران اسے دیکھتی رہتی اور اس کی باتوں پر حیران ہوتی۔ اس کے پاس علم کے ساتھ ڈگری اور آنے والی روشن خیالی اور تہذیب تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے ذہن پر اپنا قبضہ جما گیا۔

اپنے آپ سے اظہار محبت کے بعد وہ شدید باپوسی کا شکار ہو گئی۔ باہر اس سے دس سال بڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ نہ وہ اس کے خاندان کے بارے میں جانتی تھی۔ خود اس کے لیے اس کا حصول چاند کی خواہش کرنے کے مترادف تھا۔ اس کا کاکڑ بھی باپ اولاد کے معاملے میں انتہائی سخت مزاج تھا۔ شاہدہ نے ضد کر کے داخلہ تو لے لیا تھا، مگر اسے اپنی اے کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کا باپ دن رات کسی اچھے رشتے کی جستجو میں تھا۔ اس کے نزدیک ہر لڑکی کی زندگی کا مقصد صرف گھر بنانا ہے۔

شاہدہ کو یقین تھا کہ باہر صرف اس کا ہی نہیں پوری کلاس کا محبوب ہوگا۔ ہر لڑکی اس پر مرتی تھی۔ کیونکہ وہ رومانی ناولوں کے صفحات سے جسم ہو کر حقیقی دنیا میں قدم رکھنے والا ریڈی میڈ ہیرو تھا۔ خوبصورت خوش پوش۔ خوش اخلاق۔ مہذب۔ اور اعلا تعلیم یافتہ۔ چنانچہ جب اچانک اسے احساس ہوا کہ باہر نے اسے پرنسپل کے آفس کے باہر آمدے میں روک کر

لما وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ تو شاہدہ لڑ رہا
گئی۔
”جی کہئے۔“

”پہل نہیں کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ لائبریری
ہی آجائیں۔“ اس نے کہا۔
”جی سر۔۔۔ ہو سکتا ہے۔“ وہ زور سے گئی۔
لائبریری تک پہنچنے ہوئے شاہدہ خیالات کے
گرداب میں گھر گئی۔ کیا اس نے کوئی غلطی کی تھی۔
کسی نے اس کے بارے میں کوئی شکایت تو نہیں
کردی۔ انہوں نے میری ذہنی غیر حاضری کو نوٹ کر لیا
تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میرا دھیان لیکچر کی
طرف نہیں ان کی طرف ہے۔

بار کے آنے تک وہ بری طرح گھبراہٹ کا شکار رہی
تھی۔ وہ خاموشی سے آیا اور سامنے بیٹھ گیا۔ ”کتاب
درمیان میں کھول لیں۔“
شاہدہ نے کانپتے ہاتھوں سے کتاب کھول کر اس
کے سامنے رکھ دی۔

”میں نہیں چاہتا کہ کوئی غلط کا غلط مطلب
نکالے۔ اور آپ کے یا میرے بارے غلط رائے
نکالے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”میں لمبی بات نہیں کروں گا۔ مجھے آپ کے
بارے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے صرف یہ دیکھا آپ
ذہین ہیں، کچھ باتیں آپ نے کتابوں میں لکھیں وہ آپ
کو نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ مگر آپ کے ذوق اور
خیالات نے مجھے متاثر کیا۔ میں آپ سے شادی کرنا
چاہتا ہوں۔ جب تک آپ کا تعلیمی سلسلہ جاری ہے،
میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ نہ یہ چاہوں گا کہ
کوئی آپ کا نام میرے نام کے ساتھ لے۔ اگر آپ کی
نسبت کہیں طے ہے یا آپ کسی اور سے شادی کا ارادہ
رکھتی ہیں تو اس بات کو یقینی ختم سمجھیں۔ میں آپ
سے معذرت کر لوں گا اور پھر آپ کی طرف دیکھوں گا
بھی نہیں۔“

آپ کے بارے میں سوچوں گا بھی
نہیں۔“
”کیا ایسا ممکن ہے سر۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ

بولے۔
”اور تاکام رہے تو۔۔۔“
”پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کسی دوسرے شہر،
ملک یا کان کن۔ یقین کروں میں تمہارا نام بھی لب پر نہیں
لاؤں گا۔ نہ میں کسی کی زندگی ڈسٹرب کرنا اچھا سمجھتا
ہوں۔ نہ محبت کے نام پر جذبات سے کھیلنا۔ میرا
سیدھا سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے۔ اگر ہے تو میں
کس سے بات کروں۔ میرے باپ، ماں ہیں نہیں۔
چچا نے پرورش کی، وہ لاہور میں ہیں اور وہ یہاں نہیں
آئیں گے۔ بھائی کینیڈا میں ہے۔ پھر میں خود بات
کروں۔“

شاہدہ کا جسم ٹھنڈا اڑا گیا اور زبان کنگ ہو گئی۔ وہ
کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ یہ سب اسے ایک
خواب محسوس ہوتا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ چانک نیند
کھولنے سے اس کا خواب نہ ٹوٹ جائے۔

”کیا میں آپ کے والد سے بات کروں۔“
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

”مقتدک یو۔۔۔ اب میری زندگی میں کچھ سکون
ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے آپ کے والدین نا نہیں
کریں گے۔ میں انہیں ہر طرح سے مطمئن کر سکتا
ہوں۔ بات طے ہو جانے کے بعد ہم ایسے ہی رہیں
گے جیسے اب رہتے ہیں۔ نو خط و کتاب، نو فون، نو
مسکراہٹوں کا تبادلہ۔ رائٹ۔۔۔“

”لیں سر۔۔۔ مگس۔“
”مگر بولو۔۔۔ جو کہتا ہے ابھی کہہ دو صاف
صاف۔۔۔“

”اگر۔۔۔ آپ خود۔۔۔ میرا مطلب آپ کے بزرگ
یہ کام کرتے۔“

”ٹھیک ہے، میں اپنے چچا کو بلانے کی کوشش کرتا
ہوں، دراصل ان کا احسان ہے مجھ پر کہ انہوں نے
مجھے اپنے گھر میں رہنے دیا اور میری تعلیم کا سلسلہ بھی
منقطع نہیں کیا۔ مگر ایک تو ہمارے والدین کا مکان تھا

اور اس پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ میں ان پر تھانہ چھری نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میرے بھائی نے ان سے وہ مکان لے لیا اور پیسے لے کر کینڈا چلا گیا۔ میں نے اپنی تعلیم بھی مکمل کی اور ہوشل میں رہنے لگا۔ بھائی نے مجھے خرچا بھیجنا شروع کر دیا۔ جب میں پیکچر لگا تو انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا۔ میں ان کو ہرگز انکار نہ کرنا اگر ان کی بیٹی کے ساتھ میرا گزارہ ہوتا۔ آپ سے اس کا موازنہ نہیں۔ اگر وہ حسین تھی تو آپ حسین تر تھے مگر حسین ہونا میرے لیے اہمیت نہیں رکھتا۔ میں نے آپ کو ایک سال دیکھنے پر کھنے اور سوچنے کے بعد پسند کیا ہے۔ میں نے چچا سے معذرت کر لی۔ ان حالات میں چچا کا آنا مشکل ہی لگتا ہے، لیکن میں پھر بھی بات کروں گا۔“

اس نے کوشش کی اور وہ ناکام ہو گیا۔ وہ مایوس نہیں ہوا اور چچا سے مایوس ہونے کے بعد خاندان کے دوسرے بزرگوں کو اپنا مسئلہ بتایا۔ مگر خاندان کے مسئلے پر سب ایک ہو گئے۔ ایک بھائی نے اس سے مکان چھینا اور دوسرے نے رشتے سے انکار کر کے ان کی تذلیل کی ہے۔ اب وہ کس منہ سے اپنی ضرورت کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ خود بابر نے دوبارہ شاہدہ سے اس مسئلے پر بات نہیں کی۔ شاہدہ نے ہی ایک دن خود اسے روک دیا۔

”میں لائبریری میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔“ اور جواب سنے بغیر چل پڑی۔

”جی فرمائیے۔ کیا کہنا ہے آپ کو۔“ وہ تھوڑی دیر بعد آگیا۔

”کیا آپ کو اندازہ نہیں کہ مجھے کیا کہنا دو گا۔“

”آپ پوچھنا چاہتی ہیں کہ میں چار ماہ کیا کرتا رہا۔ میں ابھی تک چچا کے ساتھ پیغام لے کر کیوں نہیں آیا۔“

”آپ نے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ سے خود پوچھوں۔ کیا آپ کا فرض نہیں کہ آپ مجھے خود بتاتے۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”آزاد ایم سرری۔ میرے پاس بتانے کے لیے کچھ

نہیں تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا۔“

”آپ کب تک کوشش کریں گے۔ چار مہینے کم تو نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک کہتی ہو تم، مگر ابھی تک مجھے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ میں ایک بے خاندان کا شخص ہوں۔ جہاں تک رشتوں کا تعلق ہے، تو پرانے رشتے باقی ہی نہیں رہے، میرے اپنے حوالے بہت ہیں اور معتبر بھی، مگر شاید تمہارے گھر والوں کے لیے مستند نہیں۔“

”پھر کیا کرو گے تم۔“ اس نے سر یا آپ کہنے کی بجائے تم کہا۔

”تم ہی بتاؤ۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”میرے ابا نے ایک رشتہ پسند کر لیا ہے۔ ابھی تو طے نہیں کیا۔ مگر تم نے دیر کی تو ہو جائے گا۔“ اس پر گھبراہٹ سوار تھی۔

”تمہاری مرضی کے بغیر کیسے ہو گا۔“

”جیسے ہر روز، ہر جگہ سیکڑوں ہزار ہوتے ہیں۔“

”تمہارے والد دین کا علم رکھتے ہیں۔ کیا شرعی احکامات سے ناواقف ہیں۔ باج مرد اور عورت کو پسند نا پسند کا حق حاصل ہے۔“

”تم جاننے ہو کہ ایسا کیس بھی نہیں ہوتا۔ رسا“

اخلاقاً اور خانہ پر کی کے لیے بھی ان کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ ماں باپ جو فیصلہ کریں وہ ان کو قبول کرنا پڑتا ہے۔“

”تم قبول مت کرنا۔ انکار کر دینا۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔“

”یہ ناممکن ہے میرے لیے۔“

”پھر ایک صورت رہ جاتی ہے کہ میں تمہارے والد سے خود بات کروں۔ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہ میں ایک شریف اور ذمے دار انسان ہوں۔ بے عیب تو صرف ایک خدا کی ذات ہے۔ مگر وہ معلوم کر لیں میرے بارے میں عام رائے کیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہیں مایوسی ہو۔ یا تمہیں بے عزت کر دیا جائے۔“

راخ عقیدہ صرف مسلمان ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے کافی کہا اور پھر مجھ سے ایسے سوال کیے کہ جس سے میں لاجواب ہو گیا اور پھر مجھ دھکے دے کر نکلا دیا۔ ان کے پاس جو نوجوان بیٹھے تھے وہ بہت جاہل قسم کے نوجوان تھے۔ اگر بات بڑھ جاتی تو مجھے قتل کر دیتے۔ وہ مسلح تھے اور میرے دلائل نے ان کو مشتعل کر دیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے لوگ دین سے بھاگتے ہیں۔ جیسے تمہارے ابا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ یہی ہو گا۔ کیا تم میری خاطر ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے؟“

”کیا میں منافقت کرتا بھوت بولتا۔ دین اور ایمان کے معاملے میں۔ تم کیا کہہ رہی ہو شاید۔ صرف شادی کرنے کے لیے میں ان کے مسلک کا ہو جاتا۔ اتنا گرا ہوا آدمی تمہارے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔“

”کچھ دیر کی بوجھل خاموشی میں شاہد اپنے آنسو پتی رہی اور بال پوائنٹ سے لکھتی رہی۔ جب صفحہ بھر گیا تو باہر کے سامنے کر دیا۔ جس پر لکھا تھا کہ ”میں اس مولوی سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔“

”ہو قونی کی بات مت کر۔ ایسی کوئی مشکل نہیں جس کا کوئی حل نہ ہو۔“

”ہاں ایک حل جسے تم نے اصولی اختلاف کی بنا پر قبول نہیں کیا۔ اور ایک حل اور ہے۔ شاید آخری حل۔“

”یہ کہ میں تم سے سولہ مہینہ کر لوں۔ تم گھر سے بھاگ کر آ جاؤ۔ اور میں دو گواہوں کی موجودگی میں تم سے نکاح کر لوں۔ تو میں اس معاشرے میں جس چیز کی ڈرتا ہوں وہ ہے رسوائی۔ میرے پاس اپنی عزت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور تمہارے پاس کیا سرمایہ ہے۔ عزت کے سوا۔ میں رسوا ہو کر اس معاشرے میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ لوگ میری طرف انگلی اٹھائیں اور تمہارے بارے میں باتیں کریں۔ میں جہاں جاؤں وہاں تہمت کا یہ داغ میرے ماتھے پر سجا ہو

”کسی کے بے عزتی کرنے سے میری عزت کم نہیں ہوگی نہ ہی میں کو شش سے پہلے مایوس ہونا جانتا ہوں۔“

”پھر تو آج رات ہی ان سے مل لو۔ نماز عشا کے بعد وہ فارغ ہوتے ہیں۔ کل میں پھر تم سے یہی ملوں گی۔“

”نہیں۔ یہ دوسری بار ہے کہ مجھ سے ملنے تم میری آتی ہو۔“

”دیکھنے والا کون ہے یہاں۔ صرف لائبریرین۔ کیا پتا کہ تم مجھے ٹیوشن پر دھارہ ہو یا کوئی سوال بھارہ ہو۔“

”نہیں تم اسٹاف روم میں آ جاؤ۔“

”اسٹاف روم میں۔ سب کے سامنے ملنا اچھا لگے۔“ وہ حیرانگی سے بولی۔

”سب کے سامنے ملنا اچھا ہے۔ سب سے چھپ رٹنے سے مجھے خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوتی ہے۔“

”سر مجھے سوال سمجھنا تھا آپ سے۔“ دوسرے نے دوسرے پیر میں اسٹاف روم میں پہنچ گئی۔

”ایکسیوزی۔ کیا سوال ہے ایسا۔“ وہ امینان سے اٹھ گیا۔

”سوال تم جانتے ہو۔“ وہ اسٹاف روم کے کونے میں بیٹھ گئے۔

”ہاں۔ میں زندگی کے ہر امتحان میں فرسٹ اپرین میں پاس ہوا۔ لیکن اس امتحان میں بری طرح ناکام ہو گیا۔“

”کیوں۔ ابانے انکار کر دیا۔“

”ہاں۔ اور انہوں نے مجھے بے عزت کر کے نکال دیا۔ مجھے ان سے حسن اخلاق کی توقع تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری جائز بات سن لیں۔ مگر ان کے نزدیک

ہاں اور ناجائز کا معیار بالکل غلط ہے۔ انہوں نے مجھ سے زیادہ میرے مسلک اور عقیدے کو اہمیت دی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان فردی مسائل کا مجھے زیادہ پتہ

نہیں جن پر فرقوں کی بنیاد ہے۔ میرے نزدیک میرا

کہ میں نے شاگرد اور استاد کے رشتے کا استحصال کیا ہے۔ اس کو بے آبرو کیا ہے۔ لوگ ایسی بات بھی نہیں بھولتے۔ خود کو معزز اور معتبر بنانے کے لیے ایسے موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے ابا بھج پر اغوا کر مقدمہ دائر کر دیں۔ اور جب ہم مجرم بن کر کٹہرے میں جائیں تو عدالت تمہارے باپ کے حق میں فیصلہ دے اور اگر میرے حق میں دے تو تمہارے باپ کے جونی شاگرد مجھے قتل کر دیں اور اگر ایسا نہ ہو تو ہماری اگلی تسلیں شرمندگی سے سر نہ اٹھا سکیں۔ اچھا ایسے تھے تمہارے والدین۔ ”سوری شاہدہ میں تم سے شادی کر دوں گا تو اعلانِ ورنہ چوروں کی طرح چھپ کر نہیں۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے بزدل اور خود غرض ہو۔ محبت کرنے والے تو جان دے سکتے ہیں۔“

”جان میں بھی دے سکتا ہوں۔ لیکن تمہاری اپنی عزت داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ رہی محبت تو اس کا اظہار میں لفظوں میں کیسے بنا سکتا ہوں۔ فلمی ہیرو کی طرح تمہیں محبت نائے لکھوں گا ناگا کر سناؤں۔“

اگلے دن اسے کلج جانے سے روک دیا گیا۔ اس کے باپ نے اس سے باہر کے بارے بات نہیں کی پر فیصلہ سنایا کہ اس کی اگلے ماہ مولانا نور الدین سے شادی طے کر دی گئی ہے۔

اس کا پہلا بیٹا سرکاری زچہ خانے میں ہوا۔ اسے تین دن اسپتال رہنا پڑا۔ ایک دن نرس نے اسے اخبار لا کر دیا۔ اس نے ویسے ہی وقت گزاری کے لیے اخبار پڑھنا شروع کیا۔ مولانا اخبار نہیں منگواتے تھے ان کے خیال میں اخبار بے حیائی پھیلاتے ہیں۔ صرف تین دن اخبار پڑھ کر اسے سکون کا احساس ہوا۔ وہ کلج کے ریڈنگ روم میں باقاعدگی سے اخبار پڑھتی تھی۔ اچانک اس کی نظر اخبار میں باہر کے ہنستے مسکراتے چہرے پر پڑی۔ ”کینڈا یونیورسٹی سے پاکستان کے انگلش کے استاد اسکا رشب کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔“ تو وہ چلا گیا۔ چلو کوئی تو وعدہ نبھایا اس نے۔ وہ ایسا ہی تھا۔ محبت کو اس نے الفاظ اور قالب میں

محدود نہیں کیا۔ سمندر کی وسعت اور گہرائی کسا کی محتاج کہاں ہوتی ہے۔ مگر اس نے محبت کسا وقار دیا۔ اس کی آبرو مندی کو مقدمہ جانا۔ گزر جانے والے ہر لمحہ کا عکس اس کی نظر میں زندہ ہو گیا جیسے وہ ہی ہو۔ آنسو خود بخود اس آنکھوں میں آگئے۔ چلو اچھا ہوا۔ امید ختم ہوا۔ انتظار ختم ہوا۔ وہ سمندر پار انتظار کی حد سے بھی آگیا۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے ورنہ کیا پتا بھی اس کا کہاں بھی ہو تا تو زخم پھر ہرے ہو جاتے۔



لاہور میں اس کا کوئی رشتے دار اور شناسا نہ رات اس نے ریلوے کے مسافر خانے میں کلا سے یقین تھا کہ چند دنوں میں اسے رہائش کے مکان مل جائے گا۔ وہ کرائے کے گھر کے کچھ بھٹ نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ پندرہ بیس دن اسے ذاتی خریدنے میں لگ جاتے۔ ہوٹل میں ٹھہرنے ڈرتی تھی کہ کہیں پولیس نہ پکڑ لے۔ جعفر کا کوئی نہیں کہ وہ بھاگ جانے کی خبر کے ساتھ اس کی تو بھی اخبار میں لگوا دے۔

اس نے کرائے کا مکان لینے کا فیصلہ کیا۔ نے سب سے پہلے اس سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔

”آپ کے شوہر کیا کام کرتے ہیں۔“

”سرکاری ملازم ہیں۔ اکثر دورے پر ہیں۔ آج کل ملک سے باہر ہیں۔“ اس نے سے تیار جواب دیا۔

”وہ اچھا۔ ابن۔ غلام رسول کا بھی یہ ہی ہے۔ خود گھر سے گیا ملک سے باہر رہتے ہیں اور والی کو اندر باہر کے سارے کام خود کرنے ہیں۔“ اس نے آفس میں بیٹھے ایک شخص کو کہہ کر سن کر یں بھائی تو گزرا کہہ گئے۔ ان دو بچوں ساتھ سارا دن خواری ہوتی ہے کن کے پاس چھ ان کو۔“

”اُمی آپ کدھر رہتی ہیں۔“
 محمد ریس۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن وہ
 ہادی ضرورت سے زیادہ بڑا ہے ہم اتنا زیادہ کرایہ
 نہیں دے سکتے۔“
 ”چھاجی۔ ابھی ادھر ایک مکان ہے دو کمروں کا۔
 بڑے میاں بیوی رہتے ہیں۔ سب بچوں کی شادیاں
 ہو چکی ہیں اکیلے ہوتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو۔ کرایہ
 بھی مناسب ہے۔“

شہدہ فوراً رضامند ہو گئی۔ اس نے اسی شام اپنا
 ملان سمیٹا اور نئے گھر پہنچ گئی۔ ایڈوانس دے کر اپنا
 ضرورت کا سامان لے آئی۔ بروکر اپنا کمیشن لے کر
 ہلا گیا۔ اگلے دن وہ برقع اوڑھ کر سودا سلف لینے گئی۔
 ملار کو دیکھا۔ اس میں اس بارے تصویر تو دور اس
 امت کی خبر تک نہ تھی۔ اس سے شہدہ کی ڈھارس
 مٹ گئی۔ اس نے بڑے میاں بیوی پر اعتبار قائم
 کر لیا۔ وہ پرانی وضع کے لوگ تھے شہدہ کے حسن
 طلاق نے انہیں متاثر کیا۔ شہدہ بھی ان سے محبت
 کرنے لگی تھی۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے اپنے شوہر
 اور خاندان کے بارے جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔

ایک ہفتے بعد اس نے خریداری کے بہانے مکان
 تلاش کرنا شروع کیا۔ اپنی پسند کا ایک مکان اسے دو
 راز میں مل گیا۔ یہ پانچ مرلے پریتا ہوا ایک پرانا مکان
 تھوڑا آبادی بھی پرانی تھی لیکن جگہ صاف تھی۔
 گھر کے قریب ایک پرائمری اسکول تھا۔ جہاں بچے
 می پڑھ سکیں گے اور وہ خود بھی پڑھا سکے گی۔ وقت
 لازاری کے لیے اچھا مشغلہ تھا۔

اس نے ہیمانہ لودا کیلوار کہا کہ فوری قبضہ چاہیے۔
 نے کہا کہ ضروری کارروائی ہوتی رہے گی اور مکمل
 ایجنسی کر کے شفٹ ہو گئی۔ ٹھیک پندرہ دن بعد اس
 نے مسٹر ایڈمز منجہ بابر کے نام رجسٹری حاصل کر لی۔
 شہدہ جواب منجہ بابر تھی۔ اس نے رقم اپنے اصل
 ادراہ قومی بچت میں جمع کرائی، باقی رقم سے اس نے
 گھر کا ضروری سامان خرید لیا۔ اور اپنی زندگی کے
 ہرے دور کا آغاز کیا رشتوں اور حوالوں کے بغیر۔

نہ سہی تو حسرت ہی سہی۔ منجہ بابر کے لیے
 زندگی کا سب سے کھٹن دور تھا۔ اس نے اپنے
 سارے رشتوں کو بھلا دیا تھا۔ اس سب کے لیے وہ
 مرجی تھی۔ اب بہر حال اسے تنہا جینا تھا۔ اس نے
 اپنے لعلق کو انتہائی محدود رکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ
 اس کے بروسی اس کی نجی زندگی کے بارے جتس کا
 شکار ہوں کہ اسے ایک جھوٹ بھانے کے لیے دس
 جھوٹ بولنے پڑے۔ اسلم دو سال تھا اور فرخ چھ ماہ
 کا۔ اس نے بچوں کو پالنے کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ
 پھر شروع کیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ بابر سے رابطہ قائم کرنے کی
 کوشش کرتی رہی۔ اس نے کالج کے پرنسپل کو خط لکھا
 لیکن اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔
 آخر کار پرنسپل نے اسے جواب دیا کہ اس کی پاس بابر کا
 ایڈریس نہیں ہے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور
 پرنسپل سے کالج کے فون پر خود بات کی۔ اس کے
 اصرار پر انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس کو ایڈریس دے
 دیں گے۔ اسے اسکا رٹپ ملا تھا۔ اس کے پاس
 تمام کوائف موجود ہوں گے۔

وہ بی اے کر چکی تھی جب اس کو بابر کا ایڈریس
 ملا۔ ساتھ میں فون نمبر بھی تھا۔ اس نے رات کو
 ایک پبلک کال آفس سے اسے کال کی۔ دھڑکتے دل
 کے ساتھ وہ اس کی ہیلو کی منتظر تھی۔

جب کال ملی تو اس نے بابر کی آواز سنی۔ ”ہیلو۔“
 ”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ مشکل سے بولی۔
 ”تم۔۔۔۔۔ شہدہ۔۔۔۔۔“ وہ شدید حیرت کی انتہا پر تھا۔
 ”ہاں۔۔۔۔۔ تم نے پہچان لیا۔“ ہزار ضبط کے باوجود
 اسے آنسو روک نہ پائی۔
 ”کہاں سے بات کر رہی ہو تم۔۔۔۔۔“

”لاہور سے۔۔۔۔۔“
 ”تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ۔ کیا بات
 ہے۔۔۔۔۔“
 ”مجھے تمہاری ضرورت ہے۔۔۔۔۔ میں اکیلی ہو گئی
 ہوں۔۔۔۔۔“

”کیوں۔ تمہارا۔ شوہر۔“

”نہیں، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میں اس جہنم میں نہیں رہ سکتی تھی۔ میں مرجائی۔ خودکشی کر لیتی لیکن میں نے سوچا ایک بار تم سے بھی پوچھ لوں۔ کہ کیا میں مرجاؤں۔“

”ڈونٹ بی سلی۔ تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں ہے۔“

”اور کس کی ہے۔ تم سمندر پار چلے گئے۔ تم نے شادی کر لی ہوگی۔ میری بھی دینچے ہیں۔“

”میں شادی کیسے کر لیتا۔ یہ تو صریحاً دھوکا ہوتا۔ اس محبت کے ساتھ جو میں نے تم سے کی تھی۔“

”میں نے بھی زندگی کا ہر لمحہ تمہارے ساتھ جیا ہے۔ تمہارے سوا اور کوئی مجھے نہیں اپنا سکتا تھا، جسم کا کیا ہے یہ تو کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ بیچ سکتا ہے۔ خرید سکتا ہے۔“

”خدا کے لیے شاہدہ اپنے آنسو روک لو۔ میں آ رہا ہوں۔“

”کیا واقعی تم میری لیے آؤ گے۔“

”اور کس کے لیے بن باس لیا میں نے۔“

”دو سال۔ دو سال ہو گئے مجھے تمہیں تلاش کرتے۔ مت پوچھو کیسے مشکلوں سے پایا ہے۔“

”اور اگر تمہیں پتا چلتا کہ میں شادی شدہ ہوں تو۔“

”مجھے یقین تھا ایسا نہیں ہو گا۔ میرا یقین میرے ساتھ نہ ہوتا میں تمہیں تلاش کیوں کرتی۔ بزدل اور کمزور تم نہیں تھے میں تھی۔ اگر اس وقت مجھ میں انکار کی ہمت ہوتی تو زندگی کے اتنے خوب صورت سال ضائع نہ جاتے۔ ہم اس عذاب کا سفر تما

راستوں پر نہ کرتے۔“

”شاید یہی تقدیر ہے۔ تم کراچی سے لاہور کیسے پہنچیں۔“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں اب نجمہ بابر ہوں۔“

”وہ شرمناک رہی۔“

”نجمہ بابر۔ اچھا کیا تم نے اپنا نام پہلے کیا اور ایسا بدلا کہ پھر نہ بدلنا پڑے۔ اپنا فون میں تمہیں اپنی فلائٹ نمبر سے مطلع کروں گا۔“

”فون نہیں ہے میرے پاس۔“

”اوکے۔ کل پھر اسی وقت فون کر لیتا میں۔“

”اے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا ہر خواب کی گرجی سے مل گئی ہے۔ اس نے ان کو کر پھروہ آئینہ بنالیا ہے جس میں اس کی امیدیں

تمناؤں کے سارے رنگ پوری تابانی کے ساتھ رہے تھے۔ بابر اسے بھولا نہیں تھا۔ اس نے نہیں کی تھی۔ وہ آج بھی اسے چاہتا تھا اور اس لیے واپس آ رہا تھا۔ ایک خوش حال مستقبل کی

محبت پر قربان کر رہا تھا۔ وہ خود پر نازاں نہ ہوئی ہوگی۔“

”چوبیس گھنٹے اس نے سوتے جاگتے گزارے اس کے سامنے سب سے اہم سوال تھا کہ وہ بابر کو بارے کیا بتائے گی۔ بابر نے ابھی نہیں پوچھا

انے شاہدہ سے نجمہ بننے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن ایسا جواب ضرور ہونا چاہیے جو بابر

با ضمیر شخص کو مطمئن کر دے۔ کیا وہ اس جھوٹ بول سکتی تھی۔ ایک ایسے شخص سے

نے محبت کو عبادت بنالیا تھا۔

”نجمہ بابر۔ اچھا کیا تم نے اپنا نام پہلے کیا اور ایسا بدلا کہ پھر نہ بدلنا پڑے۔ اپنا فون میں تمہیں اپنی فلائٹ نمبر سے مطلع کروں گا۔“

”فون نہیں ہے میرے پاس۔“

”اوکے۔ کل پھر اسی وقت فون کر لیتا میں۔“

”اے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا ہر خواب کی گرجی سے مل گئی ہے۔ اس نے ان کو کر پھروہ آئینہ بنالیا ہے جس میں اس کی امیدیں

تمناؤں کے سارے رنگ پوری تابانی کے ساتھ رہے تھے۔ بابر اسے بھولا نہیں تھا۔ اس نے نہیں کی تھی۔ وہ آج بھی اسے چاہتا تھا اور اس لیے واپس آ رہا تھا۔ ایک خوش حال مستقبل کی

محبت پر قربان کر رہا تھا۔ وہ خود پر نازاں نہ ہوئی ہوگی۔“

”چوبیس گھنٹے اس نے سوتے جاگتے گزارے اس کے سامنے سب سے اہم سوال تھا کہ وہ بابر کو بارے کیا بتائے گی۔ بابر نے ابھی نہیں پوچھا

تھے اب ایک بیٹی بھی ہو گئی۔ اس کے بعد ان کی اولاد نہ ہوئی۔ حالانکہ مجھ چاہتی تھی کہ ان کے مزید بچے ہوں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باہر کی محبت میں فرق نہ آجائے۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ وہ نہ صرف اچھا شوہر۔ بلکہ اچھا باپ بھی ہے۔ ان کے ماضی کا کوئی بھی معاملہ ان کی زندگی میں حائل نہیں ہوا تھا۔

ان کے بچے اب جوان ہو گئے تھے۔ باہر نے کینڈا سے واپس آکر پھر بیکچر شپ شروع کر لی تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھ نے اسے قائل کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ کر بزنس شروع کر دے۔ اس نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اس کی بات مان لی تھی۔ مہجرات میں بٹھے بنائے والی ایک کمپنی نے اس کو اپنا ڈسٹری بیوٹر مقرر کر لیا تھا۔ سب سودا نقد ہوتا تھا۔ باہر نے ٹیازٹ جمع کر دیا۔ فیکٹری کا موجودہ مالک باہر کا انا شکر دہا۔ اس نے باہر کو کراچی میں متعارف کروا کر اسے وہاں کا ڈسٹری بیوٹر بنادیا اور وہ لاہور سے کراچی شفٹ ہو گئے۔ وہ کئی سال سوسائٹی میں کرائے کے مکان میں رہے اور پھر چند سال میں اس نے امپورٹ کے ساتھ ایکسپورٹ کا بھی کام شروع کر دیا۔ ان چند سالوں میں باہر نے اتنا کمایا کہ ساری عمر بیکچر شپ سے نہ کما سکتا تھا۔ اس میں اس کی ذاتی محنت تھی لیکن وہ سارا کریڈٹ مجھ کو دیتا تھا۔ جس نے کاروبار کی طرف راغب ہی نہیں کیا بلکہ سرمایہ بھی فراہم کیا۔

نجمہ اکثر ڈرتی تھی کہ اگر باہر کو پتا چل جائے کہ اس نے یہ محل جھوٹ کی بنیاد پر کھڑا کیا ہے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگے گا۔ لیکن ان سب کے باوجود اسے اپنی محبت کے تناور درخت پر یقین تھا کہ یہ مجھ نہیں گر سکتا۔



باہر سے شور کی آواز سن کر وہ کھڑکی کی جانب بڑھی اور پردہ ہٹا کر دیکھا۔ نیچے ایک جنازہ جا رہا تھا۔ کسی نے با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھا تھا۔ اور باقیوں نے

کسی خطرناک قیدی کو رکھا جاتا ہے۔ میں سارا گھر میں بڑی رہتی نہ کوئی ملے آنا نہ مجھے کہیں جانے کی اجازت تھی۔ ریسروں کی اس بستی میں کوئی نہیں پوچھتا بھی نہیں تھا۔ گھر میں اخبار ریڈیو کی حالت نہیں تھی۔ وہ صبح سے رات تک مسجد میں بیٹھتا تھا۔ میں پاگل ہونے کے قریب تھی۔ میں باہر چاہتی تھی۔ دنیا سے تعلق رکھنا چاہتی تھی۔

میرے درمیان جھگڑا رہنے لگا۔ اور یہی جھگڑا میرے دل کی بنیاد بن گیا۔ وہ مرد تھا۔ مرد اور کریم کیا سکتا ہے۔ طلاق مانگنے پر اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔

دل میں بچوں کے ساتھ یہاں بھاگ آئی۔ یہاں ہر رشتے کی خالہ تھی جو بے اولاد تھی۔ شوہر نے یہ کہہ خالہ کے نام لگا کر انہیں طلاق دے دی خالہ نے مجھے مولانا سے طلاق دلوائی۔ مولانا کو آج تک علم میں کہ میں کہاں ہوں۔ ورنہ وہ مجھے جان سے مار دے مرنے سے پہلے خالہ نے مجھے یہ گھراور کچھ بینک اس میرے نام کیا تھا۔ میں نے بہت مشکل وقت گزارا ہے۔ اذیتوں سے گزری ہوں آپ کو اندازہ

”تم واقعی بہت بہادر ہو۔“ میں بزدلی تھا جو ماری بات نہیں مانتی۔ ورنہ واقعی خرابی ہوئی۔“

”غلط تم بھی نہیں تھے۔ تم نے اخلاقی اصولوں کی بے اداری کی۔ اس سے میرے دل میں تمہارے مزید عزت پیدا ہوئی۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے وہی اور بتا جو میں نے تمہیں دیا تھا۔“

”تمہاری خالہ کب فوت ہوئی۔“

”کچھ عرصہ ہوا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتیں۔ تو میں ان کے گھروں کے برتن ہاتھ رہی ہوتی۔“

”ایسا مت کہو۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ نے یقیناً بڑے حوصلے کے ساتھ زندگی میں اہم کی۔ مجھے بھی ڈھونڈ لیا۔ اب فکر مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نجمہ باہر ہو جاؤ۔“

”شادی کے بعد ان کی پہلی بیٹی تو باہر کو بہت خوشی ہوئی۔ کہ ان کے پہلے تو بیٹے

”جبکو مت۔۔۔ مجھے تم سے ابھی ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”آپ سیریس ہیں می۔ میں آتا ہوں پندرہ بیس منٹ تک۔ سب ٹھیک ہے نا۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”ہاں سب ٹھیک ہے۔ تم آجاؤ آرام سے۔۔۔ اور ہاں اسلم کو بھی لے آنا۔“ فرخ اُدھے کھٹے بعد پریشان عطیہ جا چکی تھی۔ وہ ماں کے کمرے میں گیا تو وہ علی چھت کو گھور رہی تھی۔ اس نے جا کر اس کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے می۔“
 ”کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو۔۔۔ کیوں ایک ہی بات کے پیچھے پڑے ہو سب۔۔۔“ وہ چڑکی۔
 ”اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“ وہ چڑکیا۔
 ”کیوں انسان کو دنیا میں کوئی الجھن کوئی پریشانی نہیں۔۔۔“

”تم از کم آپ کو نہیں ہو سکتی۔ آپ کے دکھ اور پریشانی ہمارے لیے ہو سکتے ہیں۔ مائیں ایسی حرکتیں تب کرتی ہیں جب وہ بے کاری سے بے زار ہو جاتی ہیں۔ اور کوئی چاند سی ہولانا چاہتی ہیں۔ اس سے لڑنے میں وقت گزارنے کا سوچنے لگتی ہیں۔ اگر آپ میرے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی ہیں تو ہاتھ حاضر ہیں۔“

”تم اپنے ڈیڈی کو کتنا چاہتے ہو۔“ اس نے اس کی باتیں نظر انداز کیں۔
 ”یہ سوال آؤٹ آف کورس ہے۔ ہوتا ہی نہیں چاہیے۔“

”جواب دو میرے سوال کا۔“
 ”کمال کرتی ہیں می۔ میرے جیسا سعادت مند بیٹا اپنے ڈیڈی کو اتنا ہی چاہتا ہے جتنا اس کے ڈیڈی اس کی می کو۔“
 ”فرض کرو۔“ نجمہ اسے دیکھتی رہی۔
 ”کیا فرض کروں۔“ ماں کی باتیں اب اسے الجھ رہی تھیں۔

”فرض کرو۔ یہ تمہارے ڈیڈی نہیں ہیں جنہیں

اس درد کو دہرایا تھا۔ میت کے اوپر کلی چادر پڑی تھی اور نجمہ دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ جتنا اس کے سابقہ شوہر کا ہے۔
 انسان کی تقدیر کیسے امکانات اور اتفاقات کو ناگزیر حقائق میں بدل سکتی ہے۔ آدمی صرف رستوں کا انتخاب کر سکتا ہے منزل کا تعین نہیں۔
 ”می آپ جاگ رہی ہیں۔“ عطیہ نے پردہ ہٹا کر کہا۔

”ہاں۔ کیوں۔“ اس نے پردہ برابر کر دیا۔
 ”آپ کا پی پی چیک کرنا ہے۔ پہلے بھی آئی تھی آپ سو رہی تھیں۔“
 ”مسو نہیں رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔“
 ”چھاپ اور ہر بیٹھ جائیں۔“ اس نے اس کو کرسی پر بیٹھایا اور پی پی چیک کرنے لگی۔
 ”دیری لو۔ آپ کو اندازہ ہے کہ غنودگی اور کمزوری بلڈ پریشر کم ہونے سے محسوس ہوتی ہے۔ آپ کا پی سواور ساٹھ ہے۔“

”کیا کروں پھر ڈاکٹر صاحب۔“ وہ مسکرائی۔
 ”کم ہونا کوئی مصیبت نہیں۔ گلو کوڑ میں نمک ڈال کر پی لیں۔ میں ابھی آئی۔“
 ”عطیہ بات سن۔ فرخ کہاں ہے۔“
 ”فرخ بھائی اس وقت آس ہوئے ہیں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”اچھا۔“ اس نے سر ہلایا پھر کچھ سوچ کر فرخ کا نمبر لایا۔
 ”کیا کر رہے ہو اس وقت۔“
 ”سچ بتاؤں۔ ایک نئی لڑکی آئی ہے اسے گھور رہا ہوں۔ آپ نے اس وقت کیوں یاد کیا۔“

”گھر آسکتے ہو۔“
 ”گھر آنے سے مجھے کون روک سکتا ہے۔ میرے باپ کا گھر ہے۔ لیکن آپ کا مطلب فوری آنے سے ہے تو سوری۔“

”کیوں۔؟“
 ”مجھے وجہ بتائی تو ہے۔ کہ مصروف ہوں۔ مجھے اچھا رسپانس ملنے لگا ہے۔“

”اچھی سمجھتے ہو تو۔۔۔“ وہ ہمت کر کے بولی۔

”آپ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں۔ ایسا فرض
کیوں کرول میں۔۔۔“

”نہیں فرض کرو۔ تمہیں کوئی بتائے۔۔۔“

”کوئی کون۔۔۔“ وہ سیریس ہو گیا۔

”مثلاً۔۔۔ مثلاً۔۔۔ میں۔۔۔ کیا اس سے کوئی
لڑکے گا تمہیں۔۔۔“

”مئی میں سمجھا نہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتی
ہیں۔۔۔“ وہ ماں کو گھورتے ہوئے بولا۔

”جو کہنا تھا کہہ لیا۔ اب جواب دو میرے سوال
کا۔۔۔“

”کیا جواب دوں۔۔۔“ وہ الجھ گیا۔

”میں فارسی نہیں بول رہی۔ اگر میں کہوں کہ
تمہارا اور اسلم کا باپ کوئی اور تھا۔ میرا پسلا شوہر۔۔۔

میں نے مجبور ہو کر اس سے طلاق لی تھی۔ باہر سے
میں نے بعد میں شادی کی تھی۔۔۔“

”مئی آج یہ بتانا کیوں ضروری ہو گیا تھا آخر۔۔۔“
خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد وہ بولا۔

”اب تم جوان ہونے پڑے لکھے ہو۔ کیا کبھی
تمہیں لگا کہ باہر تم سے اتنی محبت نہیں کرتے جتنی

ایک باپ کو کرنی چاہیے۔ کبھی تمہیں میری اور ان
کی محبت میں کوئی فرق معلوم ہوا۔ سوچ کے اور غور

کر کے جواب دو۔۔۔“

”میں نہیں مانتا۔“ وہ برہم ہوا۔

”مگر ایسا ہے۔“ نجمہ نے زور دیا۔

”اگر ہے تو اس بات کا ہماری زندگی سے کیا تعلق جو
آج ہم جی رہے ہیں۔۔۔“

اسی وقت اسلم پہنچ گیا۔ ماں بیٹے کی صورت دیکھ
کر تشویش میں مبتلا ہوا۔ ”مئی کیا فرخ نے کچھ کہا

آپ سے۔۔۔“

”نہیں۔ میں نے کچھ کہا ہے فرخ سے۔ مولانا
اور الدین نورانی جن کا آج انتقال ہوا ہے وہ تمہارے

آپ ہیں۔ تم اور فرخ ان کی اولاد ہو۔ اور عطیہ باہر
اور میری بیٹی۔۔۔“ وہ جذبات سے عاری سپاٹ انداز

میں بولی۔

”مئی آپ مذاق کر رہی ہیں۔۔۔“ اسلم کا رنگ اڑ
گیا۔

”مولانا نے مجھے میرے مطالبے پر طلاق دی تھی۔
دراصل میری شادی ان سے زبردستی کر دی گئی تھی۔

میں باہر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مولانا کے ساتھ
میری زندگی تلخ ہو گئی۔ میرے سامنے دو راستے تھے

طلاق لے لوں۔ یا خودکشی کر لوں۔ پھر میں نے
طلاق لی۔ ورنہ تم آج مدر سے میں ہالٹ پذیر

ہوتے۔ باہر نے مجھ سے شادی کی اور انہوں نے ہی
تم دونوں کو اپنا نام دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ

کسی کو پتا نہ چلے کہ وہ تمہارے باپ نہیں۔ انہوں
نے بھی تمہیں یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیا۔ اپنی

اولاد سے بڑھ کر چاہا۔ وہ سب کیا جو ایک محبت کرنے
والا باپ کر سکتا ہے۔“

”پھر آج۔ کیا ہوا ایسا۔۔۔“ اسلم نے پوچھا۔

”کیا ڈیڈی نے کہا ہے۔“ فرخ نے کہا۔

”نہیں۔ ان کو تو پتا بھی نہیں۔ اگر انہیں پتا
چلے گا تو خفا ہوں گے۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ تم کوچ

کا پتا چل جائے۔ اور ویسے بھی اب کیا فرق پڑتا
ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔۔۔“ دونوں
چونکے۔

”ہم نہیں جانتے کسی مولانا کو۔ خدا کے لیے آپ
ڈیڈی کو مت بتائیں کہ آپ نے ہم سے کچھ کہا

ہے۔۔۔“

”بلاوجہ نہیں بتایا۔“ معاملہ ایک موٹی رقم کا
ہے۔“

”کتنی؟“

”مئی نے تین کروڑ کہا ہے۔ کیا عطائی نے انہیں
کوئی غلط گولی تو نہیں دے دی۔“ فرخ نے بھائی کو

دیکھا۔

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ مئی آپ کا داغ چل گیا
ہے آپ نشے میں ہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے

”جس کا انتظار آپ کو ہے جانے وہ آتے بھی ہر
نہیں۔“ تیسرے نے کہا۔
”مجھے نمبر پتائیں میں فون کر کے پوچھتا ہوں کہ کلا
کون آ رہا ہے۔“ چوتھے نے جیب سے موبائل نکال
کر کہا۔

نہیں کیا۔۔۔ تمہاری عمر میں وہ لیکچرار تھے۔ صرف
تنخواہ بھی ان کی۔۔۔ رہنے کو اپنا گھر تنگ نہیں تھا۔۔۔
تمہیں اس عمر میں پچاس لاکھ مفت میں مل سکتے
ہیں۔۔۔ چند دن کے اندر۔۔۔ بولو۔۔۔ تین کروڑ چاہیے
ہیں۔ تو مری بات غور سے سنو۔“



اپنی الیکٹریک ڈائری میں سے انہوں نے چارے
بات کی جن میں سے تین نے معذرت کرنی اور کہا کہ
جو اکثریت کی رائے ہوگی وہی ان کی ہوگی۔ چوتھے نے
دس منٹ کا کہا تھا اور وہ بیس منٹ میں پہنچ گئے۔
یہ ایک طرح سے مولوی قدرت کے خلاف تحریک
عدم اعتماد کے لیے بلایا جانے والا خصوصی اجلاس تھا۔
لیکن وہ مطمئن تھے انہوں نے کوئی غلط بات نہیں کی
تھی جو کہا تھا وہ سنت کے مطابق کہا تھا۔ وہ کسی سے
خائف تھے نا شرمندہ۔

مولوی قدرت کو پیش امام قبول کر لیا گیا۔ لیکن
وہ اپنے ذاتی خیالات کے باعث ناپسندیدہ ہونے لگے،
ان کی مخالفت کرنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کیونکہ
وہ منافقت کے قائل نہیں تھے۔ اور مذہب کی سیدھی
سادہ اخلاقی تعلیمات سے روگردانی انہیں اللہ اور اس
کے رسول سے جھوٹ بولنے کے مترادف لگتا تھا۔

”مولوی صاحب۔۔۔ لوگوں کو آپ سے بہت سی
شکایات ہیں۔“ آغاز حاجی صاحب نے کیا۔
”میری ذات سے۔“

مسجد کمیٹی نے رمضان المبارک کی آمد سے قبل
چند معززین کو بھی مسجد کے معاملات طے کرنے کے
لیے بلایا تھا۔ یہ سب صاحب ثروت لوگ تھے اور
مولوی صاحب کے طرز عمل پر ان کو بار بار شرمندہ ہونا
پڑا تھا۔ وہ احساس دلاتے رہے تھے کہ جو کچھ اسلام کے
نام پر اوپر سے نیچے ہوتا ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق
نہیں۔ یہ بات کوئی سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ خلاف
معمول عشا کی نماز میں زیادہ لوگ اکٹھا تھے۔ باقاعدہ
نمازی تو نماز پڑھ کر چلے گئے باقی لوگوں کو خان صاحب
اور حاجی صاحب نے روک لیا تھا۔ ان کی نماز بھی
درحقیقت اجلاس میں شرکت کا بہانہ تھا۔

”نہیں آپ کے رویے اور دینی معاملات میں آر
کے نظریات سے۔“ خان صاحب نے کہا۔
”خان صاحب دین کے معاملے میں آپ کا اور ہم
نظریہ الگ کیسے ہو سکتا ہے۔ چودہ سو سال سے سر
کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے احکامات وہی ہیں
جسے آپ دینی اختلاف کہہ رہے ہیں۔ وہ درحقیقت
معاشرتی سوچ کی تبدیلی ہے۔“

”آپ حضرات تشریف رکھیں کچھ لوگوں کا انتظار
ہے وہ آجائیں تو بات شروع کرتے ہیں۔“

”آپ نے میری بیٹی کی شادی پر سب کے سائے
کیا کہا تھا۔۔۔ آپ نے سب میں ہمیں ذلیل کروا
تھا۔“ ایک صاحب برہمی سے بولے۔
”مجھے تو یاد نہیں۔۔۔ آپ بتائیں ایسی کیا بات ہو
تھی۔“

”ہاں آج معاملات طے ہو جانے چاہیے۔ اور
فیصلہ اکثریت کی رائے پر ہوگا۔“ خان صاحب نے
کہا۔

”کیا آپ نے میرے بیٹے کی مفتی پر نہیں کہا تھا کہ
ہندی اور مایوں غیر رسمی اور ہندوانہ رہیں ہیں۔
ایک صاحب بیچ میں بول پڑے۔
”یہ میں نے کہا تھا۔“

”حاجی صاحب دس بجے میری کسی کے ساتھ
ملاقات طے ہے میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔“
ایک صاحب نے گھڑی دیکھی۔

”جی۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیت ہے۔“ ایک
نے تائید کی۔

”کیا ہم ہندو ہیں۔۔۔ ہزاروں سال سے ہمارے آ

”ایک مسلمان ہیں۔“
 ”صرف مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانا اور مسلمانوں والے نام رکھ لینے سے کوئی مومن نہیں ہو جاتا۔ ان تمام رسالت کا تعلق ہندوں سے ہے جو ہم شادی پر اور موت پر ادا کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ان کی حیثیت شرعی ہے۔ اسراف یعنی فضول خرچی کرنے والے کو اخوان اشیاطینی۔ یعنی شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔“

”آپ لوگ انصاف سے کام لیں اور بتائیں۔ کہ ایک بیٹا جو اپنے باپ سے محبت کرتا ہے اور اس کے چٹم پر سب کو مدعو کرتا ہے۔ اور دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔ صرف اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے۔“ وہ دھکی انداز میں بول رہے تھے۔ ”معاف کیجئے گا۔ باپ کی یا بیٹے کی محبت کا اظہار چٹم پر دیکھیں پکانے سے نہیں ہوتا۔ یہ تو نمود و نمائش ہوئی۔ ایک ہزار افراد کو اس دعوت نامے کو اخبار کے ذریعے دینا مختلف ڈشوں سے تواضع کرنا جب کہ شہر میں بیشتر بھوکے سوتے ہوں۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر بولے۔

”مولوی صاحب۔ خدا نے مجھے توفیق دی ہے۔ میں آج جو بھی ہوں اپنے والد محروم کی دعاؤں سے ہوں۔“ وہ مزید رہم ہوئے۔
 ”عزت اور ذلت دینے والا اللہ ہے۔“
 ”میں کیا کرتا۔ ان کو دو گز کے لٹھے میں لپیٹ کر دفن کر دیتا ان کی مغفرت کے لیے کچھ نہ کرتا۔“
 ”مغفرت کے لیے دعا کے علاوہ سب بے کار ہے۔ اور اللہ نے سوئم اور چٹم کی کوئی شرط عائد نہیں کی آپ جب مرضی قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کریں۔“
 ”میں اپنا پیسہ جیسے چاہوں خرچ کروں۔ آپ حد بندی لگانے والے کون ہوتے ہیں۔“
 ”غزوہ بالائے اللہ میں کون ہوتا ہوں۔ وہ تو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہے میں تو صرف یاد دلا تا ہوں۔“

”آپ نے تو یہ بھی کہا کہ ہم جنہی ہیں۔ ہم اپنی اولاد کو دین سے دور کر رہے ہیں۔ پوچھ ہم سے ہوگی۔“

”ظاہر ہے اولاد کی تربیت میں کوتاہی کے بارے میں باپ سے پوچھا جائے گا۔ انہیں دین کے بارے میں کیا بتائے اور پرہیز کرتے ہیں۔“
 ”آپ نے تو خود ہمیں اپنے ہی گھر میں ذلیل کر دیا یہ کہہ کر کہ ہم حرام کھاتے ہیں۔“ ایک صاحب بھڑک اٹھے۔

”آپ کا بزنس کیا ہے جناب۔ ڈیک۔ وی سی آئی وی کے ڈیکر ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ سب لبو و لب ہیں۔ بلکہ شرع بھی یہی کہتی ہے۔ آپ دینی سے سالن منگواتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ اسمگلنگ ہے۔“

”آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ زمانے کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔“

”ضرور دیں۔ مگر مجھے الزام مت دیں کہ میں غلط کہتا ہوں۔ آپ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔“

اگر میں آپ کو آپ کی غلطی کا احساس نہ دلاؤں تو یہ میری غلطی ہے۔
 ”آپ خود دیکھ لیں کہ اس معاشرے میں علما کی قدر و منزلت کیا ہے۔“
 ”اس کے ذمہ دار علما ہیں۔“

”سب کو الزام مت دیں۔ میں حقیقی علما کی بات کر رہا ہوں۔ کیا مرتبہ اور حیثیت ہے اس معاشرے میں مولوی کی۔ کیا دیتے ہیں آپ اسے۔ نہ کو بھی نہ کار۔ آپ تو اسے عزت تک نہیں دیتے۔ ملا اور جو کر کو آپ کا یہ معاشرہ ایک سطح پر لے آیا ہے۔ آپ اور آپ کے بچے کیسے کیسے لطائف مولویوں سے منسوب کر کے سناٹے ہیں۔ کبھی کسی مولوی کی شخصیت کی قاتل تقلید مثال بھی نہیں کسی نے اس کی حیثیت کیا ہے۔ آپ کے نوکر جیسی۔ ایک گاڑی چلاتا ہے۔ دوسرا گاڑی چلاتا ہے۔ بلکہ گاڑی چلانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ جیسے آپ کسی ڈرائیور کو بتاتے ہیں کہ راستے پر جانا ہے۔ ایسے ہی مولوی بھی بتاتا ہے کہ کس راستے پر جانا ہے۔ جتنا آپ اپنے کتوں اور گھوڑوں پر خرچ کرتے ہیں کیا اس کا شکر عظیم بھی اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔ کیا ایک امام کی زندگی کا ان آسائشوں پر حق نہیں جو آپ کے ملازموں کا ہے۔ وہ سچ بھی نہیں بول سکتا۔ راہ راست بھی نہیں دکھا سکتا۔ ایسا ہی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے آپ کو دین کی اور دین کا راستہ دکھانے والے کی۔“

”دیکھیے۔ ایسے تو کوئی بھی معاملہ طے نہیں ہو گا۔ بحث اور الزام تراشیوں میں رات گزر جائے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ مسجد کے معاملات بھی ٹھیک سے نہیں چلا رہے۔ مولانا کے زمانے میں آپ موزن تھے اب آپ پیش امام بھی ہیں اور موزن بھی۔“
 حاجی صاحب نے بات بدلی۔

”کیا اس میں بھی یہ ناچیز قصور وار ہے۔“
 ”نہیں۔ صرف ایک آدمی یہ سارے معاملات نہیں سنبھال سکتا۔ اب دیکھیے یہاں مولانا کے ساتھی آپ تھے ان کے بیمار ہو جانے کے بعد آپ نے

معاملات کو سنبھال لیا۔“
 ”یہ ہیں۔ مولوی عبد الرشید۔ حلف الرشید مولانا حافظ عبداللہ۔“ خان صاحب نے ایک باریش رنگ دار پگڑی والے نوجوان کو آگے کیا۔
 ”آپ چھل۔ وہ جو مرکزی جامع مسجد کے پیش امام اور آستانے کے متولی ہیں۔“ قدرت اللہ نے کہا۔
 ”جی ہاں۔ درگاہ شریف کا جانشین میں ہی ہوں گا۔“ وہ کھٹکار کر بولے۔
 ”اپنے والد کی رحلت کے بعد۔“ وہ طنز سے بولے۔

”میں فی الحال آپ کی معاونت کروں گا۔“
 ”یہ موزن بھی ہیں۔ اور دوسرے میں درس بھی دیں گے۔“ حاجی صاحب نے وضاحت کی۔
 ”صاف بات ہے کہ تم مسجد کے انتظام میں بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ مسجد پہلے مقفل رہتی تھی۔“
 ”خان صاحب۔ مسجد خدا کا گھر ہے۔ اسے مقفل کرنا ناجائز ہے۔“

”اسی وجہ سے یہاں چوریاں ہو رہی ہیں۔ مسجد میں پانچ گھنٹیاں تھیں جو لوگوں نے عطیہ کیں تھیں۔ اب ایک بھی نہیں ہے۔“
 ”مسجد بند نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں کوئی جب چاہے عبادت کرنے آئے۔ مسافر ہو تو قیام کرے۔ اس کو سونے کی جگہ ملے گی۔ اور نہ مانے دھونے کا مسئلہ نہیں ہو گا۔ مسافروں کو آسانی رہے گی اور ثواب بھی ملے گا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ رات دس بجے ایک نماز جنازہ سڑک پر ادا کی گئی۔ کیونکہ مسجد مقفل تھی۔ نماز جنازہ کے شرکاء وضو تک نہ کر سکے۔“

”مولوی صاحب۔ مسجد اور سرائے میں فرق ہے۔ جو لوگ یہاں ٹھہریں گے وہ چوری بھی کریں گے۔“

”مگر سب چور نہیں ہوتے۔“
 ”یہ ٹھیک ہے کہ آنے والے سب چور نہیں ہوتے۔ لیکن اگر ان میں کوئی چور ہو تو اس کی شناخت

”وہ سب دشمنان اسلام تھے اور اخبار والے ان کے ایجنٹ ہیں۔“ عبدالرشید دھاڑا۔
 ”میں بس سمجھتا ہوں کہ سب کلمہ گو مسلمان ہیں۔ میں یہودی لابی کو یا را کو ان مذہبی منافرت کا الزام نہیں دوں گا۔ قصور وار وہ ہیں جو شیطان کو برکائے میں آکر کسی کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کرتے ہیں۔ مساجد میں خون بہاتے ہیں اور ان کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔“

”کیا تم مسجد کو اپنی جاگیر نہیں سمجھتے۔ تم نے اس پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔“ وہ آپ سے باہر ہو گیا۔
 ”مسجد میرے باپ کی تھی۔“ اچانک ایک آواز گونجی۔

اچانک سب آوازیں بند ہو گئیں۔ لوگوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک گورا چٹانوجوان تھا جس نے کلف لے کر بڑے پرن رکھے تھے۔

”آپ لوگ خفا میں میری بات پر یا حیران۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ خیر میں فرخ ہوں۔“ وہ سامنے آیا۔
 ”میں جانتا ہوں۔ تم باہر کے بیٹے ہو۔“ ایک شخص نے کہا۔

”نہیں انکل۔ پڑوسی ہونے کے ناطے بھی آپ نہیں جانتے کہ میں مولانا کا بیٹا ہوں باہر کا نہیں۔ بردار اسلم۔ آگے آکر اپنا کھڑا دکھائیے۔“ اسلم خاموشی سے آگے آکر فرخ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ سب کی نظریں ان کے چروں پر جم کر رہ گئیں۔ وہاں اکثر لوگ ان کی صورت سے پہچانتے تھے۔

”مجھے آپ لوگوں کی خاموشی پسند آئی۔ اس کا مطلب کہ آپ کو میری بات سے اختلاف نہیں۔“
 ”اختلاف اس وقت ہو گا جب تمہاری بات پر کوئی یقین کرے گا۔“ حاجی صاحب نے کہا۔

”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم ان کے فرزند ہو۔“ خان صاحب نے کہا۔

”مولانا نے شادی نہیں کی تھی۔“ ایک نے کہا۔
 ”ساتھ ان کی بیوی شادی کے کچھ عرصے بعد فوت ہو گئی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔“

”آپ ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ حاجی صاحب نے کہا۔
 ”مگر انہوں نے بعد کالم اسپیکر یا لاؤڈ اسپیکر اعلیٰ فائر پوری ہو گئے تو ان ذمہ دار ہے۔“
 ”وہی جس کا گھر ہے۔“

”یہ سب نہیں چلے گا۔ تم صرف امامت کرو۔ انتظام مولوی عبدالرشید کے حوالے کرو۔“

”دیکھیے۔ مولانا کے انتقال کے بعد گریڈ سترہ یا اٹھارہ کی کوئی اسامی خالی نہیں ہے جسے بر کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص سے آفیسر کی پوسٹنگ ہو۔ آپ میں جو شیخ وقت نمازی ہے۔ بزرگ اور رہبر گار ہیں۔ مگر وہ اس منصب کے اہل ہیں۔ آپ ان ہی میں سے کسی کو عزت دیں۔“

تو میں کسی طرح اس منصب کے لائق نہیں۔ آپ مجھ سے متاثرہ کر لیں۔ مبالغہ کر لیں۔ شرعی اور فقہی لحاظ سے میری معلومات کا امتحان لے لیں۔ آپ کو اندازہ ہونا چاہیے کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔“

”دینی معاملات میں فوقیت حسب نسب کو نہیں دی جاسکتی۔ ویسے بھی اسلام میں غلام اور آقا کا کوئی تصور نہیں۔ آپ کے والد ماجد میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ ان کے علم و کمال کا میں معترف ہوں۔ لیکن ان کا نام آپ کے لیے سفارش بنے۔ آپ کو خود شرمندگی ہونی چاہیے۔“

”یہاں رہنے والوں کا خیال ہے کہ آپ مخصوص مذہبی نظریات کی تبلیغ کے لیے مسجد کا پلیٹ فارم استعمال کر رہے ہیں۔ اور ایک مخصوص لوگوں کا پشت پناہی سے آپ مسجد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”یہاں کسی قسم کی مذہبی سیاست نہ ہوئی نہ ہوگی۔ میں آپ کو یا آپ کے والد محترم کو مورد الزام ٹھہرائے بنا تھا تو ان کی روشنی یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو فتنہ فون چند مساجد میں ہوا اس میں آپ کے والد۔ میرا مطلب جہاں وہ پیش امام ہیں۔ وہ بھی شامل ہے۔“
 قدرت اللہ سے الزام برداشت نہ ہوا تو کہا۔

تھا آپ کو۔“

”برادران لوگوں کو جواب دو۔“ فرخ مسکرایا اور بیٹھ گیا۔

”بزرگوں۔۔۔ آپ لوگ مولانا کو کب سے جانتے ہیں۔۔۔ کوئی دس سال سے تو کوئی بیس سال سے۔۔۔ مگر میری عمر ہے تیس سال۔ کیا یہاں کوئی ایسا نمازی ہے جو تیس سال سے یہاں ہو۔ اور مولانا کی امامت میں نماز پڑھی ہو۔“

”کچھ ہیں۔۔۔ لیکن وہ نماز پڑھ کر جا چکے ہیں۔“
 ”چھل۔ اتنے پرانے لوگوں سے آپ مشورہ نہیں کرتے۔ یا وہ آپ لوگوں کی مذہبی سیاست سے دور رہتے ہیں۔ خیر میں آپ لوگوں کی ناقص معلومات میں قیمتی اضافہ کرتا ہوں مولانا نے چونتیس سال پہلے شادی کی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ میں اسلم اور فرخ۔۔۔ میں دو سال کا تھا جب مولانا نے ہماری ماں کو طلاق دی تھی۔ پھر انہوں نے باہر سے شادی کی۔۔۔ اب رہی بات ثبوت کی۔ تو کیا ہماری صورتیں والد محروم سے نہیں ملتیں۔ ذرا ہمارے چہرے پر داڑھے لگا کر دیکھیں۔۔۔“

”والہائی گاؤ۔“ پیچھے سے آواز آئی۔
 ”ہی ازراٹھ۔ یہ چہرہ مولانا کا ہے۔“ ایک اور نے کہا۔

”میاں صاحب زاوے۔ صرف صورت کی مماثلت ہی کافی نہیں۔“ حاجی صاحب نے تھوک نکالا۔

”خصوصاً“ قانونی اور عدالتی معاملات میں۔ اگر مسئلہ زمین و جائیداد کا ہو۔“ خان صاحب صدے سے باہر نکلے۔

”بھجارشا۔ یہ سارے ثبوت ہمارا وکیل عدالت میں پیش کرے گا۔ یہ ساری بات ہم نے ایسے ہی یہاں بیٹھ کر نہیں بک دی۔ ہم جب اپنا حق وراثت ثابت کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ہماری والدہ حیات ہیں۔ اب آپ ان کو مطلقہ کہیں یا یہوے۔ ایزیدوش۔ دیسے قدرت اللہ۔ آپ تو مولانا کے بہت قریب تھے کیا انہوں نے کبھی بتایا نہیں

”انہوں نے سب بتایا تھا۔ جو آپ نے کہا غلط نہیں ہے۔“ انہوں نے اپنا جھکا سر اوپر اٹھایا۔
 شرکائے محفل کا سارا جوش ماند پڑ گیا۔ مولوی قدرت کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، لیکن عبدالرشید کی باپوسی دیدنی تھی۔ وہ ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے اس کی سچ کو اچانک تقدیر نے شکست میں بدل دیا ہو۔ قسمت کی خوبی۔ ٹوٹی کہاں کہند۔

”چلیے حضرت۔ آپ ان کے وارث سہی۔ لیکن یہ مسجد آپ کو ورنہ میں نہیں مل سکتی۔“
 ”توبہ توبہ۔ یہ مسجد ہمارے جد امجد نے بنوائی تھی۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ اپنے گھر کی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ اس کے وارث نہ آپ ہیں نہ میں۔ اب ہم مسجد کو ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور ٹرسٹ عدالتی احکامات کے مطابق قائم ہو گا۔ اس وقت تک معاملات کو جوں کا توں رہنے دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ ورنہ ہم صبح عدالتی حکم لے آئیں گے۔“ فرخ نے کہا۔

خان صاحب اور حاجی صاحب کو سانب سو گھ گیا۔ وہ لڑکا قانون کی زبان میں بات کرتا تھا اور حق ملکیت کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود عموماً ربن گیا تھا۔ اس کے ساتھ بڑا بھائی۔ پیچھے بابر اور ان کی طاقت اور دولت تھی۔

وہ سب جو اس تحریک عدم اعتماد کے خصوصی اجلاس میں کورم پورا کرنے والے تھے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ حاجی صاحب نے اس مسئلے کو فی الحال نہ چھیڑنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ اس لیے رات زیادہ ہونے کا عذر کر کے چلے گئے۔

”حضرت یہ مسئلہ یوں حل نہیں ہو گا۔“ عبدالرشید سب سے آخر میں اٹھے اور کہا۔
 ”یہ مسئلہ حل کرنے میں آپ زحمت بھی نہ کریں۔“ فرخ نے کہا۔

”اسلام کے نام پر اس مسجد میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہم برداشت نہیں کریں گے۔ لا اعلق رہنا ناممکن

یہاں اہل محلہ سے یا ان کی مرضی سے کسی کو بھی لے کر آئیں گے جو اس منصب کا اہل ہو گا تو جھگڑا نہیں ہو گا۔“

”آپ کا یہ فیصلہ دانش مندی پر مبنی ہے۔“
”مگر آپ اپنے طور پر عبدالرشید سے نمٹ سکتے ہیں تو شوق سے رہیں۔ اس مسجد میں اگر آپ دونوں کے درمیان معرکہ گھڑا تو وہ اسلام ہوتا ہے۔“
”خدا سے توبہ کرو۔ مسجد میں عبادت کرنے کی جگہ کسی کا خون بہنے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں یہ حجرہ بھی خالی کر دوں گا۔“

”مولانا! جس حجرے میں مولانا نور الدین رہتے تھے۔ وہاں کیا ہے۔ میرا مطلب ہے ایسی کوئی چیز۔“

”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ ان کے اثاثے سب آپ کے ہیں۔ میرے پاس ایک خفاں ہے۔ اس زمین کی تمام قانونی دستاویزات اسی میں ہیں۔ وہ آپ مجھ سے کسی بھی وقت لے سکتے ہیں۔ آپ کی امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔“ دونوں چلے گئے تھے، مولانا گھر واپس آگئے تھے، بیوی چائے پی رہی تھی، مولانا نے اسے نور الدین کے بارے میں بتایا تو چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بجاتا تھا۔ تھوڑی سی چائے چھلک کر اس کے کپڑوں پر گر گئی تھی۔

”مولانا کی بیوی۔“
”ہاں۔“ انہوں نے سر سے ٹوپی اتاری اور بستر پر دراز ہو گئے۔

”شاہدہ زندہ ہے اور یہاں ہے۔“
”ہاں اس نے کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ قریب ہی رہتے ہیں وہ لوگ۔“

”لیکن مولانا نے ان کو طلاق تو نہیں دی تھی۔“
”اس کا بیٹا کہتا ہے کہ دی تھی۔ دو بیٹے ہیں ان کے۔ آج دونوں مسجد میں آئے تھے۔“

”مولانا کو پوچھا انہوں نے۔“
”ان کے بارے کیا پوچھتے۔“
”یہی کہ۔ ان کا انتقال کب ہوا۔“

”جیسے۔“
”آپ کا اور ہمارا دین الگ تو نہیں۔ ہم کو ان ہوتے ہیں دین کے معاملات میں دخل دینے والے۔“ فرخ نے کہا۔

”یہ مسئلہ قانون کے مطابق طے ہو گا۔“
”ہم دینی معاملات میں دنیاوی قانون کو تسلیم نہیں کرتے۔“
”بڑا اچھا کرتے ہیں آپ جو بھی کرتے ہیں۔ مگر ہمیں نہ بتائیں اور تشریف لے جائیں۔“ فرخ ترخ کر بولا۔

”قدرت اللہ کی حمایت تم کو مستحکم کرے گی۔“
”دھمکی دے رہے ہو۔“ اسلم سے رہانہ گیا۔
عبدالرشید دروازے کی طرف بڑھے اس کو ٹھوکر لگی وہ آگے کو جھکا اور اس کی رنگ دار پگڑی گر گئی۔ آواز پر دونوں بھائیوں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ریو اور بھی جو اس کی پگڑی سے گر تھا۔
فرخ نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن مولوی عبدالرشید نے پھرتی سے ریو اور پکڑا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔

”اللہ ہم سب پر رحم کرے۔ ہم سب کے گناہ معاف کرے۔“ مولوی قدرت نے کہا۔
”مجھے بالکل نہیں پتا کہ آپ اذان دیتے اور امامت کرنے کے علاوہ کیا کرتے ہیں۔ یہاں جس مسلک اور عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے نظریات کا علم ہی نہیں تو اختلاف اور اتفاق کیا۔ لیکن یہ بات قطعی ہے کہ آپ کے اور اس دہشت گرد مولوی کے درمیان کوئی وجہ عناد ہے۔“
”مگر اس کے دل میں ہے تو اللہ اس پر بھی رحم کرے۔“

”اس کا سبب وہ آپ کو سمجھتا ہے۔ میں آپ کی حمایت کر سکتا ہوں۔ اور نہ مخالفت۔ میں اس جھگڑے میں پڑنا ہی نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ از خود اس زعم داری سے سبکدوش ہو جائیں۔ نہ آپ یہاں ہوں گے اور نہ کوئی جھگڑا ہو گا۔ ہم

”وہ کہیں دور سے نہیں آئے۔ یہی اسی محلے میں رہتے ہیں۔ پچھلے دس سال سے اکثر بابر صاحب کے ساتھ جمعے کی نماز پڑھنے آتے تھے۔ میں نے اس کو فوراً پہچان لیا۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات تھی۔“
”یعنی دس سال سے شاہدہ بیگم پر تھی۔“ وہ اپنے آپ سے بولی۔

”ہاں اسے معلوم ہو گا کہ مولانا ابھی بھی اسی مسجد میں پیش امام ہیں۔“

”تمہارا خیال ہے کہ اس نے اپنے شوہر کو نہیں بتایا کہ اس کا پہلا شوہر کون ہے۔“

”ممکن ہے۔ بابر کو بتادی ہو لیکن بیٹوں کو علم نہیں تھا۔ اگر ان کو پتا ہو تا تو وہ اس مسجد میں نماز پڑھنے کے بجائے کسی اور مسجد میں جا کر نماز پڑھتے۔“

”بالکل ٹھیک کہا۔ وہ بیٹوں کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کیسے کرتی کہ وہ ایک لاکھ کافراؤں کے بھاگی تھی۔ کیا نام تھا اس شخص کا۔“

”جعفر۔ اس نے مولانا کے خلاف پولیس میں رپورٹ کروانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔“

”اس نے بھروسے پر دے دیا ہو گا۔“

”واللہ مولانا نے کبھی پلاٹ بیچنا نہیں چاہا۔ وہ کہتے تھے کہ میں اپنے پیسوں سے دارالعلوم اور مسجد بناؤں گا۔“

”بڑی غلطی کی انہوں نے پلاٹ ویسے ہی پڑا ہے۔

نہ مسجد میں تو وسیع ہوئی نہ دارالعلوم بنا۔“

”لوگوں کے دل تنگ اور ہاتھ کشادہ ہوتے ہیں نیک بخت۔ وہ صرف لیتا جانتے ہیں ورنہ نہیں نہ کوئی ٹیکس ادا کرتا ہے نہ کوئی زکوٰۃ۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے کماتے ہیں۔ کسی بھی پیشے میں جھوٹ اور بے ایمانی کے بنا گزراہ نہیں ہوتا اب لوگوں کا۔“

”یہ اب جعفر کہاں ہے۔ کیا وہ اس عورت کو گرفتار نہیں کروا سکتا۔“ اس کی سوچ ابھی تک شاہدہ میں بھٹک رہی تھی۔

”بہت سال ہوئے وہ مریچکا ہے۔ اور جو بات کسی نے تیس سال پہلے نہیں مانی تھی اب کوئی کیسے مانے گا۔ اس کے پاس ثبوت یا گواہ ہوتے تو وہ رپورٹ نہ درج کروا دیتا۔ سارے اخباروں میں اس کی تصویر چھپتی تو شاید وہ پکڑی جاتی۔ مگر مولانا کی بات مانی گئی۔ مولانا کی بدنامی تو بہت ہوئی لیکن سارا قصور اس کے باپ کا تھا جس نے لڑکی ذات کو کالج بھیجا تھا۔“

”علم حاصل کرنا یہی بات تو نہیں۔“

”ہاں۔ لیکن کالج میں ایسے بچے علم حاصل کرنا تھوڑی جاتے ہیں۔ کالج میں جس طرح کی آزادی اور روشن خیالی ملتی ہے پھر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے شاہدہ نے کیا۔ ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے خواب دیکھتے ہیں سب۔ دینی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔“

”یہ شاہدہ بھی ایسی تھی کیا۔“

”غیب کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ وہ صرف دنیاوی خواہشات سے مغلوب لڑکی تھی۔ کسی مولانا کے ساتھ حجرے میں رہنے والی عورت نہیں تھی۔ شوہر کے گھر سے نکل کر بد بخت نے دنیا اور آخرت خراب کی۔ اب یہ مولانا ہی بتائیں گے روز قیامت کہ انہوں نے اس کو طلاق دی تھی یا اس نے جھوٹ بول کر دوسری شادی کی تھی۔“

توبہ تو ہے۔“ مولوی قدرت نے کالوں کو ہاتھ لگایا۔

مولوی قدرت کی بیوی کو اس کے اپنے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ اس کا شاہدہ کا اتنے قریب آکر خاموشی سے رہنا کچھ کھٹک رہا تھا۔ اسے یقیناً ”معلوم تھا کہ مولانا نے شادی نہیں کی اور ان کا کوئی اور ان دو بیٹوں کے سوا حقیقی وارث نہیں ہے۔“

”مولانا کے بیٹے کیوں آئے تھے۔“

”وہ مسجد اور ماتحتہ زمین کی ملکیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ چمت کو گھورتے ہوئے بولے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ نے ان کو مولانا کے بارے میں بتادیا ہے۔“

”ہاں آج مسجد کے انتظامی معاملات پر میٹنگ تھی۔ بڑے بڑے لوگ آئے تھے۔ وہ میری جگہ کسی

اب تو ان کے وارث بھی آگئے ہیں۔ وہ جو چاہیں کریں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ پیش امام بھی اپنا لائیں گے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مولانا کی زندگی میں یہ مختار نامہ کار آمد تھا۔ یہ بات سچ نہیں ہو سکتی۔ تقدیر اس کے ساتھ ایسا سنگین مذاق نہیں کر سکتی۔ اس نے خود اپنے پاؤں پر کھٹائی کیوں ماری۔ خود اس نے مولوی قدرت کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا۔ مولانا اسی حالت میں بڑے رہتے وہ ہمارا کچھ نہ بیگاڑ سکتے۔ جو کام شاہدہ نہ کر سکی وہ میں کر سکتی تھی۔ مولوی قدرت پچاس لاکھ کے مالک بن سکتے تھے۔ یہ اس نے کیا کیا۔ مشکل آسان کرنے کا سوچا اور مستقبل ہی تاریک کر لیا۔ قتل کا جرم الگ کیا۔ دنیا اور آخرت دونوں گنوا دیں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
”صبر کر نیک بخت۔ اللہ ایک درہند کرتا ہے تو سو کھول دیتا ہے۔ ہم کہیں اور چلیں جائیں گے۔ میں پیش امام نہ بھی رہا تو کوئی فرق نہیں پڑتا میں اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ محنت سے رزق حلال کمانے کے لیے ختم نہیں ہوتے۔“

”میں اس بات پر نہیں رو رہی بے وقوف آدمی۔ میں رو رہی ہوں اپنی اور تمہاری تقدیر کو۔ جب مختار نامہ عام تمہارے پاس تھا تو تم نے زمین کیوں نہ بیچی۔“

مولوی قدرت اللہ کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور خالی الذہن ہو کر خلا میں گھورنے لگے۔ اس کی نظریں تاریکی میں دیکھ رہی تھیں۔ آسمان سے نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ رنکین نوٹ جنگلوں کی طرح چمک رہے تھے اور دھیرے دھیرے پیچھے گر کر ڈھیلڑ ہوتے جا رہے تھے یہ ڈھیلڑ اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نوٹوں کے انبار میں دفن ہونے لگے۔ وہ نوٹوں کے تالاب میں نہا رہے تھے اور خوشی سے چلا رہے تھے۔

مولوی قدرت کی بیوی بین کر رہی تھی۔ ہائے مولانا نور الدین۔ تم زندہ رہتے۔ لاش کی طرح پڑے

عبدالرشید کو لانا چاہتے ہیں۔“
”یہ تو ہوتا ہی تھا۔ تم نے کسی سے بھی بنا کر نہیں رکھی۔ اپنے خیالات اور نظریات سے سب کی مخالفت مولیٰ سورنہ آملی کا اچھا خاصہ ذریعہ تھا۔“
”تین وقت پر دونوں بھائیوں نے سب کا کھیل بیگاڑ دیا کہ مسجد کو ٹرسٹ میں دیا جائے۔“

”ٹرسٹ۔“
”عدالت کے حکم سے کچھ لوگ سارا انتظام سنبھالتے ہیں۔ آملی اور خرچ کا حساب رکھتے ہیں تاکہ خور و برد نہ ہو۔“
”یہاں کون سی لاکھوں کی آملی تھی۔ لاکھوں نہیں تو ہزاروں کما سکتے تھے تم۔“

”نہیں نیک بخت میں وہ سب نہیں کر سکتا جو دوسرے کرتے ہیں۔ خدا کے گھر میں بے ایمانی کا کاروبار۔ توبہ توبہ۔ میں دین کے نام پر پیسہ لوں اور سب کھا جاؤں۔ وہ تو اللہ نے عین وقت پر عزت رکھ لی اور سب منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان کے بیٹوں نے کما کہ میں فل الحال مسجد کا نگران ہوں۔ زمین کا فیصلہ الگ ہے۔“

”الگ کیسے۔“
”الگ ہے۔ ضروری تو نہیں کہ جو مولانا چاہتے تھے وہ بھی وہی کریں۔ وہ زمین پر کوٹھی بنا میں یا کارخانہ۔ ان کی مرضی۔“
”مگر مولانا نے مختار نامہ عام دیا تھا۔ کہ ان کی زمین وجائیہ اوجو بھی ان کا ہے۔“

”بے شک دیا تھا۔ ان کی زندگی میں تمام اختیارات میرے پاس تھے۔ میں زمین سچ بھی سکتا تھا۔ اپنے نام بھی کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی بھی بات غیر قانونی نہ ہوتی۔“

”اور اب۔“ اس کا دل ڈوبا۔
”اب وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کی قانونی حیثیت مولانا کے ساتھ ختم ہو گئی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“
”ہاں۔ مختار نامہ صرف زندگی تک ہوتا ہے۔“

رہتے۔ بستر پر پیشاپ اور پاخانے میں لتھڑے
رہتے۔ تمہاری کمر اور نچلے دھڑ پر زخم ہی زخم
ہو جاتے۔ ان میں کیرے پڑ جاتے۔ سانس تو
لیتے۔ وہ مختار نامہ تمہارے دم سے زندہ تھا۔ میں نے
خود خاک میں ملا دیا۔ تمہارے ساتھ مختار نامہ بھی
مر گیا۔ پیسے بھی مر گئے۔

وہ روز ہی تھی اور قدرت اللہ سوچ رہے تھے۔ کیا
مولانا نور الدین کو اپنی ساری زندگی دین کے لیے وقف
کردی اور ان کی ساری حسرتوں کا جتنا وہ اس کے مفلوج
جسم کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ اے بس آرزو خاک
شہد۔ عزت کے بدلے بھی رسوائی ہی ملی۔ دم
آخرت نہ شریک حیات ساتھ تھی نہ ہی اولاد نے
جنازے کو کندھا دیا۔ اور مجھے کیا ملا۔ اپنی نیک نیتی کا
صلہ۔ عزت پر کون سالاکھوں کا خرچ تھا۔ مگر اس
معاشرے نے مولانا کو بھی عزت نہ دی۔ میں نے سچ
بولنا۔ منافقت سے گزر کیا۔ وہی کام جاس کا حکم تھا۔
جو میرے ضمیر کے فیصلے کے مطابق تھا۔ جواب میں
منافق، باطل عقیدے والوں نے مجھے غلط ٹھہرایا۔
میرے صبر و قناعت۔ استغنا اور فقر کی شان قلندری
کو میری کم مائیگی اور کمتری پر محلول کیا۔ آج ایک
نوجوان، ماڈرن اور فیشن ایبل دین اور دنیاوی تعلیم
سے بے مہر حلیص زاوے نے سرعام کہا کہ مولوی
بس ہو چکی نماز، مصلّا اٹھائے۔ اپنا پوری بستر سیٹھے۔
دہشت گرد مولوی نے مسیح ہو کر مجھے دھمکی دی۔
میرے خلاف بہتان تراشی کی۔ میرے عقائد پر حملہ
کیا۔ مجھے کافر کہنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔
شیطان نے ایک ققمہ لگایا۔ وقت میرے ساتھ
ہے۔ زمانے میں چلن میرا ہے۔ پھر تم کیوں خود کو
ناقابلِ تسخیر سمجھتے ہو، مولوی قدرت اللہ۔
پھر وہی ہوا انہوں نے قدرت کو مسجد سے پوری
طرح فارغ کر دیا تھا۔

☆☆☆

”بھئی میاں فرخ۔ آپ کا ذوق بڑا اعلا ہے۔“

حاجی صاحب نے کہا۔
”جی یہ مجسمہ میں نے ونس سے خریدا ہے اور یہ
ڈریکوریٹن جرمن کا ہے۔ سب میرے منتخب کیے
ہوئے ہیں۔ کیوں براؤس۔“ وہ اسلم کو دیکھتے ہوئے
بولا۔

”میں نے کب کہا کہ یہ کہاڑ میرا ہے۔“
”کہاٹا۔ بھائی یہ بہت قیمتی چیزیں ہیں۔ نوادرات
میں شمار ہوتی ہیں۔“ وہ ہنس کر بولا۔
”ہوں گی۔ لیکن میں اس گھر میں کوئی مجسمہ رکھنے
کے حق میں نہیں ہوں۔“
”تم میں تو لگتا ہے کہ مولانا کی روح حلول کر گئی
ہے۔“ اس نے مذاق اڑایا۔

”فرخ میاں۔ کیا خیال ہے اب ہم کام کی بات
کریں۔“ حاجی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے
ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں۔ ذرا کچھ دیر میں لگے گا۔“
”وہ آپ کے والد بابر صاحب کے ساتھ شرف
ملاقات حاصل نہیں ہوا۔“
”نہیں ایک صنعتی نمائش میں اپنا اسٹال دیکھنے
استنبول جانا پڑا۔“

”مولوی قدرت کا قصہ تو پاک ہوا۔“ حاجی
صاحب خوش ہوئے۔

”میں داؤد تباہوں آپ کو آئین جوان مروی حق
گوئی و بے باکی۔ یہاں کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ
مسجد میں اس کی اجارہ داری کو چیلنج کر سکے۔“

”عاجز تو سب تھے اس کے طہانہ عقائد سے۔“
”پرانی باتوں کو چھوڑیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ
دونوں صاحب پہلے کی طرح مسجد کے معاملات میں
شامل رہیں اور اس کمیٹی کا حصہ بنے رہیں۔“

”مسجد کی توسیع کا بھی پلان تھا۔“ حاجی صاحب
نے کہا۔

”توسیع تو اس مرحلے میں غیر ضروری ہے جب تنگی
محسوس ہوگی موجودہ عمارت میں اضافہ کر دیا جائے
گا۔ میرے ذہن میں اس کی ریویژنیشن۔ کیا کرتے

ہیں۔ اسے ”فرخ نے ذہن پر زور ڈالا۔

”تین و آرائش۔“ حاجی صاحب نے کہا۔

”رائش۔ ایک تو اس پر اندر باہر سے رنگ ہوتا

چاہیے۔ اندر انجمن۔ آف وائٹ۔ باہر موسم کے

اثرات سے محفوظ ویدر کوٹ یا ویدر شیلٹ۔ میناروں پر

بھی اور گنبد پر بھی۔ تمام دیواروں پر نئے کلاک۔

میوزیکل چائموالے اور سامنے الیکٹرانک کلاک۔ جو

وقت بدلنے کے ساتھ خود پانچ وقت الارم دے گا۔

صحن میں ایک میوزیکل فاؤنٹین۔“

”موسیقی روح کی غذا ہے۔“ حاجی صاحب نے

واڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

”اندر اور باہر نئے کالم اسپیکر۔ یہاں تو بڑا رانا

ساؤنڈ سسٹم ہے۔ بالکل آؤٹ آف ڈیٹ۔ آج کل

آر ہے ہیں اسٹیرو ڈوبی سسٹم والے ڈیجیٹل کالم

اسپیکر۔ گوالٹی اچھی ہونی چاہیے۔“

”وہ تو خاصے منگے ہوں گے۔“

”راہ خدا میں ہاتھ بھیچ کر نہیں رکھنا چاہیے۔ ہم

فنڈ ریزنگ کریں گے۔ کچھ بن کریں گے۔ آپانسر

شب کریں گے۔“

”بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ بڑے بڑے ادارے ہیں

جو ہمیں اشارہ دیں اور ہم ان کو مسجد میں ڈسپلے کریں تو

ہمیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔“ ”ایئر کنڈیشننگ

بھی ضروری ہے۔ کتنی گرمی ہوتی ہے نا اندر۔

فرائڈے کی اسپیٹل پر پڑیں کراؤڈ بہت زیادہ ہوتا

ہے۔ اور وہ عین دوپہر کے وقت ہوتی ہے۔“ فرخ

نے کہا۔

”مگر ڈیرہ ڈیرہ ٹن کے چار اے سی لگ

جائیں۔“ خان صاحب نے کہا۔

”اس کے لیے موجودہ شیشے بھی بدلنے پڑیں گے۔

اور اس کی جگہ ڈارک موٹے شیشے لگیں گے پھر ہی

کونٹ زیادہ ہوگی۔“ خان صاحب نے کہا۔

”مگر یہ منگے رہیں گے۔“

”فنڈز کا کوئی مسئلہ نہیں یہاں لوگ اسلام کے نام

پر جان تکوے سکتے ہیں۔ سال تو معمولی بات ہے۔“

”یہاں جو چٹائیاں پڑیں ہیں وہ خاصی میلی ہو گئی

ہیں۔ ان کی جگہ اگر امپورڈ کارپٹ بچھائیں جائیں تو

نمازی بھی کھٹوٹ اسیل ہوں گے۔ درے میں تو

سر زمین کو لگتا ہے۔“ فرخ نے کہا۔

”اور سینٹ کا پتھر اتھے پر پتھر کی طرح لگتا ہے۔“

حاجی صاحب نے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”سچ کہا ہے آپ نے۔ مسجد میں دینر قالین اور

اے سی ہو گا تو عبارت میں لطف بھی آئے گا اور یکسوئی

بھی۔“ خان صاحب نے کہا۔

رقم کا حساب لگایا گیا اور اس کو جمع کرنے کے لیے

چندہ کی جگہ فنڈنگ کا نام دیا گیا۔ اس کے لیے ایک

کمیشن بنائی گئی۔ ایک کلرک رکھا گیا جس کے پاس

سب حساب ہو گا۔ اسے آفس دیا جائے اور مسجد کا

اکاؤنٹ بینک میں کھولا جائے۔ مسجد کی رسیدیں

چھپوائی جائیں اور کمیشن آفس کے لیے فرنیچر خریدا

جائے۔ شروع میں ہر گھر سے ایک ہزار ڈونیشن لی

جائے۔ کلرک کی تنخواہ پندرہ ہزار مقرر کی گئی۔ پھر

موزن کا مسئلہ آیا۔ خان صاحب نے ایک مسیحی اور

نادر شخص کا حوالہ دیا موزن کے لیے۔

”بنگالی ہے۔ آواز بھی اچھی ہے۔ صفائی بھی

کروے گا مسجد کی۔“

”بھی تو ٹھیک ہے لیکن قالینوں پر جھاٹو نہیں لگے

گاؤ کیویم کلینر لپٹا پڑے گا۔“

”وہ بھی لے لیں گے۔“ حاجی صاحب نے کہا۔

”اس تمام ساز و سامان کی حفاظت موزن اور مولوی

نہیں کر سکتا ہمیں ایک سیکورٹی گارڈ بھی چاہیے۔“

فرخ نے کہا۔

”اور یہ سیکورٹی گارڈ ہمیں کالونی فراہم کروے

گی۔“

”مسجد متقل رہے گی۔“

تجویز پیش ہوئی اور منظور ہو گئیں۔ کسی نے یہ

نہیں کہا کہ نماز کی طرف لوگوں کو راغب کیا جائے۔

مسجد کی شان شوکت بڑھانے والے نمازیوں کو نمازی

بڑھانے کا خیال نہیں آیا۔ وہ پیسہ خرچ کر سکتے تھے

لیکن ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وقت ان کے لیے پیہ تھا۔

جب رات بارہ بجے وہ پر تکلف و زکر کے جانے لگے تو فرخ نے کہا۔

”میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ کل ایک پیش امام آجائے گا۔ مسکین سا بندہ ہے جو کہیں گے وہی کرے گا اور سب کو خوش رکھے گا۔“

”یہ اچھا کیا آپ نے۔“

”دیکھیے نا ہماری مسجد ہے تو پیش امام بھی ہماری مرضی کا ہونا چاہیے۔ مولانا اور مولوی قدرت جیسا پھڑے باز اور خود سر نہیں۔“

وقت بدل گیا تھا۔ مسجد اللہ کا گھر نہیں۔ ذاتی جائیر

ہو گئی تھی۔ پیش امام کے لیے یہ ضروری نہیں رہا تھا کہ

وہ خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی کو مد نظر رکھے۔

ان کو خوش رکھنا ضروری تھا جس کا وہ ملازم تھا۔

مولوی قدرت سے سب چھین لیا گیا تھا۔ وہ پہلے

ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ مولانا کی رحلت

کے بعد وہ ان کے کوارٹر میں آگئے تھے۔ اب نہ مولانا

تھے اور نہ وہ پیش امام تو میٹھی نے ان کو کوارٹر خالی کرنے

کا حکم دے دیا تھا۔ اس کے لیے انہیں ایک مہینے کا

نوٹس ملا تھا۔

مولانا کی وفات کا صدمہ ہی کم نہ ہوا تھا کہ ان سے

امامت اور موزن کی سعادت چھین لی گئی تھی۔ پھر ان

کے پاس آنے والے بچوں کو بھی روک دیا گیا۔ ان کے

روزگار کا یہی وسیلہ تھا۔ آمدنی کے تمام راستے مسدود

ہو گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی انہیں بیوی کی طرف

سے ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ چل گیا تھا۔ پہلے وہ گم

صم بنی رہتی پھر اچانک رونا شروع کر دیتی۔ ان کے

پوچھنے پر کہتی۔ ”قدرت میں نے رقم نہ دادی۔“

وہ سمجھتے تھے کہ رقم ہاتھ نہ آنے کا صدمہ ہے۔

اس لیے اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ ”بد بخت وہ وہ

رقم ہماری نہیں تھی جو ہمارا نہیں تھا اس کے نقصان کا

کیا غم کرنا۔“

”میں نے گلا گھونٹ دیا ہے کوئی مجھ سے بڑا

قاتل۔“ وہ ہنسی جاتی۔

”خدا کے لیے ہوش کرو۔“

”پاپے پورے ہوش میں تھی میں۔ جب میں

نے رقم کا قتل کیا خود اپنے ہاتھوں سے۔“ ہلہا

”کیسی باتیں مت کرو۔ بچے پریشان ہوتے

ہیں۔“

”ان بچوں کے لیے کیا تھا میں نے سب کچھ میں

چاہتی تھی کہ یہ کوٹھی میں رہیں۔ کاروں میں

گھومیں۔“ وہ سر کوٹھی کرتی۔

”ذنا والے تمہیں پاگل کہیں گے۔“

”پاگل تو میں ہوں۔ تم بھی پاگل ہو۔ تمہارے

باپ نے بھی خواب میں نہیں دیکھے تھے تم نے چھوڑ

دیے۔ رئیس ابن رئیس کی اولاد۔ تمہارے بچے

فالتے کر رہے ہیں۔ ننگے پڑ رہے ہیں۔ ان کے پاؤں

میں جو تانیں۔ انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ انسان

کے بچے ہیں کہ کتے کے بچے۔“ وہ اچانک سنجیدہ

ہو جاتی۔

”مولانا نور الدین نورانی۔“ ایک رات وہ چلانے

لگی۔

”کیا ہوا۔“ قدرت اللہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

”وہ مولانا ان کا انتقال ہو گیا۔“

”اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ یہ تو پرانی بات ہے۔

ہست دان ہو گئے۔“

”اسے کیا ضرورت تھی مرنے کی۔ اور کچھ دن

زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ نہیں دیر کی میں نے۔ شاہدہ

نے ٹھیک کیا تھا اس نے دیر نہیں لگائی۔ وہ عقل مند

تھی۔“

”اللہ رحم کرے تم پر اور ہم سب پر۔“ مولوی

قدرت نے اس کو آیت الکرسی پڑھ کر پھونکا۔

”اللہ رحم کرے تمہاری عقل پر تم نے مجھے بتایا

کیوں نہیں تھا کہ مختار نامہ عام صرف زندگی میں کام

آتا ہے۔ جب یہ بات معلوم تھی تمہیں اور مختار نامہ

عام تمہارے پاس تھا تو کیوں نہیں بتایا مجھے۔“ وہ

چلائی۔

بھاگ بھی گئے تھے۔ مسجد کی پانچ گھڑیاں بھی چرائی تھیں۔ ”وہاں چاہتے ہوئے مزے سے بولا۔
”اور تم سامنے کھڑے اتنی ڈھٹائی سے اعتراف کر رہے ہو۔“ وہ حیران ہوئے۔

”دنیا سے ہم جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ایک اللہ سے نہیں بول سکتے۔ اور دوسرا آپ سے۔ آپ ہمیں معاف کر دو۔“ اس نے کان پکڑے۔
”بھئی، ہم کون معاف کرنے والے۔ تم جانو اور اللہ جانے۔“

”آپ ادھر کیوں نماز پڑھ رہے ہیں جی۔“
”نماز نہیں بھی پڑھی جاسکتی ہے۔“
”میرا مطلب ہے کہ آپ کی اپنی مسجد ہے جی۔“
”مسجد کسی کی نہیں ہوتی۔ وہ خدا کا گھر ہوتی ہے۔ اب وہاں دوسرے پیش امام اور مؤذن آگئے ہیں۔“

”آپ کہاں ہو۔“
”تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ مسکرائے۔
”آپ سمجھ لو کہ میں بڑا غیث اور کمینہ ہوں۔ میں نے تجبور ہو کر چوری کی تھی۔ اللہ جانتا ہے، ہم نے اللہ سے اجازت لی تھی مولیٰ صاب۔“
”اجازت لی۔ چوری کی۔“

”ہاں جی۔ مسجد میں پانچ گھڑیاں تھیں۔ جو کسی کام کی نہیں تھیں۔ ہم نے اللہ سے کہا کہ ہم مجبور ہیں یہ لے جاتے ہیں اور کوئی کام دھندہ کرتے ہیں۔ اللہ نے ہم کو اجازت دے دی۔“
”لا حول لا قوۃ کیسی لغو باتیں کرتے ہو۔“
”ہاں جی اجازت نہ ملتی تو ہم پکڑے جاتے۔ اللہ کے گھر سے چور کچھ بھی نہیں لے جاسکتا۔ وہ ہر وقت دیکھتا ہے۔“

”تمہیں توبہ کرنی چاہیے۔“
”ہم ہر وقت توبہ کرتے ہیں۔ میں نے پانچ گھڑیاں سو سو میں بیچ دیں اور ان سے مرغیاں خریدیں اور ان کو بھی دو دو سو میں بیچ دیا۔ یوں ہو گئے ہمارے پاس پورے ہزار اور ان کو ڈالا، ہم نے جیب میں۔“

”وہ توبہ کرتے اور نماز پڑھ کر دعا کرتے کہ اللہ اس عورت کے دل سے ہوس اور لالچ کے ناسور کو دور کرے۔ تو نے میرے ایمان کو سلامت رکھا اس عورت کو بھی صبر دے۔ اس کے ذہن کو صدمے سے شفا دے۔“

لیکن ان کی دعائیں بے اثر ہو گئیں۔ ان کی بیوی کی حالت ہر دوسرے دن کے ساتھ خراب ہوتی جاتی تھی۔ وہ اب علی الاعلان کہنے لگی تھی کہ اس نے مولانا کو قتل کیا ہے۔ ان حالات میں بے دخلی کا نوٹس ایک آفت ناکہلی ثابت ہوا۔ اگر وہ سمجھتے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے اور اس کے کرم سے مایوس نہ ہوتے تو اس کی رحمت جوش میں آتی۔ مایوسی گناہ اور کفر ہے۔ پریشانی کے عالم نے قدرت اللہ نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا۔

وہ سخت پریشانی اور مایوسی کے عالم میں مختلف مدارس کا چکر لگا چکے تھے۔ لیکن انہیں کہیں سے بھی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا تھا۔ بعض جگہ ان کو ایسے دھتکار دیا گیا کہ ان کو سبکی ہوئی۔ کچھ کارڈ عمل ایسا تھا جیسے وہ ان کی مسجد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے پیٹ میں لات مارنے آئیں ہیں۔

ظہر کی نماز انہوں نے ایک ایسی بستی میں پڑھی جو تیزی سے آباد ہو رہی تھی۔ اس کو غریب آبادی میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں وہی رہتے تھے جو کم تعلیم یافتہ تھے۔ ان کے خاندان بڑے تھے۔ وہ خواہش کے باوجود اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے تھے۔ وہ نماز پڑھنے نکلے تھے کہ کسی نے انہیں پیچھے سے آواز دی۔

”اچی مولوی قدرت اللہ السلام علیکم۔“
”وعلیکم السلام۔“ وہ پلٹے۔

ایک دہلا پتلا نوجوان ان سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کی داڑھی ابھی مشیت بھر نہیں ہوئی تھی۔ چار خانے والی لنگی پر سفید وائل کا میلہ کرنا اور جالی دار ٹوپی پہننے تیل سے چڑے بال۔ وہ نوجوان انہیں آشنا لگا۔
”اچی، ہم عبد الصمد۔ ہم نے آپ سے قرآن پڑھا تھا۔ مار بھی کھائی تھی۔ اور قرآن ختم ہونے سے پہلے

”اب یہ مت کہنا اس میں بھی خدا کی رضا تھی۔“
وہ مسکرائے ہنارہ سکے۔

”توبہ توبہ۔ ہم نے مرغیاں نہیں چرا لی تھیں۔
جیسے خریدی تھیں اس نے بھی نہیں چرا لی تھیں۔
سزا ملے گی اصلی چور کو۔“

”تم غلط تاویلیں دے رہے ہو تم نے جانے بوجھتے
چوری کا مال خرید لیا تھا۔“

عبدالصمد باتیں کرتا ہوا وہ اس کی اوٹ پانگ
باتیں سنتے رہے۔ یوں ہی بے خیالی میں انہوں نے اس
کو اپنی پریشانی بتائی۔

”آپ کو خدا رسول کا واسطہ انکار مت کرنا۔ آپ
ادھر آجائے۔ ہمارے پلاٹ میں ایک کمرہ بنا ہوا ہے۔
ہم ساتھ میں غسل خانہ اور کچن بنادیتے ہیں۔ آپ کو
تکلیف ضرور ہوگی لیکن ہم اس کو بعد میں اچھا کریں
گے۔ ادھر بیٹھ جاؤ گے تو لوٹنے خود سپارہ پڑھنے
آجائیں گے۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے
کہا۔

مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ جاہل
تھا۔ گمراہ تھا اور بے عقل بھی مگر اس کے دل میں
انسانیت کا درد تھا۔ استاد کے رشتے کا احترام تھا۔
”تمہاری مہربانی اب بتاؤ۔ کرایہ کیا لو گے۔“
”کرایہ۔ توبہ توبہ۔ آپ سے کرایہ لیں گے
ہم۔ ایک کمرے کا جو ایسے ہی خالی پڑا ہے۔“ مولوی
نے شکر ادا کیا تھا۔



”یہ تم نے اچھا نہیں کیا نجمہ۔ ویسے اب تو مجھے
شائبہ ہی کہنا چاہیے۔“ بابر کو جب پتہ چلا تو اس نے
کہا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اٹھائیس سال ہو گئے
ہماری شادی کو۔“

وہ خاموش رہا سر کے نیچے ہاتھ رکھے نیم دراز سامنے
دیکھتا رہا۔

”تم ناراض ہو مجھ سے۔“

”ناراض ہونے سے کیا ہوگا۔ شاید ٹھیک کیا تم
نے۔ یہ راز تمہارا تھا تم نے جب چاہا دنیا سے چھپایا۔
اب پچاس لاکھ میں افشا کر دیا۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ
گیا۔ جب تمہیں رسوائی کا اندیشہ تھا۔ وہ شخص اب
نہیں رہا جس کے لیے تم نے اپنا نام بدلا تھا۔ اس کے
بعد تمہیں کسی چیز کا ڈر نہیں رہا۔“

”پھر تمہاری خنکی کا کیا جواز ہے۔“
”یہ خنکی نہیں احساس ہے کہ ایک رشتے کا شفاف
آئینہ تمہاجس میں بال آگیا۔ کل تک جو میرے بیٹے اور
عطیہ کی بھائی تھے اب وہ نہیں رہے۔ سوتیلے
ہو گئے۔“

”یہ سب وہ ہے تمہارا۔“
”فرق آئے گا بھی نہیں سمجھدار نوجوان ہیں۔
اور سعادت مندی میں بھی کم نہیں۔ حقیقت بہر حال
انہوں نے قبول کر لی ہے۔ شاید میں بلاوجہ جذباتی
ہو رہا ہوں۔ تین کروڑ پان کا شرعی اور قانونی حق تھا
جو انہوں نے لے لیا۔“

”تین کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔“
”میرے اپنے اٹائے بھی اتنی ہی بڑی رقم کے
ہوں گے۔ یہ گھر جسے تم کو بھی کہتی ہو۔“

”تم نہیں سمجھتے۔ یہاں سب کو ٹھیاں اور بنگلے
ہیں اور ہمارا گھر ان کے مقابلے میں صرف گھر۔“

”چلو اب ہم بھی ہزار گز کی کوٹھی میں منتقل
ہو جائیں گے۔ فرخ نے مسجد کے ساتھ والے پلاٹ کا
سوڈا کر لیا ہے۔ اسلم بھی عین مسجد کے ساتھ والی دیوار
کے ساتھ کوٹھی بنانے کے حق میں نہیں۔ مسجدوں

میں آج کل فتنہ و فساد بہت ہو رہا ہے اور پھر عین سر
کے اوپر وہ لگا دیتے ہیں چار لاؤڈ اسپیکر۔ منہ اندھیرے

آدی دہل کے اٹھ بیٹھے۔ کانوں کے پردے پھٹ
جائیں۔ جمعے کے جمعے انسان کو خطبے کے سوا کچھ سنائی

نہ دے۔ ہر دو سرے روز موت کی خبریں سنو۔
رمضان میں تراویح کے شور میں دروازے بند کرنے
کے باوجود ڈرائے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔“

”تمہاری باتیں سن کر ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی

”جیسے اخبار میں اشتہار چھپتے ہیں تین سو گز کا سوپر لکڑی بنگلہ۔“ عطیہ نے کہا تھا۔
”کوٹھی ہو تو ایک ہزار گز کی۔“ عطیہ نے تائید کی۔

اچانک مولانا کی وفات بران کے نام آدھے کروڑ کی لائبریری نکال دی تھی۔ یہ سارا کھیل قدرت کا تھا۔ مولانا عقد خانی کر لیتے اور ان کے بچے ہوتے یا ٹرسٹ کر دیتے۔ اگر نجمہ یہاں لوٹ کر نہ آتی تو بھی اسے پتانہ چلتا۔

اس فرخ نے پلاٹ کا سودا پچیس لاکھ میں کر لیا تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے موجودہ تین سو گز کے مکان کو بیچ کر ہزار گز کی کوٹھی خرید لیں۔ وہ کسی کو منع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ منع کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اچانک گھر جذباتی طور پر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ یہ میرا ہے یہ تیرا ہے۔ جیسے اٹھائیس سال پہلے ان کو ان کا فعلی باپ ملا تھا آج ان کو اصلی باپ ملا تھا جو پچاس لاکھ کا اٹھارہ چھوڑ کر مر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں بابر علی بابا ثابت ہوا تھا۔ جو بھوٹ اس نے اٹھائیس سال پہلے بولا تھا وہ سامنے آگیا تھا۔

بے شک ان لوگوں کی موت اور لحاظ تھا کہ وہ آج بھی اسے ڈیڑی کہتے تھے۔ وہ بہر حال اچھا انسان تھا۔ جس نے ان کی پرورش کی اور بہت محبت اور ذمہ داری سے اس مقام تک پہنچایا تھا۔ لیکن وہ کتنا تھا برا دور۔ فیکٹس۔ مولانا ہی ہمارے والد تھے۔ ایک یہ حقیقت ہے۔ سیب کے درخت پر لگا پھل سیب ہی کہلائے گا۔ آم نہیں۔“ فرخ نے بڑا بخ بجز یہ کیا تھا۔
بابر کو اب واقعی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح خوش حال اور خوش رہ سکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود محسوس کرتے کہ فرق پڑ چکا ہے۔ کاش وہ کراچی سے لاہور نہ آتے۔ یہ سب کچھ نجمہ کے اصرار پر ہوا تھا۔

اس نے کروٹ بدلی۔ نجمہ سکون سے سو رہی تھی۔ وہ آزادی نہیں خود مختار بھی ہو گئی تھی۔ اس کے جوان بیٹے راتوں رات کروڑ پتی بن گئے تھے۔ اور اس دولت

مسلمان کے گھر میں پیدا ہی نہیں ہوئی۔ حالانکہ تمہارا باپ تو کٹر مولوی تھے۔ معلوم نہیں مولانا نے تمہارے ساتھ کس طرح گزارہ کیا ہو گا۔ وہ یقیناً ”غیر معمولی قوت برداشت کے مالک ہوں گے جب ہی انہوں نے تمہیں برداشت کیا۔“

”یہی کون سی غلط بات کہی میں نے۔“ وہ خفا ہوئی۔

”غلط اور سہی کا تصور ہی بدل گیا۔ ورنہ جہاں زر پرستی کا چکر نہیں لوگ آج بھی مسجد کے زیر سایہ رہنے میں سعادت سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ جبر اور زبردستی کا رد عمل ہے۔ کہ پہلے تمہارے باپ نے اور پھر مولانا تمہارے ساتھ کی۔ اگر تمہیں ہمار محبت سے سمجھایا جاتا تو شاید تمہارا رویہ اور سوچ مختلف ہوتی۔“
”لو خانوں کی دین سے دور کی وجہ یہ ہی ہے کہ وہ سختی سے گھبراتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر کفر کے فتوے سے بدگمان ہوتے ہیں۔ انہیں اتنا ڈرایا جاتا ہے کہ وہ بدک جاتے ہیں۔“ اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ اکیلے ہی بولا جا رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے۔ وہ بابر کی باتوں کو غلط بھی نہیں کہہ سکتی تھی اور جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اس لیے بے زار ہو رہی تھی۔

بابر نے لائٹ بند کی اور سوچا کہ دس سال پہلے جب وہ اس گھر میں آئے تھے تو کتنا خوش تھے۔ یہ ان کے خوابوں کی جنت تھی۔ اس سے پہلے وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ چھ سو گز کا پلاٹ خریدنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اچانک ان کو ایک ضرورت مند مل گیا جو آدھا پلاٹ بیچنا چاہتے تھا۔ نجمہ نے کہا کہ ہم دن پونٹ بنالیں گے۔ دو بیڑ روم اوپر رکھیں گے تو یہ بھی چھ سو گز ہو جائے گا۔ اور پھر سب نے مل کر اسے ڈیرا زن کیا تھا۔

لیکن آج جو کوٹھی ان کے خوابوں کی جنت تھی ان کی نظروں سے اتنی گر گئی تھی کہ انہیں تین سو گز کے گھر میں رہنے سے احساس ندامت ہونے لگا تھا۔

”یہ کوٹھی ہے۔ تین سو گز کی کوٹھی۔“ فرخ نے کہا تھا۔

”دیکھیے ہم مسجد کمپنی کے ممبر ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم مسجد کے صحن میں بیٹھے مسجد کے پلان کو فائل کر رہے تھے کہ اچانک وہ آگئے۔“

”وہ کون۔“ بابر نے بڑی مشکل سے خود کو گرنے سے بچایا۔

”وہ چار تھے نقاب پوش۔ انہوں نے قدرت اللہ کا بوچھا۔ شاید اسے قتل کرنے آئے تھے۔ لیکن فرخ نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ اس نے چلا کر کہا تم وہی ہونا عبد الرشید۔ بس یہی اس کی غلطی تھی۔ انہوں نے کلا شکوف کا برسٹ کھول دیا۔“

”ہم تو نہیں جانے کسی مولوی عبد الرشید کو۔ ہم نے پولیس کو بھی مطلع کر دیا ہے اور ایسویکس بھی منگوائی ہے۔“ خان صاحب نے کہا۔

بابر نے پیچھے ایک دھماکا سنا۔ یہ اس کی بیوی تھی۔ جو بے ہوش ہو کر گری تھی۔ اس کا سر گٹ کو لگا تھا۔ وہ عورت شطرنج کی بازی نہیں اپنی زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ بابر نے میچ اپنے دونوں بیٹے کھو دیے تھے۔ بال صرف شراف آئینے میں نہیں آیا تھا۔ یہ میچ موت کی خونی خلیج تھی۔ جو ان کے رشتوں کے درمیان دولت نے حاصل کر دی تھی۔

مولوی قدرت ایک کمرے میں چارپائی پر بیٹھے چھت کو گھور رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے بچے سوئے ہوئے تھے۔ وہ ابھی ان کو مشکل سے سلا کر بیٹھے تھے۔ ان کی ماں دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا میں نہیں تھی۔ شاید وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ یہاں آکر اس کی ذہنی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بار بار کہتی کہ میں نے تین کروڑ قتل کیے ہیں۔ کبھی رونے لگتی اور کبھی ہنسنے لگتی۔ وہ کہتی تھی پتا ہوتا کہ تم تین کروڑ کے ہو تو تم کو زندہ رکھتی۔

مولوی قدرت کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کیا اس نے مولانا کو قتل کیا ہے وہ اثر سوچتے مگر یہ ناممکن تھا۔ مولانا کی حالت بچنے والی نہیں تھی۔ ان کو کسی نے مارا نہیں تھا وہ طبعی موت مرے

پر بابر کو کوئی اختیار نہیں تھا۔ بیٹے اچانک باپ سے اونچے ہو گئے تھے۔ انہیں کوئی تخت نہیں کرنا پڑی تھی۔ کوئی قربانی نہیں دینا پڑی تھی۔ سارے عذاب بابر کے حصے میں آئے تھے یا ان کے باپ نے جھیلے تھے۔

اب اسے شک ہو رہا تھا کہ یہاں شفٹ ہونا اس میں نغمہ کی پلاننگ شامل تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولانا نے شادی نہیں کی۔ اس کے وارث آج بھی دونوں بھائی ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اور کیوں کر رہی ہے۔ یہ صرف بابر کی محبت نہیں تھی۔ محبت ایک جذباتی ضرورت تھی جو بابر نے پوری کر دی تھی۔ باقی سب ایک شطرنج کی بازی تھی۔ جو اس نے جیت لی تھی۔

رات کے سنانے کو اچانک آوازوں کے شور نے درہم برہم کیا۔ باہر کیے بعد دو گاڑیاں آکر روکی اور انہوں نے گھنٹی بجا کر دروازہ پشٹا شروع کیا اس نے اٹھ کر پردہ ہٹایا اور کھڑکی کا پٹ کھول کر باہر دیکھا۔

”نجمہ اٹھ بیٹھی اس نے سائیز بلب جلا دیا اور ٹائٹ سوٹ کو سنچال کر بال سیٹھے۔“ یہ کیسا شور ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“

”ایسے مت جائو۔ ڈاکو نہ ہو۔“ اس نے روک دیا۔

”ڈاکو ایسے شور نہیں کرتے۔ یہ کوئی مصیبت زدہ ہیں۔ دیکھو کیسے شور کر رہے ہیں۔“ اس نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالا۔

”کیا بات ہے۔ کیوں چلا رہے ہو۔“

”بابر صاحب باہر آئیں۔“ کسی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کیسی بری خبر۔“ اس نے گیٹ کھول دیا۔

”آپ کے فرزند۔ اسلم اور فرخ۔ شہید ہو گئے ہیں۔“

”شہید ہو گئے۔“ واٹ نان سینس۔ وہ کون سا جہاد پر گئے تھے۔ وہ سو رہے ہیں اپنے کمرے میں۔“ بابر نے برہمی سے کہا۔

کی۔

ایک مہینہ میں وہ عبدالصمد سے سات ہزار روپے لے چکے تھے۔

”مملووی جی۔۔۔ آپ ہمارے استاد اور بزرگ ہیں۔۔۔ آپ ہمیں سوچتے بھی مارو گے تو ہم آف تک نہیں کہیں گے۔۔۔ آپ ہم سے سات ہزار روپے لے چکے ہو۔۔۔ کب تک ایسے ہی گزارہ ہو گا۔۔۔“
”وہ تمہارا قرض اور احسان ہے۔۔۔“ ان کا سر جھک گیا۔

”پچلو یہی سہی۔۔۔ ہم تو دیتے رہیں گے اور کبھی مانگیں بھی نہیں۔۔۔ لیکن ایسے گزارہ کیسے ہو گا۔۔۔ آپ خدا انخواستہ معذور تو نہیں۔۔۔“
”ہم بتاؤ ہم کیا کریں۔۔۔ ہم کام کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن کوئی کام نہیں ملتا۔۔۔“

”لو جی ملتا نہیں پیدا کیا جاتا ہے۔۔۔ آپ وہی کرو جو پہلے کرتے تھے۔ مسجد میں امامت کرو۔ بچوں کو پڑھاؤ۔ نکاح کراؤ۔ جنازے پڑھاؤ۔ اور پھر دیکھو تماشا۔ یہاں جو لوگ ہیں وہ کٹر قسم کے مسلمان ہیں۔ تم انہیں خالی دم بھی کرو گے تو وہ یقین رکھیں گے۔ آپ کی خالی پھونک پر بھی اعتماد ہو گا انہیں۔۔۔“
”تم کیا کہہ رہے ہو میں ان کو بے وقوف بناؤں۔۔۔“

”نہیں جی۔۔۔ اللہ کی پاک کلام میں برکت ہے۔۔۔ آپ خود منہ سے کچھ نہ کہیں یہ خود پیش کریں گے۔ کبھی کالا مرغا تو کبھی سورہے۔ اور کبھی بکرا بھی۔۔۔“
”نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔۔۔“
”چلیں آپ تعویذ نہ کریں۔۔۔ وہ کریں جو پہلے کرتے تھے۔ رہا مسئلہ مسجد کا تو وہ بن جائے گی۔۔۔“
”کیسے بنے گی اور کہاں۔۔۔“

”اسی جگہ۔۔۔ اسی پلاٹ پر۔۔۔ کیسے بنے گی یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔۔۔ اور دیکھتے جائیں۔۔۔“ اور پھر عبدالصمد نے راتوں رات بارہ پندرہ مزدور لگا کر مسجد کھڑی کر دی۔ کل رات ساڑھے نو بجے کام شروع ہوا تھا اور صبح چار بجے ختم ہو گیا۔ مزدور سے لے کر

تھے۔ یہ ان کا خیال تھا۔۔۔ ان کی بیوی کو تو حجرے کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ وہ کبھی اکلی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ پھر وہ قتل کیسے کر سکتی تھی۔ وہ آخری دن تک گھر پر تھی ان کے ساتھ ساری گڑ بڑ بھی تھی۔ ایک رات غفلت کی نیند کے چند لمحے ان کو یاد نہیں تھے۔ جب لانچ نے ان کی بیوی کی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ وہ سوئے تو بیوی کے پہلو میں تھے۔ بیدار ہوئے تو بیوی ان کے پہلو میں تھی۔ پھر وہ شک کیوں کرتے۔

جب اس کی کیفیت، جفنی ہو گئی تو قدرت اللہ نے اسے عبدالصمد کے مشورے پر دماغی امراض کے اسپتال پہنچا دیا تھا۔ وہ کسی کا خون نہیں کر سکتی تھی۔ ڈاکٹر کے نزدیک اس کو ذہنی دھچکا لگا ہے جو وہ برداشت نہیں کر پارہی تھی۔

وہ ایک ہفتے بعد اپنی بیوی سے ملنے گئے تو ڈاکٹر نے انہیں ملاقات سے روک دیا۔ ان کے اصرار پر انہیں اجازت ملی تو وہ ان کی شریک حیات زنجیروں سے بندھی تھی۔ اس کے جسم پر لپاس نام کی چیز نہیں تھی۔ وہ انسان نہیں حیوان تھی۔ جس کو کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔

وہ واپس لوٹ آئے۔ بے حد مایوس اور دل برداشتہ۔ وہ جہاں بھی جاتے انہیں نوکری سے انکار ہو جاتا تھا۔ ان سے ان کی تعلیم کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔ اسکولوں میں اب الزاما ڈرن استاد قرآن کی تعلیم دے رہے تھے۔ ان کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ بچوں کی ضروریات کیسے پوری کریں۔ یہاں تک کہ بھیک مانگنے کے لیے بھی پولیس کی اجازت درکار تھی۔ یہ مسئلہ بھی عبدالصمد نے حل کر دیا۔ وہ اس وقت ذہنی کم ہمتی اور مایوسی کا شکار تھے۔ وہ اکثر بچوں کے بھانے کھانے پینے کی چیزیں پھوڑ جاتا لیکن کب تک۔ ان سب کے باوجود کہ عبدالصمد کی لائی چیزیں حرام کے پیسوں کی تھی لیکن وہ کھانے پر مجبور تھے۔ انہوں نے اللہ سے معافی مانگی کہ وہ مجبور ہیں۔۔۔

عبدالصمد نے راتوں رات ان کے لیے مسجد تعمیر

جب نماز چلے گئے تو مولوی صاحب نے کہا۔

”یہ پلاٹ کس کا ہے؟“

”بس جی اللہ کی زمین ہے۔ آپ آم کھاؤ پتہ مت گنومولی جی۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

کہا۔

”پلاٹ کس کا ہے۔“ انہوں نے سختی سے

پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اب مسجد بن گئی۔

کوئی ہٹا سکتا ہے تو ہٹا کر دکھائے۔ چھ ماہ سے کوئی

نہیں آیا یہاں۔ آیا تو قیمت دے دیں گے۔ ورنہ

جائے تھانے میں رپورٹ درج کروا دے۔ مسجد کی

ایک اینٹ بھی نہیں ہٹا سکتا۔ یہاں کے لوگ خون

بدلوں گے اپنا۔ اخباروں میں شور مچا دیں گے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسجد کو شہید کرنے والا کافر

ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اسے کہیں اور زمین دے

سکتی ہے گورنمنٹ۔“

مولوی قدرت چٹائی پر بیٹھے خلا میں دیکھتے رہے۔

آخر اللہ ان کے کس کس گناہ کو معاف کرے گا۔

اس کی رحمت کی انتہا نہیں۔ مگر بندے کو مجبوری کو

عذر گناہ بنانے کا حوصلہ کیوں بدھتا جاتا ہے۔

اسی دن ظہر کے بعد انہوں نے سینٹل اسپتال فون

کیا تھا۔

”آپ کی بیوی مر گئی۔ اس کی میت لے

جائیں۔ اس نے دیواریوں سے سر کلزا کلزا کر اپنی

جاہن دے دی۔ وہ چلائی رہی میں قائل ہوں۔ تجھے

پھانسی دے۔ میں نے مولانا نور الدین نورانی کو قتل کیا

ہے۔ یہ کون تھے۔“

”حق مغفرت کرے۔ عجیب آزاد مرد تھا۔ یہ

سانحہ کس وقت پیش آیا۔“

”آج الصبح۔ پانچ بج کر چالیس منٹ پر۔“

مولوی صاحب فون رکھ کر ساکت وصامت کھڑے

تھے۔ صبح اذان ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی گھڑی

دیکھی تھی۔ اس وقت پانچ بجکر چالیس منٹ ہوئے

الیکٹریشن تک۔ سب نے اپنا اپنا کام ختم کر لیا۔

عبدالصمد نے کسی باہر اچھینٹ کی طرح زبردست پلاننگ

کی تھی۔ اس نے مسجد کی تعمیر ختم ہوتے ہی وہ پورٹ

باہر آوازیں کر دیا جو پہلے سے تیار تھا۔

”ایک برکھتا تھا نکاح خواں قدرت اللہ نورانی اور

دوسرے پر لکھا تھا یہاں بچوں کو ناظرہ اور حفظ کر لیا

جاتا ہے۔ اسی کے نیچے لکھا تھا کہ بعد نماز عشاء رس و

ذکر میں شرکت فرمائیں۔“

”مولوی جی۔ اب دیکھو خدا کی قدرت۔ ان

شاء اللہ ظہر تک پلسٹر ہو جائے گا اور شام تک

سفیدی بھی ہو جائے گی۔ یہ رہی آپ کی مسجد۔ آؤ

بسم اللہ کرو۔ فجر کی نماز ہونے والی ہے۔ آپ اذان دو

ہم چلتے ہیں۔ اور ہاں کل باہر چندے کا بکس بھی لگا دیں

گے۔“ وہ کاریگروں کو رخصت کر کے بولا۔

”کیوں۔ تم نماز نہیں پڑھو گے۔ مسجد ہی بنانا

کافی ہے کیا۔“

”ہم گناہ گاروں کی نماز کہاں قبول ہوگی۔ آپ

کہتے ہیں تو پڑھ لیتے ہیں جی۔“

جب مولوی صاحب نے اذان دی تو انہیں اپنی

آواز میں پہلے سے زیادہ سوز محسوس ہوا۔ وہ اپنے

آنسو روک نہ پائے۔

انہوں نے جماعت کے لیے انتظار کیا۔ پہلے

ایک نمازی آیا پھر دوسرا اور جب چار ہو گئے تو انہوں

نے امامت کے لیے جائے نماز بچھائی۔ نماز کے لیے

آنے والوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ ان کی گلی میں بھی

ایک مسجد بن گئی ہے۔

”بڑی جلدی کی مولوی صاحب آپ نے۔“

راتوں رات مسجد بنادی۔“ کسی نے کہا۔

”یہ پلاٹ کس کا ہے۔“ ایک صاحب نے

پوچھا۔

”آپ نے نہیں دیکھا مسجد کے پیچھے والے کمرے

میں مولانا رہتے ہیں۔ بس انہوں نے راہ خدا میں

نہیں دے دی۔ تو جب ارادہ کر لیا تو نیک کام میں دیر

کس بات کی۔“ عبدالصمد نے کہا۔

زیادہ غربت سے پناہ مانگنی چاہئے۔ غربت میں انسان حرام حلال کی پروا نہیں کرتا اور بے غیرت ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی وفادار تھی تو پھر بے وفا کیسے ہو گئی؟ اس سے یہ کیسی بھول ہو گئی تھی کہ اس نے غربت کی وجہ سے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ ذمے دار کون تھا؟ شوہر یا شوہر کا دوست۔۔۔

پرائی عورت

سدیش کمار



نہ صرف یہ بلکہ کرشن کمار گھر کے دیگر اخراجات کے لیے بھی شترو کو رقم ادھار دینے لگا۔ شترو گھن اتنا بھولا نہیں تھا کہ اسے دوست کی ان نوازشوں کا سبب سمجھ نہ پاتا۔ وہ کرشن کمار کی نظموں کو پچھانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کرشن کمار، کمعلیش میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود اس نے اس معاملے کو روکنے یا آگے بڑھنے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ ایک طرح سے خاموش تماشائی بن گیا۔ اس نے کمعلیش کو اس دلدل سے بچانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ شترو گھن نے کمعلیش پر کوئی اعتراض کرنے کے بجائے اسے کرشن کمار کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے، باتیں کرنے اور گھر سے باہر کرشن کمار کے ساتھ اکیلے جانے کی اجازت دے دی۔

ابتداء میں کمعلیش نے اس پر اعتراض بھی کیا کہ اس کا شوہر اپنے دوست کو اتنی ڈھیل کیوں دے رہا ہے، مگر شترو گھن نے الٹا اسے ہی ڈانٹ دیا۔ پھر تو شترو گھن کی طرف سے کھلی چھوٹ پکار کرشن کمار من مانے کرنے لگا۔

شراب نوشی کی عادت کے سبب شترو گھن کے عادات و اطوار خاصے بدل گئے تھے۔ رات کو وہ دیر سے گھر واپس آتا اور بات بے بات کمعلیش کو مارنے پینے لگتا۔ پھر یہ کہ کم آمدنی کے سبب وہ اپنی نئی نوہلی دامن کی کوئی بھی خواہش پوری نہیں کر پاتا تھا۔ کمعلیش کبھی اس سلسلے میں زبان بھی کھولتی تو اسے ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ کے سوا کچھ نہ ملتا۔

کرشن کمار صرف کمعلیش کی وجہ سے شترو گھن کے گھر کا پورا خرچ برداشت کرتا تھا، کمعلیش بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ طویل عرصے خود کو کرشن کمار کے بڑھتے ہوئے دست ہوس سے نہ بچا سکی۔ کمعلیش کو یہ بھی علم تھا کہ کرشن کمار پہلے ہی دو شادیاں کر چکا ہے۔ اس کی پہلی بیوی سے ایک بچہ تھا اور دوسری بیوی سے دو بچے تھے۔ کرشن کمار کے بارے میں یہ علم ہونے کے باوجود کمعلیش اپنے شوہر کی حالت دیکھ کر کرشن کمار کے اشاروں پر

کمعلیش، ننان پور گاؤں کی رہنے والی تھی۔ 1977ء میں اس کی شادی مرتضیٰ پور کے ایک گاؤں نگرام میں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کا نام شترو گھن تھا۔ شترو تین بھائیوں میں منبھلا تھا۔ گاؤں میں وہ بھتیجی پاڑی کیا کرتا تھا۔ بھتیجی کے قابل زمین کیوں کہ کم تھی اس لیے خاندان کی گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ شترو گھن کو اکثر گھر کے کھانے پینے کا سامان گاؤں ہی کی ایک دکان سے ادھار لینا پڑتا تھا۔ اس دکان کا مالک کرشن کمار تھا۔ کرشن کمار، شترو گھن کے بچپن کا دوست تھا اور اکثر اس کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ کرشن کمار کو شراب نوشی کی بھی عادت تھی۔

شترو اور کمعلیش کی ان دونوں نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ کمعلیش کی عمر صرف بیس سال تھی۔ وہ نئی ساڑھی پہنے، ہاتھوں میں ہندی رکھائے، پاؤں میں پائل باندھے کسی ہنسی کی طرح گھر میں گھومنا کرتی تھی۔ حسن و جوانی سے بھرپور کمعلیش کو کرشن کمار جب بھی دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کمعلیش کو دیکھ کر اس پر بے خودی سی طاری ہو جاتی۔ جب بھی وہ شترو گھن کے گھر آتا تو اس کی نگاہیں کمعلیش ہی کو تلاش کرتی رہتیں۔ کمعلیش کو حاصل کرنے کے لیے اس نے دھیرے دھیرے شترو گھن پر اپنا جال پھینکنا شروع کر دیا۔ اس نے رفتہ رفتہ شترو گھن کو بھی شراب کا شوق لگا دیا۔ وہ شترو کو اپنے پاس سے پیسے خرچ کر کے بلاتا تھا کیوں کہ شترو کے پاس تو کھانے پینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے وہ بھلا شراب کا شوق کہاں سے پورا کرتا۔

اول شترو نے شراب نوشی سے بچتا چاہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مہنگا شوق ہے، مگر روز روز کی ترغیب سے آخر وہ کب تک بچتا ایک دن اس نے جام اٹھایا لیا۔ یوں گویا وہ اپنی عمرو میوں اور احساس غربت کو شراب میں ڈبو رہا تھا۔ ویسے بھی وہ کرشن کمار کا مقروض تھا اس کی کسی بات سے کس طرح انکار کرتا۔

جب شترو گھن نے کرشن کمار کی بات مان لی تو اس نے شترو سے قرض کی واپسی کا مطالبہ بھی ترک کر دیا۔

گالیاں کھانے سے بھی وہ تنگ آچکی تھی۔ کرشن کمار
بہر حال کھلیش کو چاہتا تھا اس لیے اسے بھی شتروگھن
کا یہ رویہ بہت گراں گزرتا تھا۔ اس کی محبوبہ اس کے
سامنے پتی رہتی تھی اور وہ اندر ہی اندر چیخ و ناپ کھاتا
رہتا تھا۔

ایک دن جب کرشن کمار، کھلیش کے ساتھ اکیلا
تھا تو اس نے اپنے دل کی بات اپنی محبوبہ سے بھی کہہ
دی۔

”کرشن، ہم کب بھی کیا سکتے ہیں۔“ کھلیش
اواس آواز میں بولی۔ ”میں اس کی پتی (بیوی) ہوں اور
اسے ادھیکار (حق) ہے مجھ پر۔“

”رنتو (گھر) میں اپنے من کو کیسے سمجھاؤں!“
کرشن کمار نے کہا۔ ”سچ کہتا ہوں تم سے کہ جب وہ
میرے سامے ہاتھ اٹھاتا ہے تو میرا من (دل) اندر ہی
اندر ٹٹنے لگتا ہے۔“

”تو پھر تم ہی کچھ سوچو کہ میں اس زرگ (جنم) سے
کس پرکار (طرح) نکل سکتی ہوں۔“
کرشن کمار کچھ دیر کو چپ ہو گیا، پھر بولا۔ ”ایک
راستہ ہے۔“

”وہ کیا؟“ کھلیش فوراً ”لوچھ بیٹی۔“
”تم اپنے میکے چلی جاؤ۔“ کرشن کمار نے تجویز پیش
کی۔

”ر اس سے کیا ہو گا؟ پھر میرا تمہارا ملن کیسے ہوا
کرے گا؟“ کھلیش نے دریافت کیا۔
”اس کی تم پروا نہ کرو، میں کسی نہ کسی بہانے
تمہارے میکے آکر تم سے مل جایا کروں گا۔“ کرشن کمار
نے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔“ کھلیش نے
طویل سانس لے کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

پھر کچھ ہی دنوں بعد کھلیش اپنے میکے کنال پور
چلی گئی۔ وہاں جانے کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے
اپنے شوہر شتروگھن کو خط لکھا۔ خط میں اس نے خرچ
کے لیے رقم منگائی تھی۔ شتروگھن کمائی ہی کہاں تھا جو
اسے خرچ بھیجتا اس سلسلے میں اس نے کرشن کمار کے

بانہنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ اسے کچھ اور نہ سوجھا اور وہ
بھی کرشن کمار کے جال میں پھنسی چلی گئی۔ کرشن کمار
موقع سے پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ جب بھی موقع ملتا وہ
کھلیش کو اپنے ساتھ لے جاتا اور کھلیش اسے انکار
نہ کر پاتی۔

ظاہر ہے کہ گاؤں میں کھلیش اور کرشن کمار کے
تعلقات کس طرح جیسے رہتے۔ لوگ طرح طرح کی
باتیں بنانے لگے۔ وہ شتروگھن کو بھی بے غیرت کہتے جو
سب کچھ دیکھتے بھالتے کچھ نہ کہتا تھا۔ یوں تو کرشن کمار
اکثر شتروگھن کو شراب کے نشے میں دھت رکھتا تھا، پھر
بھی جب کبھی اسے کچھ ہوش آتا تو وہ کھلیش کو کرشن
کمار کے ساتھ محبت کی بیٹنیں بڑھانے پر طعنہ دیا کرتا
تھا۔ اب اس نے کھیتی باڑی میں بھی دلچسپی تقریباً ختم
کر دی تھی اور دن کے وقت بھی نشہ کیے رہتا تھا۔
پیسوں کی اسے فکر نہیں تھی۔ کرشن کمار سے جب
بھی وہ پیسے مانگتا مل جاتے، لیکن اس کے باوجود اس کے
دل میں کوئی کانٹا سا چبھتا رہتا۔ اس کا ضمیر اسے
ملامت کرتا اور اسی کے نتیجے میں وہ اپنی بیوی کو طعنہ
دیتا۔ اس طرح اس کے دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی
حالانکہ سب کچھ کیا دھرا خود اسی کا تھا اور کھلیش اس
کی ذمے دار نہیں تھی۔ کبھی بھی تو وہ شراب پی کر
کرشن کمار کے سامنے ہی کھلیش کو مارنا پینا شروع
کر دیتا تھا۔ شاید اس طرح وہ لاشعوری طور پر خود کو یہ
جتاتا تھا کہ کھلیش پر اس کا حق ہے، کھلیش اس کی
عورت ہے اور وہ چاہے تو اسے مار بھی سکتا ہے، اس
شخص کے سامنے بھی جو کھلیش کا وہ سرا دعویدار
ہے۔ کرشن کمار کے سامنے اپنی بیوی کھلیش کو
مارتے ہوئے اسے عجیب سی روحانی خوشی ہوتی تھی۔

کھلیش یہ ظلم برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اسے
بھی علم تھا کہ کرشن کمار سے اس کے تعلقات کی خبر
سارے گاؤں کو ہے مگر وہ اب اس کی پروا نہیں کرتی
تھی۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے شرابی شوہر سے نفرت ہوتی
جا رہی تھی اور اسی نفرت کے رد عمل میں وہ کرشن کمار
کی طرف مزید جھکنے لگی تھی۔ روز روز کی مار پیٹ اور

پورے ہوتے رہتے تھے اور جیسے بھی بھری رہتی تھیں۔ پھر یہ کہ کرشن کمار کے ساتھ نشہ پانی بھی چلا رہتا تھا۔ اب وہ کبھی کرشن کمار سے نشہ پانی کے لیے کہتا بھی تو کرشن کمار یہ کہہ کر ٹال جاتا کہ فرصت نہیں ہے کام میں بہت الجھا ہوا ہوں۔

موجودہ صورت حال شتروگھن کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کرشن کمار کنال پور آتا جاتا رہتا ہے۔ یوں گویا خود تو کرشن کمار اپنی خواہشات کو پورا کرتا رہتا تھا اور وہ کملیش سے دور تھا۔ روز روز وہ کرشن کمار کی طرح کنال پور نہیں جاسکتا تھا۔ کملیش کے فراق سے مجبور ہو کر ایک دفعہ اس نے خط بھی لکھا کہ تم گاؤں واپس آ جاؤ۔

شتروگھن کے اس خط کا جواب کملیش کی بجائے اس کے باپ نے دیا۔ اس نے لکھا کہ جب تمہارے حالات ٹھیک ہو جائیں اور تم میری پتری (بیٹی) کا خرچ اٹھانے کے قابل ہو جاؤ تو خود آ کر اسے لے جانا۔

یہ جواب پا کر شتروگھن بل کھا کہ رہ گیا۔ اب وہ کوئی اور راہ سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے آخر اسے ایک راہ نظر آئی تھی۔ اس طرح کملیش بھی اس کے پاس رہ سکتی تھی اور گویا وہ بھی ہوئی بہار میں بھی واپس آ سکتی تھیں۔ وہ ایک بار پھر عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس طرح وہ اپنی دانست میں حالات سے سمجھوتا کر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کیوں نہ وہ کملیش کو ساتھ لے کر خود بھی کرشن کمار کے ساتھ رہے۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ کرشن کمار سے ملنے روانہ ہو گیا۔

اسے خوش خوش دیکھ کر کرشن کمار کو تعجب ہوا۔ اس نے کہا۔ ”کیا بات ہے شترو؟ آج بڑے پرسن (خوش) کو کھانی پڑتے ہو۔“

”ہاں کرشن، بات ہی پرسن ہونے کی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کہو، کیا بات ہے؟“ کرشن کمار نے کہا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کملیش کو کنال پور سے بلا لوں۔“

سامنے ہاتھ پھیلاتا بھی ضروری نہیں سمجھا، مگر وہ تین دن گزرنے پر کملیش کا دوسرا خط اسے ملا تو وہ مجبور ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ کرشن کمار انکار نہیں کرے گا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ وہ نرم کملیش کو بھیجی جانا تھی۔ وہ کرشن کمار کے پاس پہنچ ہی گیا۔

شتروگھن کی بات سن کر کرشن کمار بولا۔ ”مجھے اپنے ایک کام سے کنال پور جانا ہے، وہیں کملیش کو خرچ کے پیسے بھی دے دوں گا۔“

کرشن کمار کا جواب اتنے ہی شتروگھن کا چہرہ بچھ گیا۔ اس ہمانے وہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے بھی کچھ پیسے رکھ لیتا چاہتا تھا مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔

اسے خاموش دیکھ کر کرشن کمار نے ٹوکا۔ ”کیا سوچنے لگے تم؟“

”کچھ نہیں، ٹھیک ہے تم وہاں جا رہے ہو تو خود ہی جو وہ مانگے دے دینا۔“ اس نے بھی ہلکی سی آواز میں کہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس طرح کرشن کمار، کملیش کے گاؤں کنال پور بھی آنے جانے لگا۔ گاؤں والے عموماً ”سمان نواز“ ہوتے ہیں۔ کملیش نے کرشن کمار کو اپنے شوہر کا گہرا دوست بتایا تھا اس وجہ سے کرشن کمار، کملیش کے گھر ہی ٹھہرتا تھا۔ کملیش کے ماں باپ کہتے تھے کہ داماد کا دوست بھی داماد سان (داماد کی طرح) ہوتا ہے، رہتے اور عزت میں پھر یہ کہ وہ لوگ غریب تھے اور ان کے مقابلے میں کرشن کمار مالدار! اس لیے بھی وہ اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر کرشن کمار، کملیش سے تنہائی میں ملنے کا موقع نکال لیتا تھا۔ خود کملیش بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کرتی تھی۔

جب سے کملیش اپنے میکے گئی تھی، کرشن کمار نے شتروگھن کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ وہ اب شتروگھن کو پیسے اودھار دینے میں ٹال مٹول کرنے لگا تھا۔ شتروگھن ایک طرف تو کملیش سے دور ہو گیا۔ دوسری طرف خرچ سے تنگ۔ کملیش گاؤں میں تھی تو اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ جسمانی تقاضے بھی

تنہائی میں کھلیش کو بھی اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ وہ اس سے خوش ہوئی اور خود بھی اپنے والدین سے آملوگی ظاہر کر دی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جانے پر راضی ہے۔

کھلیش کے والدین نے جب دیکھا کہ کرشن کمار ایسا مالدار آدمی شترگوں کی ضمانت لے رہا ہے اور ان کی بیٹی بھی اپنے شوہر کے ساتھ جانے پر آمادہ ہے تو انہوں نے کھلیش کو ساتھ کر دیا۔ کرشن کمار کو ان سے یہی توقع بھی تھی۔

کنال پور سے وہ تینوں مرتضیٰ پور لوٹنے کے بجائے سیدھے لکھنؤ پہنچ گئے۔ انہوں نے رکاب گنج کے پاس مشک گنج میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ کرشن کمار تیز آدمی تھا اس نے اپنی پرانی جان بچان نکال کر ایک کلرک کی سفارش سے چرائی کی نوکری حاصل کر لی۔

شترگوں نے لکھنؤ میں بھی کوئی کام کرنا قبول نہیں کیا۔ وہ یا تو کھلیش کی ٹھکانی کرنا ریتا یا پھر پی کر پڑا ریتا۔ پینے کے لیے پیسے اسے کرشن کمار ہی دیتا تھا۔ اب اسے عیش و آرام بھی نصیب تھا اور کھلیش بھی اس کے پاس تھی۔ شراب بھی میسر تھی اور خوب صورت عورت بھی! اسے اور چاہے بھی کیا تھا، مگر ایک بار پھر اس کی رگوں میں رقابت کا زہر دوڑنے لگا۔ وہ لکھنؤ آکر بھی کوشش کے باوجود زیادہ دن بر سکون نہیں رہ سکا۔ اکثر شراب پی کر وہ جھگڑا کرنے لگا تھا۔ وہ کھلیش کو برا بھلا کہتا رہتا تھا اور گالیاں بکتا تھا۔ پہلے اس نے کرشن کمار کی غیر موجودگی میں ایسا کیا، پھر اسے کرشن کمار کی بھی پروا نہ رہی۔

کرشن کمار نے جب اسے پڑی سے اترتے دیکھا تو سمجھایا ابتدا میں وہ کرشن کمار کے سمجھانے پر چپ ہو جاتا تھا، مگر کچھ ہی روز بعد کرشن کمار سے بھی اچھے لگا۔ پھر شترگوں ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اس نے کھلیش کو بار بار پینا بھی شروع کر دیا۔

ایک دن کرشن کمار اپنے دفتر سے لوٹا تو شترگوں کھلیش کو پیٹ رہا تھا۔ کرشن کمار درمیان میں آگیا

”پر تم تو کہہ رہے تھے کہ کھلیش کے ماتا پتا (والدین) اسے یہاں بھیجنے پر راضی نہیں ہیں۔“
”وہی ترکیب تو میری سمجھ میں آئی ہے۔ اگر تم کھلیش سے یہاں آنے کو کہو گے تو وہ فوراً“ راضی ہو جائے گی اور اس کے ماتا پتا بھی تمہاری بات نہیں پالیں گے کیوں کہ تم ایک عزت دار اور پیسے والے آدمی سمجھے جاتے ہو۔ تم انہیں یقین دلادو گے کہ ان کی بیٹی خراج کی طرف سے تنگ نہیں رہے گی تو انہیں کھلیش کو بھیجنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے“ کرشن کمار مسکرایا۔ ”میں تمہاری ضمانت لے سکتا ہوں اور کھلیش کو یہاں لا بھی سکتا ہوں مگر گاؤں والوں کی زبان کون بند کرے گا؟ وہ تو مجھے اور تمہیں دونوں ہی کو بدنام کرتے رہے ہیں۔ کھلیش دوبارہ گاؤں آئی تو پھر ان کی زبانیں بھی کھل جائیں گی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ شترگوں نے سر ہلایا، پھر زادیہ بعد کہا۔ ”پھر تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ تاکہ ہم دونوں بدنامی سے بچ سکیں۔“

”ترکیب تو ہے، لیکن اس کے لیے تمہیں گاؤں چھوڑنا ہوگا۔ بولو ہے منظور؟“ کرشن کمار نے کچھ سوچ کر شترگوں سے سوال کیا۔

”پہلے پوری بات تو بتاؤ۔ اگر یہ ضروری ہو تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔“ شترگوں پر اشتیاق لہجے میں بولا۔

”اسیسا ہے کہ ہم دونوں کھلیش کو لے کر یہاں سے لکھنؤ چلتے ہیں، وہیں کوئی گھر کرائے پر لے کر رہیں گے۔ میری بیوی اور بڑا لڑکا دونوں دکان سنبھال لیں گے۔ میں وہاں کوئی نوکری بھی دیکھ لوں گا۔ ہم تینوں وہاں بغیر کسی بدنامی کے رہ سکیں گے۔“

شترگوں کو کرشن کمار کی یہ تجویز پسند آئی۔ پھر دوسرے ہی دن وہ کرشن کمار کو لے کر کنال پور پہنچ گیا۔ کرشن کمار نے کھلیش کے والدین سے خود بات کی اور انہیں یقین دلایا کہ کھلیش اب خراج کی طرف سے تنگ نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ اس نے

اور اسے ایسا کرنے سے روک لگا۔
 ”تم ہٹ جاؤ سامنے سے!“ شتروگھن چیخا۔ ”ہٹ جاؤ ورنہ مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہو گا؟“
 ”مگر تم کیوں مار رہے ہو اسے؟ آخری کوئی وجہ بھی ہو!“ کرشن کمار کو بھی غصہ آگیا۔ کملیش اس کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔
 ”کسی وجہ سے بھی مار رہا ہوں، تم کون ہو پوچھنے والے! تمہیں کیا حق ہے میرے اور میری بیوی کے بیچ بولنے کا؟ یہ میری بیوی ہے، میں اسے خوب ماروں گا؟“
 اسی بات پر جب دونوں کے درمیان تکرار ہونے لگی تو کملیش غصے میں گھر سے نکل کر رکاب گنج کے چوراسے پر جا بیٹھی۔ ان حالات میں وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنے میکے واپس چلا جانا چاہیے، مگر جانے سے پہلے وہ کرشن کمار سے ملنا چاہتی تھی۔
 کچھ ہی دیر کے بعد اسے کرشن کمار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ کرشن کمار پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے سے فکر مندی کے آثار ختم ہو گئے۔
 ”مگر تم جاؤ تو واپس کنال پور جا سکتی ہو۔“ کرشن کمار اس کے قریب پہنچ کر بولا۔
 ”ہاں میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ کملیش نے رضامندی میں سر ہلایا۔
 پھر کرشن کمار نے اسے پیسے دیے اور بس میں بٹھادیا۔ گھر واپس آکر اس نے دیکھا کہ شتروگھن اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ وہ اس سے کچھ نہیں بولا۔
 ”میں بھی اپنے گاؤں واپس جانا چاہتا ہوں، مجھے کرائے کے لیے کچھ پیسے دے دو۔ اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔“ بالا خرہ شتروگھن ہی نے کرشن کمار کو مخاطب کیا۔ وہ سامان باندھ چکا تھا۔
 اس کی بات سن کر کرشن کمار چونکا۔ ”کیا تم نے کملیش کو واپس جاتے دیکھ لیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ شتروگھن نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”تم نے اسے بس میں بٹھایا تھا۔ میں کچھ دور سے تم دونوں

کو دیکھ رہا تھا۔“ اس کے بعد اس نے جب میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکالے اور شتروگھن کی طرف بڑھا دیے۔ یہ لو۔“
 شتروگھن نے خاموشی سے پیسے لیے اور پھر وہاں نہیں رکا۔ اس کے دل کو ہر حال یہ سکون آگیا تھا کہ اگر کملیش اس کے پاس نہیں تو کرشن کمار بھی اب اس سے نہیں مل سکتا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ بغیر اس کے کرشن کمار، کملیش کو یوں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔
 اس واقعے کے بعد تقریباً ”دو سال تک کملیش اپنے میکے کنال پور ہی میں رہی۔ اس دوران میں کرشن کمار کا جب جی چاہتا اس سے مل آتا۔ لیکن شتروگھن کو کملیش کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔
 دو سال کے بعد کرشن کمار کے دل میں کملیش کی محبت نے کچھ زیادہ ہی جوش مارا۔ وہ اب اسے مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار وہ کملیش سے ملنے کنال پور گیا تو اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔
 ”کملیش! یوں تمہارے بنا بھلا میں کب تک اکیلا رہوں، تم سے ملے اکثر مہینوں ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری نظر سے دور نہ رہو۔“
 ”میریسے ہو سکتا ہے؟“ کملیش بولی۔ ”میرے ماتا پتا مجھے تمہارے ساتھ کیسے بھیج سکتے ہیں! اگر شترو بھی ساتھ ہوتا تو اور بات تھی۔ پھر یہ کہ ایک بار بات بگڑ چکی ہے۔ تم نے ذمے داری لی تھی میری کہ شترو مجھے تنگ نہیں رکھے گا۔ پھر وہ اپنے وعدے سے پھر گئے تو میں واپس اپنے میکے چلی آئی۔ اب دوبارہ شاید میری ماتا پتا شترو کے ساتھ بھی مجھے نہ بھیجیں۔“
 ”اسے بھول جاؤ کملیش!“ کرشن کمار نے کہا۔
 ”اب ہمارے تمہارے بیچ اس کا کوئی دخل نہیں۔“
 ”پھر؟“ کملیش حیرت سے بولی۔
 ”بس مجھے یہ بتا دو کہ تمہیں مجھ پر وشواس (بھروسہ) ہے یا نہیں؟“
 ”وہ تو ہے۔“
 ”تو پھر چلو میرے ساتھ۔“
 ”پر کیسے؟“

”پھر کرشن کمار نے اسے سمجھایا کہ والدین کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، بس خاموشی سے بغیر کچھ بتائے کملیش اس کے ساتھ چلی چلتے۔ کملیش تذبذب کا شکار ہو گئی۔ وہ دن سوچ بچار میں گزر گیا۔ کرشن کمار کے ساتھ رہنے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کرشن کمار ہر طرح اس کی ناز برداری کرتا تھا۔ کھانے پینے اور پہننے کو اڑھنے کو اچھالتا تھا۔ پھر یہ کہ اس مرتبہ شترگوں بھی ساتھ نہیں تھا جو اسے بارنا پٹیتا۔ اس کے علاوہ اپنی بھابی سے بھی میکے میں اس کی بنتی نہیں تھی۔ اس کی بھابی اسے طعنہ دیتی رہتی تھی۔ اس کے سامنے اگر کوئی مسئلہ تھا تو والدین کی رضامندی کا تھا۔ اگر وہ ایک بار اس طرح بغیر کچھ کے

سنے کرشن کمار کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی تو پھر واپسی کا درد اذہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کرشن کمار اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کرشن کمار کو اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنے دن وہ اس کے پیچھے نہ لگا دیتا۔ کرشن کمار کی محبت کا جوش وقتی نہیں ہے یہ سوچ کر اس نے کرشن کمار سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہر طرح پہلے ہی پورا اطمینان کر لیتا جاتی تھی۔

”دیکھو یہ چوں بھر کا ساتھ ہے۔“ اس نے کرشن کمار سے کہا۔ ”مگر تم چوں بھر ساتھ بھانے کا چہن دو تو میں تمہارے ساتھ چلتے پر راضی ہوں کیوں کہ پھر میں کنال پور واپس نہیں آسکوں گی۔“ کرشن کمار راضی ہو گیا۔ اس نے کملیش کو وچن (عمد) دیا کہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ پھر کرشن کمار اسے لے کر لکھنؤ آگیا۔ وہ لکھنؤ آکر کملیش کے ساتھ مردان کھیڑا میں رہنے لگا۔ اس بار شترگوں کو کملیش کے لکھنؤ جانے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ اپنے گاؤں میں ایک بار پھر کھیتی باڑی کر کے اپنی زبردستی کرنے لگا تھا۔

اسی دوران میں کرشن کمار کی دوستی دفتر کے ایک کلرک پر تپ سے ہوئی۔ پر تپ اس کا ہم پالہ ہم والہ بن گیا تھا۔ نشے کی لہر میں ایک دن کرشن کمار نے

پر تپ کو کملیش کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ پر تپ اب تک کملیش کو اس کی بیوی سمجھتا رہا تھا۔ کرشن کمار اس بات سے بے خبر تھا کہ پر تپ بھی کملیش میں دلچسپی لے رہا ہے۔ پر تپ کو جب معلوم ہوا کہ کملیش پر اپنی عورت ہے اور کرشن کی بیوی نہیں تو اس کا شیطان جاگ اٹھا۔

کچھ ہی دن بعد اس نے کرشن کمار پر پاؤں اٹھا کر شروع کیا کہ کملیش سے اس کے بھی تعلقات استوار کر اے۔ کرشن کمار کو اپنے دوست سے یہ توقع نہیں تھی۔ نتیجہ دونوں کے درمیان تلخی پیدا ہو گئی۔ کرشن کمار نے صاف صاف انکار کر دیا تھا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

”وہ کون سی تمہاری بیوی ہے جو تم انکار کرتے ہو!“ ایک دن موقعی کر پر تپ نے بات چھیڑ دی۔

”وہ میری بیوی نہ تھی مجھ سے تو ہے!“ کرشن کمار اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم نے پر اپنی عورت کے بارے میں ایسا کیوں سوچا!“

”وہ اگر میرے لیے پر اپنی ہے دوست تو تمہارے لیے بھی پر اپنی ہے!“ پر تپ دھڑالی سے بولا۔ ”تم نے بھی تو پر اپنی عورت کے بارے میں وہی سوچا تھا نا جو میں نے سوچا ہے!“

”کیا تمہیں دوستی کا بھی خیال نہیں؟“ کرشن کمار نے بے بسی سے کہا۔

”دوستی ہی کا تو خیال کر رہا ہوں اب تک!“ پر تپ مسکرایا۔

”مگر مجھے تمہاری دوستی کا خیال نہ ہوتا تو اب تک پولیس میں رپورٹ کر چکا ہوتا کہ تم پر اپنی عورت کو بھگا لائے ہو اور اسے غیر قانونی طور پر اپنے ساتھ رکھے ہوئے ہو!“

یہ سن کر کرشن کمار کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنی حماقت پر پچھتاتے لگا کہ ناحق پر تپ کو رازدار بنایا۔

”کیا سوچنے لگے دوست!“ پر تپ نے اسے ٹوکا۔

”مگر تم نے میری بات نہ مانی تو پھر مجبوراً“ مجھے پولیس سے ملنا پڑے گا۔ جلی اگر کھائی نہیں تو اونڈھا رہتی ہے۔ تم پکڑے گئے تو نوکری الگ جائے گی اور کھلیش سے الگ ہاتھ دھونا پڑے گا۔“

کرشن کمار چکر کے رہ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ بات اتنی آگے بڑھ جائے گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ برتاپ کی بات مان لیتا۔ کھلیش کو اب وہ واپس اس کے میکے کنال پور بھی نہیں بھیج سکتا تھا اور اپنے گاؤں بھیجنے کا تو سوال ہی نہیں تھا پھر یہ کہ کھلیش کی جدائی بھی اس سے برداشت نہ ہوتی۔

”مگر مگر۔“ کافی دیر بعد اس نے زبان کھولی۔ ”میں۔۔۔ میں کھلیش سے یہ کس طرح۔۔۔ کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم۔۔۔ تم سے۔۔۔“

”تمہیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔“ برتاپ ہنس کر بولا۔ ”جس طرح کھلیش کے شوہر نے آنکھیں بند کر لی تھیں، تم بھی ویسا ہی کرو۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔“

اس کے بعد کھلیش کے گرد جال تنگ کرنے کے لیے برتاپ جو کچھ کہتا گیا، کرشن کمار نے اس پر عمل کیا۔ برتاپ نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسی منصوبے کے مطابق ایک دن کرشن کمار نے کھلیش کو اپنی دوا لینے اکیلے ہی اسپتال بھیج دیا۔ راستے میں برتاپ کے ایما پر دو تین غنڈوں نے کھلیش کو اغوا کرنے کا سوانگ رچایا۔ برتاپ نے عین موقع پر پہنچ کر کسی فلمی ہیرو کی طرح کھلیش کو اغوا ہونے بچالیا۔

اس دن کے بعد سے برتاپ، کرشن کمار کے گھر زیادہ آنے لگا۔ کھلیش اس کی ممنون تھی۔ پھر کرشن کمار کی چشم پوشی سے فائدہ اٹھا کر برتاپ، کھلیش کے قریب ہو گیا، لیکن جب اس نے حد سے گزرنا چاہتا تو کھلیش آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے برتاپ کو پھنکار دیا۔ پھر برتاپ نے وہی حربہ کھلیش پر آزمایا جو کرشن کمار پر آزمایا تھا۔ ”نتیجتاً“ کھلیش ڈر گئی۔ برتاپ نے اس سے کہا تھا کہ کرشن کمار کے ساتھ ہی

وہ بھی جیل بھیج دی جائے گی۔ کچھ دن مزاحمت کے بعد آخر کھلیش کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ برتاپ نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کرشن کمار کو بھی سب کچھ معلوم ہے اس لیے اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کھلیش نے جب عملاً ”کرشن کمار کی چشم پوشی کو محسوس کر لیا تو اسے برتاپ کی بات پر یقین آ گیا۔ کرشن کمار کا اثر ان دونوں کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر کسی نہ کسی بہانے چلا جاتا تھا۔

برتاپ احسان فراموش نہیں تھا۔ اس نے اپنے دفتر پیش کو تشل کر کے کھلیش کو بھی نوکری دلادی۔ یوں وہ تینوں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کرشن کمار اور کھلیش دونوں ہی نے برتاپ کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ پہلے بھی ان کے درمیان تیسرا شخص موجود تھا، یعنی شتروگھن! برتاپ نے گویا اس کی جگہ نے لی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ شتروگھن کی طرح رقابت کے زیر اثر کھلیش کو مارتا ہیبتا نہیں تھا۔

مرون کھیڑان کے دفتر سے کافی دور تھا اس لیے برتاپ نے اپنے ایک دوست کے ذریعے ان دونوں کی سکونت کا بندوبست علی گنج میں کر دیا۔ وہ دونوں مرون کھیڑا سے علی گنج کے اس کوارٹریں آکر رہنے لگے۔

کرشن کمار اور کھلیش نے مقامی عدالت میں کافی دن سے اپنی شادی کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ ان دونوں ہی نے خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا تھا۔ برتاپ کے درمیان میں آجانے کے بعد کرشن کمار نے اسے معاملے کو نمٹانے کا فیصلہ کیا تاکہ

کھلیش قانونی طور پر اس کی بیوی بن جائے اور وہ برتاپ کے دباؤ میں نہ رہے۔ عدالت میں دونوں کی بیروی ایک وکیل جے جے رام نے کی تھی۔ شادی کی تمام کارروائی بھی اسی وکیل کے ذریعے طے پائی۔ اس کے بعد کرشن کمار قدرے مطمئن ہو گیا۔

اس دوران میں کھلیش کا شوہر شتروگھن اس کے بارے میں قطعی لاعلم رہا کہ وہ کہاں ہے کیوں کہ وہ اپنے میکے سے بھی غائب تھی۔ کرشن کمار جب بھی

چھڑانا مشکل ہے اس لیے اس نے صاف صاف بات کر لیا مناسب سمجھا۔ کچھ سوچ کر اس نے شتروگھن سے کہا۔ ”کملیش یہیں ہے مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے لیے بہت پریشان ہو مگر وہ اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے بھی اس سے کئی بار کہا تھا کہ تمہارے پاس گاؤں چلی جائے مگر اس نے ہر بار انکار کر دیا۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں اسے زبردستی نہیں لے جاؤں گا۔“ شتروگھن نے کرشن کمار کو یقین دلایا۔ ”بس تم ایک بار مجھے اس سے معلوم دو۔“

”وہ اسی دفتر کے ایک دھماگہ (شعبے) میں ملازم ہے۔ اسے لے کر ہم دونوں گھر چلتے ہیں مگر ایک شرط ہے کہ تم اس سے جھگڑایا مار پیٹ نہ کرنا۔“

شتروگھن اس پر راضی ہو گیا کہ وہ راستی کے ساتھ کملیش سے بات کرے گا۔

کملیش نے جب کرشن کمار کے ساتھ اپنے شوہر کو دیکھا تو چونک اٹھی۔ پھر اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کرشن کمار نے کہا۔ ”شترو تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے مگر یہاں نہیں گھر چل کر!“

جواب میں کملیش کچھ نہ بولی اور ان دونوں کے ساتھ گھر آگئی۔ گھر آتے ہی مکمل اندر والے کمرے میں چلی گئی۔ پھر کرشن کمار نے اس سے کھانا پکانے کے لیے کہا تو وہ باورچی خانے میں آگئی۔ موقع پا کر کرشن کمار باورچی خانے میں آگیا۔

”سنو کملیش!“ اس نے مدھم آواز میں کملیش کے قریب آکر کہا۔ ”شترو تمہیں لینے آیا ہے، لیکن تم اس کے ساتھ کبھی قیمت پر نہ جانا۔ وہ تم سے ساتھ چلنے کو کہے تو صاف الفاظ میں انکار کر دینا۔“

کرشن کمار جیسے ہی باورچی خانے سے باہر آیا شتروگھن، کملیش سے بات کرنے باورچی خانے میں آگیا۔ وہ کملیش سے گاؤں چلنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔

”آج آیا ہے تو مجھے لینے!“ کملیش بری طرح بھر گئی۔ برسوں سے تو کہاں مر گیا تھا! اب میں تیری

لہو دینے بعد اپنے گاؤں آتا، شتروگھن اس سے غور ملتا اور کملیش کے بارے میں استفسار کرتا۔ کرشن کمار جھوٹ بول کر کہہ مجھے کچھ معلوم نہیں بس ہے پیچھا چھڑا لیتا تھا۔ شتروگھن کی تشویش کا سبب وہ ہلائی تھی جو گاؤں بھر میں اسے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح دوبارہ کملیش واپس آجائے گاؤں کے لوگ اکثر اس کا مذاق اڑانے کے لیے اس سے کملیش کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ گاؤں والوں کے رویے سے شتروگھن بہت چڑتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کرشن کمار کو کملیش کے بارے میں ضرور علم ہے کہ وہ کہاں ہے۔

مارچ 85ء کے ابتدائی دنوں کا واقعہ ہے کہ ہولی کے توہار پر کرشن کمار، کملیش کو لکھنؤ چھوڑ کر گاؤں آیا۔ شتروگھن اس مرتبہ بھی اس سے ملا اور اپنی بیوی کے بارے میں معلوم کیا۔ کرشن کمار نے وہی پہلا جواب دیا کہ مجھے کملیش کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔

شتروگھن کو شبہ تھا کہ کرشن کمار، کملیش کے ساتھ لکھنؤ ہی میں نہیں رہتا ہے ورنہ وہ نوکر ہی چھوڑ کر گاؤں میں آ سکتا۔ ہولی کی چھٹیوں کے بعد کرشن کمار واپس لکھنؤ چلا گیا تو دن بعد ہی شتروگھن لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ اسے علم تھا کہ کرشن کمار کس دفتر میں ملازم ہے وہ سیدھا کرشن کمار کے دفتر پہنچ گیا۔

”میری بیوی کا پتا بتا دو کرشن کمار کہ وہ کہاں ہے؟“ شتروگھن نے وہاں پہنچ کر بھی کرشن کمار سے یہی سوال کیا۔

کرشن کمار نے بہت کوشش کی کہ شتروگھن ٹل جائے مگر ناکام رہا۔ شتروگھن اس کے دفتر میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔

شام کو چھٹی کے وقت شتروگھن اس سے بولا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا!“ اس کا بوجھ فیصلہ کن تھا۔

کرشن کمار اب سمجھ چکا تھا شتروگھن سے پیچھا

مارپیٹ سننے والی نہیں، سمجھا! بہتر یہی ہے کہ چلا جا یہاں سے!"

جواباً "شترگوں اس پر الزامات عائد کرنے لگا۔ دونوں میں جھگڑا ہونے لگا تو مجبوراً "کرشن کمار بچ بچاؤ کرانے لگا۔

"س بچ کے لیے میں کھانا نہیں پکاؤں گی! اسے یہاں سے بھاگ دو!" کملیش غصے سے کانپتی ہوئی کرشن کمار سے بولی۔

"آوارہ ہو کر تیرا دلخ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے!" شترگوں بھی چیخ اٹھا۔ "پنے یار کے سامنے آج بہت اکر رہی ہے!"

کرشن کمار نے بات بڑھتے دیکھ کر کملیش سے کہا۔ "چھوڑو بھی کملیش، کم سے کچھ کھانا تو پکا ہی دے اس کے لیے، میرا ستر (دوست) ہے یہ اگاؤں سے اتنے دن بعد آیا ہے، بھوکا پیاسا ہو گا۔ بانی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

کھانا کھانے سے پہلے شترگوں نے پیٹ اور شرٹ اتاردی تھی۔ اب وہ صرف ایک ٹیکر اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ کھانا کھانے کے بعد شترگوں نے پھر کملیش سے گاؤں واپس چلنے کو کہا۔

کملیش نے اسے پھر دھتکار دیا۔ شترگوں کو اس پر غصہ آگیا۔ اس نے کملیش کے منہ پر پھینکا مارا۔ میکیش اب تک اس کی مار پیٹ برداشت کرتی رہی تھی، مگر اس وقت وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ شادی ہونے کے آٹھ سال بعد تک اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے اس کا جسم گنٹھا ہوا تھا اور وہ جسمانی اعتبار سے بھی شترگوں کا مقابلہ اچھی طرح کر سکتی تھی۔ غصے میں میکیش نے شترگوں کو چارپائی سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔

دونوں کو ہاتھ پائی کرتے دیکھ کر کرشن کمار کی رگوں میں بھی لمبو جوش مارنے لگا۔ ایک شخص اسی کے سامنے اس کی محبوبہ کو مار پیٹ رہا تھا، یہ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے پیشہ کے لیے اس کانٹے کو نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور چاقو نکال

لایا۔ شترگوں اس وقت کملیش کے نیچے دبا ہوا تھا اور اس کو شش کر رہا تھا کہ میکیش کی گردن اس کے ہاتھوں میں آجائے کرشن کمار نے کملیش کے نیچے دے ہوئے شترگوں کی گردن میں چاقو بھونک دیا۔ شترگوں کٹتے ہی شترگوں کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا جس سے کملیش اور کرشن کمار کے کپڑے خون سے تر ہو گئے۔ پھر چند لمبے ایڑیاں رگڑ کر شترگوں کا جسم ساکت ہو گیا۔ وہ مرد کا تھا۔ اس کی لاش کے آس پاس جیسے خون کا دریا بہہ رہا تھا۔

شترگوں کی موت کے بعد کملیش اور کرشن کمار دونوں ہی کو اپنے غصے اور بھول کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے جو میکیش کسی بچھی ہوئی شیرنی کی طرح دوکھائی دے رہی تھی اب بڑی بڑی سی لگ رہی تھی۔ کملیش کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر کرشن کمار نے کہا۔ "اب ہمیں اس کی لاش جلد سے جلد ٹھکانے لگانا چاہیے۔"

بعد میں انہوں نے خون میں سنا ہوا بنیان اتار کر لاش سے خون کے دھبے دھوئے پھر انہوں نے شترگوں کی لاش کو ایک کپڑے سے صاف کیا اور سڑک کی دوسری جانب خالی پڑے ہوئے ایک کوارٹر میں چھپا دیا۔ پھر دونوں نے مل کر کمرے کا خون آلود فرش دھویا اور خون میں سے ہوئے سارے کپڑوں کو جلانے کی تیاری کی۔ کپڑے پوری طرح نہ جل سکے۔ کرشن کمار اور کملیش دونوں ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ نتیجتاً انہوں نے جلے اودھ جلے کپڑوں کو سمیٹ لیا جن میں شترگوں کا بنیا بھی شامل تھا۔ کرشن کمار وہ کپڑے اور خون آلود چاقو اپنے مکان کے پچھواڑے مٹی جھاڑیوں میں چھپا آیا۔ یہ واقعہ 19 مارچ کا تھا۔

دوسرے دن بیس مارچ کو شام کے وقت اسی علاقے میں رہنے والا ایک نوجوان معراج خاں، خلی پڑے ہوئے کوارٹر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس نے کوارٹر میں کئی کتے گھمتے ہوئے دیکھے۔ اندر سے بھی کتوں کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

مسکرائیے

ہالی دوڑ کے قریب ایک گلی کے کونے پر دو کتوں کی ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے پوچھا۔
”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔“

”میں اپنی دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔“
دوسرے کتے نے جواب دیا۔

”کیسی ہے وہ؟“ پہلے کتے نے تجسس سے پوچھا۔
”سفید رنگ کی ہے، دو فٹ لمبی ہے، دم چھوٹی ہے، لیڈی کہہ کے آواز دو تو متوجہ ہو جاتی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

”اچھا..... اچھا“ اس کی پیشانی پہ سیاہ دھبہ ہے اور ذرا لنگڑا کر چلتی ہے۔“ پہلے کتے نے مزید نشانیاں بتائیں۔

”ہاں..... ہاں وہی“ دوسرے نے تائید کی۔
”میں تو خود اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“ پہلا کتا بولا۔

دوسرے نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔
”کیا زمانہ آ گیا ہے..... ہماری مادائیں بھی ہالی دوڑ کی عورتیں ہوتی جا رہی ہیں۔“

☆

شادی کے چھ ماہ بعد میاں بیوی میں پہلا جھگڑا ہوا۔ غصے سے بے قابو ہو کر شوہر نے بیوی کی پیٹھ پر از دوامی زندگی کا پہلا گھونسا رسید کیا۔

اتفاق سے بادی صاحب وہاں سے گزر رہے تھے انہوں نے کھڑکی سے گھونسا پڑتے دیکھا تو فوراً دوڑے بچ بچاؤ کے لیے۔

شوہر نے دیکھا کہ بادی صاحب گھر میں آئے ہیں تو تسخیل کر اس نے بیوی کی پیٹھ پر از دوامی زندگی کا گھونسا نمبر دو رسید کیا اور گرج دار آواز میں بولا۔
”اب بھی چرچ جانے سے انکار کرو گی۔“

☆☆

پہلے دیکھ کر معراج کو کچھ تعجب سا ہوا۔ اپنے تجسس کو دور کرنے کے لیے اس نے جیسے ہی کوارٹر کے اندر قدم رکھا اسے بدبو کا بھکا محسوس ہوا۔ اس نے شام کے دھندلکے میں دیکھا کہ کسی لاش پر کئی کتے ایک ساتھ جھپٹ رہے تھے لاش دیکھتے ہی وہ سہم گیا اور پھر فوراً وہاں سے نکل کر تقریباً دوڑتا ہوا علی گنج تھانے جا پہنچا۔ اس وقت تھانے کا انچارج ہری شکر شکلا وہاں موجود تھا۔ معراج نے جو کچھ دیکھا تھا، ایک ہی سانس میں بتادیا۔ کسی لاش کا ذکر سنتے ہی ہری شکر شکلا سپاہیوں اور معراج کو ساتھ لیے فوراً ہی موقع واردات پر پہنچ گیا۔

ٹارچ کی روشنی میں ہری شکر شکلا نے دیکھا کہ وہ لاش کسی مرد کی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس برس کے قریب رہی ہوگی۔ شکلا کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ لاش دیوار کے سارے سر کے بل ٹکی ہوئی تھی۔ مرنے والے کے جسم پر صرف ایک نیکر تھا۔ اس کی گردن پر کسی دھار دار ہتھیار کا گمراہ ختم تھا۔ جس سے بہا ہوا خون مرنے والے کے چہرے پر جما ہوا تھا۔ چہرے کا کٹانی حصہ نچا ہوا تھا جو یقیناً کتوں ہی نے نوچا تھا۔ پولیس والوں نے اس پاس کے کچھ لوگوں کو بلا کر وہ لاش دکھائی مگر لاش کی شناخت نہ ہو سکی۔ رات زیادہ ہو جانے کے سبب شناخت اور پتہ چایت نامہ بھرنے کی کارروائی کو دوسرے دن صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ وہاں دو سپاہیوں کا پیرا لگا دیا گیا تھا۔

21 مارچ کی صبح تھانے کا انچارج شکلا اور ایس بی فکر مصرا موقع واردات پر جا پہنچے۔ شناخت وغیرہ کی کارروائی شروع کرنے کے کچھ دیر بعد ہی وہاں کٹانی ہجوم ہو گیا۔ کٹانی دیر تفتیش کے بعد بھی لاش کی شناخت نہ ہو سکی تو پولیس نے پتہ نامہ بھرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں انڈس پڑوس کے لوگ لاش لہکنے آ جا رہے تھے۔

اچانک اس بھیڑ میں موجود ایک جوان عورت آگے بڑھتے ہوئے زور زور سے چیختی لگی۔ ”یہ میرا شوہر ہے میرا شوہر ہے!“ اس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔

کا قتل میری ہو کھلیش اور اس کے عاشق کرشن نے کیا ہے۔

ایس بی شکریہ سن کر سی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بڑھاپا اور کچھ سپاہیوں کو ساتھ لیا اور کھلیش کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کھلیش اور کرشن کمار کی گھڑیاں کرنے والے دو سپاہی بھی موجود تھے۔ جنہیں آج صبح شکر نے متعین کیا تھا کہ وہ دونوں کہیں فرار نہ ہو سکیں۔

شترگوہن کی ماں کے ساتھ پولیس گھر میں داخل ہوئی تو کھلیش اور کرشن کمار کے چہروں کی رنگت بدل گئی۔

اچانک بڑھاپا، کھوٹی پر ٹنگے ہوئے کچھ کپڑے دکھ کر چیخ اٹھی۔ ”صاحب! وہ دیکھیے شترگوہن کے کپڑے یہی کپڑے ہیں کرشن کمار کے گھر سے چلا تھا۔“ کھلیش اور کرشن کمار کی سٹی کم ہو گئی۔ ان دونوں کو اب تک ان کپڑوں کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ایس بی شکر نے کپڑے اپنے قبضے میں لے کر اسے ساتھ آسا والے سپاہیوں کو گھر کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ کلا تلاش و جستجو کے بعد پولیس نے کوارٹر کے پیچھے جھاڑیوں میں چھپے ہوئے خون آلود جے ادھ جے کپڑے اور چاقو برآمد کر لیا۔ تلاشی کے دوران مٹر پولیس کی عدالت کی طرف سے جاری کردہ وہ کانڈا گم مل گیا جس سے کھلیش اور کرشن کمار میاں بیوی ثابت ہوتے تھے۔

قتل کا راز افشا ہونے کے بعد پولیس نے سختی کے ساتھ کرشن کمار اور کھلیش سی پوچھ گچھ کی۔ وہ دونوں زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکے اور اقبال جرم کر لیا۔ پولیس نے انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور پھر چارج شیٹ عدالت میں پیش کر دی۔

اس عورت کو پختہ دلیہ لڑکے کے لوک حیران رہ گئے۔ وہ اس عورت کو پہچانتے تھے۔ وہ عورت سامنے ہی کے کوارٹریں کرشن کمار کے ساتھ رہتی تھی اور لوگ ان دونوں کو میاں بیوی سمجھتے تھے۔ مرنے والا کرشن کمار نہیں کوئی اور ہی تھا؟ اس کے سبب وہ حیرت زدہ تھے۔

پاگلوں کی طرح چیخنے والی وہ جوان عورت کھلیش تھی جو شاید اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکی تھی، مگر حقیقتاً ”ایسا نہیں تھا۔ اس کا ثبوت اس وقت مل گیا جب اس نے پولیس کے سامنے اپنا بیان دیا۔ اس نے کہا مرنے والا میرا شوہر شترگوہن ہے جو مرتضیٰ پور کے گاؤں گرام کارہنے والا ہے۔ تین دن پہلے وہ مجھ سے ملنے یہاں آیا تھا اور واپس گاؤں جانے کو کہہ کر چلا گیا تھا۔“ کھلیش بہر حال گاؤں کی ایک عورت تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ اس طرح شاید اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔

لاش کی شناخت ہو جانے کے بعد تھانے کے انچارج شکلا نے اسے سیل کرا کے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا۔ کارروائی پوری کرانے کے بعد شکلا نے دو سپاہیوں کو فوراً ”متقول کے گاؤں بھیج دیا۔ کھلیش کی حالت دیکھ کر اس نے فی الحال مزید پوچھ گچھ سے گریز کیا۔ تھانے آکر وائزلیس کے ذریعے اس نے تھانہ اموا کی پولیس کو ہونے والے قتل سے مطلع کروایا۔

مگر ان گاؤں اسی تھانے کے علاقے میں تھا پھر شکلا نے معاملے کی جانچ پڑتال ایس بی شکر مصر کے ایما پر اسے سونپ دی۔

ایس مارچ کی شام کو ہی شترگوہن کی ماں اپنے بیٹے کے قتل ہونے کی اطلاع پاکرونی پستی علی خاں تھانے پہنچ گئی۔ شترگوہن کی ماں کو اس پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں ہے کیوں کہ اب تک اس نے اپنے بیٹے کی لاش نہیں دیکھی تھی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جا چکی تھی۔ ایس بی شکر کے استفسار پر بڑھاپا نے کہا۔

”مگر قتل ہونے والا میرا ہی بیٹا شترگوہن ہے تو اس

رشتے

ریاض فاطمہ

کوئی لمحہ اتنا سچا ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے۔۔
پہن ہی سے وہ رشتوں کے جال میں پھنس گئی تھی جب یہ جال ٹوٹے
تو وہ خود حیران رہ گئی۔

دو سو تیلیجنیجنوں کے درمیان جھوٹ اور غرض کی کھانی

مارے ان کے ہاتھ سے ڈبا آکر پڑا اور چینی باورچی
خانے کے فرش پر پھیل گئی تو مجھے اور غصہ آگیا۔ جھٹکے
سے ان کا بازو ٹھینچا اور بے دردی سے باورچی خانے
کے باہر کی طرف دھکا دیا۔ نازک مزاج گڈو صاحب کو
ٹیرٹھی نظر سے تو دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ ”ظلم“ کہنے
برداشت کرتے تھے جتنا ”اس قدر گلا پھاڑ کر رونے لگے
کہ الامان۔

ادھر سے صاحب بہادر لپکے ہوئے آئے ”غصہ
مجھ پر آرہا ہے تو مجھ پر اتارو نا۔ خواہ مخواہ معصوم“ بے
خطابچے کو مارا۔ ”انہوں نے جھٹ سے اپنی لاڈلی اولاد
کو سینے سے لگا لیا۔

آج دس بارہ دنوں کے بعد وہ لاہور سے لوٹے تھے۔
آفس کے کام سے تین آدمیوں کو لاہور بھیجا گیا تھا۔

”میں نے جب آپ کو ہزار مرتبہ بتا دیا ہے کہ
فیوڈی رنگ سے مجھے سخت نفرت ہے تو پھر؟“ مارے
رنگ اور غم کے مجھ سے بات مکمل نہ کی گئی۔ وہ الگ
شرم سارے کھڑے تھے۔

”دراصل مجھے یہ شیڈ اس قدر خوب صورت لگا کہ
میں نے فوراً“ خرید لیا۔ میرے ساتھ سعد بھی تھے۔
ابیس بھی بے حد پسند آیا تھا، تم بہن کرو تو دیکھنا یہ رنگ
تم پر بہت کھلے گا۔“

وہ میرا موڈ درست کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر
میں نے غصے سے ساڑھی میز پر پھینکی اور خود باورچی
خانے میں آگئی۔ وہاں گڈو صاحب چینی کے ڈبے میں
اتھ ڈال کر مٹھیاں بھر بھر کر چینی کھانے میں مصروف
تھے مجھے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ڈر کے



اسے بلانے آگیا۔ ”میری گردن پر کسی کا سر لگا تو میرے مزے کڑھ گیا۔ ایاز صاحب میرے کندھے پر سے اٹھ کر دیکھنے کی کوشش فرما رہے تھے۔

”وہ انگل آپ ہیں، دراصل میں اپنا ہوم ورک کر رہا تھا، آج مس نے بہت سا ہوم ورک دے دیا، رات کو تو مجھے جلدی نیند آ جاتی ہے اس لیے میں نے آدھا کر لیا۔ بس میں ابھی آپ کے پاس آنے ہی والا تھا مگر آپ خود ہی آگئے، ممی میں جاؤں؟“ بڑے بھولپن سے اجازت مانگی گئی۔

”جاؤ مگر جلدی آجانا۔“

”ٹھیک ہے ممی۔“ وہ خوشی سے ہاتھ ملاتا ہوا ان صاحب کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔

اس کی یہی بات مجھے بہت پسند تھی کہ خواہ کتنا بھی وہ شرارتی اور کھلنڈرا تھا مگر اپنی برصالی کی طرف ہمیشہ بہت توجہ دیتا تھا۔ گڈو اپنی ابتدائی تعلیم کی کئی جماعتیں طے کر کے اس سال ”کے جی ٹو“ میں آئے تھے۔ تینوں بچوں میں سب سے زیادہ چنورا یہی تھا۔ چینی تو اس کی جان تھی۔ ذرا سی نظر بچی اور گڈو صاحب باورچی خانے میں۔۔۔ پیار سے سمجھایا، ڈانٹا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا میں نے بہ ظاہر اسے اس کے چال پر چھوڑنے کے باجود کڑی نگاہ رکھنا نہ چھوڑی تھی۔ باورچی خانہ ہمیشہ بند رکھتی چینی کا ڈبہ بھی اوپر تو رکھتی مگر کبھی کبھی کیا اکثر ہی وہ ڈبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تھا جیسا کہ آج بھی ہو گیا تھا۔

احسن خوشی خوشی وہ سب کچھ دکھا رہے تھے کہ میرے اور بچوں کے لیے لائے تھے اور ہمیشہ کی طرح آج پھر بھول گئے تھے کہ فیوزی رنگ مجھے سخت ناپسند ہے۔ اس حد تک ناپسند کہ اس کی شدت کا میں خود اندازہ نہیں کر سکتی۔ شادی سے پہلے تو یہ حالت تھی کہ جہاں کسی کو فیوزی رنگ کے سوٹ میں دیکھتی میرا خون کھولنے لگتا۔ اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے سلم میں کڑواہٹ کھل جاتی، تیور یوں پر بل بڑھ جاتے اور میرا حتی الامکان کوشش یہی کرتی کہ اس جگہ سے ہٹ جاؤں جہاں یہ منحوس رنگ موجود ہو۔ مجھے فیوزی

اسی میں احسن بھی شامل تھے۔ ان کی آمد کے باعث صبح سے میرا موڈ خوشگوار تھا مگر فیوزی ساڑھی دیکھی تو غصہ آگیا۔ میری منہ شاداب کا گھر تقریباً برابر ہی میں تھا۔ ان کے گھر سے کوئی نہ کوئی چکر لگنا رہتا ہے اس لیے اکیلے دیکھے گا بھی کوئی ڈرنہ تھا۔ چنانچہ وہ نہایت بے فکری سے لاہور میں دن گزار کر آئے۔

ادھر مجھ پر نہ صرف گھر کی بلکہ باہر کی ذمہ داری بھی پڑ گئی تھی۔ اوپر سے آفت کے پر کالہ تین بچے سحر جب سے نوپن کلاس میں آئی تھی اور سائیکس کے مضامین لیے تھے اپنے آپ کو میڈیکل کلن لے میں سمجھنے لگی تھی۔

”ممی پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے گا۔ میں پڑھ رہی ہوں۔“

”مگر کھانا کھانے کے وقت تم خود ہی شرافت سے میز پر آ جانا مجھے دوبارہ نہ بلانا پڑے۔“

”ممی میں پڑھ رہی ہوں نا، بھوک لگے گی تو خود ہی نکال کر کھا لوں گی۔“

”جی نہیں، تمہارے ڈیڈی کی تاکید ہے کہ بچے ہمیشہ وقت پر کھانا کھائیں۔“

”چھٹا تو ٹھیک ہے کھا لوں گی۔“ وہ قدرے غصے سے کہتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

ایاز چھٹی کلاس میں تھے۔ ان کے تو اتنے دوست تھے کہ انہیں بہ مشکل تمام گنا جاسکتا تھا۔ پھر ان میں ہر عمر کے دوست شامل تھے۔ ایک دن اطلاعی گھنٹی بجی، میں دوڑی ہوئی گئی۔ احسن کی عمر سے کچھ بڑے ہی ایک صاحب سامنے نظر آئے۔

”فرمائیے۔“ میں سمجھی احسن کے کوئی دوست ہیں۔“

”ایاز اگر گھر پر ہوں تو انہیں بھیج دیجئے۔“

”ایاز؟“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”جی جی میں ایاز کو ہی پوچھ رہا ہوں۔ سامنے صاحب کے برابر والے گھر میں رہتا ہوں۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ ایاز روزانہ میرے ساتھ بیڈ مشین کھیلنے آتا ہے، آج نہیں آیا تو میرا دل نہیں لگا اس لیے خود ہی

ہو جائے۔

شام کو ابونے دوسری گڑیا لاکر دے دی۔ مگر یہ پہلے والی گڑیا سے لمبی تھی۔ میں نے اپنی گڑیا کے ڈھیروں کے حساب سے جو کپڑے بنائے ہوئے تھے وہ اس نئی گڑیا کے چھوٹے ہو گئے۔ چند دنوں بعد یعنی نے میری گڑیا توڑ کر پھینک دی۔ پھر تو یہ گویا روز کا معمول ہو گیا۔ میری جو بھی چیز آتی، مولیٰ یعنی اس پر قابض ہو جاتی۔ جہاں تک دوسری امی کے کردار کا تعلق تھا،

بلاشبہ ان کا سلوک مجھ سے پرانہ تھا جب بھی یعنی کوئی زیادتی کرتی، وہ اسے ہی ڈانٹتیں، وہ نہ سنتی تو مجھے سمجھائیں۔ میں شروع شروع میں تو دوسری امی سے کچھ الگ الگ سی رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ مجھے بھی ان سے محبت سی ہو گئی۔ ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔ وہ کام کاج زیادہ کرتیں تو ہاتھ پیر داب دیتی سر دبا لی۔ وہ مجھے دعا میں دیتی رہتیں۔ ”تو تو یعنی سے بھی زیادہ میرے قریب ہو گئی ہے۔ خدا کرے تو بیشہ خوش رہے۔“

بچپن یوں ہی دیے پاؤں گزر گیا۔ اب میں بی اے میں اور بی بی انٹر میں تھی۔ اگرچہ اس کارویہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتا چلا گیا۔ مگر پھر بھی اس کے بچپن کا رویہ میں ابھی تک فراموش نہ کر سکی تھی اس لیے اس کی نسبت امی کے زیادہ قریب تھی۔ ان ہی دنوں احسن کا رشتہ آیا۔ امی ابونے بی۔ اے کا امتحان ختم ہوتے ہی بڑے دھوم دھام سے میری شادی کر دی۔ رزلٹ بھی شادی کے بعد آیا۔ فیوزی ساری الماری میں رکھتے رکھتے میں دور بہت دور پہنچ چکی تھی۔

”کیا کوئی دروازہ بھی نہیں کھول سکتا، کب سے کھنٹی بج رہی ہے اس گھر میں تو میں تو اسٹڈی کرنا بھی مشکل ہے، میں تو اب ہاسٹل میں ہی جا کر رہوں گی۔“ سحر کے ہاتھ میں کتاب تھی اور وہ بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولنے آ رہی تھی۔

اف۔ میں خالات میں اس قدر محو تھی کہ کھنٹی کی آواز تک نہ سن سکی۔ میں نے کہا۔ ”میں کھول رہی

ہم سے اتنی نفرت کیوں تھی میں اب تک اس کا گریہ نہ کر پائی تھی۔ انسانی ذہن بھی عجب بھول بھلوں کے مانند ہوتا ہے۔ انجانی پگڑیوں اور پرتچ راہوں میں نفرت کی گرہوں کو ہزار چاہنے کے باوجود کھول نہ پائی تھی۔ بس اتنا یاد تھا کہ اپنی پیاری امی کی لہنگی میں، میں ہر طرف محبت کے نعروں کی آوازیں ملتی تھی لیکن نوسال کی تھی تو ای اچانک ہی بیمار ہو میں اور پھر دونوں کے اندر ہی اندر مجھ سے بیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔ ان کی اس جدائی نے میرے معصوم سے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ اس کے بعد توجیسے میں کھل کر نہ سنا بھول گئی۔ بڑا سا گھرا می کے نہ ہونے سے مجھے کاٹنے کو دوڑا تھا۔ اسکول سے آتی تو میری نگاہیں بیشہ کی طرح ہر طرف امی کو تلاش کرتیں اور پھر کہیں نہ پا کر اٹکبار ہو جاتیں۔ میں بغیر کھانا کھائے اپنے کمرے میں لیٹی امی کو یاد کرتی رہتی، گھر کی تھائی کا شاید ابو کو ضرورت سے زیادہ احساس ہو رہا تھا جب ہی تو وہ امی کا چلم کرتے ہی بڑی سادگی سے میری دوسری امی لے آئے۔

جمال آرا ابو کے دوست کی بیوہ بن تھیں۔ وہ اکیلی ہی نہیں آئی تھیں بلکہ ان کے ساتھ پہلے شوہر کی نشانی ایک ہٹی کٹی سی سات آٹھ سیال کی لڑکی یعنی بھی تھی۔ وہ مجھ سے تھوڑی سی چھوٹی تھی۔ آتے ہی میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی گڑیا جھپٹی لی۔ میں امی کے مرنے کے بعد اتنی صابر ہو چکی تھی کہ آنکھوں سے آنسو تک نہ لٹکے۔ بس خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ دوسری امی نے اس کے ہاتھ سے گڑیا چھینی اور میرے ہاتھ میں تھمادی۔ میرے دل کو تھوڑا سا سلوک ملا مگر اس مولیٰ نے توجیح چیخ کر پانچ منٹ میں ہی پورا گھر سر پر اٹھالیا۔

ابونے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولے۔ ”بنیایہ آپ کی چھوٹی بہن ہیں گڑیا! انہیں دے دیجئے میں آپ کے لیے شام کو دوسری گڑیا لے آؤں گا۔“

میں نے چپ چاپ گڑیا اسے تھمادی۔ گڑیا لے کر ایسی چپ ہوئی جیسے چابی والی کھلونے کی چابی ختم

ہوں دروازہ تم جا کر پڑھو۔“

”اب تو میں کھول ہی رہی ہوں اب کیا فائدہ؟“

اس کی تیوری پر بل پڑے تھے۔ میں خاموش رہی ہ بھی غیبت ہی تھا کہ اس کا دھیان پڑھائی کی طرف تھا ورنہ اس عمر کی لڑکیاں فیشن رسالوں اور کھونے پھرنے کی شوقین ہوتی ہیں۔ یہی سب سوچ کر میں اس کی کچھ باتیں برداشت بھی کر سکتی تھی۔

دروازہ کھلا تو سامنے ہی یاسر پر نظر پڑی یہ عینی کا بڑا

بیٹا تھا۔ اسی سال بی کام کر کے ایک بینک میں ملازم ہوا تھا۔

”آنٹی السلام علیکم۔۔۔ اور سحر علیکم السلام۔۔۔“

یاسر نے سحر کی توجہ اس کے سلام نہ کرنے پر دلائی میں زیر لب مسکراتے لگی۔

سحر جو اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی بجل سی ہو گئی۔ ”معاف کیجئے گایا سر بھائی میں آپ کو سلام کرنا بھول گئی، کل میرا ٹیسٹ ہے، دراصل۔۔۔“

”میرے سامنے کے مضامین ہیں نا۔“ یاسر نے اس کا جملہ دہرایا جو اکثر وہ شتر کرتی رہتی تھی۔

سحر شیا کر جلدی سے اندر چلی گئی۔ ان دونوں میں اکثر اس قسم کی چیخڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ عینی کو سحر بے حد پسند تھی اور اکثر وہ اس بات کا اظہار کرتی رہتی تھی کہ وہ سحر کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہے۔ مجھے بھی یاسر پسند تھا لیکن نہ معلوم کیوں اس رشتے پر میں اپنے آپ کو آمادہ نہ کیا کرتی تھی۔ لاشعور میں ابھی تک عینی کی بچپن کی زیادتیاں محفوظ تھیں۔ تاہم ہمارے میل جول سے کوئی بھی یہ اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ ہم سوتیلی بہنیں ہیں۔ سب ہمیں سگی ہی سمجھتے تھے۔

دوسری امی کا انتقال ابھی چند برس پہلے ہو چکا تھا۔ شادی کے بعد میرا ایک بھائی شہزاد اور ہوا تھا۔ نے میں اور عینی دونوں ہی بہت زیادہ چاہتے تھے۔ عینی تو اتنی مکار تھی کہ اس کے معاملے تک میں مجھ سے لڑتی تھی۔ ”شہزادہ میرا بھائی ہے، میں تمہیں اس کو نہیں دوں گی چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔“ وہ مارے محبت کے

شہزادہ شہزادہ کہتی۔۔۔ اور اب یہی شہزادہ ایک کڑا جوان تھا جس کی شادی چھ سال پہلے کر دی تھی اگر شہزادہ اور اس کی بیوی نہ ہوتے تو ابو تو گویا بالکل اکیلے جاتے لیکن وہ تو شہزاد کے بیٹے نوئی کی شرارتوں میں اپنے سب غم بھلا بیٹھے تھے۔

بھابھی کی ڈیوٹری ہونے والی تھی۔ نوئی کی دفعہ بھی ان کا آپریشن ہوا تھا۔ اس لیے اس مرتبہ بھی سب بار رہے تھے کہ خدمت کرے خیریت رہے۔

”یاسر! تمہاری امی گھر پر ہیں؟“ میں نے اسے چائے نہ دیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں آنٹی۔ وہ تو ماما کے پاس اسپتال گئی ہوئی ہیں۔“

”کوئی اطلاع آئی۔“

”مجھے تو نہیں معلوم۔۔۔ بے بی نے مجھے بتایا تھا کہ امی اسپتال ماما کے پاس گئی ہوئی ہیں۔“

”پچھا؟“ میں نے سر ہلایا۔ ”یسا کرو کہ مجھے نہ اپنے ساتھ ذرا اسپتال تک لے چلو وہاں تم مجھے چھوا کر اپنے گھر چلے جانا، میں رکشے سے واپس آجاؤں گی دراصل میں اس وقت بھی میں تمہیں اس لیے زحمت دے رہی ہوں تاکہ جلدی سے اسپتال پہنچ جاؤں۔“

رکشہ تیار نہیں جلدی ملے یا نہ ملے۔

”کوئی بات نہیں آنٹی۔“ یاسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے بال درست کیے، کپڑے اٹھک ہی تھے۔ چادر اوڑھی اور اس کے ساتھ اسپتال آئی۔

بھابی لیبر روم میں تھیں۔ عینی لیبر روم کے باہر پریشان صورت لیے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھا تو جلدی سے میرے قریب آئی۔ ”بابی۔۔۔ بھابھی کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ خدا خیر کرے۔“

”کیا اس مرتبہ بھی آپریشن۔۔۔“ میں نے پریشا سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”بھائی جان کہاں ہیں؟“
 ”ابھی تو یہیں تھے۔“ اس نے بتایا۔
 اتنے میں بھائی جان جو شاید کسی کام سے کہیں گئے
 تھے آگئے۔

”کوئی اطلاع؟“ انہوں نے آتے ہی دریافت کیا۔
 ”نہیں ابھی تو نہیں۔۔۔ آپ حوصلہ رکھیے اللہ مدد
 کرے گا۔“ یعنی نے بھائی جان کے سامنے ہمارے بٹے
 ہوئے کہا پھر اس سے بولی۔ ”یا سر تم گھر جاؤ۔۔۔ ارم
 سے کہنا، بہن بھائیوں کو کھانا وغیرہ کھلا دے، گھر کا خیال
 رکھے ہو سکتا ہے مجھے آنے میں دیر ہو جائے۔“
 ”جی بہتر۔“ کہہ کر وہ چلا گیا تو میں نے بھائی جان کی
 طرف دیکھا۔ گو شہزاد، ہم دونوں بہنوں سے کئی سال
 چھوٹا تھا مگر جسمانی طور پر کافی عظیم ہونے کی وجہ
 سے بڑا ہی لگتا تھا کیوں کہ کوئی اور بھائی نہ تھا اس لیے
 مارے محبت کے، ہم لوگ اسے بھائی جان ہی کہتے
 تھے۔

ہم سب کی اور بھائی جان کی دعائیں بے اثر ہی
 رہیں اور بھابھی اپنے بیٹے کی شکل دیکھے بغیر ہی
 رخصت ہو گئیں۔ ننھا سافلی اپنی امی کو ہر طرف
 تلاش کرتا پھرتا تھا۔ ”آئی۔۔۔ امی اسپتال سے کب
 آئیں گی؟ ابو کہہ رہے تھے کہ وہ منالے کر آئیں گی مگر
 منالو آیا ہے، امی کہاں چلی گئیں؟ امی کو بلائیے نا۔۔۔
 بلائیے نا۔۔۔“ وہ کہتے کہتے زور زور سے رونے اور
 چلانے لگتا تو اسے تسلی دیتے ہوئے خود ہماری آنکھوں
 سے آنسو بننے لگتے۔

بھائی جان کی حالت الگ خراب تھی وہ حیران و
 پریشان تھے کہ اس ننھی سی جان کو بالے گاؤں؟ میں
 نے اس معاملے میں ابھی تک اپنی کوئی رائے نہ دی
 تھی۔ ایک دو دن کے لیے بھی میں گھر آکر رہ جاتی تھی
 تو کبھی یعنی ٹھہر جاتی تھی لیکن یہ اس مسئلے کا کوئی
 مستقل حل تو تھا نہیں۔

”میرا خیال ہے کہ منے کو میں اپنے گھر لے
 جاؤں۔۔۔ اس طرح سے میرا اور باقی کب تک یہاں
 ٹھہرنا ہو گا۔۔۔ اسے پالنے کے لیے کوئی مستقل انتظام

کرنا ضروری ہے۔“ یعنی نے وہ بات کہہ ہی دی جو
 شاید کئی دنوں سے وہ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کی بات سن
 کر بھائی جان تڑپ سے گئے۔

”وہ تو مجھے چھوڑ کر چلی ہی گئی ہے لیکن اس کی نشانی
 کو تو میری نظروں سے جدا نہ کرو، میں کوئی آیا رکھ لوں
 گا۔۔۔ میں اسے خود پال لوں گا۔۔۔“ وہ جذباتی ہو گئے۔
 ”سب کچھ ٹھیک ہے شہزاد۔“ یعنی نے اپنی بزرگی
 جتانے کے لیے بھائی جان کا نام لیا۔ ”منے کو میں کون
 سا تمام عمر کے لیے لے رہی ہوں۔۔۔ ڈھائی تین سال
 کا ہو جائے تو اسے اپنے ہی گھر لے آنا۔۔۔ ہمیں نہیں
 معلوم اس ننھی سی جان کو کتنی توجہ کی ضرورت ہے
 اور آج کل اول تو آیا میں ملتی ہی نہیں اور اگر خوش
 قسمتی سے کوئی مل بھی جائے تو شاید وہ اچھی طرح سے
 اس کی دیکھ بھال نہ کر سکے اور پھر میرا گھر کون سا دور
 ہے، روزانہ آفس سے واپس کر تم اسے دیکھتے ہوئے
 آسکتے ہو۔۔۔“ شہزاد نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا
 کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بولے۔

”جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔“

معاملہ تقریباً ”طے پا چکا تھا مگر اچانک ہی میرا سوچا
 پن لا شعوری طور پر عود کر آیا۔ ”میں منے کو اپنے گھر
 لے جاؤں گی۔۔۔ میں یعنی سے بڑی ہوں اس لیے میرا
 حق زیادہ ہے، مجھے بھی اس سے اتنی ہی محبت ہے۔“
 میں نے ایک نیا جھگڑا نکالا۔

احسن جو اطمینان سے تمام گفتگو سن رہے تھے،
 سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ”اگر یعنی ہی منے کو لے جانا
 چاہتی ہیں تو لے جانے دو۔“

”آپ اس معاملے میں برائے مہربانی نہ بولیں۔“
 میں نے قدرے غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

”باقی!۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں ہی منے کو لے جاؤں
 تو صحیح رہے گا، کیونکہ ہمارے ہاں کوئی چھوٹا بچہ بھی
 نہیں ہے رونق رہے گی۔“ یعنی نے مجھے سمجھانا چاہا۔

”نہیں، منے کو میں ہی لے کر جاؤں گی۔ کیا نامیرا
 بھتیجا نہیں ہے؟“ میں اپنی ضد بڑاڑی ہوئی تھی۔

ابو نے اب درمیان میں پہلی مرتبہ مداخلت کی۔

نے بتایا۔

میں نے جلدی سے منے کو گود میں لیا جو رو رہا تھا۔
حال ہوا جا رہا تھا پورا منہ سرخ پڑ چکا تھا۔ ”دفع ہو جاؤ
تم دونوں یہاں سے۔“ میں نے انہیں ڈانٹا۔
”جھا کھانا تو دیجئے“ مجھے بہت بھوک لگ رہی
ہے۔“ گڈو منٹنایا۔

”میں بھی کھانا وانا کچھ نہیں پکا ہے جاؤ فرج میں سے
کوئی پھل لے کر کھاؤ۔“
اتنے میں دروازے پر گھنٹی بجی۔ ”جاؤ ایاز بیٹا
دروازہ کھولو جا کر باجی آئی ہوں گی۔“

سحر کمرے میں آئی تو اتنے ہی تیوریاں چڑھ گئیں۔
”گھر میں گھستے ہی روندا دھونا سنو بس۔“ ایک تو اس گھر
میں پہلے ہی کون سی خاموشی رہتی تھی جواب امی نے
خواہ خواہ کے مسائل پال لیے ہیں۔“
”سحر ایسی باتیں نہیں کرتے۔“

”تو اور کیا اچھا خاصا یعنی آنٹی اپنے گھر رکھ رہی
تھیں۔ مگر آپ لے آئیں آپ کو نہیں معلوم کہ
سائنس کے مضامین کتنے مشکل ہوتے ہیں کتنا پڑھنا
پڑتا ہے جب کوئی میڈیکل کالج میں جاتا ہے۔“

”ہاں ہاں سب جانتی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”منا سوچا تھا اسے جھوٹے میں لٹایا اور خود جلدی
جلدی کھانا تیار کر کے بچوں کو کھلایا۔ صرف بچوں ہی کو
پر اہم نہیں تھا بلکہ خود احسن بھی زیر لب کئی مرتبہ اس
قسم کی باتیں کر چکے تھے منے کی کاٹ ان کے کمرے
میں ہی تھی۔ رات کو جوں ہی وہ پیشاب کرتا فوراً
روئے لگتا احسن کی نیند بہت لمبی تھی۔ اس لیے جیسے
ہی بستر سے اس کا کپڑا بدلنے کے لیے اترتی احسن کو
آنکھ کھل جاتی۔“ کیا بات ہے بھئی؟ رات کو سونا بھر
دو بھر ہو کر رہ گیا ہے۔“

”میں بھی دو تین مرتبہ رات کو اٹھنے کی وجہ سے
اپنی نیند پوری نہ کپاتی تھی اس لیے دن بھر چڑی کر
رہتی، ایک گھنٹی سی جان کی وجہ سے مجھے لگتا جیسے
میرے دن بھر کے کاموں میں دگنا اضافہ ہو گیا ہے نہ
کہیں آنے کی رہی نہ جانے کی۔“

”یعنی اگر تمہاری بڑی بہن ہی منے کو لے جانا چاہتی
ہے تو اسے لے جانے دو۔“

”ٹھیک ہے ابو جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔“ یعنی
کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے جنہیں
چھپانے کے لیے وہ جلدی سے کمرے سے باہر چلی
گئی۔

”منے کو میں اپنے گھر لے آئی۔ دو تین دن تک تو
ٹھیک ٹھاک رہا۔ چوتھے دن سے ہی نہ معلوم اسے
پیٹ میں درد تھا کیا بات تھی کہ وہ مسلسل روئے چلا
جا رہا تھا۔ اسے سنبھالنے میں دوپہر کا کھانا پکانے میں
بھی دیر ہو گئی۔ احسن کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ کھانا
پکانے کے لیے خانہ سال رکھ لو مگر مجھے کسی کے ہاتھ کا پکا
ہوا کھانا پسند ہی نہیں تھا۔ گھر کا ہر کام سوائے برتن
دھونے کے میں خود ہی کیا کرتی تھی۔

ایاز اور گڈو اسکول سے آئے تو آتے ہی کھانا مانگا
میں نے ایاز سے منے کو سنبھالنے کے لیے کہا اور خود
باورچی خانے میں چلی گئی۔ گوشت جل چکا تھا۔ دال
کچی ہوئی تھی مگر ایاز کو ارہر کی دال بالکل پسند نہیں تھی
اس لیے جلدی سے فرج میں سے قیمہ نکال کر چڑھا
دیا۔ اتنے میں ایاز نے مجھے زور زور سے پکارا۔ ”امی
جلدی آئیے۔ جلدی آئیے پلیز۔“

میں دوڑتی ہوئی کمرے میں گئی۔ گڈو صاحب! منے
پر چڑھے ہوئے تھے ایک ہاتھ میں اس کے بال پکڑے
ہوئے تھے جبکہ دوسرا ہاتھ ایاز کے ہاتھ میں تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟ غصے اور
جھنجھلاہٹ سے میری بڑی حالت تھی۔ میں نے گڈو
کو منے کے اوپر سے ہٹایا۔

”امی۔۔۔ یہ رویہ ہاتھ تو گڈو اس کے اوپر چڑھ گیا“
اس کو زور زور سے پھڑپھڑا رہا تھا کہ روکیوں رہے ہو؟“
”امی اس نے فیڈر بھی پوری پٹی لی تھی پھر بھی
روئے جا رہا تھا، میں تو اسے پہلے پیار سے منع کر رہا تھا
پھر بھی یہ روئے جا رہا تھا تب میں نے اسے مارا۔“ گڈو
صاحب اپنی صفائی پیش کر رہے تھے۔

”اور اسی لیے یہ اس کے بال بھی فوج رہا تھا۔“ ایاز

ارم بہت خوش تھی۔ اتنے میں حرم بھی اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آگئی۔ ”ارے آنٹی آپ آنٹی ہوئی ہیں۔“

اتفاق سے میں اس کو یہ کپڑے دکھانا بھول گئی تھی۔ آج ہی تو خرید کر لائی تھی اور اتفاق سے آج ہی عینی وغیرہ بھی آگئیں۔ ”ہم نے نہیں بلکہ آنٹی نے شاپنگ کی ہے۔“ ارم مسکرائی۔

”اللہ یہ براؤن سوٹ کتنا آفت لگ رہا ہے۔“ سحر نے شرٹ اٹھالیا۔
 ”آنٹی نے مجھے عید کا تحفہ دیا ہے۔ تمہارا تو یہ گلابی والا سوٹ ہے۔“

سحر کا موڈ فوراً ”خراب ہو گیا۔ شرٹ زور سے پھینکی۔ ”ممی کو تو میرا خیال ہی نہیں ہے گلابی رنگ تو مجھے زہر لگتا ہے۔ کپڑے لانے سے پہلے کم از کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا“ میں تو یہ براؤن سوٹ ہی لوں گی۔ ”وہ حسب عادت جلد ہی غصے میں آگئی۔

میرے ذہن سے ایک دم کئی پردے ہٹ گئے ایسی ہی ایک شام میرے ذہن میں آگئی۔ میں چھوٹی سی تھی۔ عید سے چند دن پہلے امی میرے اور عینی کے لیے بھی ریڈی میڈ جوڑے ہی لائی تھیں، سرخ اور فیوزی رنگ میں سرخ رنگ ویسے بچی بچوں کو اچھا لگتا ہے، میں نے سرخ ہی لیا مگر عینی نے رو دو کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ”لال سوٹ میں لوں گی۔ لال سوٹ میں لوں گی۔“ وہ بہت روٹی۔ شام کا کھانا بھی نہ کھایا۔ وہ چھوٹی تھی۔ اس لیے سرخ سوٹ اسی نے پہنا، مگر میں بھی ایک ضدی تھی۔ فیوزی سوٹ استری کرنے کے بہانے میں نے جان کر اتنی دیر استری کے نیچے رکھا کہ سامنے ہی سے نہیں بلکہ کئی جگہ سے جلاؤ والا اور پھر اس دن کے بعد سے مجھے فیوزی رنگ سے سخت چڑ بلکہ نفرت ہو گئی۔ تحت الشعور میں دبایہ واقعہ آج ذہن میں آگیا تھا۔ فیوزی رنگ سے نفرت کی گرہ کھل چکی تھی۔ میں نے عینی کی طرف دیکھا۔ گھرے لحوں کی یادوں کے عکس شاید اس کی آنکھوں میں بھی جھللا

اس دن محلے میں مسز رضوی کے گھر میلاد تھا۔ بے ہاری بلا کر گئی تھیں۔ ان سے میری اچھی راہ و رسم لگی مگر نے کو پھر گھر میں کون رکھتا۔ رات سے حرارت سی تھی، مجھے خواہ مخواہ ہی غصہ سا آنے لگتا۔ ”خواہ مخواہ میں نے کو اپنے گھر لائی یعنی ہی رکھ لیتی تو اچھا تھا۔ اس کی ساس بھی ساتھ رہتی تھیں اس لیے نے کو منہانے کا اتنا مسئلہ بھی نہ ہوتا۔“ میں نے سوچا، اتنے میں دووازے کی کھنٹی بجی، ایک تو شام کے وقت کھنٹی بجنے سے عاجز آگئی تھی۔ نے کو اپنے پاس کیا رکھا تھا کہ تقریباً ”روزانہ ہی کوئی نہ کوئی اس کی خیریت دریافت کرنے آسکتا تھا۔ گھر بہت زیادہ دور بھی نہ تھے۔ کبھی شہزاد بھائی جان تو کبھی ابو آجاتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن نے ہی کی وجہ سے عینی ہی آجاتی تھی۔ ان کے علاوہ دوسرے عزیز رشتے دار بھی نے سے ہمدردی اور محبت کا ثبوت دینے اکثر دیر پشتر آتے ہی رہتے تھے، اس طرح سے ایک تو میرا نام ضائع ہوتا تھا۔ دوسرے بچوں کی پرہانی میں خلل الگ بڑھاتا، خاطر تواضع پر بھی اچھی خاصی رقم خرچ ہو جاتی تھی۔ گھر کا ماحول بدل کر رہ گیا تھا۔

ان ہی دنوں رمضان کا مہینہ آگیا۔ عینی کی بیٹی ارم، سحر کے برابر ہی تھی۔ چند ماہ ہی کا فرق تھا۔ عینی تو اس سحر کے لیے کچھ نہ کچھ تھے تحائف لاتی رہتی تھی، اس مرتبہ میں نے بھی سوچا کہ ارم کو میں بھی کچھ دے دوں۔ خود کپڑے سینے کا وقت نہیں تھا، درزیوں کے دماغ تو ویسے بھی عید سے قبل بہت بڑھ جاتی ہیں چنانچہ میں دونوں کے لیے خوب صورت کام والے شلوار قمیض سوٹ لے آئی۔ ارم کے لیے براؤن سوٹ تھا جس پر سفید کام بہت خوب صورت لگ رہا تھا جبکہ سحر کے لیے میں نے ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ لیا تھا، اس پر سنہری کام تھا۔ عینی نے کو دیکھنے آئی تو اس کے ساتھ ارم بھی تھی۔ میں نے اسے دونوں سوٹ دکھائے۔

”اللہ آنٹی یہ براؤن سوٹ کس قدر خوب صورت لگ رہا ہے، آپ کی چوائس بہت اچھی ہے۔ برائے کلر میرا فیورٹ ٹکریے۔“

رہے تھے۔ میں نے ارم کو دیکھا۔ ارم بیٹی کی بیٹی تھی مگر وسیع ذہن کی مالک سمجھ دار لڑکی وہ مسکراتی۔ ناراض کیوں ہو رہی ہو۔ براؤن سوٹ ہی لے لیتا مگر میری پیاری آنٹی سے ناراض نہ ہو۔ ”اس نے میرے گلے میں بانیں ڈال دیں۔

سحر کو اپنی زیادتی کا احساس خود بہ خود ہو گیا۔ ”آئی ایم سوری مٹی۔ میرا اور اصل کل ٹیسٹ ہے نا۔ اس لیے میرا ذہن ادھر ہی تھا۔“

”ہاں تمہارے تو ہر وقت ٹیسٹ ہی ہوتے رہتے ہیں۔“ میں بڑبڑائی۔ ”مگر میٹرک میں تمہاری فرسٹ ڈویژن نہ آئی تو انٹر کرتے ہی بس تمہاری شادی کروں گی۔“

”کیا واقعی باجی؟“ بیٹی پٹنے لگی۔

”تو اور کیا؟“ میں نے کہا۔

”میں کچھ امید رکھوں؟“ اس کی بات ذمہ معنی تھی۔

”دیکھا جائے گا۔“ میں نے بھی ذمہ معنی جواب دیا۔

اتنے میں منے کے رونے سے ہماری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ ایک بات جس کا فیصلہ میں کئی دنوں تک سوچنے کے بعد کر چکی تھی، میرے لبوں تک آگیا۔ ”یعنی منے کی وجہ سے کافی مشکل سی ہو گئی ہے۔“ اتنا کہہ کر میں چپ ہو گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ مگر یعنی تو شاید چہرہ دیکھ کر دلوں کی باتیں سمجھنے لگی تھی۔ دھیمے دھیمے کچے میں بولی۔

”باجی میری تو خود خواہش تھی کہ میں منے کو اپنے پاس ہی رکھتی۔“

میں غصہ کر رہی کہ وہ اب یہ کہے گی کہ اب آپ کو مشکل ہو رہی ہے تو کوئی بات نہیں میں ہی لے جاتی ہوں مگر وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ ”باجی۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اتنی سمجھ دار اور باشعور ہوتے ہوئے بھی سکے اور سوتیلے کے فریق کو نہ مناسکیں، بچپن کی بات اور تھی میں نا سمجھ تھی۔ میں نے انجانے میں یادداشتہ طور پر واقعی ایسی حرکات کیں اپنا رویہ ایسا رکھا جس سے آپ کو تکلیف پہنچی، مگر

شاید آپ کو یاد ہو کہ بچپن میں آپ کے دکھوں کا مداوا ای گرویا کرتی تھیں، سگی ماں وہ میری تھیں مگر قریب آپ کے تھیں، پھر جب وقت کے ساتھ ساتھ مجھے عقل آئی تو اپنے ذہن پر زور ڈال کرتائے میں نے کبھی آپ کا دل دکھایا؟ میں نے تو ہمیشہ آپ کو مقدم سمجھا، آپ کا احترام کیا لیکن اس کا صلہ مجھے کیا ملا؟ آپ مجھ سے بہ ظاہر خوش دلی سے ملتی رہیں لیکن دلی طور پر مجھ سے ہمیشہ نفرت کی۔ منے کو میں نے چاہا تھا کہ اپنے پاس رکھوں لیکن آپ نے محض میری ضد میں اسے اپنے ساتھ رکھا۔ اس کی صحت کس قدر خراب ہے، کوئی خاص توجہ اس پر نہیں دی جاتی، وہ ایسے ہی پل رہا ہے جیسے بن مال کے بچے پلتے ہیں۔“

آنسوؤں کی مٹی سے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں ساکت آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی وہ جو شعور کی منزل تک پہنچنے کے بعد ہمیشہ میرے سامنے بے زبان بنی رہی تھی اپنی ساری بے زبانی کی کہانی کہہ رہی تھی۔

”میں نے سحر کو اپنی بیٹی بنالینا چاہا مگر آپ نے ہمیشہ ٹالا کہ وہ ڈاکٹر بنے گی۔ کیا ڈاکٹر ایسی ہی بنتے ہیں؟ یا سر نے کئی مرتبہ اسے اپنی سہیلیوں کے ساتھ تین سے چھ والا پھر شو دیکھتے ہوئے سینما سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے آپ سے نہیں کہا کہ آپ کو کبھی یقین نہیں آئے گا۔“ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ پھر بول رہی تھی۔ ”میں جارہی ہوں۔۔۔ جب آپ کو میری باتوں کا یقین آجائے، میرے خلوص اور محبت کو پرکھنے کی پہچان آپ کا دل کرنے لگے تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ مجھ سے ملیں مگر اب میں اس یک طرفہ محبت کو برقرار رکھتے رکھتے تھک چکی ہوں۔“

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ فضا میں اس کے چھتے جملوں کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے اپنے آپ پر مذمت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میری تربیت میں کیسا جھول رہ گیا تھا جو میری بیٹی ایسی ہو گئی۔ ”مگر نہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ جھوٹ کہہ رہی ہو لیکن لگ تو نہیں رہا تھا۔ میں سحر

”بھول گئی تھیں؟ اور کتنی باتیں بھول جاتی ہیں؟“
”رنگ بھی مجھے پسند نہیں تھا۔ اس کا خیال

نہیں رہا۔“

”رنگ پسند نہیں تھا۔ ناشکری، خدا کا شکر ادا کر کہ تجھے اپنی پسند کے کپڑے پسنانا نصیب ہو جاتے ہیں ورنہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں تن و دھانپنے کے لیے بھی کپڑے میسر نہیں۔“ وہ غصے میں پٹری سے اتر آئے تھے، کبھی کبھار ہی انہیں ایسا بے لگام غصہ آتا تھا۔ انہوں نے ساری زندگی پر رکھی جیب سے لائٹر نکالا اور ساری کو آگ لگانا چاہی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ میں تڑپ سی گئی۔ پلیز ایسے جلائیے نہیں۔ مجھے معاف کر دیجئے احسن میں واقعی غلطی پر تھی۔“ انہیں اتنے غصے میں دیکھ کر فیوڈی رنگ سے نفرت غائب ہو چکی تھی۔

”غلطی بر تو میں ہوں جو پورا گھر تمہیں سوپ کر مطمئن ہو گیا تھا۔“ ”کیا مطلب؟“
”آج یا سر کا فون آیا تھا کہ سحر کو وہ اکثر اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ سینما کے قریب کھڑے ہوئے دیکھ چکا ہے اس کا مطلب میں کیا سمجھوں؟ تم ہی مجھے بتاؤ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ سحر سے شادی نہیں کر سکتا۔“

میرے دل و دماغ پر جیسے بجلی سی گرجی مگر اتنے میں اچانک ہی کمرے کا دروازہ تیزی سے کھول کر کوئی داخل ہوا۔ میں نے غم آنکھوں سے دیکھا وہ سحر تھی آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ ”عالما“ ہم دونوں کی اوچی آؤز اس کے کمرے تک پہنچ گئی تھیں اور وہ اپنے متعلق ہونے والی بات چیت بھی سن چکی تھی۔

”ممسا ڈیڈی کو بتا دیجئے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے۔“ وہ ہنسیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ”میں تو شام کو اپنی سہیلی صنم کے گھر پڑھنے جانی ہوں۔ وہاں ہم تین چار سہیلیاں مل کر پڑھتی ہیں۔ اس کا گھر صبح سینما کے قریب ہے، وہیں یار کشائینے کے لیے ہمیں سینما کے اسٹاپ پر ہی کھانا ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے یہ سب غلط باتیں آپ سے کیوں کہیں ممسا؟

سے خود پوچھوں گی مگر اتنا حوصلہ کہاں سے لادوں گی۔ ایسی کوئی بات ہوتی بھی تو پھلا سحر کہاں قبول کرے گی۔ وہ تو ویسے ہی اتنی خود سر اور منہ پھٹ ہے۔“ میں سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ احسن کی کار اندر آتی نظر آئی۔ میں نے اپنا موڈ بہتر بنانے کے لیے میز پر سے گلاس اٹھا کر پانی پر طبیعت کو کچھ سکون ملا۔ احسن کا موڈ بھی کچھ خراب ہی لگ رہا تھا۔ بغیر کوئی بات کیے سیدھے اندر چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی گئی۔ وہ جوتے اندر رہے تھے۔

”چائے لے آؤں؟“

”لے آؤ، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ جیسے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑے۔ کوئی اور دن ہو تا تو شاید میری طرف سے بھی کوئی تہتا ہوا جملہ جاتا لیکن میں تو آج خود پریشان تھی۔ اس لیے ان سے الجھنے کی بجائے چائے بنانے چلی گئی۔ جب چائے بنا لائی تو وہ الماری میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”میرا براؤن سوٹ کہاں ہے وہ پہن کر کہیں جانا ہے۔“

”آپ چائے پی لیں میں دیکھتی ہوں۔“
”نہیں آپ زحمت نہ کریں جا کر اپنے پیچھے کو سنبھالیے۔ کیا اس کے رونے کی آواز آپ کو نہیں آ رہی؟“

میں وہیں کھڑی رہی۔ اتنے میں ایک پیکٹ انہوں نے الماری میں سے نکالا۔ ”یہ میری الماری میں کیسا پیکٹ ہے؟“ انہوں نے غصے سے پوچھا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ تو وہی فیوڈی ساڑھی تھی جو احسن لاہور سے لائے تھے۔ میں نے بجائے اپنی الماری میں رکھنے کے بے دھیانی سے ان کی الماری میں رکھ دی تھی۔ اتنے میں وہ پیکٹ کھول چکے تھے۔ ”اچھا یہ ساڑھی یہاں پڑی ہے، تم نے پیکٹ کھولنے اور اسے رکھنے کی زحمت تک نہیں گوارہ فرمائی۔“

”میں بھول گئی تھی۔“

آپ وہاں جا کر تصدیق کر سکتی ہیں اور بھلا میں یوں چپکے چپکے چوری چھپے فلمیں کیوں دیکھوں گی؟ میں تو ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

میں جانتی ہوں سچائی کی ایک اپنی خاص زبان ہوتی ہے۔ میں سچائی سحر کے ہر لفظ میں موجود تھی۔ میں نے اسے سینے سے لگایا۔ ”یہاں مجھے تم پر اعتماد ہے۔“

احسن بھی اس کے قریب آگئے۔ ”ہاں بیٹا۔“ انہوں نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے چھوڑ کر ان سے لٹ گئی۔

”میں کل سے صنم کے گھر پڑھنے نہیں جاؤں گی“ میں گھر پر ہی پڑھ لوں گی۔

”نہیں، تم پڑھنے ضرور جانا۔ ہمیں تم پر اعتماد ہے۔“

میں سمجھتی تھی کہ میرے ہی ذہن میں سوتیلے پن کا جذبہ ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ سوتیلان یعنی کے اندر تھا۔ جھوٹ اور غرض کی دراڑیں اس کی شخصیت میں تھیں جو ایک بلکے سے جھٹکے سے نمایاں ہو گئیں۔ اگر یہ جذبہ اس کے اندر نہ ہوتا تو وہ محض اپنے بیٹے کے گننے پر سحر پر الزام نہ لگاتی بلکہ کسی اور طریقے سے یہ بات پوچھتی۔ دوسرے یا سحر کو احسن کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر الزام سچ بھی تھا تو ان کو بتانے سے اسے کیا فائدہ ہوتا؟ کیا وہ اسے قتل کر دے؟ سحر کو بہو بنانے کے متعلق بھی ممکن ہے کسی مصلحت اور عرض کے تحت ہی سوچا ہو اور جہاں تک منے کو پالنے کا سوال تھا، وہ اگر اس کی سگی ماں کا پوتا تھا تو میرے بھی سگے باپ کا پوتا تھا۔ رشتے برابر تھے۔ منے کو پالنے میں خواہ مخویہ کی تکلیف سہی لیکن اب میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے عینی کو دے دوں گی اور پھر جوں ہی وہ ڈھالی تین سال کا تھوڑا سمجھ دار ہو گا واپس تو چلا ہی جائے گا۔ میں نے پیار سے منے کو جھولے میں سے اٹھالیا۔

اگلے دن شام کو میں نے عینی کو فون کیا کہ منے کو میں اپنے ہی پاس رکھوں گی، وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اسے رکھ کر گھبرا رہی ہوں، یا اس کی وجہ سے مجھے کوئی پریشانی

ہے اور وہ سحر کو بہو بنانے کا خیال بھی اپنے ذہن سے نکال دے جو میری لڑکی کے محض سینما کے پاس سیلیوں کے ساتھ گھڑا دیکھ کر اس کے کردار پر الزام لگا دے وہ کل شادی کے بعد ایسی ہی کسی معمولی سی بات پر میری بیٹی کو طلاق بھی دلا سکتی ہے، مجھے اور میری بیٹی کو تنقید کا نشانہ بنانے کی بجائے اپنی اولاد کی اصلاح کو نگرانی پر ہی توجہ دینا زیادہ بہتر ہے۔

اتفاق سے فون یعنی ہی نے ریسو کیا۔ بغیر کسی لحاظ سے میں نے اسے ہر بات کھری کھری سنا دی۔ وہ خاموشی سے میری تلخ و تند باتیں سنتی رہی۔ میں سب کچھ کہہ چکی تو چپ ہو گئی۔ منتظر تھی کہ وہ بھی جواب میں کچھ کہے کی مگر اس نے فون بند کر دیا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر اور غصہ آیا۔

اسی دن شاداب بھی آگئی۔ اس کے ساتھ اس کی نند بھی تھیں جو ان ہی دنوں لاہور سے آئی ہوئی تھیں۔ آج ان کا کچھ دیکھنے کا پروگرام تھا اور وہ مجھے لینے آئی تھیں۔ سحر اپنی سیٹل کے گھر پڑھنے گئی ہوئی تھی۔ احسن گھر پر ہی تھے، تھوڑے سے پس و پیش کے بعد میں راضی ہو گئی۔ دراصل مسئلہ منے کا تھا۔ وہ ایسے طے ہوا کہ منے کو میں نے شاداب کے گھر اس کی ساس کے پاس چھوڑ دیا۔ ہم تینوں بڑے خوشگوار موڈ میں تھیں۔ تین سے چھ والا شاداب بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہم لوگ گاڑی میں ہی بیٹھے تھے۔

شو ختم ہوا تو لوگوں کی ٹولیاں باہر آنے لگیں۔ اتنے میں میری توجہ سامنے سے آئی ہوئی چند ہنستی مسکراتی لڑکیوں پر پڑی۔ فلم پر تبصرہ کرتی ہوئی وہ ادھر ادھر سے بالکل نیاز تھیں۔ اس لیے اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ چہرہ مانوس تھا غور سے دیکھا تو شبہ یقین میں بدل گیا۔ ان لڑکیوں میں وہ پارسا معصوم صورت عینی کی بیٹی ”مرم“ بھی شامل تھی۔ میں نے گھبرا کر شاداب کی طرف دیکھا خدا کا شکر تھا کہ وہ اپنی نند سے باتیں کر رہی تھی۔ جس طرح اچانک مجھ پر فیوضی رنگ سے نفرت کا انکشاف ہوا تھا اس طرح اس وقت مجھے یہ اور اک بھی ہوا کہ لاشعور میں بسا سوتیلان کبھی کبھی اس طرح ابھرتا ہے کہ رشتوں کا احترام باہمی نہیں رہتا۔

خانہ برباد

حاجی عدیل

آج کل ہر جگہ دھوکہ باز پیر بیٹھے ہیں جنہیں مجبور اور معصوم عورتیں کیا سمجھتی ہیں اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتی ہیں۔ ایک ایسے پیر کی کہانی جس کی سحر کار آنکھوں کے جال میں پھنس کر ایک عورت نے اسے اپنا سب کچھ مان لیا اور پراسرار شیطانی قوتیں اس پر حاوی آگئیں

وہ سہا واقعہ جن کا کوئی عقلی جواز ممکن نہیں

میری شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد تین سال پلک جھپکتے گزر گئے، لیکن تیسرے سال کے آخری ماہ میں مجھے احساس ہوا کہ میری شادی کو اتنی مدت گزر گئی ہے اور پھر میری زندگی پر تشویش اور پریشانی کے دنوں نے یلغار کر دی۔ میرے محبت کرنے والے خوب روشوہر کا چہرہ بجھا بھجھارنے لگا۔ وہ گھر آتے، کھانا کھاتے اور پھریوں سونے کی کوشش کرتے جیسے انہیں مجھ سے کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ اس رویے کو چند دن تو میں نے برداشت کیا اور پھر ایک دن میری زبان کھل ہی گئی۔ ”جشید! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل آپ کا منہ کیوں بنا ہوا ہے؟“

میری زندگی میں پیش آنے والے اس واقعے کو تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں۔ اس واقعے یا حادثے ہی نے میری ہستی، بہتی زندگی اور جنت نما گھر کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد ہی میں در بدر کی ٹھوکر کھانے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ اس وقت میرا سرمایہ حیات بس گزشتہ اچھے دنوں کی یادیں اور موجودہ ذلتیں ہیں۔ میری جگہ کوئی اور عورت ہوئی تو وہ اس واقعے کے بعد خود کشی کر لیتی اور اس وقت اس کی ہڈیاں بھی خاک میں مل چکی ہوتیں، لیکن میں چونکہ بے ہمت اور بڑیل ہوں اس لیے بار بار خواہش کے باوجود اپنی زندگی کو ختم نہ کر سکی۔



”میرا منہ تو نہیں بنا ہوا، لیکن میں فکر مند ضرور ہوں۔“ جمشید نے اپنے مخصوص، ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”کیا فکر ہے آپ کو؟“ میں نے ان کی آنکھوں میں کچھ بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”میرا تو خیال تھا کہ بات تمہیں معلوم ہوگی۔ اسی نے تم سے کسی مسئلے پر کچھ نہیں کہا؟“

”ہائیں، کوئی خاص بات نہیں۔ چند دن پہلے انہوں نے بس اتنا کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ جا کر کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرا لوں چونکہ معائنہ کرانے والا مشورہ میری سمجھ ہی میں نہیں آیا اس لیے میں نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں صحت مند ہوں اس لیے میں نے آپ سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔“ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

”وہ! شاید بات ہی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔“ جمشید نے میری طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات صحت کی نہیں اولاد کی ہے۔ اسی کا خیال ہے کہ اب تک ہمیں صاحب اولاد ہو جانا چاہیے تھا۔ آج بھی انہوں نے میرے گھر آتے ہی اس مسئلے میں پوچھا تھا۔“ اتنا کہ کر جمشید کھسکے رکے، پھر بولے۔

”میں نے ان سے کہا ہے کہ کل لے جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کل چلیں اگر تم بات شروع نہ کر تیں تو میں آج اس مسئلے پر خود تم سے بات کرتا۔ سارے خاندان میں آج کل ہمارے ہی بارے میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ اگر جلد ہی ہمارے گھر کچھ نہ ہوا تو پھر بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔“

مجھے اس بڑے مسئلے کا احساس تھا کیوں کہ جمشید کے بڑے بھائی اولاد ہی کے چکر میں دو شادیاں کر چکے تھے، لیکن ان کے گھر بھی ابھی تک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ جمشید کو بھی اپنی ای کی خواہش اور اپنے بڑے بھائی کی روایت پر عمل کرنا پڑ جاتا۔ بہر حال میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی، اپنے شوہر کا دل رکھنے کے لیے لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کرانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

اسی شام میں جمشید کے ساتھ ایک معروف لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے میرا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس معائنے کے بعد جو رپورٹ لیڈی ڈاکٹر نے دی وہ تشویش ناک نہیں تھی۔ میں باجھ نہیں تھی۔ میرے یہاں اولاد ہو سکتی تھی، لیکن اس کی رپورٹ کے مطابق میرا جسم چند اندرونی خرابیوں کا شکار تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میرا علاج شروع ہوا اور چند ہفتوں ہی میں لیڈی ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ اب میں ٹھیک ہوں۔

میرے ٹھیک ہونے کے باوجود حالات بدستور رہے۔ میں آس لگائے رہی اور اسی طرح کئی ماہ گزر گئے۔ جمشید نے اس درمیان کئی بار میرا معائنہ کرایا۔ میرے سر ہانے مختلف دواؤں پر رہنے لگیں۔ صبح شام دواؤں کھانے اور لیڈی ڈاکٹر کے چکر لگانا میرا معمول ہو کر رہ گیا تھا، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

ڈاکٹروں سے یابوس ہو کر میں نے بیرونی فقیروں کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دیے۔ اسی دوران میں ایک عورت کے مشورے سے میں جمشید کو ساتھ لے کر مقتدر بابا کے پاس پہنچی۔ ان کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ بہت جلالی بابا ہیں۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے بلکہ مخصوص لوگوں ہی کو فیض پہنچاتے ہیں، لیکن جس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اس کا کام ضرور بن جاتا ہے۔ ان کے متعلق دو سری بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ عموماً ”لوگوں کو اپنا مرید بھی نہیں بناتے، ان کا حلقہ بھی بہت محدود ہے۔ جہاں تک ان کی شہرت کا تعلق ہے تو وہ خاصی تھی۔ مجھ سے جس عورت نے ان کا ذکر کیا تھا وہ پہلے سندھ کے کسی شہر میں رہتی تھی اور وہاں اس نے ان کا ذکر سنا تھا اور اس کی ایک عزیزہ نے ان سے فیض پایا تھا۔

جب میں اور جمشید ان کی خدمت میں پیش ہوئے تو وہاں ایک حلقے میں جمعی افراد بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کے لباس اور گفتگو سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ معزز لوگ ہیں۔ جمشید میرے ساتھ ایک طرف بیٹھ

ہوگا۔ خدا اپنے محبوب بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے، لیکن اب آپ لوگوں کی آزمائش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔“ اتنا کہہ کر بابا نے میری طرف نگاہ کی۔ چونکہ میں نے اپنی گردن جھکا کی نہیں تھی اور ان کے چہرے ہی کو دیکھ رہی تھی اس لیے ان کی نظروں نے میری آنکھوں کا احاطہ کر لیا اور پھر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یوں لگا رہا تھا جیسے میرے وجود میں برقی لہریں سی دوڑ رہی ہوں۔ میری آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی۔ بابا کی سحر انگیز آنکھیں میرے چہرے سے ہٹ گئیں اور میں نے گردن جھکا دی۔

دھنکتے ہم لوگ اسی طرح بابا کے پاس گئے اور پھر میری ساس نے بابا کو شام کے کھانے کی دعوت دی۔ بابا نے گھر آنے سے انکار کر دیا، لیکن جب میری ساس نے بہت اصرار کیا تو بابا نے دعوت قبول کر لی۔ اس دعوت کے بعد مقتدر بابا اکثر ہمارے گھر آنے لگے۔ تمام خاندان انہیں آنکھوں پر بٹھانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ وہ ہر شام ہمارے گھر آتے اور رات گئے واپس جاتے۔ میں نے اس دوران میں جشید کو یہ خوش خبری دی تھی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ یہ خبر جشید ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام خاندان کے لیے مسرت کا پیغام تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی مقتدر بابا کی قدرو منزلت اور آؤ بھگت میں اضافہ ہو گیا۔ خاندان کا ہر فرد ان کا کریدہ اور مرید ہو کے رہ گیا۔

پھر وقت یوں گزر گیا کہ احساس ہی نہ ہوا۔ ایک رات میری گود میں چاند سا بیٹا ہلک رہا تھا۔ ایک میں ہی نہیں گھر کے سب ہی افراد خوش تھے۔ سوا مینے بعد بچے کی پیدائش کی خوشی میں جو جشن منایا گیا اس کے اختتام پر میری ساس نے بابا سے گزارش کی کہ وہ اب ہمارے ہی گھر ہیں۔ تمام خاندان نے میری ساس کی تائید کی۔ بابا نے بہت دقت تمام اس رائے سے اتفاق کیا۔ پھر چند ماہ بعد مجھ پر راز کھلا کہ تمام خاندان ان کی شخصیت اور علم کا اسیر تھا اور میں ان کی سحر آنکھوں کا شکار اس انکشاف نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ مجھے اپنا

مجھے تھوڑی دیر بعد مقتدر بابا نے ہماری طرف دیکھا اور پھر جیسے ان کی تیز آنکھیں، میرے چہرے، میری آنکھوں اور پھر میرے پورے وجود کے آر پار دیکھنے لگیں۔ چند لمحے تو میں ان کی نظروں کا مقابلہ کرتی رہی اور پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کتنی دیر میں آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی اور اس وقت جو کہ جب جشید نے مجھے ٹھوکا دیا۔ ”زہرہ آنکھیں کھولو۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بابا نے جشید کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور پھر آہستہ آہستہ ان سے سوالات کرنے لگے۔ جشید ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ پھر ہم وہاں سے باہر آئے تو جشید نے مجھے بتایا کہ بابا نے نہ صرف ہمدردی سے میری بات سن لی ہے بلکہ ہمارے حق میں دعا کرنے کا یقین بھی دلایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارا گھر اللہ جلد ہی خوشیوں سے بھر دے گا۔

میرے استفسار پر جشید نے بتایا کہ بابا کو انہوں نے تمام باتیں بتادی ہیں اور بابا نے کہا ہے کہ تمہاری پریشانیوں کے دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں۔ جشید نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ جمعے کے روز بابا نے پھر بلایا ہے۔

”جمعے کے روز کس وقت؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”مغرب کی نماز کے بعد۔“

پھر جمعے کے دن مغرب کی نماز کے بعد میں، میری ساس، جشید اور میری بڑی نند بابا کے دربار میں حاضر تھے۔ اس وقت وہاں سوائے ہمارے اور کوئی نہیں تھا۔ بابا نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری ساس، نند اور جشید کی طرف دیکھا اور جب بولے تو مجھے یوں لگا جیسے ان کی آواز رزم جھم کرتی ہوئی پھوار کا ترنم ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تمام افراد نے گردنیں جھکا دی تھیں اور بابا بول رہے تھے۔ ”آپ لوگ مجھے کسی معزز خاندان کے افراد لگتے ہیں۔ مجھے اشارہ ملا ہے کہ آپ لوگ جس مقصد سے یہاں آئے ہیں وہ بہت جلد پورا

ٹھاک ہوتے ہیں اور فطری تقاضے پورے کرنے کے اہل بھی ہوتے ہیں مگر باپ نہیں بن سکتے۔ جشید بھی ایسا ہی ہے۔ ”وہ بول رہا تھا اور میں نفرت، غصے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جب وہ خاموش ہوا تو میں بول اٹھی۔ ”مگر یہ بات تم مجھے برباد کیے بغیر بھی تو بتا سکتے تھے، ذلیل آدمی! میرا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

”نہیں!“ اس نے انتہائی مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں حاصل کرنے سے قبل مجھے خود اس کا علم نہیں تھا، لیکن جب تم نے اپنے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ ماں بننے والی ہو تو مجھے قدرے تعجب ہوا کیوں کہ میں تمہیں پانچھ سمجھ رہا تھا۔ پھر مجھے اس نیچے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ اصل معاملہ کیا ہے!“

”اوس اور پھر تم نے سوچا کہ مجھے آنکھوں کے سحر میں لیے بغیر بھی اپنی من مانی کر سکو!“ میری آواز زہر میں بھی ہوئی تھی۔

”ہاں۔“ وہ بے حیائی سے ہنسا۔ ”اس کی وجہ تھی۔“ پھر وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ ”ہوا یہ کہ تمہیں دیکھ کر پہلی بار میں نے پی سوچا تھا، حصول مقصد کے بعد تمہارا خیال دل میں نہیں لاؤں گا، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میں تمہارا اسیر ہو گیا۔ لیکن کروڑہو کہ تم سے ملاقات کے چند ہی دن بعد میں نے اپنی قوتوں سے کام لے کر اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سرگوشی گونجتی رہی کہ تم ہی میری منزل ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے گھر والوں کو منہ نہ لگاتا۔“ وہ دیر تک ایسی ہی بکواس کرتا رہا پھر جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”زہرہ! پہلے تو تم خود ہی کسی کو کچھ بتانے کی حیثیت میں نہیں ہو، لیکن میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اگر تم نے اس کا تذکرہ کیا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا، ہاں تمہارا انجام بہت برا ہوگا۔ اتنا برا انجام کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں!“

پھر وہ چلا گیا اور میں رات گئے تک جاگتی رہی۔ میری ذہن میں عجیب عجیب خیالات سرابھار رہے

وجود بخش نظر آنے لگا۔ میرا ضمیر ہر وقت مجھے کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ جس رات مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اب تک نادانستگی اور بے خبری میں مجھ پر کیا گزرتی رہی ہے، وہ رات میری پرسکون زندگی کی آخری رات تھی۔ اس کے بعد سے آج تک میری روح مضطرب ہے اور جسہلکان۔

اس رات وہی شخص جسے میں قاتل احترام سمجھتی آئی تھی، میری مسہری پر بیٹھا مسکرا مسکرا کر مجھ سے اظہار محبت کر رہا تھا اور میں اسے حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے کہا کہ میں نے محبت کا خراج پہلے وصول کیا اور پھر تم سے سچی محبت کی تو مجھے اس غمے روح پروردہ چہرے پر خباثت رقص کرتی نظر آئی اور جب میں بولی تو اس کے لیے میرے لہجے میں شامل تمام ترا احترام فنا ہو چکا تھا۔

”تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا مقتدر!“ میں نے بڑی نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو۔ تو خبیث ہے۔ تو ابلیس ہے! تو نے مجھے برباد کر دیا!“ جذبات سے مغلوب جو منہ میں آ رہا تھا گے جاری تھی۔

اس نے بڑی رعونت سے تقہر لگایا اور پھر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ ”زہرہ! یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔ میں نے تمہیں برباد نہیں کیا بلکہ تمہیں برباد ہونے سے بچالیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو پھر تم نہ صرف اولاد کو ترس جاتیں بلکہ تمہیں اپنی سوکن کو بھی برداشت کرنا پڑتا۔ تمہاری ساس چاند سے پوتے کے لیے اپنے بیٹے کی دوسری شادی ضرور کرتیں، لیکن زہرہ! اس عورت سے بھی کوئی اولاد نہ ہوتی، جس طرح جشید کا بڑا بھائی بے اولاد ہے حالانکہ اس نے بھی دو شادیاں کی ہیں۔ پانگل عورت! تم نے صرف اپنا ہی معائنہ کر لیا تھا اگر تم جشید کا معائنہ بھی کراتیں تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ خود باپ بننے کے قابل نہیں ہے۔ تمہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ عورتوں ہی میں نہیں، مردوں میں بھی بعض ایسے امراض ہوتے ہیں جن کا علاج ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ہر اعتبار سے ٹھیک

پٹی باندھ دی تھی۔ ہماری طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ جشید کی جگہ مقتدر نے لے لی تھی۔

ان ہی دنوں ایک رات مقتدر نے مجھ سے کہا کہ اب میں اس شہر سے جانا چاہتا ہوں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ چند دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ اب مقتدر کے بغیر میری زندگی پھکی پھکی رہے گی اس لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ مجھ سے جدا ہو۔ جشید کے سلسلے میں میرے دل میں بیگانگی کے سبب جذبات پیدا ہو گئے تھے، لیکن اس کے برعکس جشید کے دل میں میری محبت دو چند ہو گئی تھی۔ اس کا احساس مجھے اس کے عمل سے ہوتا تھا۔ وہ پہلے کی بہ نسبت اب میرا خیال زیادہ رکھنے لگا تھا۔

میں نے مقتدر سے کہا کہ اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ بلند کیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”بھلا کیوں؟“

”میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“ میں اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”اگر تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں تو میرے ساتھ چلو۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلوں، لیکن کیسے؟ کیا یہ گھر بار اور اپنے بچوں کو چھوڑ دوں۔ نہیں نہیں، یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“

”دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں۔ تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم کہ اب میں زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو پھر میرے ساتھ چلا پڑے گا۔“

”سوچوں گی۔۔۔ سوچوں گی میں کہ مجھے کیا۔۔۔ کیا کرنا چاہیے!“ میں اچھے اچھے سے لمحے میں بولی۔

”سوچنے کا اب وقت نہیں ہے، یہ وقت فیصلہ کرنے کا ہے! اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کل رات کسی

تھے۔ میرے ضمیر پر ایک نامعلوم بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ دل میں درد سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں آگ سی بھر گئی اور پھر موزن کی آواز کے ساتھ ہی میرے ذہن نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں بے خبر ہو گئی۔

اپنے بچے کی پیدائش کے بعد سے میں خواب گاہ میں تنہا ہی سو رہی تھی۔ جشید دوسرے کمرے میں سونے لگا تھا چند دن تو میں یہ سمجھتی رہی کہ شاید وقتی طور پر ایسا ہوا ہے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کارستانی بھی مقتدر کی تھی۔ اس نے میری ساس سے کہا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد ہم دونوں میاں بیوی کا الگ الگ سونا اور تقریباً ایک سال تک ایک دوسرے کے قریب نہ آنا ضروری ہے ورنہ بچے پر کوئی اندیشہ مصیبت ٹوٹ سکتی ہے۔

دن میں تو جشید میرے پاس آتے، بات چیت کرتے، خیر خیریت دریافت کرتے، لیکن رات کی آمد آمد کے وقت سے صبح کی آمد تک پھر ان کی شکل نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ اس خبیث نے صرف اور صرف اپنے لیے راستہ صاف کرنے کی نیت سے کیا تھا اور وہ اس صاف راستے سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا۔

پہلے پہلے جب وہ میرے پاس آتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا اس کے منہ پر تھوک دوں، مگر جلد ہی یہ صورت حال بدل گئی۔ وہ ایک دن مجھ سے بولا۔ ”زہرا! بس چند دن کی بات اور ہے پھر تمہاری آنکھوں میں میرے لیے نفرت نہیں محبت ہوگی اور میں تمہیں سحر کا شکار کیے بغیر اپنے دل کی مرادیں پوری کیا کروں گا۔“

پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، عملی صورت میں بھی ظاہر ہونے لگا۔ میں نے اپنے اندر تبدیلی سی محسوس کی۔ یہ تبدیلی خود میرے لیے عجیب اور حیرت انگیز تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں اس کی شیطانی قوتوں کے زیر اثر آچکی ہوں، میرے دل سے رفتہ رفتہ اس کی نفرت ختم ہونے لگی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ نفرت کی جگہ محبت نے لے لی۔ میرا ضمیر بالکل ہی سوجھا۔ اب میرا بچہ ڈیڑھ سال کا ہو چکا تھا۔ جشید اور اس کے گھروالوں کی آنکھوں پر جیسے کسی نے

بھی لمحے یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا اور پھر اس کی سرکار آنکھیں میری طرف اٹھیں۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے وہی فیصلہ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ دوسری رات تقریباً ”دوبجے جب میں جشید کے گھر سے فرار ہو رہی تھی تو میں نے مقتدر سے کہا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے بچے کو ساتھ لے چلوں۔ یہ میرے بچے کیسے رہے گا؟“

”ممکن تو ہے، لیکن یہ میرے لیے پریشانی کا باعث بنے گا۔ بس چند دن کی بات ہے، پھر یہ ہمارے ہی پاس ہو گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے دوبارہ تم تک پہنچا دوں۔ فی الحال اسے یہیں رہنے دو۔ جشید کی امی اس کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ہمارے مستقبل کے لیے یہی بہتر ہے کہ بچے کی جدائی کا غم وقتی طور پر برداشت کر لیں ورنہ نہ صرف ہم بلکہ بچہ بھی مصیبت میں پھنس جائے گا۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کچھ اس انداز میں کہا کہ مجھے خود بھی اس کی بات تسلیم کر لینے ہی میں اپنی اور بچے کی بھلائی نظر آئی۔

وہ بچے کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھنا چاہتا تھا؟ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ بہت چالاک اور شیطانی فطرت کا مالک تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر ماں اور بچہ دونوں ہی گھر سے غائب ہو گئے تو گھروالے باگل ہو جائیں گے اور ان کی بھاگ دوڑ دوچند ہو جائے گی۔ صرف میرے گھر سے بھاگ جانے پر اتنا ہنگامہ نہیں ہو گا۔ چند دن کی تلاش کے بعد سب لوگ بچے کی نگہداشت میں لگ جائیں گے اور مجھ پر لعنت بھیج دیں گے۔ پھر شاید ہوا ابھی یہی۔

میں مقتدر کے ساتھ حیدر آباد سے کراچی آئی۔ کراچی انسانوں کا سمندر ہے۔ اس سمندر میں ہمارا صدمہ ہو جانا کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔ دس بارہ دن تو مقتدر نے مجھے ایک غیر معروف سے ہوٹل میں رکھا اور پھر ایک رات ہم کو رنگی کے ایک کوارٹر میں منتقل ہو گئے۔ جس کوارٹر میں ہم آئے تھے، اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اور یہ آثار بھی کہ ہم سے

پہلے بھی وہاں کچھ لوگ رہتے تھے جو آج ہی کہیں گئے ہیں۔ میرے استفسار پر مقتدر نے یہ کہہ کر میری تسلی کر دی کہ یہاں میرے بھائی اور ان کے بچے رہتے تھے، وہ آج ہی لیاقت آباد منتقل ہو گئے ہیں۔ اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے تسلی نہیں ہوئی اور میں شک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے میری نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تم بڑی شکی مزاج ہو زہرا! لیکن میرے سلسلے میں تمہارے شکوک تمہیں سکون سے نہیں رہنے دیں گے اس لیے شک اپنے دل سے نکال دو۔“ اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں اور وہ عورت صرف تم ہو! شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میری زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور چلی گئیں۔ یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ میں نے اپنے مطلب کے حصول کے بعد انہیں اپنی زندگی سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا، مگر تم ان میں سے نہیں ہو۔ تمہیں تو مجھ پر شک کے بجائے خود پر فخر کرنا چاہیے۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن مقتدر!۔۔۔“
”لیکن، لیکن کچھ نہیں۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں آنکھوں اور چہرے سے دل اور دماغ کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہوں، یہی میرا ہنر ہے اور میں اپنے ہنر میں کامیاب ہوں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح میں نے جشید اور اس کے گھروالوں کو اپنے قبضے میں کر لیا اور تمہارے دل میں اتر گیا۔ اب وہ نہ صرف میری بلکہ تمہاری بھی گردن کو نہیں پہنچ سکتے۔ رہ گیا بچے کا مسئلہ تو تم یہ اچھی طرح جانتی ہو، وہ میرا بچہ ہے اور میں آج نہیں توکل اسے حاصل کر لوں گا۔“

وہ اس لب و لہجے میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے لفظ لفظ کے رعوت کی بو آ رہی تھی۔ میری دل میں یہ احساس جاگ رہا تھا کہ وہ آج نہیں توکل مجھے بھی دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا، مگر میں اس

وقت کیا کر سکتی تھی؟ سوائے اس کے کہ اس کی مرضی کے مطابق چلوں۔ یہ بات بھی میرے لیے عجیب ہی تھی کہ وقتی طور پر کبھی کبھار میں اس کی طرف سے برگشتہ ہو جاتی تھی مگر پھر یہ احساس مفقود ہو جاتا تھا۔ میں پھر اس کے اشاروں پر ناپٹے لگتی تھی۔

صبح بیدار ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلا حکم تو یہ دیا کہ یہاں میں کسی سے نہیں ملوں گی اور یہ کہ وہ جب گھر سے باہر جائے گا تو دروازے پر باہر سے نالا لگا دیا کرے گا اور میں گھر میں اس طرح رہوں گی جیسے موجود ہی نہیں ہوں۔ اس حکم کے بعد فطری طور پر مجھے یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ لیکن خواہش کے باوجود یہ سوال میری زبان پہ نہ آسکا۔ ناشتے کے بعد اس نے جاتے ہوئے واقعی دروازے پر نالا لگا دیا اور میں رات گئے تک گھر میں اکیلی رہی۔

یہ سلسلہ کوئی دو ماہ تک چلتا رہا۔ میں رفتہ رفتہ آکٹا ہٹ کا شکار ہونے لگی۔ وہ جب گھر میں نہ ہوتا تو میرا دل چاہتا کہ گھر چھوڑ کر کھانا جاؤں، لیکن ہمت نہ ہوتی۔ جب وہ گھر آتا تو جیسے مجھے قرار آ جاتا اور میں سب کچھ بھول جاتی۔ پھر ایک رات میں اس وقت اپنے آپ سے مزید نفرت کرنے لگی جب مقتدر نے مجھے کسی اجنبی کے تصرف میں دے دیا۔

سروپوں کی رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی کہ کوئی ساڑھے گیارہ بجے مقتدر اپنے ایک دوست کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ صبح جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ رات گیارہ بجے تک آئے گا اور اس کے ساتھ ایک دوست بھی ہوگا۔ صبح میں ٹھیک طرح اس کا مطلب سمجھ نہیں پائی تھی، لیکن جب اس نے اپنے دوست کی آمد کا مقصد بتایا تو پہلے مجھے سا ہو گیا اور پھر میں پھر گئی۔

وہ ایک بار پھر پہلے روز والا مقتدر ہو گیا۔ میری کیفیت بھی روز اول والی تھی۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سارے وجود میں اپنی لہریں سی دوڑ رہی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا تنفس تیز ہو گیا اور پھر

اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”زہرہ! تم میری کینز ہو اور کینز صرف حکم مانتی ہیں! تم بھی میرا حکم مانو گی! یہ میرا دوست ہے اس کا دل توڑنا میری کسی کینز کے بس میں نہیں اس لیے تم وہی کرو گی جو یہ کہے گا! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے یاد رکھو! تم میرا حکم بھولو گی نہیں، نہیں بھولو گی۔ نہیں بھولو گی!“ میں اس کی بات آج تک نہیں بھول سکی۔ اس رات کے بعد اس کی خیاں اپنے عروج پر پہنچ گئی اور کورنگی کا وہ کوارٹر عیاشی کا ڈابن گیا۔ اب میں وہاں تنہا نہیں تھی، میرے ساتھ تین لڑکیاں اور بھی تھیں۔ وہ سب بھی میری ہی طرح تھیں، یعنی ”مقتدر بابا“ کی اسیر! وہ مقتدر کو شیطان کہتی تھیں، لیکن اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ ان میں تھی نہ مجھ میں۔ ان لڑکیوں کی آمد کے کوئی پندرہ دن بعد ہی محلے کے لوگوں نے ہنگامہ کر دیا۔

یہ بڑا خاموش ہنگامہ تھا اس لیے کہ اس کی اطلاع مقتدر کو اس وقت ملی جب وہ اپنے چند دوستوں اور ہمارے ساتھ علاقے کے تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانے میں نہ تو میں نے اپنے سابقہ گھر کے بارے میں کوئی بیان دیا نہ ہی ان لڑکیوں نے ایسا کیا بلکہ ہم اصرار کرتے رہے کہ اس سلسلے میں ہم سے کچھ نہ پوچھا جائے اور جس جرم میں ہمیں گرفتار کیا ہے اس کی جو بھی سزا ہے وہ ہمیں دی جائے۔

تھانے ہی میں مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مقتدر کا اصل نام ارشاد بیگ تھا اور وہ پولیس کو کئی سال سے مطلوب تھا۔ وہ کئی جرائم میں ملوث تھا۔ میں ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ چھ دن تھانے میں رہی اور پھر ہمیں چھوڑ دیا گیا۔ یہ رہائی میرے لیے ایک طرح سے موت کا پیغام تھی۔ روانگی سے قبل تھانے دار نے بتایا کہ مقتدر کے خلاف ہمیں جس بے جا میں رکھنے کا مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔ تھانے دار نے ایک بیان پر ہمارے دستخط بھی لیے تھے اس نے ہمارا پتا بھی پوچھا تھا، لیکن ہم نے جب بتانے سے انکار کیا تو اس نے یہ کہہ کر ہمیں رخصت کر دیا کہ دو تین دن بعد تھانے میں

آکر معلوم کرو کہ تمہاری درخواست کا کیا ہوا ممکن ہے وہ دونوں لڑکیاں تھانے گئی ہوں، لیکن میں نے پھر بھی اس علاقے کا رخ نہیں کیا۔

تھانے سے نکلنے کے بعد میں ان بنتوں لڑکیوں سے الگ ہو گئی۔ ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے اپنا ساتھ چلنے کے لیے بھی کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ کراچی میرا دیکھا بھلا شہر تھا۔ میں وہاں سے سیدھی کینٹ اسٹیشن آئی تاکہ کسی ٹرین میں بیٹھ کر حیدر آباد پہنچ جاؤں، لیکن اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکی۔ ایک تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، دوسرے میں جانی بھی کہاں؟ ماں باپ کا گھر اور شوہر کا گھر تو حیدر آباد ہی میں تھا لیکن دونوں کے دروازے مجھ پر بند ہو چکے تھے۔

میں رات تک بھوکی پیاسی اسٹیشن کے ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ رات کی آمد کے ساتھ ہی کچھ شیطانوں نے میرا گھراؤ کر لیا اور میں ان کے آگے بے بس ہو گئی۔ اس رات کے بعد میں ان شیطانوں کا کھلونا بن گئی۔ میں روز کسی نئے محلے، نئے گھر کے چکر کاٹنے لگی۔ میں نے اس دوران میں کئی بار کوشش کی کہ کوئی ”اللہ کا نیک بندہ“ مجھے مستقل طور پر اپنے گھر میں رکھ لے مگر جو بھی ایسا ملا اس نے مہینے پندرہ دن سے زیادہ مجھے برداشت نہ کیا اور پھر میں کسی نئے گھر کی تلاش میں نکل پڑی۔ اسی طرح دو سال بیت گئے۔ ان دو سالوں نے گزرتے گزرتے مجھ پر اتنے ستم توڑے کہ میری عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا اور میں نے وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کی سرحدوں کو چھو لیا۔

بڑھاپے نے مجھے کئی عذاب عطا کیے۔ ان میں سے ایک عذاب حصول رزق کا بھی تھا۔ جب نوبت بھیک مانگنے کی آئی تو میں نے سوچا کیوں نہ حیدر آباد چلی جاؤں، ممکن ہے جشید مجھے نوکرائی ہی کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار ہو جائے۔ تو ہو گا اس طرح کہ میں اپنے بیٹے کے قریب رہ سکوں گی۔ پھر میں نے اسی پر عمل کیا اور حیدر آباد پہنچ گئی۔ مجھے ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید جشید مجھے اس حال میں پہچان ہی نہ سکیں۔

ایسی صورت میں میرے لیے وہاں نوکرائی کی حیثیت سے رہنا اور بھی آسان ہوا، مگر میری بد نصیبی کہ جشید نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے مجھ پر بڑی لعنت ملامت کی اور مجھے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بہت التجا میں کیں، واسطے دیے اور ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے اپنے گھر میں نوکرائی رکھ لیں، لیکن وہ نہیں مانے اور دھمکی دی کہ اگر میں ان کے گھر سے چلی نہ گئی تو وہ مجھ پر کوئی الزام لگا کر گرفتار کر ادیں گے۔ پھر میں نے ان سے التجا کی کہ ایک نظر اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

”نہیں، تم جیسی بد ذات عورت کا سایہ بھی میں اپنے بچے پر نہیں پڑنے دوں گا ذلیل عورت! اب اس اب میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ جاؤ، چلی جاؤ!“ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

اب میں انہیں کیسے سمجھاتی کہ میں بے قصور ہوں اور جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری میں نہیں، مقتدر تھا۔ وہ انسان کی شکل میں ایک شیطان تھا۔ وہ رحمانی قوتوں کا نہیں، شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ وہ سفلی عمل کے ذریعے معصوم عورتوں کی زندگی اور ان کے ہشتے بستے گھروں کو برباد کرتا تھا۔ اس نے تمہیں ہی نہیں، مجھے بھی برباد کر دیا۔ میں نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ کنا چاہا مگر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ جب سننے والا کچھ سننے ہی پر آمادہ نہ ہو تو کہنے والا کیا کر سکتا ہے۔

حیدر آباد سے میں پھر کراچی آئی اور آج تک یہاں دردور کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ مجھے حیدر آباد سے آئے کئی سیال گزر چکے ہیں۔ جب میں نئی نئی حیدر آباد سے آئی تھی تو میرے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح مقتدر کو تلاش کرتی پھرتی تھی کہ وہی میری تباہی کا ذمہ دار تھا۔ کالی تلاش و جستجو کے بعد بھی وہ مجھے نہیں ملا۔ شاید وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ پھر یوں ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتقام کا یہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ اب میں صرف اپنی موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ کاش میرا یہ انتظار طویل نہ ہو۔

جیب کتری ---

جگدیش جگیش

جرانم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بننے والی ایک لڑکی کی کہانی جسے غنڈوں کا ہر گروہ اپنانا چاہتا تھا۔ مگر اس لڑکی نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ کیا وہ زیر دام آگنی؟

حسن و ذہانت سے بھرپور ایک لڑکی کا ماجرا

کتنے روپ دیکھے تھے سویرے کاروپ، دوپہر کاروپ، شام کاروپ اور رات کاروپ۔ ماریا دھیرے دھیرے خودی اپنی ماں کی ہر بات سمجھ گئی تھی۔ ماریا ابھی طرح جانتی تھی کہ ماں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنار رہتی تھی کیوں کہ وہ بے حد خوب صورت تھی۔ جب ماں اسے اچھے کپڑے پہنا کر سجا بنا دیتی تو پڑوسین کہتیں۔ ”تمہارا بڑھاپا بہت سکھ سے کئے گا۔“

ماں کی کوئی دوسری اولاد نہیں تھی اس لیے اس کی

ماں نے اس کا نام جلوپائی رکھا تھا، مگر وہ کئی ناموں سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ کچھ لوگ اسے جولیا، کچھ زلیخا اور کچھ جلیبی جان کتے تھے، لیکن اس نے خود اپنا نام ماریا رکھا تھا۔ اس کی ماں کھار کے علاقے میں جو اہر گلی رانڈ پورا میں ایک کھولی کے اندر رہتی تھی۔ اس کا باپ کون تھا؟ اس کا علم ماریا کو نہ تھا۔ اس کی ماں نے بھی کبھی اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ جانے کب سے اس کی ماں پیشہ کر رہی تھی۔ ماریا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنی ماں کے نہ جانے



تمام تر توجہ ماریا ہی پر تھی۔ یوں بھی اس محلے میں لڑکیوں ہی کی ماں جان تھی۔ لڑکے تو وہاں اس طرح سمجھے جاتے تھے جیسے کسی ناستک کے گھر میں بھگوان کی مورت۔ یہ لڑکے اپنی ماؤں کے پاس آنے والوں کی نقلیں اتارتے، کم عمری میں دھڑلے سے سگریٹ پھونکتے، چہرہ مارنے کا ہیل پھیلے، گالیاں بکتے، مار پیٹ کرتے، جوا کھیتے، گرہ کٹی کرتے اور کبھی کبھی چھوٹی موٹی چوریاں بھی کر گزرتے۔

ماریا کو لڑکوں کے ساتھ ہی کھیلنا پسند تھا۔ اس نے لڑکوں میں گھل مل کر ان کی ساری حرکتیں سیکھ لی تھیں۔ لڑکوں کو اس محلے میں رہنے والے دادا لوگ (غذے) یہ سارے ”ہنر“ سکھا دیتے تھے۔ لڑکوں کی مائیں اس کی کوئی پروا نہیں کرتی تھیں کہ ان کی اولاد کس راستے پر جا رہی ہے، لیکن ماریا لڑکانہ تھی اس لیے ماں اسے لڑکوں کے ساتھ جانے سے منع کرتی تھی۔ ماریا اپنی ماں کی بات ایک کان سے سنتی دوسرے

سے نکال دیتی اور لڑکوں کے ساتھ نکل جاتی۔

ماریا بہر حال لڑکی ہی تھی۔ جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو لڑکے اور دادا لوگ اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھنے لگے۔ ماریا کو اس بات کا احساس ہوا تو وہ اپنے جسم کو چھپانے لگی، لیکن اس کے ساتھیوں نے جب اس سے پھینٹ چھاڑ شروع کر دی تو وہ بے پروا ہو گئی۔ لڑکوں میں جس طرح پیسوں کے لیے لڑائی ہوتی تھی، ماریا کے لیے بھی لڑائی ہونے لگی۔ پھر دادا لوگوں کی باری آئی۔ ماریا نے لڑکوں سے تو کسی طرح خود کو بچالیا تھا، داداؤں سے اپنے آپ کو کس طرح بچاتی۔

دادا لوگوں کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ ماریا بہت آگے بڑھ گئی۔ پھر اس کے لیے داداؤں کے درمیان بھی جھگڑا ہونے لگا۔ آخر ماریا پر ایک دادا بیرو کا قبضہ ہو گیا۔ بیرو سب سے ٹھنڈا اور نڈر دادا تھا۔ اس نے ماریا کو نئے سرے سے دھندا سکھانا شروع کیا۔

بیرو نے ماریا کا گھر سے لٹکانا بند کر دیا۔ ماں اور بیٹی کا

دھندا مکمل طور پر بند کر کے اس نے ماریا کو انگریزی سکھانے کے لیے ایک ٹیچر رکھا۔ اس نے ٹیچر سے کہا کہ تم ماریا کو فرانے سے انگریزی بولنا سکھا دو۔ اس کے ساتھ ہی بیرو نے ماریا کو لباس پہننا، سنگار کرنا اور تہذیب سے بیٹھنا اٹھنا سکھایا، پھر بخالی، بھجراتی، مراٹھی اور ہندی اردو بولنا بھی سکھایا۔

ماریا یہ سب کچھ سیکھ گئی تو بیرو استاؤ نے اسے اپنے ساتھ میدان میں اتارا۔ بیرو نے ایک دن ماریا کو الحضر کالج گرل کے روپ میں، ایک لوکل ٹرین میں سوار کرا دیا۔ ماریا اپنی دراز زلفوں کو جھٹکتی ہوئی، جے پوری سلیر پہنے شوخ نظروں سے بجلی گرائی کپار ٹنٹ میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ تنگ مری کی پینٹ اور گمرے پیلے رنگ کی ٹائلیوں کی جرسی پہنے ہوئے تھی۔ کتابوں کو سنبھالتی ہوئی وہ ڈبے میں کھسی تھی۔ کھڑے ہوئے مسافروں نے اسے آگے بڑھنے کی جگہ دے دی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی تو کبھی مسافروں کی نظریں جیسے اس پر جم کر رہ گئیں۔ ماریا نے ان لوگوں پر ایک

طاثرانہ نظر ڈالی اور پھر کھسکتی ہوئی ایک شخص کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس شخص کے چہرے پر جیسے بہار آگئی اسے ایک خوب صورت لڑکی کا قریب آ کر گھڑا ہونا اچھا لگا۔ گمروہ کچھ سٹپا بھی گیا۔ ماریا نے اپنی پینٹ کی جیب سے دیوال نکال کر گردن اور چہرے کا پسینا پونچھا۔ اس کے بعد ماریا نے چشمے کو ہاتھ میں لے کر اس کے نیلے شیشوں کو بھی دیوال سے صاف کیا۔ پھر اس نے قریب کھڑے ہوئے شخص کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ چشمہ پہن لیا۔ وہ شخص بھی چور نظروں سے ماریا کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ ایک بار ان دونوں کی نظریں مل گئیں تو شرم سے اس شخص کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے اسے چوری کرتے پکڑ لیا گیا ہو۔

اگلے اسٹاپ پر گاڑی رکی تو اور بھی کچھ لوگ اس ٹھساٹھس بھرے ہوئے ڈبے میں چڑھ گئے۔ ماریا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہ اس شخص سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

ہوتی کہ اگر کبھی معاملہ بڑھ گیا تو وہ سنبھال لیں گے اور اڑایا ہوا پرس اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوگا۔ جب بھی ضرورت پڑی تو وہ ماریا کی مدد کرتے۔ ماریا اتنی صفائی سے ہاتھ دھاتی کہ کسی کو اس پر ذرا بھی شبہ نہ ہوتا۔

تقریباً دو سال تک بغیر کسی کھٹکے کے یہ کام چلتا رہا۔ ماریا بیرو استاد کے گروہ کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی بن گئی تھی۔ اس نے بیرو اور اس کے ساتھیوں کو مال مال کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ اب اس نے اپنے گھر کا نقشہ بھی بدل دیا تھا۔ اس کی مال ہر وقت نشے میں جھومتی رہتی تھی اور جوجی میں آتا تھا کھاتی پتی تھی۔

بہمنی میں جیب کتروں کے کئی گروہ تھے۔ ان کے درمیان چلتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی مارکٹ بھی ہو جاتی تھی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی مخبری نہیں کرتا تھا اور نہ دھندا خراب کرتا تھا۔ سبھی گروہوں میں اب ماریا کا نام چک اٹھا تھا۔ ان گروہوں کے استاد عاشق بھائی، بنسی ماچھی، منور، جارج، ٹیکم اور بنواری لال تھے۔ ان سبھی کی خواہش تھی کہ کسی طرح ماریا انہیں مل جائے۔ انہوں نے ماریا کو پیغام بھی بھیجا اور اسے زیادہ حصہ دینے کا لالچ بھی دیا، لیکن ماریا راضی نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کوئی ایسی حرکت کی تو بیرو اسے چین سے نہیں رہنے دے گا۔

ایک دن ماریا بس کے کیو میں بس آنے کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک ایک ٹیکسی آکر اس کے پاس رک گئی۔ پھر ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے تیزی کے ساتھ جارج باہر نکلا۔ وہ جرسی اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ جارج نے بجلی کی سی تیزی سے پلک کر ماریا کی کلائی پکڑ لی اور پھر اسے کھینچ کر ٹیکسی میں بٹھالیا۔ ماریا اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے مزاحمت نہ کر سکی۔ پلک جھپکتے یہ واقعہ ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ٹیکسی اشارت ہو گئی۔ اسی وقت ماریا کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے ٹیکسی سے ہاتھ نکال کر

گاڑی چلی تو مارا نے اچانک اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جیسے سہارا لیتا چاہتی ہو۔ پھر اس نے بڑی شوقی سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے لی ٹی کالج اسٹاپ کہاں پڑے گا؟“

اس شخص نے چونک کر ماریا کی طرف دیکھا، پھر جواب دیا۔ ”شاید اگلا ہی اسٹاپ ہے۔“

اگلے اسٹاپ پر ماریا اتر گئی۔ اس کے پیچھے بیرو بھی اتر گیا جو اسی ڈبے میں تھا۔

گاڑی چلی گئی اور ماریا نے ایک پرس، بیرو کی طرف بڑھادیا۔ بیرو نے پرس کھول کر دیکھا۔ پرس میں ایک سوپائیس روپے پچھتر پیسے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کی تصویر، ایک رسید اور کچھ دوسرے پرچے تھے۔

بیرو نے ماریا کو شاباشی دی۔ ”بہت اچھے! آج کی پوری کمائی تمہاری۔“

اسی وقت شکر قریب آگیا۔ یہ نوجوان بھی بیرو استاد کا شاگرد تھا۔ اس نے کہا۔ ”استاد! کچھ ہاتھ لگا ہو تو کھلاؤ پلاؤ آج ماریا کا پہلا دن تھا۔“

”بولو شکر! ماریا کی مہورت کیسی رہی؟“ یہ کہہ کر بیرو نے پرس دکھایا اور رقم بھی۔

”بہت عمدہ!“ شکر نے تعریف کی۔

”تو پھر چلو۔“ بیرو بولا۔ ”یہ ساری رقم تو میں ماریا کو دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ تم جو کھانے پینے کو کھو گے اپنے پاس سے کھلاؤں گپلاؤں گا۔“

شکر، کولھا اور سے بھاگ کر بہمنی آیا تھا۔ وہ انگریزی بول سکتا تھا۔ بیرو کو وہ ایک ہوٹل میں پلیس دھونا ہوا ملا تھا۔ بیرو نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ پھر بیرو نے اسے دھندا سکھانا شروع کیا تھا۔ شکر اس وقت بائیس سال کا تھا اور جسمانی طور پر بہت طاقتور بھی۔ اس کامیابی کے بعد ماریا دوسرے دن سے اسی روپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھندے رہ جانے لگی۔ بیرو کے دو تین گھر گئے اجنبی بن کر اس کے پاس موجود رہتے اور ماریا اطمینان سے اپنا کام کرتی۔ اسے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں کسی طرح کی فکر نہ

اشاپ کے شیڈ کا کھمبا مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ماریا کے بلاؤز میں چاقو بھی تھا، مگر وہ اسے نکال نہ پائی تھی۔ شیڈ زور سے جلا اور اسی کے ساتھ وہاں موجود افراد کو بھی احساس ہو گیا کہ کیا واقعہ رونما ہو رہا ہے وہ ”پولیس پولیس“ چلاتے ہوئے ماریا کی مدد کرنے پہنچ گئے۔ اسی وقت پولیس کی ایک گشتی گاڑی ادھر آتی دکھائی دی۔ یہ دیکھ کر جارج نے ماریا کو ٹیکسی سے نیچے دھکیل دیا اور خود وہاں سے ٹیکسی میں فرار ہو گیا۔ لوگوں نے اس ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ انہوں نے چلا کر اور ہاتھ اٹھا کر پولیس کی گاڑی کو روکا۔ اسی دور ان میں ماریا ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی اور لوگ حیران رہ گئے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے نو بجے تھے اور سڑکوں پر لوگوں کا جھوم تھا۔ پولیس کی گاڑی کو بس اشاپ تک پہنچنے میں اسی سبب کئی منٹ لگ گئے۔ پولیس والوں نے آس پاس ماریا کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔

اس حادثے کے بعد بیرو چوکنہ ہو گیا۔ اس نے ماریا کو ریو اور چلانا سکھایا اور پھر حفاظت کی خاطر ایک غیر ملکی ریو اور اس کے حوالے کر دیا۔ یہ ریو اور بغیر لائسنس تھا۔ اس کے ساتھ ہی بیرونے شکر کو ماریا کے ساتھ ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ اپنے گروگوں میں اسے شکر پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ ماریا مزاجاً سنسنی خیزی پسند کرتی تھی اسی لیے اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ پھر شکر کا ساتھ بھی اسے پسند تھا۔ وہ شکر کو دل ہی دل میں چاہنے لگی تھی، مگر اس کا اظہار نہیں کیا تھا اس کا سبب بیرو بھی تھا۔ ماریا اس سے بہت ڈرتی تھی اور اسی کے خوف سے شکر کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کرتی تھی۔

دھندے کے دوران میں کبھی تو شکر ماریا کے ساتھ کھل کر رہتا تھا اور کبھی چھپ کر۔ شکر کے علاوہ گروہ کے دو تین آدمی بھی سائے کی طرح ماریا کے آگے پیچھے رہتے تھے۔ شکر جب کھل کر ماریا کے ساتھ رہتا تو اسے ایک انجانا سا سکھ ملتا۔ کبھی وہ دونوں طالب علم بن کر سفر کرتے اور کبھی نو بیاہتا جوڑا بن کر۔ دونوں ہی

صورتوں میں ان کے کردار قابل دید ہوتے تھے۔ ان پر کوئی بھی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

ان دونوں کے یہ ظاہری کردار مسافروں کو اصل صورت حال سے توجہ مبذول کرانے کے لیے ہوتے تھے۔ جب ماریا اپنا شکار ناڑی لیتی تو وہ اٹھ کر شکار کے پاس چلی جاتی اور اپنا کام کر گزرتی۔

بھی بھی اداکاری محبت کی اداکاری بھی سچائی کا روپ دھارتی ہے۔ یہی ماریا اور شکر کے ساتھ ہوا، لیکن بیرو کے خوف سے ان کے دل کی بات زبان پر نہیں آتی اور وہ کسی موقع کے منتظر رہے۔

ایک دن دوپہر ڈھلنے تک کوئی اچھا شکار نہ ملا تو ماریا اور شکر ٹرین سے اتر کر بس اشاپ کی طرف چل دیے۔ ان کے پیچھے پیچھے بیرو بھی تھا۔ راستے میں ماریا اور شکر کو منور کے گروہ کا ایک آدمی دکھائی دیا جو ماریا کی طرف دیکھ کر کھانسا رہا تھا۔ بس میں بیٹھ جانے کے بعد شکر نے یہ بات بیرو کو بتائی۔ بیرو اس وقت ہیرے کی انگوٹھیاں پہنے سیڈھ بنا ہوا تھا۔ بس چلی تو اس نے دیکھا کہ ایک ٹیکسی بھی بس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ ماریا نے بس میں ہاتھ کی صفائی دیکھا کر ”مال“ شکر کو ٹھہرایا۔ اگلے اشاپ کے لیے پیدل ہی چل پڑے۔ وہاں ان کا دوسرا ساتھی انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ وہ ایک بائی پاس سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے اچانک ایک کار آئی اور بیرو کو چلتی ہوئی نکل گئی۔ یہ دیکھ کر ماریا اور شکر جو جیسے سکتے سا ہو گیا۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ اس کار میں کون تھا۔ ان کے ہوش ٹھکانے آئے تو انہوں نے فوراً ”بیرو کو اسپتال پہنچایا، لیکن بیرو کو ہوش نہ آسکا۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے دم توڑ دیا۔

بیرو کا انتقال ہو جانے سے شکر اور ماریا نے سکون کا سانس لیا۔ انہوں نے سوچا کہ اب وہ اپنی آرزو پوری کر سکیں گے۔

کچھ دن وہ دونوں دھندے پر نہیں گئے اور گھر ہی میں رہ کر ایک دوسرے سے محبت کا خراج وصول کیا۔

قابل دید

ایک دن دو چوہنیاں خوراک تلاش کر رہی تھیں
اچانک راستے میں ان کو ایک ہاتھ ملا۔ ایک چوہنی دوسری
سے تھری سے بولی۔
”وہ دیکھو سامنے سے ہاتھی چلا آ رہا ہے۔ آج اس
کو مار گرائیں۔“
”یہ سن کر دوسری غمت سے ناک چڑھا کر بولی۔
”رہنے دو پھر بھی سہی۔ آج وہ بے چارہ اکیلا ہے۔
اور ہم دو ہیں۔“

☆

ایک چوہیا اپنے تین ننھے بچوں کے ساتھ شام
کی سیر کو نکلی کہ ایک لمبی سامنے سے آئی ہوئی دکھائی دی۔
اس سے پہلے کہ لمبی ان کی طرف جھپٹی، چوہیا اپنی پوری
طاقت سے چلائی۔
”بھوں بھوں..... بھوں بھاؤں۔“
لمبی ہکا بکا رہ گئی اور اپنے قدموں واپس دوڑ گئی۔
چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا۔
”اب تم جان گئے ہو گے کہ اپنی مادری زبان سیکھنے کے
علاوہ بھی کوئی اور زبان سیکھنا کتنا ضروری ہے۔“ ☆

یقین تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو کسی قیمت پر چھوڑنا
نہیں چاہتے تھے۔ اسی سبب وہ کسی کے سامنے جھکنے پر
تیار نہیں تھے۔

کچھ ہی روز بعد انہوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ
ایک بار پھر اپنا دھندا شروع کر دیا۔ ماریا پہلے ہی کی طرح
اپنا کام کرتی اور شکر سائے کی طرح اس کے آس پاس
موجود ہوتا وہ اپنی جیب میں ماریا کی حفاظت کے خیال
سے بھرا ہوا ریوا لور رکھے رہتا تھا۔

جارج نے ایک دن بس میں ماریا کا ہاتھ پکڑ لیا تو شکر
اس سے بھڑکیا۔ اس وقت ماریا نے کسی کی جیب نہیں
کلی تھی اس لیے وہ بھی بڑھو کر جارج کو پھٹکارنے
لگی۔ مسافروں نے بھی جارج کے بجائے ان دونوں کا

وہ یوں پہلی بار ساتھ رہے تھے ورنہ بیرواب تک ان
کے درمیان جھڑکی دھوا رہا تھا۔ وہ تو چین سے تھے مگر
ان لوگوں کو چین کیسے آسکتا تھا جنہوں نے ماریا کو
تھمیانے کے لیے بیرو کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

پہلے جارج نے اور پھر منور نے براہ راست ماریا
سے بات کی تو اس نے ان دونوں ہی کے ساتھ رہنے
سے انکار کر دیا۔ بنواری لال نے ماریا کی ماں سے رابطہ
قائم کیا کہ اس کے ذریعے ماریا پر دباؤ ڈالو۔ اس کے
لیے اس نے بڑھیا کو لال دیا۔ ماریا کی ماں جانتی بھی کہ
اب لڑکی جوان ہو چکی ہے اور دباؤ میں نہیں آئے گی۔
اس نے یہی سوچ کر بنواری لال کو صاف جواب دے
دیا کہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ منور نے تو ایک دن شکر کو
راستے میں گھیر لیا۔ پھر اس نے شکر کو اس شرط پر رہا کیا
کہ تم اپنا ماریا کا ساتھ چھوڑ دو۔ گے یا پھر اس کے ساتھ
میرے گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔ بنی ما بھی اور
عاشق نے ماریا کو دھمکی دی کہ اگر وہ ان کے ساتھ
شامل نہ ہوئی تو بیرو کی طرح اسے بھی جہنم رسید کر دیا
جائے گا۔ ٹھیکہ نے بیرو کے دو گرگوں کو توڑ کر اپنے
ساتھ ملا لیا۔ ان گرگوں کے ذریعے بھی ماریا اور پر دباؤ
ڈالا گیا کہ وہ ٹھیکہ سے مل جائے۔

تنگ آکر شکر اور ماریا نے کسی بھی گروہ میں شامل
ہو جانے کا فیصلہ کیا مگر دو باتیں آڑے آئیں۔ ایک تو
یہ کہ کوئی بھی شکر کو اتنا حصہ دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا
جتنا ماریا چاہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ ماریا کو تنہا
شکر کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔
جارج تو ماریا کے ”ہنر“ سے زیادہ خود اسی کا دیوانہ تھا
لیکن ماریا پر تو شکر کا جاوہ چل چکا تھا۔ وہ اب شکر کے
سوا کسی کو بھی اپنی غلطیوں کا امین بنانے پر آمادہ نہیں
تھی۔ اب وہ اتنی بھولی اور معصوم نہیں رہی تھی کہ ہر
کوئی اسے بہلا پھسلا کر اپنا مقصد پورا کر لے۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ کسی بھی گروہ سے مصالحت نہ ہو سکی۔

ماریا کو اپنے روپ اور ہاتھ کی صفائی پر پورا بھروسہ
تھا۔ شکر کو بھی اپنے قوت بازو اور ماریا کی وفا پر پورا

ساتھ دیا۔ جارج نے صورت حال دیکھی تو وہ بس سے اتر کر کھسک گیا۔

اس واقعے کے بعد بس یا لوکل ٹرین میں ماریا کو دوسرے گروہوں کا کوئی نہ کوئی آدمی دکھائی دینے لگا۔ اس سے ماریا سمجھ گئی کہ اب وہ لوگ اسے پکڑوانے کے چکر میں ہیں اسی لیے اس نے وقتی طور پر اپنا دھندا ٹھپ کر لیا۔ اس سے شکر فکر مند ہو گیا۔ اس نے

ایک دن ماریا سے کہا۔ ”کیا ان سالوں کے ڈر سے ہم اپنا دھندا بند کر دیں گے! تم میرے ساتھ چلو، میں دیکھوں گا کہ وہ کیا کر لیتے ہیں۔“

شکر کے اصرار پر ماریا راضی ہو گئی۔ اس دن تو ماریا نے شکر کے دل پر قیامت ہی ڈھادی۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ چوڑی دایا جاہ، پچکن کا کرتہ اور کادارو دیشا اوڑھ کر وہ کوئی لکھنؤی دو شہرہ معلوم ہو رہی تھی۔ شکر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دونوں اسٹیشن پہنچ کر ایک لوکل ٹرین کے ڈبے میں چڑھ گئے۔ خوش قسمتی سے پہلے ہی نظر میں ماریا کو ایک موٹا آسامی نظر آگیا۔ وہ گھونگھٹ کی اوٹ سے اس کی طرف نیوں کے تیر چلانے لگی۔ آسامی نے یہ دیکھا تو خود ہی کھنچ کر اس کے پاس آگیا۔

گاڑی ایک اسٹاپ پر رک کر آگے بڑھی تو شکر نے دیکھا، جارج ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہوا ماریا کو گھور رہا تھا۔ شکر ماریا سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے آنکھوں سے آنکھوں میں ماریا کو اشارہ کیا کہ خطرہ ہے۔ اس کے باوجود ماریا اب اپنا شکار چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ گاڑی نے ایک موڑ پر جھکا کھایا۔ آسامی جیسے ہی ماریا کی طرف جھکنا ماریا نے اپنا کام کر لیا۔

عین اسی لمحے جارج چیخا ہوا ماریا کی طرف لپکا۔ اس نے ماریا کو ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ ماریا کی کلائی پر ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے شکر کا بازو پکڑ لیا اور چلایا۔ ”دیکھو یہ جیب کترے ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے جیب کٹی ہے۔“

ماریا نے فوراً ”ہی پرس کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے چیخی۔ ”غڈ! غڈ! غڈ!“ شکر نے دانت پیس کر کہا۔ ”سلا، شریف لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔“ پھر اس نے جارج سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس پر وار کر دیا۔ شکر نے چاقو نکال لیا تھا۔

وار بجاتے بجاتے بھی جارج کے پیٹ میں ایک ڈبڑھ اچ چاقو گھس ہی گیا۔ پھر تو جیسے اس پر خون سوار ہو گیا۔ وہ بحر حال ایک کمرہ کا سردار اور مانا ہوا چاقو باز تھا۔ اس نے شکر کے منہ پر مکامارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ شکر لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر جارج نے بھی چاقو نکال کر کھول لیا۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے شکر پر بجھ پڑا۔

جارج کا لمبے پھل والا چاقو سیدھا شکر کے پیٹ میں ٹھس گیا۔ شکر چیخ اٹھا اور اسی کے ساتھ ماریا کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ جارج کا چاقو ابھی شکر کے پیٹ ہی میں گھسا ہوا تھا اور چاقو کے دسے پر اس کی گرفت تھی۔ اس نے دانت پر دانت جتا کر چاقو کھمایا اور پھر اسے باہر نکال لیا۔ شکر منہ کے بل پیچے آ رہا۔ خون کا فوارہ چھوٹا تو مسافر خوف زدہ ہو کر ایک طرف ہٹ گئے۔

ماریا اب بت کی طرح کھڑی ہوئی جارج کو گھور رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

جارج خون آلود چاقو تھامے ماریا کی طرف بڑھا اور بولا۔ ”چلو میرے ساتھ!“ اس کا لہجہ حکمہ تھا۔ اسی وقت ماریا نے اپنی کمر سے ریو اور نکال کر جارج پر گولی چلا دی۔ جارج کا جسم لہرا کر زمین پر آ رہا۔ گولی نے اس کے ماتھے میں سوراخ کر دیا تھا۔

دو قتل، دو منٹ میں ہو گئے تھے سارے مسافر ڈبے میں ایک طرف سمے کھڑے تھے ٹرین چلتی جا رہی تھی اور اس کے جھکوں سے فرش پر خون پھیل رہا تھا۔

اگلے اسٹاپ سے پہلے ہی گاڑی کی رفتار دھبی ہوئی

دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھکا۔ پھر وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑ گئی۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کے صدر دروازے پر رک کر دیکھا تو ابھی تک وہ اجنبی اس کے تعاقب میں تھا۔ یہ دیکھ کر وہ لے ہی دل میں کچھ ڈر گئی۔

ٹرین میں چڑھنے کے بعد بھی وہ سیدھی اندر ڈبے میں نہیں گئی بلکہ دروازے ہی پر رک کر اس اجنبی کو دیکھنے لگی۔ پھر جیسے ہی ٹرین حرکت میں آئی، وہ اجنبی بھی لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اسے ٹرین میں سوار ہوتے بھی ماریا نے دیکھ لیا تھا۔ بیروں سے اکثر اس نے سی آئی ڈی والوں کے قصے سنے تھے کہ ان کا کیا طریقہ کار ہوتا ہے اور کس طرح مجرموں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اس اجنبی کے انداز و اطوار بالکل ویسے ہی تھے۔ اس بات نے ماریا کو اور بھی ہراساں کر دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب اس کا پچھا مشکل ہے۔

اگلے اسٹاپ پر ماریا نے ٹرین سے اتر جانا ہی غنیمت سمجھا، لیکن وہ جیسے ہی اتری تین چار آدمیوں نے اسے گھر لیا۔ ان لوگوں میں وہ اجنبی بھی شامل تھا جو اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ ماریا نے خود کو ان لوگوں کے درمیان گھرا دیکھ کر ریو اور نکالنا چاہا، مگر اس سے پہلے ہی انہوں نے ماریا کو دبوچ لیا۔ پھر انہوں نے سب سے پہلے ماریا کا ریو الور اپنے قبضے میں لے لیا۔

ماریا کے خلاف قتل کرنے، جیب کاٹنے اور بغیر لائسنس کا ریو الور رکھنے کے الزام میں مقدمات چلائے گئے، لیکن کوئی یقینی گواہ نہ ہونے کی وجہ سے ماریا کو شک کا فائدہ مل گیا۔ صرف بغیر لائسنس کا ریو الور رکھنے کے جرم میں اسے چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اپنے ریو الور سے دوسری گولی نہیں چلا سکی تھی۔



تو ماریا چلتی ہوئی گاڑی سے باہر کود گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔

اسٹیشن پر گاڑی رکستے ہی اس ڈبے کے مسافر کو دو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اندر گھسنے والے مسافر، دروازے ہی سے ڈبے کے اندر کا منظر دیکھ کر چیخ اٹھے۔ پولیس نے آکر اس ڈبے کا معائنہ کیا اور پھر اسے ٹرین سے الگ کٹوا کر ٹرین کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔

ماریا بحفاظت اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کے بعد دس

بارہ دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلی۔ بیروں کے گروہ کے دو ایک آدمی اس دوران میں اس سے ملے اور انہوں نے بتایا کہ پولیس نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ شاید اس نے یہ کیس فائل کر دیا ہے۔ ماریا اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اسے کسی نہ کسی گروہ کا سہارا لے ہی لینا چاہیے مگر فی الحال اسے کوئی بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے کو آمادہ نہیں تھا۔

کچھ دن اور گزرے تو ماریا پھر اپنا دھندا کرنے لگی۔ دو تین دن اطمینان سے گزر گئے اور پولیس اس کے پیچھے نہ لگی تو وہ اور بھی مطمئن ہو گئی۔

ماریا اس سے بے خبر تھی کہ سی آئی ڈی والے انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہے تھے۔ وہ مشتبه لڑکیوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیوں کہ ماریا کا کوئی ریکارڈ پولیس کے پاس نہیں تھا اس لیے صرف اس کے حلیے کی بنیاد پر اس کی تلاش جاری تھی۔ اسی دوران میں ماریا ایک دن بس میں چڑھی اور اس نے مسافروں پر نگاہ ڈالی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک مسافر اسے دیکھ کر چونک اٹھا ہے۔ وہ ماریا کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ماریا جان بوجھ کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ اگلے اسٹاپ پر بس سے اتر گئی۔ بس سے اتر کر وہ ایک طرف چل دی۔ اس کے دلی میں چور تھا اس لیے کچھ دور چل کر وہ مڑی اور پیچھے دیکھا۔ اپنے پیچھے اسی بس والے مسافر کو آتے

نیا ساجن پرانا آنگن

احسان بن جان

عورت کے بہکتے قدم ہمیشہ تباہی اور بربادی کے باعث بنتے ہیں۔ شیطان اس پر حاوی ہو جاتا۔ اس نے بھی اپنی ہوس اور خواہش کی وجہ سے اپنے بچوں تک کو چھوڑ دیا۔

شیطان کے بھکاوے میں آئی ایک عورت کی شقیہ القلبیہ

لیتے اور اپنے کام پر چلے جاتے۔ کوئی منصوبہ خواہ گھر یا ہو یا تجارتی اس وقت تک شروع نہ ہوا تا جب تک بڑی اماں منظوری نہ دے دیں۔

اتنی ناز برداری اور بے پناہ عقیدت کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی اماں خاندان کی بلا شرکت غیرے مطلق العنان فرماں روا بن گئیں۔ آخر کو وہ بھی انسان تھیں۔ ان سے کئی غلط فیصلے ہوئے بعد میں جن کے نتائج بڑے کرناک اور تباہ کن رہے، لیکن کیا مجال کسی نے اف تک کی ہو۔ سارے بگاڑ کا الزام تقدیر کے سر تھوپ دیا گیا۔

یہ 44 کی بات ہے۔

بڑی اماں کے غلط فیصلوں میں سے ایک فیصلہ شازیہ اور جامی صاحب کی شادی تھا۔ اب یہ بتانا تو بہت

مشکل ہے کہ جامی صاحب کی بڑی اماں تک رسائی کیوں کر ہوئی! لیکن لوگ کہتے سنے گئے کہ وہ اپنی روایات کے مطابق فلم انڈسٹری کو ایک اور ہیروئن دینا چاہتے تھے کیوں کہ پہلی دونوں اداکاراؤں نے شہرت پانے اور قیمت منوانے کے بعد ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ بہر حال شازیہ اور جامی صاحب کی شادی کردی گئی، بغیر یہ سوچے سمجھے کہ دونوں کی عمول میں آدم آدم آؤ اور شکل و صورت رنگ روپ میں زمین

یہ 42ء کی بات ہے۔ نام تو شاید کچھ اور رہا ہو، لیکن عام طور پر وہ جامی صاحب کہلاتے تھے۔ درمیانی عمر، اچھی صحت اور عمدہ قد کاٹھ جھنگ کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا۔ وجہ شہرت اور مقبولیت میں کچھ تو خاندانی امارت کو دخل تھا اور کچھ یہ بھی کہ انہوں نے انڈین فلم انڈسٹری کو دو ایسی اداکارائیں دیں جو اپنے دور میں صف اول کی ہیروئنیں شمار ہوئیں۔

شازیہ کے اسلاف کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا، مگر برسوں پہلے وہ بمبئی چلے آئے اور مستقل طور پر وہیں آباد ہو گئے۔ شازیہ کی پیدائش بھی بمبئی میں ہوئی اور وہیں وہ سن بلوغت کو پہنچی۔ یہ اس دادی کی پوتی تھی جس کے خاندان کو اللہ نے ہر طرح بڑی وسعت دی تھی۔ بیٹے تو بڑی اماں کے دو ہی تھے، مگر وہ دونوں ہی کثیر الاولاد تھے۔ ان کا اچھا خاصا کاروبار تھا، روپے پیسے کی ریل پیل تھی، جس کام میں ہاتھ ڈالتے وارے نیارے ہو جاتے۔ وہ دونوں ہی بڑی اماں کے انتہائی تابعدار اور خدمت گزار تھے۔ شاید قدرت بیٹوں کو ماں کی خدمت کا انعام دے رہی تھی کہ ہر طرح سکھ چین کی ہنسی بچ رہی تھی۔ ان کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا کہ صبح سویرے ماں کے پاؤں دبا کر انہیں جگاتے دے مائیں



قہری سے بیاہی ہوئی بھی یہ بمبئی سے اٹھ کر ان کے پاس آئیں۔ بڑی اماں کے دونوں بیٹیوں نے کراچی میں ڈراما کیا۔
یہ 48ء کی بات ہے۔

شازیہ کے دو بچے ہوئے، عظمت جامی اور عفت جامی! لاہور پہنچ کر سر توڑ کوشش ہوئی کہ شازیہ کسی طور فلموں میں آجائے لیکن جامی صاحب کے ستارے اب شاید الٹی چال چل رہے تھے۔ یوں بھی وہ عجب افرا تفری کا زمانہ تھا۔ ہر کوئی پر اُگندہ اور مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن تھا۔ بھلا ایسے میں کون فلموں میں سرمایہ پھنساتا! نتیجتاً جامی صاحب اپنے مقصد میں ناکام ہو کر شازیہ اور بچوں سمیت جھنگ چلے آئے۔ پے درپے ناکامیوں سے وہ تڑھال ہو گئے

آسمان کا فرق ہے۔ شازیہ انتہائی مناسب قد و قامت اور دل کش نقوش و خطوط لیے ہوئے تھی۔ پہلی نظر میں وہ پندرہ سولہ سالہ دوشیزہ دکھائی دیتی تھی، نہایت سکھڑ اور شرمیلے والی! اخلاق ایسا کہ اجنبی بھی گرویدہ ہو جائیں۔

یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی یا جامی صاحب زوال پذیر تھے کہ وہ شازیہ کو فلم لائن میں روشناس کرانے کے ابھی ابتدائی مراحل میں تھے، سیٹھوں، ڈائریکٹروں سے بات چیت چل ہی رہی تھی کہ پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ وہ بڑے گرم و سرد چشمدہ تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد بمبئی سے لاہور چلے آئے کہ وہاں فلم انڈسٹری سے بہتر توقعات تھیں۔ بڑی اماں کی ایک یونی تقسیم سے بہت پہلے راولپنڈی کے ایک ممتاز

ساتھ روکھی پھینکی اور جھیل کے پانی کی طرح سسکتا۔ جامد بے کیف لرزتی زندگی اسے بے آب و گیارہ رنگ زار محسوس ہوتی تھی جہاں حد نظر تک چمک دار اور سلگتی ریت ہو اور صرصر کے جھونکے ہوں۔ ایسے میں اختر ایسا چھبلا نوجوان اسے نخلستان دکھائی دیا۔ ان حالات میں شازیہ کا اختر میں دلچسپی لینا ایک فطری امر تھا۔

اختر بے فکر اور کھلنڈرا لڑکا تھا، لیکن چچی کی آنکھوں سے جھلکتی یاس اور حماں نصیبی کو محسوس کیے بغیر نہ رہتا اور سوچا کرتا بیوں کی آمریت نے یہ کیسی بے جوڑ شادی کو جنم دیا کہ خاوند باپ کی عمر کا ہے۔ یہ اس کی کم علمی اور نا تجربہ کاری تھی کیوں کہ وہ فطرت کی فیاضی سے بے خبر ہے نہیں جانتا تھا کہ شازیہ دو بچوں کی ماں ہونے پر بھی غیر شادی شدہ نظر آتی ہے۔ وہ ایک ایسا سدا بہار پھول تھی جو ماہ و سال کے رفت و گزشت اور خزاں و بہار کے تغیر و تبدل سے بے نیاز اور اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ منہلکا رہتا ہے۔ بلاشبہ وہ اختر سے کئی سال بڑی تھی لیکن عشق بلا تفریق مذنب، رنگ، نسل اور عمر اثر دکھاتا ہے، نتیجے اور انجام کی پروا کیے بغیر! رفتہ رفتہ بغیر سے غیر محسوس طور پر وہ دونوں خود کو ایک دوسرے کے بغیر ادھورا اور نامکمل محسوس کرنے لگے۔ یوں اختر کا آہا جانا بھٹا چلا گیا۔ پہلے پہل پچا جان کی موجودگی میں اور جب طلب نے شدت اختیار کی تو ان کی غیر موجودگی کا انتظار رہنے لگا۔ اس طرح ان دونوں کا عشق پروان چڑھنے لگا۔

آخر ایک دن شازیہ نے پہل کی اور پوچھ بیٹھی۔ ”ختر! تم جب تک میرے پاس رہتے ہو، ہر چیز بہار نظر آتی ہے، لیکن یہ وقت ہوتا ہی کتنا ہے! میں تو اس چوری چھپے کے گھٹے ہوئے لمحاتی ملاپ سے تنگ آچکی ہوں۔ تم نے کبھی اس بارے میں سوچیدگی سے کچھ سوچا؟“

”بھئی میں کیا کروں اور کیا سوچوں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔“

”تمہیں پانے کے لیے، اپنی محبت کی تکمیل کے

تھے اور یوں بھی اب عمر کافی ڈھل چکی تھی۔ جامی صاحب برادری والے تھے۔ ان کے آزد بازو میں ان ہی کے رشتے ادروں کے مکان تھے۔ بالکل برابر والے مکان میں ان کا دور پار کا ایک بھتیجا اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ اختر نام تھا۔ اٹھارہ بیس برس کا نئی نسل کا نوجوان، طرح دار، خوش مذاق اور بذلہ منہج! شکل صورت اچھی پائی تھی۔ گریجویشن کے بعد وہ فرصت ہی سے تھا کہ باپ نے ترکے میں خاصی زمین چھوڑی تھی۔ رشتے داری کی بنا پر اختر کا جامی صاحب کے ہاں آنا جانا لگتا تھا۔

شازیہ بنیادی طور پر بہت نیک طبیعت تھی۔ دولت کو چھوڑ کر گوجا صاحب سے اس سے کسی طور لگانہ کھاتے تھے اس پر بھی اس کی توجہ اور تمناؤں کا مرکز شوہر اور بچے ہی تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ خود کو ہیروئن دیکھنے کی چاہت میں اس کی اپنی دلی سی آرزو بھی شامل تھی۔ اس سلسلے میں اس کا نظریہ بھی وہی تھا جو عام طور قائم کر لیا جاتا ہے کہ انسان خود برائی سے بچے پھر کسی کی کیا بھل جو آنکھ بھی میلی کر سکے۔ حالانکہ عملی زندگی میں ان خیالات کو حالات کی آندھی خشک گھاس کی طرح جانے کہاں سے کہاں اڑا کر لے جاتی ہے!

مانا کہ ہمیں اور لاہور کے نگار خانوں کی نیرنگیوں سے شازیہ کو بھرپور مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن جو کچھ بھی جننے دن کے لیے دیکھا اس کی خوشگوار یادیں اسے کبھی بھی مضطرب کر دیتیں جیسے تھہرے پانی میں کوئی کنکر پھینک دے۔ یوں بھی جھنگ ایسے مقابلہ پسندانہ علاقے کے ایک پر آسائش گھر میں وہ خود کو ایک پرندہ سمجھنے لگتی جسے بال و برنوج کر ایک خوب صورت پنجرے میں ڈال دیا گیا ہو۔ ادھر عمر کے تفاوت اور تقاضے نے اس کے اور جامی صاحب کے درمیان ایک ان دیسی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ کبھی کبھی اسے شدت سے احساس ہوتا کہ بڑی اماں نے بے جوڑ شادی کر کے اسے ایک کرب اور عذاب مسلسل میں مبتلا کر دیا ہے جس کا انتقام نظر نہیں آتا۔ بوڑھے کے

ہلے میں ہر حد سے گزر سکتی ہوں، ہر رکاوٹ پھلانگ سکتی ہوں، لیکن بتاؤ تو سہی اختر کہ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”یہ تو تم مانو گی شازیہ کہ چچا کی صحت بتاتی ہے کہ وہ ابھی سدھاریں گے نہیں۔ ان کے سدھارنے تک اللہ جانے، ہم بڑھے ہو جائیں۔ مجھے تو بس دوراستے دکھائی دیتے ہیں یا تو چچا کو کسی طور پر چلتا کر دیا جائے یا پھر تم ان سے طلاق لے لو۔“

”میں نے بتایا نا اختر، تمہارے حصول کے لیے نہ تو مجھے قانون کی پروا ہے اور نہ ساج کی، کوئی ڈر، کوئی خوف مجھے اپنے ارادے باز نہیں رکھ سکتا۔ مجھے تو بس یہ تباد کہ ان دونوں میں سے تمہیں کون سی بات پسند ہے؟“

”میرے خیال میں قتل سے زیادہ طلاق میں عافیت ہے۔“

”بس پھر ٹھیک ہے تم مطمئن رہو میں جلد ہی جابی صاحب سے چھٹکارا پاؤں گی۔“

اس کے بعد میاں بیوی میں آئے دن کی کھٹ پٹ رہنے لگی جس میں جابی صاحب ہی کو پسنا ہونا پڑا۔ پہلے پہل تو وہ حیران و ششدر ہوئے کہ ایسی گھریلو بیوی کو کیا ہوا کہ ایک ایسی ایسا رویہ ہو گیا، مگر چونکہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیسے ہوئے تھے، جلد ہی معاملے کی تک پہنچ گئے اور اختر کا گھر میں داخلہ بند کر دیا، یہ کارروائی سنا کر نکل جانے کے بعد لیکر پیٹنے کے برابر تھی۔ گھر کے درگروں حالات بچے دیکھتے اور کچھ سمجھ نہ پاتے، ہر وقت کی چیخ بک بک اور والدین کی عدم توجہی نے انہیں نکما، خود سر اور ڈھیٹ بنادیا تھا۔ اسی دوران میں جابی صاحب کو تار ملا کہ بڑی اماں شدید بیمار ہیں، شازیہ کو فوراً بھیجو۔ پرانا کھلاڑی اور سیانا کو ابھی آخریات کھا ہی جاتا ہے۔ ان کا ذہن بھولے سے بھی کسی سازش کی طرف نہ گیا۔ یوں بھی وہ بڑی اماں کے زیر احسان تھے کیوں کہ ان کی شادی ان ہی کے حکم سے ہوئی تھی۔ انہوں نے شازیہ اور دونوں بچوں کو والدینڈی بھجوا دیا۔

شازیہ کا قیام جب غیر معمولی ہو تو جابی صاحب نو، پنڈی پہنچے اور بڑی اماں سے کہا کہ اب ماشاء اللہ آپ تندرست ہو گئی ہیں۔ شازیہ کو بھیج دیں، گھر چھوٹ ہو کر رہ گیا ہے۔

وہ اپنا سہرا تھوں میں تھام کر بیٹھ گئے جب بڑی اماں نے اپنے روایتی پر جلال انداز میں جابی صاحب سے شازیہ کی طلاق کا مطالبہ کیا۔

وہ بے چارے بہت روئے چلائے، خوشامریں کیں، لیکن انہیں بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔ جابی صاحب بے چارے اس بربھاپے میں بہ یک وقت کئی صدموں میں گھر گئے۔ بیوی کی بیوفائی کا غم، اولاد کی جدائی اور سسرال سے طلاق کا مطالبہ، ذہنی و باؤ جب حد سے گزر گیا تو ایک دن خبر آئی کہ جابی صاحب انتقال کر گئے۔

ایام عدت کے بعد شازیہ ایک بار پھر دلہن بنی۔ اسے دلچسپ کر یوں لگتا تھا جیسے یہ دن اس کی زندگی میں پہلی بار آیا ہو۔ اس کے حسن اور رعنائی میں ہنوز روز اول کی سی تازگی تھی۔ بہر کیف وہ دونوں بچوں سمیت ایک بار پھر جھنگ روانہ ہوئی، لیکن اس بار خاوند اختر تھا اور جابی صاحب تو مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے تھے۔ شازیہ بھرپور خوشیوں کے جھرمٹ سے گزرنے لگی۔ ہر دن عید اور ہر شب، شب برات تھی۔ جو کچھ چاہا پایا، لیکن اس کم بخت وقت کو کب ٹھہراؤ ہے، گزرتا ہے اور گزرتا رہے گا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ایک وقت آیا کہ دوسرے کی اولاد بوجھ اور کہاب میں بڑی محسوس ہونے لگی۔ وقتی جوش، دلولے اور نادانی کے زیر اثر اختر نے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی، لیکن عمل کا وقت آتے ہی سوتیلانن جاگ اٹھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ اختر سے زیادہ شازیہ بچوں کو بار گراں اور خلوت و جلود میں غیر ضروری رکاوٹ سمجھنے لگی۔ بچوں سے لویا ہوتا جوڑے کی نفرت روز بہ روز بڑھتی چلی گئی۔ سگی ماں نے اپنے عیش اور تکمیل خواہشات کی خاطر عظمت اور عفت کو ان کی خالہ کے ہاں پنڈی بھجوا دیا۔

جائے۔

دنیا کے حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں زمانے کو گزرتا ہے اور گزرتا رہے گا۔ دونوں بہن بھائی سبکی ماں سے سینکڑوں میل دور خالہ کے ہاں پل رہے تھے۔ یاہوں کہیں نوکروں سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ چونکہ ہوش سنبھالتے ہی والدین کی شفقت اور تربیت سے محروم رہے تھے لہذا ان کے اطوار بھی ناپسندیدہ تھے۔ جب خالہ کی قوت برداشت نے دم توڑ دیا تو انہوں نے شازبیہ کو لکھا، بچوں کو بلا لویہ ماں باپ کے زیر سایہ ہی صحیح پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اسے بھلائیہ کب گوارا تھا کہ جس مصیبت سے بہ ہزار وقت جان چھڑائی ہے اسے پھر سے مسلط کر لی اجائے۔ نتیجتاً ”لکھ بیچا کہ سوتیلا آخر سوتیلا ہوتا ہے۔ اول تو یتیم جان کر اپنے پاس ہی پرارہے۔ وہ نہیں تو یتیم خانے بھجوادے۔ جب سبکی ماں کا یہ وتیرہ ہو تو خالہ کو کیا پڑی تھی کہ پرانی آگ میں کودتی، لہذا انہوں نے دونوں بہن بھائی کو لاہور کے یتیم خانے میں داخل کرادیا۔

زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے زیادہ زیادہ لطف اٹھانے کے لیے شازبیہ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ مگر کی بہترین آرائش کی عمدہ سے عمدہ لباس بنوایا۔ ہمہ وقت بتاؤ سنگار کا خیال رکھا۔ ایک گاڑی خرید لی اور اس طرح پر تعیش زندگی کی معراج پالی۔ گھڑی کی سوئیاں چلتی رہیں۔ دن ہفتوں میں ہتھتے مہینوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ یہ وہ دور تھا کہ اختر شازبیہ پر کسی غم کی ترد کا سایہ تک نہ تھا۔

وہ سرسبز کا وقت تھا اور موسم برسات کا اودی اودی گھٹاؤں نے آسمان پر پورش کر رکھی تھی، جاں فزا صبا اپنے جلو میں کیف و سرور سے بھرے جھونکے لیے خراباں خراباں چل رہی تھی۔ سناں بڑا پیارا اور دل فریب تھا۔ اتنی مدت گزرنے پر بھی اختر سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شاید یہ کفران نعمت کی سزا تھی جو عظمت اور عفت کو ٹھکرا کر انہیں مل رہی تھی۔ ایسا جوڑا جس کا جوش اور ولولہ ہنوز روز اول کا سا ہو۔ ایسے پیارے موسم میں بھلا کب نکلا بیٹھنے والا تھا، طے پایا کہ کھانے پینے کی دوچار چیزیں لی جایں اور پکنک منائی

ابھی گاڑی شہری حدود چھوڑ رہی تھی اور بچکے موسم کا مزا ابھی باقی تھا کہ خاک اڑا نا ایک ٹرک نہایت تیزی سے موڑ پر نمودار ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ اختر بچاؤ کی کوئی صورت نکالنا ٹرک ایک دھماکے ساتھ ان کی کار سے ٹکرا گیا۔ راہ گریوں اور کھیتوں میں کام کرنے والوں کے جائے حادثہ پر پہنچنے سے قبل ہی گاڑی آگ پکڑ چکی تھی۔ اختر اسٹیرنگ پر بے جان جھول رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں نے اسے اور گاڑی کو نکل لیا۔ شاید دھماکے کی شدت تھی کہ شازبیہ گاڑی کے باہر پائی گئی اس کے کپڑے آگ پکڑ چکے تھے چہرہ اور سر کے بال جل کر رہ گئے تھے۔

شازبیہ ایک عرصے تک زیر علاج رہی اس دوران میں اسے بتایا گیا کہ وہ ایک بار پھر بڑھ ہو گئی ہے۔ بہتر علاج کے لیے اس کی بہن نے اسے لاہور کے ایک بڑے اسپتال میں داخل کرا دیا تھا جہاں کا ایک نوجوان ڈاکٹر بڑی محنت اور جاں فشائی سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ وہ اپنے محسن کی صرف آوازیں سن سکتی تھی کیوں کہ آگ نے اس کے چہرے اور آنکھوں کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ ایک وقت آیا کہ زخم مندمل ہو گئے۔ مگر جل کر سڑ کر رہ جانے والی کھال نے چہرے کو بہت بھیا تک بنا دیا تھا۔ اب آنکھوں کی پٹی کھلتا باقی تھی جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔ وہ سوچتی اسے کاش اس کی بینائی باقی رہے مگر وہ اپنے محسن ڈاکٹر کو جی ہر کر دیکھ سکے جس نے اس کے لیے اپنا دن رات کا سکہ چین بچ کر رکھا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ آنکھوں کا آپریشن کامیاب رہا۔ پٹی کھلنے پر جب آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس کے بڑی کی ایک طرف اس کی پنڈی والی بہن عجب گومگو کی حالت میں نظر آئی۔ دوسری طرف ایک باری سی لڑکی ڈاکٹری سفید کوٹ پہنے میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے گھڑیاں کی سوئیوں نے الٹا دوڑنا شروع کر دیا اور شازبیہ اس نوجوان ڈاکٹر اور نو عمر لیڈی ڈاکٹر سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔

غزلیں

قیصر مجنی

جو کم آمیز ہے اور کم سخن ہے
وہی ظالم تو جانِ امجن ہے
دھنک سی ہر طرف جیسے ہو رتھوں
عجب اک سامنے خوش بیدار ہے
نہ ہاتھ اس نے ملایا اب یہ کہہ کر
ملانا ہاتھ اک رسم کس ہے
عبث ہے شکوہ بے اتفاقی
یہی ہر شخص کا اب تو چلن ہے
میں اس کے حال پر گریہ کناں ہوں
مرے احوال پر وہ خندہ زن ہے
لے ہوں عقل کی ہر دم تراو
یہی قیصر مرا دیوانہ پن ہے

ترکین راز زیدی

چشمِ دوراں میں کہاں زیت کا کاجل ہے اب
اس قدر ٹوٹ کے بری ہے کہ جل تھل ہے اب
جلتے خرمن پہ برس جاتی تھیں آنکھیں جس کی
بجلیاں خود میں مچھپائے وہی بادل ہے اب
دکھ گھٹا بن کے امنڈتے ہی چلے آتے ہیں
کرب کی قید میں احساس کا ہر ٹپل ہے اب
اکٹھاری پہ ہند یاس کے ظالم لمے
اکٹھیشو کی کو بڑھا آس کا آٹھل ہے اب

یہ دونوں اس کے اپنے عظمت اور عفت تھے
جن سے اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ اپنی خواہشات کی
تحمیل کے لیے جنہیں اس نے نظر انداز کر دیا تھا، لیکن
قدرت ویسے بناتی ہے ضرورت صرف مصمم ارادے
کی ہوتی ہے۔ یمیم خانے پہنچ کر انہوں نے اپنے بہتر
مستقبل کے لیے ایک راہ متعین کی۔ محنت اور لگن ہو
تو محرومیوں کی دھند چھٹنے لگتی ہے۔ ہر قیمت پر کچھ بن
جانے کے جذبے کو دیکھتے ہوئے یمیم خانے کے خدا
ترس متہم نے لاہور کے ایک لاولد مگر پردرد و تاجر سے
سفارش کی۔ اس تاجر نے نہ صرف ان کی تعلیم کے
اخراجات برداشت کیے بلکہ ذہنی بالیدگی کے لیے
انہیں اپنے بنگلے میں لے آیا۔ پھر یہ عزم استقلال کی
کٹھالی میں ڈھل کر کنڈن بن کر نکلے۔ احساس محرومی
نے انہیں کچھ کر گزرنے کا جذبہ دیا اور سر توڑ کوشش
ایک دن پار آور ہوئی۔ اس طرح عظمت و اکر عظمت
جائی فزیشن سرجن بنا اور عفت نے اپنے پانچ سالہ
کورس میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔

”ای! آپ ذرا فکر نہ کریں۔ کچھ عرصے بعد میں
آپ کو بیرون ملک پلاسٹک سرجری کے لیے لے جاؤں
گا۔“

”عظمت بیٹے! مجھے سرجری کر کر کیا لیتا ہے! میرا
چہرہ دیکھنا ہو تو خود کو دیکھو، اپنی بہن عفت کو دیکھو! میں
بس یوں ہی ٹھیک ہوں اس لیے سرجری والی بات ہمیشہ
کے لیے بھول جاؤ۔“

عشق کا دیوتا جو یہ سب کچھ سن رہا تھا، بہت مایوس
ہوا۔ شازید کا چہرہ ٹھیک ہو جانے پر وہ اپنے ترکش سے
ایک اور تیر نکالتا پھرنا ممکن تھا کہ اختر سا کوئی اور نوجوان
گھائل ہو جائے کہ شازید کا پیکر اب بھی سدا بہار تھا
ہزار کی طرح جو ہزاروں سال گزرنے پر بھی دھیر نہ ہی
نظر آتی تھی۔



حادثہ

اولیس احمد

ہاں اسے آئرن سے ہوشیار دھنا پڑے گا۔ ایک سادہ سا گھبریلو حادثہ ہی بہتر ہو گا۔ مگر بیچاری پیٹرس کسی طرح غسل کے دوران میں گرنے اور ڈوب جانے والا طریقہ اب مناسب نہیں رہے گا۔ اس بار کوئی اور ہی طریقہ ہونا چاہیے۔ ان چکرانی سیڑھیوں سے گھر گھر گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ اگر کوئی ان کاموں کا عادی نہ ہو تو یہ سیڑھیاں اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

اس شمارے کی ایک منفرد انجام کی تحریر

کارٹر وارلے پر اسرار کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ جب وہ چھپ جاتیں تو انہیں اپنے ذہن سے نکال دیا کرتا۔ اس کے دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی اس کی کوئی کہانی پڑھ بھی لیتے تو اس سے تذکرہ نہ کرتے شاید اس معاملے میں وہ اس سے حسد کرتے تھے۔ جہاں تک عام قاری کا تعلق ہے تو وہ تفریح طبع کے لیے اس کی کہانیاں پڑھتے تھے پھر صفحہ پلٹ دیتے اور رسالہ ختم کر کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

مگر نومبر کی اس صبح جب تیز بارش نے ویمبلڈن کا من میں واقع وارلے کے مکان کی کھڑکیوں پر جلتنگ چھیڑ رکھا تھا تو وارلے اپنی ڈیسک پر بیٹھا امریکہ سے آنے والے ایک خط کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ خط نیویارک میں چھپنے والے ایک رسالے کے توسط سے اس کے پاس آیا تھا۔ مگر لفافے پر نیویارک کی بجائے پینانوغا ٹیکسی کی مہر لگی ہوئی تھی۔

خط میں لکھا تھا۔ ”آپ کی کہانی بھولنے والا پڑھ کر حیران رہ گیا۔ آپ نے تو گویا میری ہی کہانی لکھ دی تھی۔“ خط لکھنے والے نے اپنا تعارف ولیم اشاک کے نام سے کر لیا تھا اور وہ ایک وکیل تھا۔ اتفاق ہے کہ اس کہانی میں وارلے نے اپنے ولن کا نام اشاک ہی رکھا تھا اور اس کا پیشہ بھی وکالت دکھایا تھا۔

وارلے نے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھایا اور جواب لکھنے لگا۔ اس نے اس اتفاق پر معذرت کرنے کے بعد خط لکھنے پر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر یہ بھی لکھ دیا کہ اگر بھی اس امریکی کا لٹرن آتا ہو تو اس سے ضرور ملے۔

دو پہر تک بارش تھم گئی۔ وارلے باہر نکلا کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا اور پھر ولیم اشاک کے نام اپنا خط پوسٹ کر دیا۔

رات کو جب کھانا کھانے کے بعد وہ کافی پی رہا تھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اس نے امریکی کو خط میں

حکومت کی دعوت کیوں دے ڈالی تھی۔ وہ تنہائی پسند شخص تھا۔ اسے تو اپنے دوستوں کا اپنے گھر آنا بالکل پسند نہیں تھا۔ کجا یہ کہ وہ ایک اچھی امریکی کومڈو کر بیٹھا تھا جو شخص ایک اتفاق کی بنا پر اس سے شناسائی کا حق بنا رہا تھا۔

کافی ختم کر کے اس نے دوائے کھائے اور کافی کی دوسری پیالی حلق سے اٹھیل لی۔ پھر اس نے ایک جام میں شراب اٹھیلی اور میز پر آ بیٹھا۔ اس نے سوچا کہ وہ تو خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہا ہے۔ اس نے تو صرف روادری میں جواب دے دیا تھا اور گھر بلانے کی دعوت تو شخص تکلف تھا جسے کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لے سکتا تھا۔ چٹیا لوگا لندن سے ہزاروں میل دور تھا۔ بھلا اسے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی۔

کرکس آ گیا اور وارلے کو احساس ہوا کہ دو سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ اپنی بیوی کی موت کو نہیں بھلا سکا ہے۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود بیوی کی یاد کانٹنے کی طرف اس کے دل میں جھٹکتی رہتی۔ مہینوں وہ خود کو یہ دھوکا دینے کی کامیاب کوشش کرتا رہا کہ اسے کسی کی رفاقت کی ضرورت نہیں لیکن سال کے آخر میں جب وہ کام سے سرائٹھا، فرصت اسے میسر آئی تو خوفناک یادوں کا ایک سیلاب سا امنڈ آتا۔ تاریکیوں کی خوشبو۔ کھر آلود راتوں میں

سنسان بڑک کی سیر، کھڑکی کے پردوں سے کرکس کے موقع پر درختوں میں ٹٹھنیانی روشنیوں کی جھللاہٹ۔ پھر کرکس ہی کے موقع پر لڑکوں کی ٹولی کا گانا گاتے ہوئے اس کے دروازے پر آنا۔ ہر چیز کے ساتھ بے شمار یادیں وابستہ تھیں اور ہر سال یہی سب کچھ ہوتا تھا۔ دل میں کانٹنے چھب جاتے تھے۔ اس برس بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ بچوں کی ٹولی کو تو اس نے پچاس سینٹ دے کر بھگا دیا تھا۔ پھر روشنائی گل گر کے تاریکی میں اس کا کج کی بوتل لے کر ماضی کی غذا بنا کر یادوں کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ پچیس سال کا تھا اور بیٹرس کے ساتھ گرچا میں پادری کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کرکس کی رات تھی۔ پادری دعائیں پڑھ کر انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ رہا تھا۔

بیٹرس کے ساتھ از دو اجی زندگی کے ابتدائی چند سال کس قدر حسین تھے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی محبت میں کمی آتی گئی پھر بھی وہ یہ رشتہ نبھاتے رہے مگر اب جبکہ وہ تنہا تھا وہ صرف خوشگوار دنوں کو ہی یاد کرنا چاہتا تھا۔

کرکس گزر گیا، سال بدل گیا۔ اب سرد جنوری کا مہینہ تھا۔ پھر بھورا فردری آ گیا۔ یہ دونوں مہینے وارلے کے لیے آرام کے مہینے تھے۔ پھر جھیلما مارچ آ گیا۔ سورج کی روشنی وارلے میں نئی زندگی دوڑا گئی



اور وہ سر جھکا کر کام میں جگمگا رہا تھا۔
 اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔
 ”ہیلو!“ اس نے فون اٹھا کر کہا۔ ”وارلے
 اسٹیلنگ۔“
 ”ہیلو۔ میں بلی اسٹاک بول رہا ہوں۔“
 دوسری طرف سے آواز آئی جو وارلے کے لیے اجنبی
 تھی۔ ”کیا آپ مسٹر کارٹر وارلے ہیں۔؟“
 ”ہاں! میں کارٹر وارلے ہی ہوں۔“ وہ بولا۔
 اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔
 ”ذیل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں۔ ہم کل
 ہی لندن پہنچے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ کے اس پر
 خلوص دعوت نامے کے جواب میں کم از کم آپ کو ہیلو
 ہی کہہ لوں۔“
 ”اچھا آپ ہیں! بڑی خوشی ہوئی۔“ اس نے
 اسٹاک کی ہنسی سنی۔ انداز بڑا بچکانہ تھا۔
 ”میرے خیال میں آپ نے شاید ہی کبھی اپنی
 کہانی کے کسی کردار کا فون ریسیور کیا ہو۔“ لہجے میں
 زندہ دلی تھی۔
 گفتگو کے دوران میں اسٹاک نے کسی آئرن
 کو بھی آواز دی تھی۔ وہ تنہا نہیں آیا تھا۔ نہ جانے
 کیوں اس خیال سے وارلے نے بڑا اطمینان محسوس
 کیا۔
 ”مجھے احساس ہے کہ مصنفین کا وقت بڑا قیمتی
 ہوتا ہے میری اور آئرن کی خواہش ہے کہ آپ لندن
 آ کر ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔“
 وارلے مہینوں سے ہائی اسٹریٹ سے آگے
 نہیں گیا تھا۔ لندن کے معنی تھے واٹرلو تک ٹرین کا سفر
 اور وہ سفر سے بہت گھبراتا تھا۔
 ”دراصل ان دنوں مصروفیت بہت ہے۔
 اگلے ہفتے شاید کوئی دن نکال سکوں۔“ اس نے ٹالنے
 کے لیے کہا۔
 ”مگر محترم! ہم لندن میں صرف دو دن ہیں۔
 ہم نے ایک کار کرائے پر لے رکھی ہے۔ ہمارا ارادہ
 جنوبی ساحل کی طرف جانے کا ہے۔“ اسٹاک نے

جواب دیا۔
 ایک لمحے کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا
 گئی۔ پھر وارلے کے منہ سے از خود نکلا۔ ”پھر یہاں
 میرے ہاں آ جاؤ۔ آج ہی رات ڈنر پر۔“ بعد میں
 اسے خود حیرت ہوئی کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔
 امریکن نے اس دعوت پر اس قدر مسرت کا
 اظہار کیا کہ وارلے کا جذبہ میزبانی جوش پر آ گیا۔
 اس نے پر جوش انداز میں کہا۔ ”آپ لوگ ہوٹل کو
 مکمل طور پر خیر آباد کہہ دیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔
 ”میرے ہاں ایک بڑا آرامدہ گیسٹ روم ہے۔ آپ
 کو پسند آئے گا۔“

اس کے بعد اس کا لکھنے کو دل نہیں چاہا۔ اس
 نے مسودہ ایک طرف کھسکایا اور سادہ کاغذ ٹائپ رائٹر
 پر چڑھا کر ڈنر کے لیے مینو ٹائپ کرنے لگا۔

چھ بجے تک وہ اپنے مہمانوں کے ڈنر کا اہتمام
 کر چکا تھا۔ ڈنر بہت معقول تھا۔ ٹھیک اس وقت جبکہ
 وہ آئرنڈن میں کوسلے ڈال رہا تھا اس کے مہمان آ
 گئے۔ وارلے ایک لمحے تک قد آدم آئینے کے سامنے
 کھڑا رہا۔ ٹائیٹی گریہ درست کر کے اس نے اپنے
 بھورے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کئی برس بعد پہلی مرتبہ
 اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی دوڑی تھی اور
 آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی۔

ویم اسٹاک اور آئرن اس کی توقع کے مطابق
 بڑے دلکش ثابت ہوئے۔ اس کے دل میں جو تھوڑا
 بہت خوف رہ گیا تھا، وہ بھی ہوا ہو گیا۔ پہلی بات تو یہ
 تھی کہ ان کا لباس بچکانہ نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر
 امریکنوں کا لباس ہوتا ہے۔ اسٹاک کسی قدر دراز قد
 اور بھاری جسم کا تھا۔ چہرہ بڑا جاذب نظر تھا۔ وہ
 وارلے سے دس سال چھوٹا نظر آتا تھا۔

آئرن اسٹاک تیس سال سے زیادہ کی نہیں
 ہو سکتی تھی۔ اپنے انداز گفتگو اور میک اپ کی بنا پر وہ
 کسی فلم کی اداکارہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے نقوش
 بڑے تھیکے اور دلاویز تھے۔ گھنے سنہرے بال اس کے
 شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سبز آنکھوں میں بڑی گہرائی

لکھی تھی۔

آتشدان کے قریب بڑی کرسیوں پر بیٹھ کر شراب کا دور شروع ہوا تو باہر بارش شروع ہوئی۔

”انگلینڈ کی سیر کی خواہش بڑی دیرینہ تھی مگر اب تک اسے نالٹا رہا۔“ اشاک کہہ رہا تھا۔ ”مگر آپ کا پر خلوص دعوت نامہ پا کر پہلے ہی موقع پر چلا آیا۔“

”آپ کا گیسٹ روم بہت خوب صورت ہے۔“ آرن بولی۔ پھر اس نے اپنی سبز آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ”مجھے آپ کا یہ مکان بے حد پسند آیا۔“ اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

ڈنزیبل چھوٹی تھی۔ اس لیے وہ تینوں بہت قریب قریب دائرے میں بیٹھے تھے۔ اشاک کے ہماری کندھے آگے کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران میں وارلے جب بھی آرن کی طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز جھک دوڑ جاتی۔ اس انداز میں ایک پیغام تھا۔

وارلے کو ان دونوں کے بے تکلفانہ انداز پر حیرت تھی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی اس کے باوجود وہ دونوں انتہائی بے تکلفی اور اطمینان سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر کافی کی میز پر ایک ممکنہ جواز اس کی سمجھ میں آ گیا۔ شراب کی ایک بڑی بوتل ان کے حلق سے اتر چکی تھی۔ اتنی شراب پینے کے بعد تو اجنبیت کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ خود اس نے نئی برس بعد اتنے خوشگوار ماحول میں شراب پی تھی اور خوب پی تھی۔

”میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا ہے۔“ وہ گردن اٹھا کر بولا۔ ”تم ہنسو گے۔“

”کیا خیال آیا ہے۔“ اشاک نے پوچھا۔

”یہی کہ شاید تم ولیم اشاک نہ ہو بلکہ محض مہم جو ہو۔ یہ کہ شاید تم استاد قسم کے لوگوں میں سے ہو اور محض اس لیے مجھے خط لکھا ہو کہ یہاں آ کر میرا اعتماد حاصل کر لو۔“ وارلے اس وقت درویشانہ انداز میں

گفتگو کر رہا تھا ”مگر کہنا پڑتا ہے کہ تم اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہو۔“

نہ جانے یہ قریب نظر تھا یا حقیقت۔ بہر حال اسے ایسا لگا تھا کہ اشاک نے بڑے معنی خیز انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تھا پھر اشاک نے گویا اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”مگر میرے لیٹر پیڈ پر میرا نام چھپا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس پر میرے نام ولیم اشاک کے ساتھ انٹاری ایٹ لا آف پیناٹوٹیلیسی لکھا ہوا ہے۔“

”جعلی لیٹر پیڈ چھپوانا تو دنیا کا آسان ترین کام ہے۔“ وارلے نے کہا تھا اور پھر یہ بھی سوچا تھا کہ آخر وہ اس خیال پر اتنا زور کیوں دے رہا ہے۔ کہیں اس کے مہمان برائہ منائیں۔

مگر اشاک ہنس پڑا اس نے کہا۔ ”مصنف کا ذہن کام کر رہا ہے میرے خیال میں آپ کو ہر بات میں کوئی نہ کوئی چکر نظر آتا ہے مگر آپ ہی بتائیے آخر ہمیں ایسا کرنے کی کیا غرض پڑی ہے۔ کیا مقصد ہو سکتا ہے ہمارا۔؟“

وارلے تڑسے بولا۔ ”مالی فائدہ اور کیا۔ یہاں آ کر تم مجھ سے دوستی بڑھاتے اور بتا لگاتے کہ میں اپنی دولت کہاں رکھتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی طرح مجھ سے کوئی رقم نکلوا لو یا جبک ہی حاصل کرنا اور غائب ہو جاؤ۔ پولیس اس جعلی نام کے فرد کو کہاں تلاش کرتی پھرے گی۔“

پھر سب چپ ہو گئے تھے۔ یہ خاموشی وارلے کے جسم میں چھری کی طرح اترتی جا رہی تھی سمجھنے سی چند لمحوں کے لیے اسے اپنے سینے میں ٹھن سی محسوس ہوئی پھر وہ بتدریج اعتدال پر آ گیا۔ اس نے اشاک کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اس کا انداز دھمکی آمیز تھا مگر وہ تو بیضا شراب کے جام سے کھیل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ یوں جڑے ہوئے تھے جیسے وہ چسکی کا لطف لے رہا ہو۔

آتشدان کے پاس بیٹھے وہ آدمی رات تک باتیں کرتے رہے۔ دونوں میاں بیوی بخود آ رہے

اثلاٹا اور کیلیفورنیا تک اپنے موٹر ٹرپ کے بارے میں کہانیاں سناتے رہے۔ یہ فاصلے وارلے کے لیے ایسے ہی تھے جسے دو سیاروں کے درمیان کا فاصلہ کیونکہ وہ خود پچاس میل دور برٹین سے آگے بھی نہیں گیا تھا۔

مہمانوں کی موجودگی نے وارلے پر نشہ آور دو کا سا اثر کیا۔ اس نے بھی خلاف عادت اپنی زندگی کے سارے ہی گوشے ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ مگر شاید یہ تو اس قانون دان کے عقلمندانہ سوالات کا اثر تھا جس کا اسے بعد میں احساس ہوا تھا۔ اس وقت تو وہ خود کو اس دنیا میں قطعی تہا سمجھ رہا تھا جس نے پہلی بار ہمدرد سامع پائے تھے۔ نہ اس کے کوئی بچہ تھا نہ کوئی عزیز رشتہ دار۔ وہ ایسا شخص تھا جس کی موت پر بھی کوئی رونے والا نہ تھا۔

”آپ کی بیوی کیسے.....“ آرنن کہتے کہتے رک گئی۔ اشاک نے گلا صاف کیا۔

”نہیں کوئی بات نہیں!“ وارلے اس کا اشارہ سمجھ کر بولا۔ ”حادثے میں میری گئی تھی۔ نہاتے میں اس کا سر ٹکرایا تھا اور وہ ڈوب گئی تھی۔“

گھنٹوں بعد اپنی تاریک خواگاہ میں لیٹے ہوئے وارلے نے میٹر ہیوں پر قدموں کی چاپ سنی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلپپر پہنے۔ گاؤن باندھا اور دبے قدموں چلتا نیچے آ گیا۔ اس نے مہمانوں کی سہولت کے لیے ہاتھ روم کی بنی کھلی چھوڑ دی تھی۔ اس کی روشنی زینے کی پانچ میٹر ہیوں تک پڑ رہی تھی۔ مکان پر سیانے کا راج تھا مگر فضا میں ایک خوشبو سی رچی ہوئی تھی۔ کسی عورت کی خوشبو۔ اتنی رات گئے اپنے مکان میں کسی عورت کے وجود کو محسوس کیے اسے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔

میٹر ہیاں اتر کر وہ سرد کارپٹور میں آ گیا۔ ہال کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ ہال سے گزر کر باغ کی طرف جانے والے راستے پر آ گیا۔ آرنن اشاک ایک روش پر کھڑی تھی۔ اس نے بڑا لمبا غزل پہن رکھا تھا۔ اس کے طویل سنہرے بال کھلے ہوئے لہرا رہے

تھے۔ وہ آرنن کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر روک گیا۔ ایک لمحے تک دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔

”مجھے افسوس ہے۔“ آرنن ہی نے پہل کی۔

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔“

آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ اینٹوں کی دیوار پر چڑھی ہوئی انکور کی تیل بے جان سی لگ رہی تھی۔ وارلے کے ہاتھوں میں زمین کی نمی اور درختوں کی باس کھل گئی۔ وہ جیسے فضا کے اس سحر میں کھوسا گیا۔

اچانک آرنن نے پرانے دوستوں کے انداز میں اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگے جھکی اور وارلے کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ وارلے کو یوں لگا جیسے اس کے ہونٹ گلاب کی ٹکفٹہ پھول سے مس ہو گئے ہوں۔ مگر وہ فوراً ہی سبکھل گیا۔ ”مہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ بڑی مشکل سے بول سکا۔

آرنن نے مڑ کر مکان کی جھت پر بنی ہوئی چینی کے اوپر معلق چاند پر نظر کاڑی۔ ”مجھے یہ مکان بہت پسند ہے۔“ اس نے جیسے خواب میں کہا اور پھر عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔

ناشتے کے بعد وارلے اشاک کے ساتھ تھا۔ آرنن ضد کر کے بازار جا چکی تھی اور کہہ گئی تھی کہ دوپہر کے لیے کھانا بھی خود ہی لائے گی۔ اشاک کافی کے تیرے کپ سے مشغول کر رہا تھا۔ ”میرے خیال میں آرنن نے پچھلی رات پاگل پن کا ثبوت دیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

کچھ نہ کرنے کے باوجود بھی وارلے غل سا ہو رہا تھا۔ ”کوئی بات نہیں بہت سے لوگوں کو اچھی جگہ نیند نہیں آتی۔“ وہ دم لہجے میں بولا۔

”میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ماضی کے بارے میں ہمیں کچھ پتا چلتا۔“ اشاک بولا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمیں تمہارے مکان میں رات گزارنی پڑے گی۔“ پھر وہ اسے بتانے لگا کہ یہ

برائے روڈ پر ڈال دی۔ اس سے گزر کر سسکس سے ہوتے ہوئے شرق کی طرف نکل گئے۔ ہسٹنگ کے قریب ساحل پر انہوں نے گاڑی روک دی اور باہر نکل آئے۔ آدھ میل ساحل پر پہل کر وہ پھر کار میں آ بیٹھے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے گزرتے ہوئے ڈوور تک آ گئے۔

”مجھے تو اب تک کوئی بھی جگہ رہائش کے لیے پسند نہیں آئی۔“ اشاک بولا۔ ”بہت ہی میٹرو پولیٹن قسم کے مقامات ہیں۔“

”لینڈ گیٹ چھوٹی اور بڑی اچھی جگہ ہے۔“ وارلے نے مشورہ دیا۔

”کیوں نہ کسی میدان میں ڈیرہ ڈال لیا جائے۔“ آرن کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ”یا اگر گھوٹو کسی جنگل میں جھونپڑی بنالیں۔“

وارلے کو اس وقت احساس ہوا کہ اشاک واقعی بے حد سنجیدہ ہے جب وہ ایک اسٹیٹ آفس کے سامنے یہ معلوم کرنے جا کھڑا ہوا کہ آیا اس علاقے میں فروخت کے لیے کوئی مکان موجود ہے یا نہیں۔ آرن نے دفتر کے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وارلے اس کے ساتھ کار میں ہی بیٹھا رہا۔ چند لمحے کار میں خاموشی رہی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا آرن کی گردن شانے اور سنہریے بالوں کو دیکھتا رہا۔ کار میں خوشبو ہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”تو اس نے تمہیں پوری طرح اعتماد میں لے لیا۔“ اچانک آرن پلٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

”کیا مطلب۔“ وہ ہنسا گیا۔

”تمہیں اس کی باتوں پر یقین آ گیا ہے نا۔؟“

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا۔“

وارلے بولا اور آرن نے آنکھیں بند کر لیں۔

”رات تو تم تصورات کی دنیا میں تھے۔“ وہ بولی ”مگر اب تو جاگ رہے ہو۔“ اس نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے وارلے کو دیکھنے لگی۔

”یہ کیا تم نہیں دیکھ رہے۔“ وہ بولی۔ ”مصنف

جن کا تفریحی دورہ نہیں تھا۔ وہ ایک خطرے کے پیش نظر ہی سفر پر نکلے تھے۔ آرن کئی سالوں سے لیبارٹنفل اسٹورز سے چیزیں چرانے کی عادی تھی۔ وہ کئی مرتبہ پولیس کے ہاتھ لگ چکی تھی مگر اب وہ مقام آ گیا تھا جہاں اشاک کی قانونی حیثیت بھی ناکام نظر آرہی تھی۔ پولیس اب آرن کو اشاک کے مژدہ سونخ کے باوجود جیل بھیجے گا تبہ کہ چکی تھی۔

”کلپو میڈا۔“ وارلے بولا۔ ”اسے کسی ماہر نفسیات کو کیوں نہیں دکھایا۔“

”کوشش کی تھی۔ مگر کچھ لوگ اچھے معمول نہیں ہوتے۔ آرن انہی میں سے ایک ہے۔“ وہ بڑی کئی سے مسکرایا۔ ”کچھ نہیں بن سکا تو میں نے تبدیلی کا سوچا۔ کسی قصبے میں یا دیہات میں منتقل ہو جانے کا ارادہ کیا جہاں اسے چوری کے کم سے کم مواقع حاصل ہوں۔“

”مگر تمہاری پریکٹس کا کیا ہوگا۔؟“

”خوش قسمتی سے میں ایک بڑا کامیاب وکیل رہا ہوں۔ اس لیے دولت کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

اسی وقت آرن بازار سے واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اشیا سے بھری ہوئی باسکٹ تھی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں خاموش ہو گئے۔ آرن اس معینی خیز خاموشی کو بھانپ گئی اور اس نے کہا۔

”میرے شوہر باتیں کر رہے تھے۔ ہے نا۔“

اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ”ہی کے ساتھ یہی ایک پرائیلم ہے۔ حضرت کو یہی معلوم نہیں کہ کب زبان بند رکھنی چاہیے اور کب کھلنی چاہیے۔“ پھر اس نے میز کے پاس جا کر باسکٹ سے چمڑیں نکال کر میز پر رکھی شروع کر دیں۔

اشاک ہی کا مشورہ تھا کہ وہ ان کی کرائے کی سڈان میں ان کے ساتھ جنوبی ساحل چلے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ مارچ کا سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اشاک نے کہا۔ ”ہم راستے میں ایسے گاؤں بھی دیکھتے چلیں گے جہاں ہم رہائش اختیار کر سکیں۔“ اس کے بعد انہوں نے گاڑی

خیال بھی صحیح تھا۔“

اب.....؟؟

ایک خاتون مرغی کی دکان پر پہنچیں اور ایک مرغی خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ دکاندار نے ایک کٹی ہوئی صاف ستھری سالم مرغی اٹھائی اور اسے تولنے کے بعد بولا ”اس کی قیمت چھتیس روپے ہے۔ خاتون نے تنقیدی نظروں سے مرغی کا جائزہ لیا اور بولیں: ”یہ تو بہت چھوٹی ہے کیا آپ کے پاس اس سے بڑی مرغی نہیں ہے؟“ اتفاق سے دکان میں وہ واحد مرغی تھی لہذا دکاندار نے وہی چھوٹی مرغی اٹھائی اور عقبی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے مرغی کو کھینچا، پٹا اس پر ایک چوٹ لگائی، مرغی کی جسامت بڑھنے پر وہ اسے لے کر واپس دکان کے اگلے حصے میں پہنچ گیا۔ مرغی کا وزن کر کے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ”اس مرغی کی قیمت پچاس روپے ہے۔“ ”ٹھیک ہے۔“ خاتون نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”آپ مجھے دونوں مرغیاں دے دیں۔“ ☆

کی حیثیت سے تمہارا وجدان بالکل درست تھا۔ وہ ولیم اشاک نہیں ہے۔ میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔ ہم دونوں میں ایک معاہدہ ہوا ہے کہ تم سے بہت بڑی رقم ہتھیا کر آپس میں بانٹ لیں گے۔“ ”مگر پچھلی رات تو میں مذاق کر رہا تھا۔“ وارلے نے کہا پھر بھی وہ میٹھوک سا تھا۔ کیا اس نے واقعی وہ بات مذاق میں کہی تھی۔ پھر اسے خطرے کی گھنٹی یاد آگئی جو اس نے اپنے ذہن میں بجتی سنی تھی ”مذاق میں کہا تھا یا سنجیدگی سے بہر حال تمہارے منہ سے اس وقت سچی بات نکلی تھی۔ اس کا اصلی نام ٹیڈ ہے اسی نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا ذہن ایسے معاملے میں بہت تیز تھا۔ تم اسے بالکل ٹھیک سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ تمہارا جعلی لیٹر پیڑ والا

وارلے نے اپنی آنکھوں میں کھٹک سی محسوس کی۔ یہ شاید غصے یا اعتماد کی شکست کا اثر تھا۔ ”تو پھر جب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد تو میں اس سے ضرور بات کروں گا۔“ وہ بولا۔ ”مگر وہ مکان کی تلاش میں سرگرداں کیوں ہے۔ کیا یہ بھی محض فراڈ ہے؟“ ”سو فیصدی فریب۔ محض تمہیں یقین دلانے اور تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی ایک چال ہے۔“ ”اور یہ تمہارے کلچر میڈیا والی کہانی۔ کیا یہ بھی غلط ہے۔“

”ہاں یہ سب تمہیں چکر دینے والی باتیں ہیں۔ محض تمہاری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔“ اس نے ہاتھ پیچھے کر کے وارلے کا ہاتھ تھام لیا اور گرجوٹی سے دبا دیا۔ ”ہوشیار رہنا اسے یہ پتا نہ چلے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسے روحانیت میں بھی غلط ہے۔ تم واقعی خطرے میں پڑ جاؤ گے۔ بس دیکھتے رہو آگ کھیں کھلی رکھو اور زبان سے کچھ نہ کہو۔“ ”تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو۔ تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔“

”دل چسپی کی بات نہیں۔ میرے خیال میں تم ایک ایچھے آدمی ہو۔“ اس نے وارلے کا ہاتھ دبا دیا۔ ”اپنی حفاظت کرنا۔ کل تک میں اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”وہ آدمی جس نے اپنا نام ولیم اشاک بتایا تھا“ اسٹیٹ ایجنٹ کے دفتر سے نکلا تو اس کے ہاتھوں میں ایسے مکانوں کی فہرست تھی جو اس علاقے میں برائے فروخت موجود تھے۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ مکانوں ہی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی جس کے پار سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ”یہ منظر نظر آئے۔“ اس نے آئرن سے سوال کیا۔

آئرن جواب دیے بغیر کار سے اتری اور دوڑتی ہوئی پہاڑی کے کنارے پہنچ گئی۔ دونوں ہاتھ پشت پر جما کر وہ منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔

”آگے مت جانا۔“ اشاک نے تنبیہ کی۔
 ”بڑی اچھی جگہ ہے مگر دو قدم آگے بڑھے اور موت
 کے منہ میں پہنچے۔“ وہ سب کنارے پر کھڑے ہو کر
 چاروں طرف دیکھنے لگے۔ سمندری ہوا اور سورج کی
 شعاعیں ان کے چہروں کو چوم رہی تھیں پھر آرن کی
 نظر ہائی وے کے قریب ہی کھڑی ایک کافی دکان پر
 پڑی۔ وہاں ایک رہائشی زیر تعمیر عمارت کا ڈھانچہ کھڑا
 تھا۔ آس پاس ٹی بیس بنی ہوئی تھیں۔
 ”اس وقت ہمیں یہیٹنا گرما گرم کافی کی
 ضرورت ہے۔“ آرن نے کہا۔

اشاک یہ سن کر پلٹا تھا مگر وارلے نے اسے
 نہیں جانے دیا۔ بعد میں وہ خود ہی کافی کے تین کپ
 لانے کے لیے نیچے اترنے لگا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا
 تھا کہ وہ اس خطرناک صورت حال سے بچنے کے
 لیے کیا طریقہ اختیار کرے۔ سیدھی بات تو یہ تھی کہ وہ
 اس معاملے میں پولیس سے مدد لیتا۔ اگر یہ جعلی
 اشاک اتنا ہی خطرناک آدمی تھا جتنا کہ آرن نے
 بتایا تھا تو اسے سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے تھا۔ مگر
 پولیس کو وہ کیا بتا سکتا تھا۔ ابھی انہوں نے کسی جرم کا
 ارتکاب نہیں کیا تھا۔ انہیں گرفتار کرنے کی کوئی وجہ
 نہیں تھی لیکن اگر امریکن کو یہ شک بھی ہو جاتا کہ
 وارلے اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہے تو نہ
 جانے وہ کیا کر بیٹھے۔

گتے کی ٹرے پر کافی کے بھرے تین کپ
 رکھے واپس آتے وقت اس نے یہی فیصلہ کیا کہ کل
 تک کسی نہ کسی طرح دوستانہ رویہ اختیار کیے رہے اور
 پھر انہیں بڑے خلوص سے رخصت کر دے۔ ان کے
 جانے کے بعد وہ پولیس کو ان کے تعاقب میں لگا سکتا
 تھا۔

پہاڑی پگڈنڈی پر چڑھتے وقت وہ ایک ٹیلے
 کے عقب میں آ گیا۔ جہاں سے ذرا دیر کے لیے
 چوٹی پر کھڑے دونوں مہمان نظروں سے غائب
 ہو گئے۔ اچانک اس نے آرن کی چیخ سنی وہ تیزی
 سے ٹیلے کی اوٹ سے نکل آیا۔ اوپر آرن اور اشاک

آپس میں لکھتے ہوئے تھے۔ وہ کنارے کے بہت
 قریب تھے۔ اشاک آرن کا ہاتھ پکڑے گھسیٹ رہا
 تھا۔ وہ اشاک سے بری طرح الجھی ہوئی تھی اور
 ساتھ ہی بڑی تیزی سے لاتیں بھی چلا رہی تھی۔ کسی
 جنگجو عورت کی طرح لڑ رہی تھی پھر اس نے اشاک
 سے اپنے ایک ہاتھ چھڑا لیا اور پوری قوت سے اس
 کے سر پر ہاتھ مارا ایک ہاتھ میں اس نے ایک بڑا پتھر
 پکڑ رکھا تھا۔ اشاک کے سر سے خون کا فوارہ پھوٹ
 نکلا۔ اس کے گھٹنے زمین سے ٹکے اور وہ گھاس پر
 لڑھک گیا۔ وارلے دوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔

”کیا تم نے اسے بتا دیا تھا؟“
 ”نہیں اسے شک ہو گیا تھا پھر وہ مجھے مارنے
 لگا۔“ آرن نے اپنے بازو پر سرخ نشانات
 دکھائے۔ ”اور آخر مجھے اسے سب کچھ بتانا ہی پڑا۔“
 وارلے اشاک کے زخمی سر کو دیکھنے کے لیے
 اس پر جھک گیا۔ وہ کراہ رہا تھا اور کسی قدر بیہوشی کے
 عالم میں تھا۔ ”تم نے تو اسے مار دیا ہوتا۔“
 ”مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔“ وہ بولی۔ ”اس نے
 کہا تھا کہ جیسے ہی تم کافی لے کر آؤ گے وہ تمہیں نیچے
 سمندر میں پھینک دے گا۔“ وارلے چونک کر اس کی
 طرف دیکھنے لگا۔ آرن اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 دونوں کی نظریں ملیں۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ
 پاگل ہے۔“

اشاک نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ ”اب ہم
 کیا کریں گے۔“ وارلے نے سرگوشی میں آرن سے
 کہا۔
 ”ہمیں اسے ختم کر دینا چاہیے۔“ وہ غیر
 جذباتی لہجے میں بولی۔
 ”نہیں ایسا مت سوچو۔“

”جب وہ ہوش میں آئے گا تو غصے سے پاگل
 ہو جائے گا پھر ہم اسے قابو نہیں کر سکیں گے۔ اگر ہم
 بھاگ بھی گئے تو وہ کھرا جائے گا۔ اگر تم نے پولیس کو
 خبر کر دی تو وہ چھپ جائے گا اور یوں تم مستقل
 خطرے میں رہو گے۔ یقین کرو میں اسے اچھی طرح

عدم تحفظ

ایک خاتون اپنے بچے کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں۔ بچے سے بہت سے سوالات کرنے کے بعد

ماہر نفسیات نے کہا: ”بچے کی تحلیل نفسی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بچہ لاشعوری طور پر عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہے۔“

خاتون نے پریشان ہو کر کہا: ”لیکن میں تو اسے اس لیے آپ کے پاس لائی تھی کہ اس کی وجہ سے پورا حملہ ہی عدم تحفظ کا شکار ہے۔“

☆.....☆

☆

جانتی ہوں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے۔“ وار لے نے پوچھا۔
”اسے یہاں سے نیچے لڑھکا دو فوراً۔ ہم کہہ دیں گے کہ اس کا پیر پھسل گیا تھا اور سر کا زخم نیچے گرنے کی وجہ سمجھا جاسکتا ہے۔“
”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وار لے فیصلہ کن انداز میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

آئرن نے جبکہ کراسٹاک کا بازو پکڑا اور اسے تھینے لگی۔ وہ حیرت انگیز حد تک طاقت ور عورت تھی۔ ”میری بات اچھی طرح سن لو۔“ وہ غرائی۔ ”یہ اسی قابل ہے کہ مر جائے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ اسے مار کر تم صرف انصاف کا تقاضا پورا کرو گے۔“

اسٹاک کا خون آلود سر پر اٹھا ہوا تھا۔ اس کی

آنکھیں چڑھ گئی تھیں، منہ کھلا ہوا تھا۔ بڑا خوف ناک منظر تھا۔ اچانک وار لے کا جی چاہا کہ یہ سب کچھ دیکھ کر ہوا جائے۔ اس نے جبکہ کر دوسرا بازو پکڑا اور دونوں نے اسٹاک کے جسم کو اٹھا کر کنارے پر پہنچا دیا۔ پھر انہوں نے اس کے جسم کو عودی چٹان سے لڑھکا دیا۔ اگلے لمحے اسٹاک سینکڑوں فٹ گہرائی میں جا گر تھا۔ پھر پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ گھاس پر سے خون کے دھبے مٹا دیے اور دوسرا کام یہی تھا کہ وہ کار میں بیٹھ کر نزدیک ترین پولیس اسٹیشن گئے اور حادثے کی رپورٹ درج کرا دی۔ سورج غروب ہونے تک ولیم اسٹاک کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ لاش پولیس اٹھا لے گئی۔ کارٹروار لے آئرن کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

آئرن نے ریڈیو آن کر دیا۔ ریڈیو سے کمرشل میوزک کا پروگرام آ رہا تھا مگر یہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ وار لے نے ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔

”کیا بات ہے۔“ آئرن تیزی سے بولا۔

”خاموش رہو۔“ وار لے بولا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ سب کچھ گڑبڑ تھا۔ اسٹاک کے تمام کاغذات درست تھے۔ شناختی کارڈ کے اندراجات کے اعتبار سے وہ واقعی چیلنو کا گالا ولیم اسٹاک تھا۔ وہ بولا۔ ”ڈرائیونگ لائسنس، سوشل سیکورٹی کارڈ اور دیگر کاغذات سب کے مطابق وہ اسٹاک ہی تھا۔ اگر وہ اصلی اسٹاک نہیں تھا اور یہ شخص ایک فریب تھا تو پھر اس نے اتنی دوسری کیوں مول لی تھی۔“

”یہ کوئی معرہ نہیں وار لے۔ یہ تمام دوسری اس نے اسی لیے مول لی تھی کہ وہ واقعی ولیم اسٹاک تھا۔ اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا تھا سچ تھا۔ جھوٹ تو میں نے تم سے بولا تھا۔“ اس کا لہجہ بڑا زہریلا تھا۔

کارٹروار لے کے تخلیقی ذہن نے اسے حیرت پر قابو پانے میں بڑی مدد دی۔ اس نے گزشتہ رات ڈرنیل پر خطرہ بڑھتا محسوس کیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ

الشاک ایک دم سے کیوں کھو گیا تھا۔ خطرے کی گھنٹی آئرن کی طرف سے بجی تھی۔ جسے وار لے اس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔
”تم نے ایسا کیوں کیا۔“ اس نے سادگی سے

پوچھا۔

”اس لیے کہ اس نے میری زندگی جنم بتادی تھی۔ وہ مجھے مسلسل ماہرین نفسیات کے پاس سنانے کے لیے لے کر جاتا تھا اور اب اس نے مجھے کسی دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں ڈن کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زندگی کی رعنائیوں اور گہما گہما سے دور! وہ زبان ہونٹوں پر پھیرتی ہوئی بولی۔ ”یہ کوئی آسان بات نہیں کہ مہذب آدمی کو اس طرح ہلاک کر دیا جائے۔“

”گو یا تم نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔“
”ہم دونوں نے قتل کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اسے مت بھولو۔ میں حکام کو ایسی کہانی سناسکتی ہوں جو ہم دونوں ہی کو ایک لیے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دے گی۔ مگر میرے خیال میں اس کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم غفلند آدمی ہو۔“

وار لے غصے میں کھول کر رہ گیا۔ اسے اس عورت سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ وار لے تو اب یہ بھی بھول چکا تھا کہ عورت کے ساتھ بستر میں لیٹنے کا لطف کیا ہوتا ہے۔ مگر قتل کا تازہ واقعہ اس کے جسم کو برف کی سل بنا چکا تھا۔ اس خطرناک عورت نے جس طرح اپنے شوہر کو ٹھکانے لگایا تھا وہ منظر اس کی نگاہ کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے آئرن کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ بہر حال وہ بڑی حسین عورت تھی اور ایک اچھی رفیق ثابت ہو سکتی تھی۔ بستر کی رفیق۔

لیکن دو دن بعد ہی جب ایک اسٹور کا منیجر ایک مل لے کر اس کے پاس آیا تو وار لے سوچ میں پڑ گیا۔

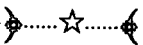
”آپ کو زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔“
”مشر وار لے وہ امریکی خاتون جو میرے

خیال میں آپ لے ہاں نہیں ہے، کچھ زائد چند ہیں لے آئی تھی جن کے پیسے دنا شاید وہ بھول گئی تھی۔ بہت تھوڑی سی رقم ہے۔ میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔“
وار لے نے بقیہ رقم ادا کی اور سوچنے لگا۔ اس کا سینہ بھول چپک رہا تھا۔ پھر وہ اپنی اس ڈیسک پر بیٹھ گیا جس پر وہ کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی سے باہر کے منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ذہن سوچ کے سمندر میں غرق تھا۔ خوب صورت موسم ختم ہو گیا تھا۔ جسم کو چھید ڈالنے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔

ہاں اسے آئرن سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ ایک سادہ سا گھریلو حادثہ ہی بہتر ہوگا۔ مگر بیجاری بیٹرس کی طرح، غسل کے دوران میں گرنے اور ڈوب جانے والا طریقہ اب مناسب نہیں رہے گا۔ اس پار ٹوٹی اور جی طریقہ ہونا چاہیے۔ ان چکرانی سیڑھیوں سے گر کر گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ اگر کوئی ان کاموں کا عادی نہ ہو تو یہ سیڑھیاں اس کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور آئرن بغیر دستک دیے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ وار لے کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے گھڑکی کی طرف دیکھا۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔
”تم یہاں تنہا بیٹھے کیا کر رہے ہو۔“ آئرن نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان اور آسودگی تھی۔

کارٹر وار لے نے قلم اٹھایا اور اپنے سامنے پڑے مسودے پر دو چار الفاظ لکھے۔ ”اوہ! میں نیا پلاٹ بنانا تھا۔“ وہ بولا۔
آئرن وہسکی کا یہ دوسرا گلاس پی رہی تھی۔ شاید اسی لیے وہ وار لے کے لہجے میں پوشیدہ خطرے کی گھنٹی کی آواز نہ سن سکی۔



خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ میں تو بس کچھ عرصے دور رہنا چاہتی تھی۔ میرا انداز غلط تھا۔ یہ رشتے اتنے نازک نہیں تھے کہ ٹوٹ جاتے۔ میں نے چچا سے کہہ دیا کہ میں واپس جا رہی ہو جو کام درہ گیا ہے وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔

اس اشارے کی ایک حساس ددل گداز تھی کہانی

پھر اس ہستی کی آواز سنائی دی، جس نے اٹھارہ برس مجھے متا اور پیار دیا تھا۔ وہ میری ماں تھیں۔ ”پروین ہمارا خون نہیں ہے نجم! اور تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان میں کسی ایسی لڑکی کو جگہ نہیں دی جاسکتی تھی جو.....“

”لیکن امی وہ دونوں بچپن سے اکٹھے رہے ہیں اور اب فرحان بہ ضد ہے کہ پروین ہی سے شادی کرے گا۔ تایا ابو سے کہہ دیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ سوچ لیں۔“ بھیا بڑے سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”ہم مجبور ہیں بیٹے! بڑے بھیا خاندانی اصولوں کے سخت پابند ہیں اور وہ اس راز سے آگاہ بھی ہیں۔“ ابو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

میں اس سے زیادہ سن نہ سکی اور لرزتے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے اپنی کم مائیگی اور محرومیوں پر آنسو نہیں بہائے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا کہ اس خاندان کو مسائل اور الجھنوں کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔ میں ان کا بھرم قائم رکھوں گی کہ انہوں نے اٹھارہ برس ایک بے سہارا بچی کو اپنی ہی

دھچکا ہی ایسا تھا میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو فرش پر گر جاتی۔ میرے وجود پر لپچی طاری تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ میری پور پور سے جیسے لہو ٹپک رہا تھا۔ میرا اعتماد کچی کچی ہو کر بھر گیا لیکن میں نے بڑی جرأت اور حوصلے کے ساتھ وہ باتیں سنی تھیں جنہوں نے میری حقیقت مجھ پر کھول دی تھی میں اپنے مقابل کھڑی خود سے سوال کر رہی تھی تم کون ہو؟

دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کچھ حقیر نہ تھی کہ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے وہ اپنی باتوں میں مگن تھے اور ان کی باتیں تیر بن کر میرے سینے میں پیوست ہو رہی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ میں اسی حویلی میں ہوں۔ یہ لوگ جن سے چند لمحے قبل میرا خونی رشتہ تھا۔ میرے والدین، بہن بھائی اور بھائی بھینس لیکن اب ان سے میرا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ اتنی بڑی حقیقت جاننے کے باوجود میں چیختی چلائی نہ تھی۔ میں نے ضبط اور تحمل کے ساتھ خود پر قابو پالیا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

مٹی جانا۔ اس کی پرورش کی، اسے متا، پیارا اور شفقت
دی۔

تمام رات میں سوچتی رہی کہ کون ہوں؟
میرے والدین کون تھے؟ میں کس کا خون ہوں؟ کیا
میرا کوئی بھی نہیں؟ ان لوگوں سے تو اب کوئی رشتہ نہیں

رہا تھا۔ اٹھارہ برس انہوں نے میرا راز چھپایا تھا۔ یہ
شاید آج بھی زبان نہ کھولتے اگر فرحان اپنی ماں
سے کہہ کر میرے رشتے کے طالب نہ ہوتے۔ فرحان
میرے تایا کے بیٹے اور میرے بچپن کے ساتھی ہیں
چند دنوں سے گھر کے کبھی افراد پریشان تھے لیکن مجھے
کچھ خبر نہ تھی۔ بھابھی اور نسرین بچپانے بھی مجھے کچھ
نہیں بتایا تھا۔ بھابھی چپ چپ تھے۔ میں سمجھتی تھی
کہ نسرین بچپانے کے پردیس جانے کی بنا پر کبھی اداس
ہیں۔ بچپانے دلہا بھائی کے پاس لندن جا رہی تھیں میں
چھٹی کا دن گزار کر پھر لاہور آ گئی تھی اور یہاں میری
طبیعت بے چین رہی، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کالج
سے واپس ہو کر آئی تو کسی کل چین نہ تھا۔ میں اپنی
روم میٹ سے کہہ کر اچانک واپس آ گئی۔ راستے میں
بس خراب ہونے کی وجہ سے عشاء کے بعد پہنچی۔

حویلی کے گیٹ سے گزر کر میں اپنے کمرے میں آئی
بیک رکھا اور اسی سے ملنے ان کے کمرے کی جانب
جاری تھی کہ بڑے کمرے سے باتوں کی آوازیں
سنائی دیں اور اپنا نام سن کر میرے قدم رک گئے۔
انہیں معلوم نہ تھا کہ میں واپس آ گئی ہوں۔

فرحان میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ ہم اسی
حویلی میں کھیتے کودتے شعور تک پہنچے تھے۔ ان سے
مجھے محبت بھی تھی لیکن میں نے کبھی اس انداز میں نہیں
سوچا تھا۔ ابھی ابتدائی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ تایا ابو
اپنے نئے مکان میں چلے گئے تھے جو انہوں نے قصبے
کی نئی آبادی میں بنوایا تھا فرحان بھی آتے بھی تو
اب ہم پہلے کی طرح نہیں ملتے تھے۔ فرحان نے
میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں بھی لاہور میں تھی اور
ہوسٹل میں رہتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے کالج یا ہوسٹل میں
ملنے نہ آئے۔ چھٹیوں میں حویلی ہی میں ملاقات
ہوتی۔ کبھی انہوں نے مجھ سے کوئی ایسی بات بھی نہ کی
تھی۔ میں تصوراتی محلوں میں رہنے والی لڑکیوں میں
سے نہ تھی اور نہ ہی میری تربیت اس انداز میں ہوئی
تھی۔ فرحان کی شادی کی بات چلی تو انہوں نے اپنی
پسند کا اظہار کر دیا۔ ہمارا بچپن کا ساتھ تھا اور بزرگ



اس سے بے خبر نہ تھے۔ پھر میرے والدین یا گھر کے کسی فرد نے مجھے غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ امی نے بھی یہ نہ کہا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ بھیا میری ہر خواہش پوری کرتے۔ بچیا اور بھابھی مجھ سے پیار کرتیں۔ تایا ابو اور تائی امی شفقت سے پیش آتیں۔ گو میں ناز و نعم میں پلی لیکن امی کی تربیت کا انداز مفرد تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ انسان کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ حالات بدلنے کے ساتھ وقت کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ امی نے مجھے ایسی تعلیم اور تربیت دی تھی کہ مجھ میں ہر دکھ سہنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے چٹانوں سے ٹکرانے کی جرات بخشی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھن اور دکھ کسی لمحے بھی جنم لے سکتے ہیں اس لیے جرات و حوصلے کے ساتھ جینا سیکھو، صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا سامنا کرو کہ جذباتی عوامل بہتر نتائج نہیں رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی حقیقت جاننے کے بعد میں نے اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔ آنسو نہیں بہائے تھے۔ حوصلہ نہیں ہارا تھا اور عزم و ہمت کے ساتھ جینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ اس عظیم عورت کی تعلیم و تربیت ہی کا اثر تھا کہ رشتے صرف خون ہی کے نہیں ہوتے۔ ان کی کہی ہوئی ایک بات آج مجھ پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ یقیناً ان کی نگاہیں مستقبل پر تھیں۔ اسی دن کے لیے تو انہوں نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ میں خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے ابو کی تھر تھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”پروین ہمارے خاندان کی بہو نہیں بن سکتی کہ اس کا اس خاندان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ پروین ہمیں فسادات کے دوران میں ایک کھیت کے اندر اس حالت میں ملی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی لاش کے بازوؤں میں پھنسی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ان دونوں میں اس علاقے کا تھانا انجارج تھا۔ فضلو بابا نے بڑھ کر اسے اٹھالیا اور پھر تہارٹی مال کی گود میں دے کر ان سے کہا کہ آپ کی بچی چند روز مل وفات

پاگئی تھی۔ قدرت نے اتنی ہی عمر کی معصوم بچی دے دی۔ اسے ہی پروین سمجھے۔ نجم اور سرین ان دونوں ننھیال میں تھے۔ پروین کی وفات کی خبر کسی کو ابھی نہیں دی گئی تھی بھیا اسی روز ہمارے ہاں آئے تھے جب ہم اس چھ ماہ کی بچی کو لائے تھے جس کا نام ہم نے پروین ہی رکھا تھا۔“

ابو نے کچھ دیر بعد مزید کہا ”میں یہ راز کبھی ظاہر نہ کرتا لیکن فرحان نے جب والدین سے پروین کے رشتے کے لیے کہا اور مجھے بھی آج اس حقیقت کو تمہارے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور نہ ہم یہ بھلا چکے تھے کہ یہ ہماری پروین نہیں ہے۔“ اس سے قبل کیا باتیں ہوئی تھیں مجھے علم نہ تھا میں فیصلہ کر چکی تھی کہ ان کے لیے ابھن نہیں بنوں گی۔ رات گئے مجھے نیند آئی۔ صبح آٹھ بجے تو سورج نکل آیا تھا اور امی میرے بستر کے قریب بیٹھی تھیں میں نادان تھی۔

انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”فضلو بابا نے بتایا کہ تم رات عشاء کے بعد آئی تھیں۔ شاید تمہاری طبیعت خراب تھی آتے ہی سو گئیں۔ مگر شاید تم سنوئیں سکیں ٹھیک طرح۔“ میں نگاہیں جھکا کر بیٹھی تھی۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آئے میں میرا سراور اٹھایا اور چہرے پر نگاہیں جما کر بولیں۔

”زندگی کی حقیقتیں امنٹ ہوتی ہیں۔ بیٹی! تم اگر خود آگہی کے چکر میں پڑ گئیں تو کیسے جی سکوگی۔ میں نے اسی دن کے لیے تمہیں تربیت دی تھی۔ میری تربیت کو نہ بھلاؤ بیٹی!“

پھر وہ میرے کمرے سے چلی گئیں۔ میں سوچتی رہ گئی کہ یہ خاتون جو میری ماں ہیں، کتنی بڑی نفسیات داں اور قیافہ شناس ہیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا اور یہ ہر بات سمجھ گئیں۔ انہوں نے سچ ہی تو کہا تھا کہ زندگی کی حقیقتیں امنٹ ہوتی ہیں اور ان ہی حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تو انہوں نے مجھے اس سچ اور ان خطوط پر بھلا دی تھی۔ میں بستر سے اٹھی

قربان کر دیتے ہیں۔

فرحان ہانسی ہو گیا ہے۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ اگر پروین ہمارے خاندان کا خون نہیں تو اسے اس سے غرض نہیں کہ اس کے خاندان کا خون اپیشل کو اپنی نہیں رکھتا۔ ہم پریشان ہیں بھیا نے اہل فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ خاندانی اصولوں سے انحراف نہیں کریں گے۔

میں ایک عزم کے ساتھ اٹھی اور بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں امی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں اس خاندان کی آن قائم رکھوں گی جس خاندان نے مجھے والدین اور بہن بھائیوں کی محبت دی ہے۔ آپ سے صرف ایک التجا ہے کہ مجھے فرحان سے ملنے کی اجازت دے دیں۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلی.....“

”پروین بیٹی!“ امی نے مضطرب لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

”اس انداز میں نہ سوچو بیٹی! ہم تمہیں اپنی بیٹی ہی کی طرح اس گھر سے رخصت کریں گے۔ رہی فرحان سے ملنے کی بات تو تم اس سے کیا کہو گی؟ اور پھر تم جانتی ہو کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے! تمہارے ابو اجازت نہیں دیں گے۔“

”میرا ان سے ملنا بہت اہم ہے امی! ابو اور تایا ابو کے درمیان نفرت کی دیوار بھی اٹھ سکتی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ.....“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو پروین! تمہارے ابو اپنے بھائی سے تعلق توڑ سکتے ہیں لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

وہ اب بھی اپنے شوہر کو میرے ابو کہہ رہی تھیں جنہوں نے مجھے باپ کی شفقت دی تھی میرے ناز اٹھائے تھے۔ وہ میری ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے گھر سواری اور نشانہ بازی کی تربیت دی تھی۔ ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی تربیت دی تھی۔

اللہ منہ ہاتھ دھو کر بڑے کمرے میں آئی تو وہاں صرف امی بیٹھی تھیں۔ گھر کے دیگر افراد ناشتا کر چکے تھے۔ ملازمہ برتن اٹھا کر لے گئی تو امی نے پوچھا کہ میں اتنی جلدی کیسے آگئی؟ میں نے بہانہ کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے چلی آئی اور راتے میں بلخ خراب ہونے کی وجہ سے دیر ہوئی۔ میں نے کسی کو نہ بتایا، صرف سر بھاری تھا اب ٹھیک ہوں۔

امی مسکرائیں پھر بولیں ”ذہن پر زور نہ ڈالو۔ ابھی ہم زندہ ہیں تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔“

ان کی باتیں ذوق نہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے جھوٹ بولا ہے اور تسلی بھی دی کہ مجھے چویشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ میری ماں ہیں۔ بھابھی اور نسرین بچا کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ابو اور بھیا بھی گھر میں نہ تھے۔ صرف امی تھیں میں خاموش بیٹھی تھی۔ امی بھی خاموش تھیں جیسے سوچ رہی ہوں۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔

پھر امی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا ”بیٹی! تم نے رات ہماری باتیں سنی ہوں گی۔ ظاہر ہے پھر تم کیسے سو سکتی تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کسی بات کا علم ہو۔ میں نے تم تینوں میں سمجھ فرق روا نہیں کیا۔ ہم چند دلوں سے پریشان ہیں۔ تم پرسوں آئی تھیں تو تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی، تم نے اگر کوئی سوال نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے کہ تم بے خبر نہیں رہیں۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بھائی جان جو خود تم سے پیار کرتے ہیں۔ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایسا رویہ اظہار کریں گے۔“ امی کی آواز تھر تھرائی اور وہ ٹھہر کر گویا ہوئیں۔

”ہم نے جس بچی کو اپنی ہی بچی کی طرح پرورش کیا، اس کے لیے آج بھی ہماری متنا پیار اللہ شفقت میں کوئی فرق یا کمی نہیں آئی لیکن خاندانی اصولوں کے سامنے ہم بے بس ہیں۔ یہ لوگ اپنی آہن اور برادری کی ریشم نبھاتے ہیں تو ان کے دل پتھر ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اپنی اولاد کو بھی ان رسوں پر

بلالائیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔

وہ یہ سن کر حیران ہوئے اور بولے۔

”بیٹی! اس عمر میں مجھے ذلیل کو نہ کرو صاحب کو معلوم ہو گیا تو مجھے.....“

وہ کسی طرح نہیں مان رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس خاندان کی آبرورقربان ہو جاؤں گی مگر حرف نہیں آنے دوں گی۔ میرا فرمان سے ملنا ضروری ہے اور یہ وقت بحث کا نہیں۔ اگر وہ جانے کے لیے تیار نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔

وہ میرا عزم دیکھ کر نرم پڑ گئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ فرمان اپنے گھر میں نہیں بلکہ ٹیوب ویل پر ہوں گے۔ میں نے بابا سے گھوڑا تیار کرنے کو کہا اور اپنے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کیا۔

پھر جب میں گیٹ کے قریب پہنچی تو بابا ابو کے گھوڑے کی لگام میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے۔

”بیٹی! جلدی واپس آ جانا۔ گھر کے کسی فرد کو بھی علم ہو گیا تو میری عزت خراب ہو جائے گی۔“ میں نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے انہیں تسلی دی اور حویلی سے کافی دور آ کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ پھر اسے ایڑ لگائی۔

ٹیوب ویل قصبے سے دو میل دور تھا اور یہاں دو کمروں پر مشتمل ایک کوارٹر تھا جس میں بتایا ابو کا ایک ملازم رہتا تھا۔ فرمان گھر والوں سے ناراض ہو کر اس کوارٹر میں چلے آئے تھے۔ میں نے کوارٹر سے باہر گھوڑے کی لگام بھیج دی اور پھر کوڈر کوارٹر کی جانب بڑھی تو فرمان کوارٹر سے باہر ایک درخت تلے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب بڑھے میں حیران تھی کہ انہیں کس نے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ وہ میرے انتظار میں تھے۔

انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”یہاں کس لیے آئی ہو؟ تمہیں.....“

”مجھے یہ امید تھی کہ آپ مجھے اس طرح رسوا کریں گے!“ میں نے بھی سپاٹ لہجے میں

حویلی کے بزرگوں کے سوا پہلے کے علم تھا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں جب ان کی بیٹی پروین کی ولادت ہوئی تھی تو بھیا اور نسرین بچیا اپنے ننھیال میں تھے۔

انہوں نے تو اپنی نوزائیدہ بہن کو دیکھا بھی نہ تھا۔ حالات بڑے دگرگوں تھے۔ جب قدرت نے مجھے ان کی گود میں ڈالا تو میں چھ ماہ کی تھی۔ اب بھی بات صرف حویلی کے کمینوں کے درمیان تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں ان کی بیٹی تو تھی لیکن مجھے بیٹی کے وہ حقوق حاصل نہ تھے جو اس خاندان کی بہو بننے کا شرف دے سکتے۔ امی نے مجھے بڑی تسلیاں دی تھیں لیکن میں جو کچھ سوچ چکی تھی مجھے اسی پر عمل کرنا تھا۔ ہر چند کہ فرمان سے ملاقات ان حالات میں ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی اور ماں ہی نے ایک بار کہا تھا کہ کم زور قوت ارادی کے انسان ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ جب کوئی انجمن یا مسئلہ درپیش ہو تو فکر مند ہونے کی بجائے اس پر ٹھنڈے دل و دماغ اور عمل کے ساتھ غور کرو اور جب کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ تو اس پر عمل کرو نتائج کو خدا پر چھوڑ دو میں نے بھی یہ کیا۔

رات کو عشاء کی نماز کے بعد جب سب سونے کے لیے چلے گئے تو میں بھی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ نسرین بچیا جلد سو جانے کی عادی تھیں۔ میں نے کمرے کی جتنی بچھا دی تھی۔ چند لمحوں کے بعد میں اپنے کمرے سے نکلی اور فضلہ بابا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ان کا کمرہ حویلی کے گیٹ کے قریب تھا اور وہ عشاء کے بعد حویلی کا ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور پوچھا کہ ”خیریت تو ہے؟“

میں نے اپنے بارے میں ان سے بہت سے سوالات کیے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے یہ باور کرانا چاہا کہ یہی میرے حقیقی والدین ہیں مگر جب میں نے ان سے کہا کہ میں حقیقت جان گئی ہوں تو اقرار کر لیا کہ میں نے جو کچھ سنا درست ہے۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ فرمان کو

کس حسوس لرتے ہوئے میں نے سجدہ سے سر اٹھایا تو دیکھا امی میرے قریب بیٹھی ہیں۔
 ”سو جاؤ بیٹی! خدا بہتر کرے گا۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 میں نے سکھ کا سانس لیا کہ انہیں خبر نہیں ہوئی لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔

دوسرے روز امی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا۔ ”تم فرحان سے ملنے گئی تھیں؟“
 میں ہلکا سا ”ہاں“ کہہ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”میں ان سے کیسے مل سکتی ہوں۔“

امی نے میرے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”جس جرات کے ساتھ تم نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اسی جرات کے ساتھ پیچ ہٹو!“
 میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولیں ”فرحان نے اپنی ضد چھوڑ دی ہے اور ماں سے کہا ہے کہ اسے ان کا ہر فیصلہ منظور ہے، لیکن اسے اپنی تعلیم سے فارغ ہونے دیں وہ واپس لاہور چلا گیا ہے۔ لیکن.....“ وہ لمحہ بھر توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

”اچانک یہ تبدیلی بے معنی نہیں ہے۔ سبھی حیران ہیں۔ مگر مجھے کوئی حیرت نہیں کہ میں نے رات تمہیں حویلی سے نکلتے دیکھا تھا۔ تم میری آواز پر نہ رکتیں تو“ انہوں نے ٹھہر کر پھر کہا۔
 ”بیٹی! مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن تمہیں میں نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہم ممنون ہیں کہ تم نے ہمیں اس پریشانی سے نجات دلائی۔ مگر کتنی بڑی قربانی دے کر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں اس گھر سے اسی طرح رخصت کریں گے جس طرح نسرین کو کیا تھا۔“

واقعی سب حیران تھے کہ فرحان جو ایک چٹان کی طرح اپنے مطالبے پر ڈٹے ہوئے تھے اور انہوں نے بزرگوں کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔ اتنی جلدی کس طرح بدل گئے! بھابھی اور نسرین بچا کی خوش فہمی یہ تھی کہ تانی امی نے کسی عامل سے تعویذ

لکھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو میں بولی۔
 ”آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کا فعل ہے لیکن میری ایک بات غور سے سن لیجئے فرحان کہ میں آپ سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ اگر بزرگ آپ کی ضد کے سامنے جھک بھی گئے تو آپ اس گھر سے میری میت تو اٹھا سکتے ہیں ڈولی نہیں۔“
 وہ کم صم سے کھڑے تھے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں اس انداز میں بات کروں گی۔

میں نے رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا ”آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس خاندان کا خون نہیں، نعم البدل ہوں۔ میرا کوئی حسب نسب نہیں۔ میں اپنے محسنوں پر جان تو نثار کر سکتی ہوں لیکن انکی آن اور روایات کو نہیں توڑ سکتی۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا فرحان علی! یا میری موت.....“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں میری بات کاٹ کر پوچھا۔
 ایک لمحے کے لیے میں ڈرگئی لیکن پھر سنبھل کر بولی۔

”یہ میرا اہل فیصلہ ہے اور میں اسی یقین و اعتماد کے ساتھ آئی ہوں کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں گے۔“

”تو اب یہاں سے دفع ہو جاؤ! وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ ورنہ رسم و رواج میرے لیے بے معنی ہیں۔“ وہ بڑے غصیلے لہجے میں بولے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ!“
 میں حویلی پہنچی تو فضلہ بابا کی جان میں جان آئی، میں بھی سارے راستے خدا سے یہ دعا مانگتی آئی تھی کہ خدا یا میری لاج رکھنا۔ میں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ دو بھائیوں کے مابین کسی غلط فہمی کو بھی جنم دے سکتا تھا اور میں بھی بدنام ہو سکتی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں سجدے میں گر گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ مجھے جھوٹے دے اور ثابت قدم رکھے۔ مجھے وقت کا احساس نہ تھا۔ اچانک اپنی پشت پر کسی کے ہاتھ کا

کر دیا ہے۔ بھیا کو فرحان پر سخت غصہ تھا۔ ابو چپ تھے۔ امی کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

میں لاہور واپس آ گئی تھی۔ دو ہفتے کے بعد میں گھر آئی تو گھر والوں کا رویہ تو وہی تھا مگر ملازموں کی نگاہوں میں سوال تھے جیسے سوال کر رہے ہوں۔ کیا میں اس گھر کی بیٹی نہیں؟ بھیا بھی نے انہیں بتا دیا تھا بھیا سخت پرہم تھے۔ انہوں نے مجھے بھی میرے کمرے میں گھیر لیا۔

”میں سمجھا تھا کہ فرحان بزدل ہے جو رسمیں ان زنجیروں کو توڑنے کا عزم کر کے بھی ہٹا گیا لیکن یہ کیا دھڑاتہ ہارا ہے“ تم نے خود اپنا حق کھو دیا بھیا! تم نے ہم پر بھروسہ نہ کیا ہمیں نہ آزمایا۔“ ان کی آواز بھرا رہی تھی۔

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور بھیا کے سینے سے لگ کر سکنے لگی۔ اس کے سوا کرنی بھی کیا۔

وہ پیار بھرے لہجے میں بولے۔ ”محبت کے ریتے اتنے نازک نہیں ہوتے پھر تم دونوں بچپن کے ساتھی ہو۔ تم نے دلوں کے رشتے کیسے توڑ دیئے۔“ اسی لمحے بھیا بھی کمرے میں داخل ہوئی اور بھیا سے کہا کہ انہیں امی ملارہی ہیں۔ بھیا کے جانے کے بعد وہ مجھ سے بولیں۔

”پرہیز! میری بات ذہن میں رکھنا کہ منہ بولے رشتے معتبر نہیں ہوتے۔ تم اب نجم سے اس طرح نہ ملا کرو۔“ نجم میرے بھیا۔ یعنی ان کے شوہر کا نام تھا۔

”بھیا بھی!“ میں نے احتجاج کیا۔ ”وہ میرے بھیا ہیں۔ آپ کو مجھ پر اعتماد ہونا چاہیے! ہمارے دل آئینہ ہیں۔ پھر برسوں کا حقیقی رشتہ محلوں میں نہیں بدل سکتا۔“

”میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے پرہیز آگے تمہاری مرضی!“ وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔ میرے لیوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آ گئی۔ میں حقیقی بچی تھی۔ میرے رشتے بدل گئے تھے۔ میں اب غیر رسمی۔ نسرین باجی کو ایئر پورٹ پر خدا حافظ کہنے کے

بعد میں سیدھی ہوٹل آ گئی تھی۔ نسرین باجی نے مجھے تسلیاں دی تھیں۔ بھیا بھی کے رویے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں محتاط رہوں اور جب بھی مجھے ان کی ضرورت پڑے تو انہیں لکھ دوں۔

میں ایک ماہ تک گھر نہ گئی تو امی خود لاہور آ گئیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن خالہ بشری کے یہاں ٹھہری تھیں۔ فضلو بابا کو بھیج کر مجھے بلایا اور جب میں خالہ بشری کے ہاں پہنچی تو امی سخت ناراض ہوئیں کہ میں گھر کیوں نہ آئی؟ میں نے انہیں اپنا نہ سمجھا کیوں نہ کسی چیز کے بارے میں لکھا؟ کیا میرا ان سے کوئی بندھن نہیں رہا؟

میں نے مجبور ہو کر ان سے بھیا بھی کے بارے میں کہہ دیا اور معذرت چاہی کہ اسی بنا پر میں نہ آ سکی۔ کہ نہیں کوئی ایسی ابت نہ ہو جس سے میرا کر دار متاثر ہو۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

”بھئی! مجھے ہر بات کا احساس ہے۔ اب تم ہوٹل میں نہیں رہوں گی۔ میں ہر ماہ تمہیں اخراجات بھیج دیا کروں گی۔ تم بشری کے ہاں آ جاؤ۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو گئی ہے۔ چھوٹی میٹرک میں ہے۔ میں اور تمہارے ابو بھی تم سے یہیں آ کر مل لیا کریں گے۔ جب بھی تمہارا دل چاہے تم ہمیں پیغام بھیج دینا۔ میں خود آ کر تمہیں سامنے لے جاؤں گی میں خود بھی نہیں چاہتی کہ تمہاری آبرو پر حرف آئے۔ بہو نے اپنا رویہ کیوں اختیار کیا۔ میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی۔“

”امی! آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنا ابو جہاں خود۔۔۔۔۔۔“

”بھئی!“ امی مضطرب لہجے میں بولیں۔ ”ہمیں ہماری نگاہوں میں اتنا نہ گراؤ۔“ ان کی آواز میں سک اور تڑپ تھی۔

وہ مجھے تسلیاں دے کر چلی گئیں۔ وہ بھی مجبور تھیں میں نے خود کو سمجھایا کہ ان رشتوں کے سہارے

تب ہی امتحان سے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ آنی
فصلو بابا بہت خوش تھے۔ وہ تو اکثر مجھ سے ملنے آتا
آتے رہتے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد امی نے مجھ سے کہا کہ
میرے لیے اتنی تعلیم ہی کافی ہے۔ وہ میرے فرض
سے سبک دوش ہونا چاہتی ہیں، میرے لیے ایک
اچھے گھرانے کا رشتہ آیا تھا۔ بھابھی کے بڑے بھیا
کے دوست تھے۔ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔
بھابھی، امی کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئی تھیں،
وہ لوگ بھی آئے تھے۔ بھابھی نے ان کی شرافت اور
اخلاق کی بڑی تعریف کی تھی۔ امی کو بھی یہ رشتہ پسند
آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ چاہتی ہیں مجھے
بہن کی طرح رخصت کریں۔ انہیں میری خوشحال عزیز
تھیں۔ ان کے بس میں جو کچھ تھا وہ کرنا چاہتی تھیں،
میری رخصتی کے بعد ہی فرحان کی کہیں نسبت طے کی
جانا تھی۔

میں ان سے کیا کہتی وہ لوگ اپنا فرض جو کہ ان
پر عائد نہیں ہوتا تھا پورا کرنا چاہتے تھے اور پھر نسرین
بجائے بھی بی اے تک ہی تعلیم پائی تھی میں بھی ان پر
کب تک بوجھ بنی رہتی۔
اس رات کو بڑے کمرے میں سبھی بیٹھے تھے۔
امی ہی نے بات شروع کی اور ابو خاموشی سے سنتے
رہے۔

امی جب اپنی رائے دے چکی تو بھیا بولے۔
”امی! ہمیں اپنے طور پر بھی ان لوگوں کے بارے
میں تحقیق کر لینا چاہیے تاکہ پروین کے ساتھ کوئی
نافضانی نہ ہو۔“

اس پر بھابھی اور امی نے کہا کہ انہیں ان لوگوں
پر یقین ہے پھر یہ کہ بھابھی نے خود ان کا خاندان
دیکھا تھا۔ اچھے رشتے، مشکل سے ملتے ہیں۔

ابو نے فیصلہ دے دیا کہ انہیں اطلاع دے دی
جائے کہ اگر شادی کا دن طے کر جائیں وہ جلد از جلد
اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔

بھابھی نے دوسرے روز ہی انہیں پیغام بھجوادیا،

کب تک جیوں گی؟ یہ رشتے؟ یہ تاتے، معتبر تو
تھیں۔ میرا اب کوئی بھی نہیں۔ نہ کوئی گاؤں، نہ کوئی
رشتہ دار۔ مجھے اپنی راہیں خود تلاش کرنا ہوں گی۔
بھابھی نے میری راہوں میں جو دیوار کھڑی کر دی تھی
اسے گرانا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا جو میرے
مقدمہ بن تھے میں تو ایک جیلہ معترضہ تھی۔ بھابھی
چاہنے کیوں اچانک بدل گئی تھیں، انہوں نے کچھ بھی
نہ سوچا کہ بھیا کتنے غلط، محبت اور باکردار ہیں۔
بھابھی ان سے بہت قریب تھیں، ان کی جیون ساسی
تھیں پھر بھی انہیں بھیا پر اعتماد نہ تھا۔ بھیا نے کتنے
یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ میں کچھ محسوس نہ
کروں۔ وہ میرے بھائی ہیں۔ پھر بھابھی نے کیوں
مجھے ان مشفق ہستیوں سے دور کرنا چاہا جب کہ چار
برس سے وہ مجھے دیکھ رہی تھیں اور میرے کردار پر
انہیں اعتماد تھا۔ میری حقیقت کھلتے ہی ان کی نظریں
بدل گئیں۔

میں نے بی اے فاضل کا امتحان دیا تو بشری
خالہ نے مجھ سے کہا کہ میں گاؤں جانا چاہوں تو وہ
میرے ہمراہ جانے کو تیار ہیں۔ مگر میں ان سے
محذرت کر لی۔ میں ملازمت کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی
یقین امی سے اجازت ضروری تھی کہ وہ آخر وہ میری
مال تھیں۔ دو روز بعد ہی بھیا اور بھابھی مجھے لینے
آ گئے۔ بھیا خفا تھے کہ میں نے گاؤں کا رخ نہ کیا۔
بھابھی نے جی گلہ کیا تو میں حیران ہوئی۔ بھابھی نے
کہا کہ میں منے کی پیدائش پر ہی آئی تھی پھر کیوں نہ
آئی؟

میں نے امتحان کی تیاری کا کہا نہ کیا۔ چھ سال
بعد قدرت نے بھابھی کی گود پر ہی کی تھی اور میں
صرف ایک روز کے لیے حویلی گئی تھی۔ وہ ناراض
ہوئیں کہ مجھ منے سے پیار نہیں اور پھر اصرار کر کے
مجھے ساتھ لے گئیں۔

حویلی میں پہنچی تو امی نے بڑھ کر سینے سے
لگالیا۔ ابو نے دعائیں دیں اور میں سسک بڑی۔ امی
نے بھی گلے کیا کہ میں اب اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی

ان کے گھر سے ایک خاتون اور ان کے ہمراہ ان کی ملازمہ ہی آئی تھی۔ باتیں ہوئیں اور شادی کا دن مقرر کر دیا گیا۔

اس خاندان میں یہ شاید پہلی شادی ہوگی جس میں رسموں کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ بھیا خفا تھے مگر امی نے انہیں سمجھایا کہ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔

ایک ماہ کے بعد میں اس گھر سے رخصت ہو رہی تھی جس میں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں جوانی ہوئی تھی۔ نسرین بچا بہت یاد آتی تھیں۔ امی نے واقعی مجھے بٹی کی طرح رخصت کیا تھا جب میں باہر کھڑی کار میں سوار کرائی جا رہی تھی تو پیچھے سے بھابھی کی آواز سنائی دی۔

”ہم نے بن ماں باپ کی اس بچی کو بھی اپنی نسرین کی طرح ہر چیز دی ہے۔“

میں مسکرا دی۔ بھابھی کا دل صاف نہ تھا۔ وہ میرا بھرم رکھ لیتیں تو ان کا کیا جاتا انہوں نے سب مہمانوں کو بتا دیا تھا کہ میں اس خاندان کی بیٹی نہیں ہوں۔ حالانکہ یہ بات تو ایسی سے واضح تھی کہ میں اس خاندان کی بہو نہیں بنی تھی۔ کسی غیر خاندان میں جا رہی تھی۔ میں نے خود سے کہا۔ حوصلہ رکھو پروین۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ سرال کی دہلیز پر تمہارا استقبال کیسا ہوتا ہے۔ یہ ابھی دیکھنا ہے کہ یہ بندھن بھابھی ہی نے باندھا ہے۔ نہ جانے ان کے ترکش میں ابھی اور کتنے تیر ہوں۔

میرے اندیشے غلط نہ تھے۔ میں جب سرال پہنچی تو دو ننھے ننھے بچوں نے ان الفاظ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

”امی آگئیں..... امی آگئیں“

میری ساس نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں بہو۔ ان معصوم بچوں کو متا بھری گود کی ضرورت تھی اور تم بھی بن ماں باپ کی بچی ہو۔ تم انہیں ضرور پیار اور ممتا دو گی کہ تم نے خود عمر ویوں کا یہ دور دیکھا ہے۔“

میں سوچ رہی تھی کہ یہ تھا بھابی کا بندھن

انتخاب مجھے غیریت کے احساس کے ساتھ تو رخصت کیا ہی تھا، میری آغوش میں دو معصوم بچے بھی دے دیئے تھے۔ انہوں نے میری سرال والوں کو بتا دیا تھا کہ میں لے پا لک ہوں۔ دہن کے حسین سینے تو سرال کی دہلیز پر ہی بکھر گئے تھے اور مجھے ان رخ حقائق سے سمجھنا کرنا تھا۔ جنہیں میں جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ میں ہر چیلنج قبول کرنے کا حوصلہ لے کر آئی تھی۔ میں آنسو بہا کر یا فریدی بن کر ان زنجیروں کو نہیں کاٹ سکتی تھی۔ جو بھابھی نے مجھے پہنائی تھی۔ مجھے ان حالات سے نباہ کرنا تھا۔ میرے والدین کو خبر نہ تھی کہ بھابھی نے انہیں اندھیرے میں رکھا ہوگا۔ ان کے ترکش میں بڑے تیر تھے اور مجھے صرف حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا تھا۔ میں نے تو ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کوئی دکھ نہیں دیا تھا۔

پھر دولہا میاں سے بڑی شان دار ملاقات ہوئی۔ وہ جب جملہ عروسی میں تشریف لائے تو آتے ہی بغیر کسی تمہید کے بولے۔

”تو تم اپنے گھر والوں پر بوجھ تھیں۔ یا انہیں بہتر رشتہ نہیں مل رہا تھا یا یوں سمجھوں کہ وہ تم سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔“

میں سر جھکائے بیٹھی تھی اور ان کی باتوں پر حیران ہی تھی۔

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔

”اب تم اس گھر کی بہو بن کر آئی گئی ہو تو سنو میرے معصوم بچوں کی پرورش تعلیم تربیت اور میرے والدین کی خدمت کے فرائض میں کوتاہی نہیں کرنا ہوگی۔ مجھے شادی کا کوئی شوق نہ تھا کہ مجھے اپنی مرحومہ بیوی سے بے پناہ محبت سے اور اس کی وفات کے بعد کسی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ میرے والدین کی خواہش تھی جسے میں نے پورا کر دیا۔“

ایک ایک لفظ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے یوں مخاطب تھے جیسے اپنی کسی ملازمہ کو ہدایات دے رہے ہوں۔

”میں میرے کسی نعل پر نکتہ چینی کا حق نہیں
میں تمہاری جانب سے یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ تم
اپنے فرائض نبھادگی۔“

میں نے نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا وہ واقعی
اپنی تصویر کی طرح تھے جو بھابھی نے مجھے دکھائی تھی۔
بڑبڑ اور سنجیدہ لیکن ان کی باتوں سے میں کوئی نتیجہ
نہیں کر سکتی تھی۔

وہ سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے بوٹ کی ٹوہ
سے مسلتے ہوئے بولے۔

”امید ہے کہ تم بہتر طور پر سوچو گی۔ اب
سو جاؤ!“ اور وہ گھوم کر کمرے سے نکل گئے۔

میں نہ اپنی تقدیر پر آنسو بہا سکی نہ ان سے کچھ
کہہ سکی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا شب عروسی ایسی
ہوتی ہے؟ آنسوؤں پر مجھے اختیار نہ رہا تو میں نے سر
ہٹے پر رکھ دیا۔ مجھے نہ تقدیر سے گلہ تھا نہ اپنوں سے
تکلیف تھی جب یہی مقصوم تھا تو پھر کیا کرنی؟ کہاں
جانی رہیں تو کھو گئی تھیں۔ رسموں کی زنجیریں ہی توڑنا
تھیں تو پھر اپنی بچپن کی محبت کو کھو کر انہیں پہنچتی
کیوں! جب یہی حقیقت تھی تو پھر اس سے انحراف
کر کے رسوائی کے سوا کیا ملا۔ اب یہ بندھن تو نبھانا
ہی تھا۔

میں نے اپنے فرائض سنبھال لیے تھے۔ کہ اس
گھر کی پرائے نام بہو تھی۔ میں تو آیا اور نوکرانی بن
گرا آئی تھی۔ میں نے ہالات کو قبول کر لیا تھا۔ ان
بچوں کا کیا قصور تھا کہ میں انہیں ہدف انتقام بنانی۔
بڑبڑ برس کیسے گزرا۔ میں ہی جانتی ہوں شوہر کی
بے اعتنائی۔ ساس کی مظلومیت باتیں محلے کی خواتین کے
تھریلے تبصرے سن سن کر بھی میں نے زبان نہ کھولی
گھاس سے کیا مل جاتا میں اپنے فرائض نبھاتی رہی۔

امی کے پیغام آئے لیکن میں ان سے ملنے نہ
گلا۔ میں نے تو وہ رشتے ہی بھلا دیئے تھے۔ امی خود
تھا میں نہ بھیا بھابھی آئے کیوں؟ میں جانتی تھی کہ
مجھ سے ان سے کیا کہا ہوگا۔ ادھر ساس نے مجھ پر
گڑی پابندیاں لگا دی تھیں میں محلے یا رشتے داروں

میں سے کسی خاتون یا لڑکی سے علیحدگی میں کوئی بات
نہ کر سکتی تھی۔ شوہر کا رویہ ایسا تھا جیسے گھر کی ملازمہ
کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ عشاء کے بعد ہی گھر
آتے اور صبح ناشتا کرنے کے بعد چلے جاتے۔ ان
سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈیڑھ سال میں ایک دو
بار صرف اتنا کہا کہ میں نے ان باتوں پر عمل کر کے
دیکھا ہی دیا جو انہوں نے کہی تھیں۔

پھر جب فضلہ بابا ابو کی بیماری کی خبر لے کر آئے
تو میرے شوہر نے مجھ سے کہا۔ ”جاؤ تیار ہو جاؤ!
احسان فراموش نہ ہو آخر انہوں نے تمہیں والدین کا
پیار اور شفقت دی ہے۔“

ساس ساتھ جانے کے لیے مصر ہوئیں مگر
میرے شوہر نے انہیں منع کر دیا۔

جب میں فضلہ بابا کے ساتھ بیرونی دروازے کی
جانب بڑھی تو ہمارے ساتھ ہی وہ باہر تک آئے اور
مجھ سے کہا۔

”جلدی آنے کی سعی کرنا۔ بچوں کو کون
سنبھالے گا کہ تم سے مانوس ہو گئے ہیں۔“

میں جب حویلی پہنچی تو بے اختیار میری
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ان آنسوؤں کو
پہنچے دیا۔ فضلہ بابا نے مجھ سے سارے راستے کوئی
بات نہیں کی تھی۔ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا
تھا۔ اتنا کہا تھا کہ گھر تو چلو۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ امی پر پڑی
جو برآمدے میں کھڑی تھیں۔ میں بڑھ کر ان کے
سینے سے لگ گئی۔ انہوں نے مجھے بھینچ لیا اور پھر مجھے
ساتھ لیے اندرونی حصے کی جانب بڑھیں۔ ہم بڑے
کمرے میں آئے تو یہاں بھابھی ابو اور بھیا بیٹھے
تھے۔ ابو نے اٹھ کر مجھے پیار کیا۔ بھابھی اٹھیں لگیں تو
بھیانے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں حیران
تھی کہ ماجرا کیا ہے؟ مجھے ابو کی بیماری کی اطلاع ملی
تھی اور ابو بہ فضل تعالیٰ تندرست تھے۔ صرف ان کے
چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

میں امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تو بھیانے سپاٹ

لجے میں کہا۔
 ”تم نے ہمیں غیر سمجھا پروین کہ برسوں کے
 بعد صحن توڑ دیئے اور ہمیں کچھ نہ بتایا۔“
 میں چپ تھی کہ ابو نے ٹھہرے ہوئے انداز
 میں کہا۔

”ہمیں افسوس ہے بیٹی کہ ہم نے بہن پر
 بھروسہ کیا اور ان لوگوں کے بارے میں کوئی تحقیق نہ
 کی۔ ہم نے تمہیں خوشیاں دینے کی بجائے دکھوں
 کے جہنم میں دھکیل دیا۔“

پھر بھابھ بولے۔ ”تم نے ایک بار بھی آنے کی
 دعوت گوارا نہ کی۔ کیا تم نے ہمیں اس قابل نہ سمجھا کہ
 ہم اس نا انصافی کا کوئی حل سوچ سکتے اور اب ہم نے
 تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ تم وہاں نہیں جاؤ گی
 اور.....“

”نہیں بھیا نہیں“ میں نے مضطرب انداز میں
 کہا۔

”کوئی فیصلہ نہ کیجئے..... میں اپنے گھر میں
 خوش ہوں، یہی بات انہوں نے چھپائی تھی کہ ان کے
 وہ محسوس نئے ہیں۔ بھابھی بے تصور ہیں۔ انہیں بھی
 شاید دھوکے میں رکھا گیا تھا“ ورنہ وہ میرا رشتہ
 بھالے لے نہ کرتیں۔“

”اور دولہا بھائی ٹی ٹی کے مریض ہیں۔ یہ
 پلٹ بھی جھوٹ ہے کہ تم اس گھر کی بہو نہیں بلکہ آیا اور
 نگہ رانی ہو“ بھیا نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہمیں دکھ اس
 پلٹ کا ہے کہ ہماری شریک زندگی نے تمہیں اس جہنم
 میں دھکیلے ہوئے خوف خدا نہ کیا۔“

”آپ سے کس نے کہا بھیا کہ وہ ٹی ٹی کے
 مریض ہیں؟ میں بھابھی کو الزام نہیں دیتی؟“
 ”تو تم زندگی بھر سکتے رہنے کا فیصلہ کر چکی ہو
 بیٹی اور ہمیں بھی یہ سزا بھگتنا ہوگی۔“ ابو نے دکھ بھرے
 لہجے میں کہا۔

کمرے میں چند لمحوں کے لیے سکوت چھا
 گیا۔ پھر بھابھی نے مجھ سے کہا۔
 ”مجھے معاف کر دو پروین! میں سچ کہتی ہوں

کہ مجھے ان باتوں کا علم نہ تھا۔ ورنہ تم سے میری گولا
 دشمنی تو نہ مچی۔ تم اب وہاں نہیں جاؤ گی۔ میں خود ان
 سے.....“
 ”نہیں بھابھی!“ میں نے ان کی بات کاٹتے
 ہوئے کہا۔

”آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ یہی نوشتہ تقدیر
 ہے۔“
 ”پروین! تم اب کچھ نہیں کہو گی! یہ ہمارا حکم
 ہے۔“ ابو نے مجھے خاموش کر دیا۔

پھر ابو اور بھابھ اٹھ کر چلے گئے۔ امی نے کوئی
 بات نہیں کی تھی۔ بھابھی نے امی کو یقین دلایا کہ
 انہیں کچھ خبر نہ مچی۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں کہ بھیا ان
 سے سخت خفا ہیں اور انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے
 کہ میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ حالات ایسی
 صورت اختیار کر گئے تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ
 میری وجہ سے اس خاندان میں الجھنیں جنم لیں۔
 بھابھی امی کے حقیقی بھائی کی بیٹی تھیں اور یہ میری ر
 شتہ تھا۔ بہن بھائی میں نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی
 اور خاندان کا سکون غارت ہو جاتا۔ میں نے امی
 سے التجا کی کہ وہ بھیا کو سمجھائیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔
 اب میرا وہی گھر ہے اگر بات بڑھ گئی تو ایک جانب
 بھابھی کے والدین سے تعلق ختم ہو جائے گا دوسری
 جانب بھابھی کے والدین سے تعلق ختم ہو جائے گا
 دوسری جانب میری سرال سے جھگڑا ہوگا۔ میں نہیں
 چاہتی کہ ایسے حالات پیدا ہوں۔

امی نے مجھے بتایا کہ وہ کن مسائل میں الجھ گئی
 ہیں! ادھر خاندان میں کوئی لڑکی ایسی نہیں جس سے
 فرحان کی شادی ہو وہ کسی ان پڑھ لڑکی سے شادی کر
 نے کو تیار نہیں۔ نسرین کے خطوط بتاتے ہیں کہ وہ بھی
 سکھی نہیں میرا دکھ بھی کم نہیں اور ان حالات میں مجھے
 بہت اہم فیصلے کرنا ہیں اور بڑی جرات و استقلال
 کے ساتھ حالات کی ان گتھیوں کو سلجھانا ہے۔ بہتر
 ہے کہ تم ابھی کوئی بات نہ کرو کہ تمہارے ابو اور بھیا
 سخت برہم ہیں۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ

میں کوئی ہسپتال نہ کر سکا۔ اور پھر تم نے بھی حالات سے غیر متوقع طور پر سمجھوتا کر لیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہے اور پھر گویا ہوئے۔

”شادی کے دو مہینے بعد اچانک میں لاہور آیا اور ڈاکٹر فرحان سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میرے گھرے مراسم تو نہ تھے لیکن ہم اکثر ملتے رہتے تھے۔ میرے سینے میں درد تھا۔ میں ان سے اسی لیے ملنے آیا تھا۔ انہوں نے جب میرا ایکسرے لیا تو مجھے کسی اسپیشلسٹ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اور انہی کے ذریعے میں نے اپنا فیصلی معائنہ کروایا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ مجھے ٹی بی ہے۔“

وہ چند لمحے پھر رک کر سانس درست کرنے لگے۔ میں نے انہیں باتیں کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔

”میرا مرض لاعلاج نہ تھا۔ لیکن میں نے اپنے معالج سے تعاون نہ کیا اور پہلے سے زیادہ سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ دو ماہ قبل ڈاکٹر فرحان نے میرا پھر معائنہ کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں سینٹی ٹوریم میں داخل ہو جاؤں، مگر میں نے کوئی پروا نہ کی۔ اب میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ میں نے وصیت تیار کروادی ہے۔ تم آزاد ہو پروین، لیکن.....“ ان پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ کچھ دیکھ کھانسنے کے بعد وہ رک رک کر بولے۔

”میری درخواست اور التجا ہے کہ ان بچوں کو خود سے جدا نہ کرنا کہ دادی انہیں پیار نہیں دے سکے گی اور میرے والد نے امی سے اس مقصد کے لیے شادی کی گھی کہ وہ ان کی دولت پر قابض ہو سکیں۔ جائیداد کے مالک بنیں لیکن میری امی نے تمام جائیداد میرے نام ہی کر دی تھی۔ میں اس وقت دس سال کا تھا۔ میرے چچا کو نگران مقرر کیا گیا تھا۔“

ان کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ وہ سستانے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

”تم میری نصف جائیداد کی حق دار ہو اور نصف میں نے دونوں بچوں کے نام کر دی ہے۔ امی

لٹ کر میرے کارخ نہ کرنے کے سبب میرے والدین نے اپنے طور پر تمام معلومات حاصل کی تھیں اس کے بعد ہی مجھے وہاں سے بلوایا تھا۔

پھر اچانک مجھے شوہر کی بیماری کی اطلاع ملی۔ فیض لاہور لے آیا گیا تھا۔ میں بھیما کے ساتھ ہسپتال پہنچی تو میرے سر اور بچے باہر لان میں بیٹھے تھے۔ سانس کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ بھیما ڈاکٹر سے ملنے چلے گئے، تھوڑی دیر بعد انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ میرے شوہر کی حالت بگڑ چکی ہے۔ انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور صرف ایک آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری سانس کو گھرنے بیچ دیں۔ میں یہاں رہوں گی، بھیما خاموشی سے چلے گئے۔

تین دن رات آنکھوں میں کٹ گئے تھے۔ میری سانس بھی سخت بیمار تھیں۔ وہ واپس چلی گئیں اور میں ان کے کمرے میں رہ گئی۔

رات گئے انہیں ہوش آیا تو میں ان کے بستر کے قریب آئی۔ سسٹر باہر چلی گئی۔ انہوں نے میری جانب دیکھا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی نجف آواز میں بولے۔

”میں نادم ہوں پروین کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا لیکن میں بے تصور ہوں میں شادی پر رضامند نہ تھا۔ یہ امی کی ضد تھی کہ وہ بچوں کے لیے ماں لائیں گی۔ میں نے یہ شرط رکھی تھی کہ میں کسی بے سہارا اور بیوہ عورت سے شادی کروں گا۔ تمہاری بھابی نے جب رشتہ طے کیا تو مجھے کچھ نہ بتایا۔ امی بھی چپ رہیں۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکے اور پھر ٹھہر کر بولے۔ ”تمہیں بیاہ کر لایا تو میری کزن نے مجھے حقیقت بتادی اور مجھے دکھ ہوا۔ اسی بنا پر میں نے تم سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ تم مجھ سے نفرت کرو اور میں مناسب موقع دیکھ کر تم سے علیحدگی اختیار کر لوں، لیکن چھ ہی دنوں میں بچے تم سے اتنے مانوس ہو گئے کہ

کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں نے کوئی شرط عامہ نہیں کی۔ صرف تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ میرے بچے.....“ ان کا سانس اکھڑ گیا۔

وہ بے در پے خون تھوکنے لگے۔ میں ٹپ کر اٹھی، سسٹر کو آواز دی۔ اس نے آ کر دیکھا تو پلٹ کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ وہ کافی خون تھوکنے کے بعد بے دم سے ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی سسٹر دو ڈاکٹروں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ان میں سے ایک فرحان تھے۔ انہوں نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”سسز فخر! آپ باہر تشریف لے جائیں۔“

میں دروازے کی جانب بڑھی۔ ایک لمحہ رکی تو میری چیخ نکل گئی۔ دوسرے ڈاکٹر نے آخری کلمات ہوا کر کے میرے شوہر کا جسم سفید چادر سے ڈھاپ دیا تھا۔ فرحان سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شوہر کی وفات کے بعد ساس بھی چند روز بیمار رہ کر چل بسیں۔ ان پر دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

میرے چچا سسر نے مرحوم شوہر کی وصیت کے مطابق عمل کیا تھا اور میرے سر خود ہی اپنے پرانے مکان میں چلے گئے تھے۔ چند ماہ میں وہیں رہی اور پھر چچا سسر کو زمین اور جائیداد کا ٹکراں مقرر کر کے بچوں کے ہمراہ لاہور آ گئی۔ امی نے فضلہ بابا کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا تھا۔ فضلہ بابا نے ہی لاہور میں سکونت کا انتظام کیا تھا۔ انہی دنوں نسرین باجی بھی اپس آئیں۔ امی مجھے بتا گئی تھیں کہ فرحان کے والد اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ فرحان کی شادی مجھ سے کر دی جائے اور ابو بھی یہی چاہتے ہیں۔ خاندان میں فرحان کے معیار کی کوئی لڑکی نہ مل سکی تھی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ لوگ خاندانی اصولوں کا کتنا پرچار کرتے ہیں۔ پہلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ اب صاحب جائیداد بھی تو خاندانی اصولوں میں لچک پیدا ہو گئی تھی۔ نسرین باجی کی آمد کے بعد میں ان سے ملنے لگی تو بھی پریشان تھے۔

میں حیران مئی کہ بجیا کی آمد کی خوشی ہی بجائے پھریشانی کیسی! اور پھر بھابھی ہی نے بتایا کہ نسرین بجا کو طلاق ہو گئی ہے۔ شوہر سے نہ نہیں ہو سکا تھا اس نے طلاق نامہ ہاتھ میں دے کر وطن بھجوا دیا تھا۔ یہ خبر بکلی بن کر مجھ پر گری اور میں گم سم سی رہ گئی۔

اسی روز تانی امی اور تایا ابو ملنے آئے تو بڑے کمرے میں بزرگوں کا اجلاس ہوا جس میں بھابھی نسرین بجا اور مجھے شریک نہیں کیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے تک اجلاس جاری رہا اور پھر تانی امی اور تایا ابو واپس چلے گئے تو امی نے بھابھی کو بلایا اور ان سے باتیں کیں۔ مجھے کچھ علم نہ تھا بھابھی چپ تھے۔

دوسرے روز جب میں واپس آ رہی تھی، امی نے اتنا کہا کہ فرحان کے والد نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے میں نے کوئی سوال نہ کیا اور لاہور واپس آ گئی۔ تین دن نہیں گزرے تھے کہ نسرین بجا گھبراہٹ ہوئی آئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تایا ابو نے فرحان کے لیے انہیں منتخب کیا ہے۔ فرحان تھے سے اکھڑ گئے ہیں۔ تایا ابو نے انہیں عاق کرنے کی دھمکی دے دی ہے اور فرحان نے گھر چھوڑ دینے کی امی سخت پریشان تھیں اور تایا ابو کو سمجھانے کی سعی کر رہی تھی۔

نسرین باجی نے مجھ سے کہا کہ میں فرحان سے شادی کر لوں۔ ایک تو عمروں میں فرق ہے۔ دوسرے وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ گھر والوں نے خود ہی یہ فیصلہ کیا تھا اور اب اپنا فیصلہ بدل دیا تھا۔ انہوں نے مجھے تنبیہ کی کہ میں کوئی بات نہ کروں۔ بھیا اور ابو تایا ابو کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنا فیصلہ نہ بدلیں۔

نسرین بجا تو واپس چلی گئیں لیکن میں ابھن میں پڑ گئی۔ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو خود فیصلے کرتے اور خود ہی ان پر عمل نہ کرتے۔ ان کی روایات، رسمیں اور اصول ایسے ہی تھے۔ فرحان کے والد کو اب خیال آیا تھا کہ خاندان کی ایک لڑکی مطلقہ ہو گئی ہے اور اس کے معیار کا کوئی لڑکا بھی قریبی

رشتہ داروں میں نہیں تو بیٹے کو قربانی کا بکرا بنا دینا چاہیے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا لیکن میرے لیے لیکن یہ بھی کہ فرحان ایک بار پھر اکڑ گئے تھے اور اسے میری رسوائی کا امکان تھا۔

بجیا کے شوہر نے انہیں اس بنا طلاق دے دی تھی کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور وہ ان کے معیار کا ساتھ بھی نہیں دے سکی تھیں۔ معیار کے بنانے میری سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ میں نسرین بجیا کے دکھوں کو سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ میں دخل نہ دوں مگر مجھے ایک بار پھر فرحان سے ملنا تھا۔

میں نے فرحان کو اسپتال فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ رخصت پر ہیں۔ میں فضلو بابا کے ہمراہ گاؤں پہنچی۔ اپنی حویلی میں جانے کی بجائے میں فرحان کے کھر ہی گئی۔ وہاں امی ابو بھیجا۔ فرحان کے والدین اور فرحان خود موجود تھے۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو امی نے پوچھا ”خیریت تو ہے پروین“ وہ ہمبر لگتی تھیں۔ میں ان سے مخاطب ہوئی۔ ”معذرت چاہتی ہوں امی کہ میں آج ڈاکٹر فرحان سے کچھ کہنے آئی ہوں۔“ پھر میں نے فرحان سے کہا۔

”ڈاکٹر فرحان! میں نے جب ایک بار آپ سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آپ سے نفرت ہے تو پھر آپ کیوں مجھے رسوا کر رہے ہیں۔ میں آج آپ سے آخری بار یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے رسوا کرنے کی سعی نہ کریں۔ میں ایک بیوہ ہوں اور دو معصوم بچوں کی خاطر میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ایسی حرکت نہ کریں۔“ میں اتنا کہہ کر کمرے سے نکل پڑی۔ امی نے مجھے آواز بھی دی لیکن میں ٹھہری نہیں۔ فضلو بابا کے ساتھ واپس آ گئی۔

میں نے سب کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے تھے۔ میں بڑی جرات کے ساتھ ان کی موجودگی میں فرحان سے مخاطب ہوئی تھی اور مجھے خود بھی اپنی جرات پر حیرت تھی۔ میں نے بھی ابو کے

سامنے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

اسی روز شام کو امی اور بھیا آ گئے اور امی مجھ پر سخت ناراض ہوئیں کہ میں کیوں وہاں گئی؟ وہ لوگ تو تاپا یا ابو کو سمجھانے اور کوئی فیصلہ کرنے جمع ہوئے تھے۔ اور تاپا یا ابو کو قائل کرنے کے لیے ابو نے آخر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نسرین بجیا کے لیے فرحان کا رشتہ منظور کرنے سے انکار کر دیں گے لیکن میں نے بنا بنا یا کھیل بگاڑ دیا۔

بھیا نے مجھے بے تیز اور بے لگام کے خطابات سے نوازا حالانکہ انہوں نے پہلے بھی مجھے اس انداز میں کچھ نہیں کہا تھا۔

میں نے ان سے ایک ہی بات کہی کہ میں فرحان سے شادی نہیں کر سکتی۔ کہ یہ میری آن کا بھی سوال ہے جب میں پہلے ان کے خاندان کی بہو نہیں بن سکتی تھی تو آج میرے خون نہیں بدل گیا۔ میں وہی پروین ہوں۔

امی میرے جواب پر گم صم رہ گئیں اور بھیا پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ امی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں ٹھہرانا چاہا تو انہوں نے خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہے بغیر بھیا کے پیچھے چلی گئیں۔ بھیا اپنی کار میں بیٹھے امی ہی کے منتظر تھے۔

پھر دو روز کے بعد نسرین بجیا اور بھیا بھی آئیں۔ بھائی نے بتایا کہ فرحان نے شادی کرنے ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں کسی لڑکی سے بھی بیاہ نہیں کرنا۔ ساری زندگی خدمت خلق میں گزار دیں گے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کسی مزار کی مجاوری کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”مذاق کی بات نہیں پروین۔ وہ سب سے تعلق توڑ آئے ہیں اور تاپا یا ابو سخت غصے میں ہیں۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ میں باپ بیٹے میں ٹھن نہ جائے اور تاپا یا ابو کوئی.....“

”چھوڑو بھائی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ

آئیں۔“

انہوں نے کچھ کہے بغیر ریسور رکھ دیا تو میں مایوس ہو گئی۔ مگر مجھے ان کی خاموشی نے یقین دلادیا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے اور دوسرے روز دوپہر سے قبل وہ آ گئے۔

وہ جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو میں احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر سر دلچے میں بولے۔

”اب کیا کہنا ہے بیگم فخر؟“

میں خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے ہی دلچے میں بولے۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہے تو پھر کس لیے بلایا ہے؟“ ان کے دلچے کی کک آواز کے سوز اور دل کے انداز نے مجھے تڑپا دیا۔ لیکن میں پروین تھی۔ وہ پروین جس نے خود ہی اپنے پر کاٹ دیئے تھے پرواز کی تمنا کھودی تھی۔ محبت کو قربان کر دیا تھا۔ جس میں پر بتوں سے ٹکرائے کا حوصلہ تھا۔ اس کا چرچا نہیں کیا تھا۔ میں مٹ گئی تھی لیکن محبت نہیں مٹی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تشریف تو رکھیے ڈاکٹر فرحان!“ وہ بیٹھ گئے تو میں نے بھی ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے سپاٹ دلچے میں پوچھا۔

”آپ کو پروین سے محبت ہے فرحان؟“ ”یہ تم پوچھ رہی ہو!“ وہ حیران نگاہوں سے مجھ کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”میں آپ سے رسوائی کی نہیں ایثار کی خواہاں ہوں۔ کیا آپ اپنی چاہت کے لیے کچھ نثار کر سکتے ہیں؟“

”میں نے اپنی جائیداد سے بھی محروم ہونا گوارا کر لیا ہے اور۔۔۔“

”بس ڈاکٹر فرحان!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر یہ قربانی نہیں۔ بغاوت ہے رسوائی ہے لوگ تو بہت کچھ نثار کر دیتے ہیں۔ میں تو

مطمئن رہیں فرحان شادی کریں گے۔“ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

”تم اب کیا کرو گی پروین؟ جب کہ تم نے سب کے سامنے اس سے کہہ دیا ہے کہ ہمیں اس سے نفرت ہے اور پھر پلنگی تم اس سے کیسے نفرت کر سکتی ہو۔ یہ بچپن کا ساتھ ہے۔ میری ماں تو تم فرحان سے شادی کر لو تاپا ابو دیکھتے رہ جائیں گے۔“ نسرین باجی نے کہا۔

میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں بھی اپنا فیصلہ بدل دوں گی تو یہ غلط ہے بچیا! میں فرحان کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دوں گی۔“ نسرین بچیا مصرعیں کہ میں ضد چھوڑ دوں۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں فرحان کی ضد ختم کر دوں گی۔ نسرین بچیا نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ فرحان سے شادی نہیں کریں گی، خواہ انہیں بزرگوں کے سامنے انکار کرنا پڑے۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں گی۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہ بات نہ کہیں اور عمروں کے فرق کو بھلا دیں۔ میں ان کے لیے کوئی ایثار نہیں کر رہی۔ میں تو ان بچوں کا مستقبل سنوارنا چاہتی ہوں کہ ان کے مرحوم باپ نے مجھ سے یہ ایثار کیا تھی۔ بھابھی نے کوئی بات نہ کی۔ نسرین باجی بھی مجھے قائل نہ کر سکیں۔ بھابھی کے رویے پر مجھے حیرت تھی۔

وہ رات کو بشریٰ خالہ کے ہاں رہیں اور دوسرے روز واپس چلی گئیں۔

میں نے فون اٹھایا۔ اسپتال کے نمبر ڈائل کیے تو ایک لمحے کے لیے میں خود گھبرا گئی کہ اگر فرحان نے یلت کرنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟ مگر میں نے ہمت کر کے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ فرحان فون چماتے تو میں نے انہیں گھر آنے کو کہا۔

وہ بولے ”اب کیا رہ گیا ہے بیگم فخر!“ ان کے طنز یہ انداز کو میں نے محسوس نہ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ”مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ آپ چند لمحوں کے لیے تشریف لے

آپ سے کچھ اور چاہتی ہوں۔“

”آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیجئے میں..... میں“ میری آواز بیٹھ گئی۔ وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے چلے گئے۔

میں نے صوفے کی پشت سے سرٹیک دیا۔ اسی لمحے باہر اسکول کی بس کا ہارن بجا اور پھر بچے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور میں نے آنسو پونچھ کر انہیں آغوش میں سمیٹ لیا۔

چند روز بعد ہی فرحان اور نسرین بچیا کا نکاح بڑی سادگی کے ساتھ بڑھا دیا گیا۔ صرف چند قریبی رشتے دار مدعو تھے میں خود اس شادی میں شرکت نہ کر سکی۔ مجھے امی کا پیغام مل گیا تھا کہ فرحان نے یہ شرط رکھی ہے کہ پروین سے اب ہمارا کوئی رشتہ نہیں اور ہمارے خاندان کا کوئی فرد اس سے نہیں ملے گا۔ میں نے لاہور سے باہر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بچوں کی تعلیم کی بنا پر میں فی الحال انہیں ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ میں نے گھر کا تمام انتظام فضلہ بابا کے سپرد کر دیا تھا اور صرف انہی کو بتایا تھا کہ کہاں جا رہی ہوں۔ بچوں سے صرف اتنی بات کہی تھی کہ میں چند دنوں کے لیے جا رہی ہوں جلد لوٹ آؤں گی۔ گھر کی پرانی ملازمہ میری ساس کی خدمت بھی کرتی رہی تھی اس سے میں نے کہا کہ وہ بچوں کا خاص خیال رکھے۔

میں نے اپنی منزل کا پتہ کسی کو نہیں بتایا تھا۔ میں اپنے چچا سر کے ہاں آ گئی تھی۔ مجھے یہاں کام بھی سرانجام دینا تھا۔ اس گاؤں میں جہاں میرے مرحوم شوہر کی زمین تھی ایک اسکول کی بنیاد رکھنا تھی کہ اپنی وفات سے قبل وہ اسکول کا نقشہ پاس کروا چکے تھے صرف تعمیر کا کام باقی تھا۔

میں ان سے کچھ عرصے دور رہنا چاہتی تھی جن سے میرا ہر بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ میری مصروفیت طول پکڑ گئی۔

مجھے یہاں آئے چھ ماہ گزر گئے تھے چچا سر بچوں کی خیریت دریافت کرتے آتے تھے اور فضلہ بابا کو

انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تمہیں شاید بچوں کے مستقبل کا اندیشہ ہے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ.....“

”نہیں ڈاکٹر فرحان! مجھے ان کے مستقبل کی ضمانت نہیں۔ کچھ اور چاہیے جو مانگوں گی دیں گے آپ؟“

”کیا چاہیے تمہیں؟“ وہ جیسے ہار مان کر بولے۔

”آپ کی زندگی!“

”میری زندگی“ وہ حیران سے ہو گئے۔

”ہاں ڈاکٹر آپ سچا ہیں آپ سے مجھے یہی وعدہ لیتا ہے کہ آپ کسی کی زندگی بچانے کی سعی کریں گے۔“

”میرا وعدہ ہے پروین کہ میں اپنے بیٹے اور وقار کے بھرم کو قائم رکھوں گا۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولے۔

”تو پھر تیا ابو کی بچا لیجے ورنہ وہ اپنی ضد پر جان دے دیں گے۔ آپ نسرین باجی سے شادی کر لیں۔“

میں نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

وہ کم صم سے رہ گئے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں

ان سے یہ کہوں گی۔ وہ تو کچھ اور سمجھ کر آئے تھے کہ

ممکن ہے میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہو ورنہ ان سے

غفرت کا اظہار کرنے کے بعد رابطہ قائم کرنے کی کیا

ضرورت تھی وہ چند لمحے بڑے طویل تھے کمرے میں

سکوت چھا گیا تھا۔

اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منہ پھیر کر

بولے۔

”صرف ایک بات بتا دو پروین! تمہیں مجھ

سے نفرت تو نہیں۔“

”فرحان!“ میں تڑپ کر بولی۔ ”مجھے کسی سے

نفرت نہیں۔ آپ میرا مان رکھ لیجئے۔ میں پھر بھی

اخراجات کے لیے رقم بھی دے نہیں دیتے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے بارے میں انہیں نہ بتائیں کہ اس طرح میں اپنا کام مکمل نہ کر سکوں گی۔ کبھی میرے دکھوں سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کسی کو بتایا۔ میں نے اس گھر کو بھی سنوا دیا تھا جس میں کبھی میری شوہر کے والدین رہتے تھے اور وہ ایک عرصے سے غیر آباد تھے۔ ایک روز میں اسکول سے واپس آئی تو بچی نے مجھے ایک خط دیا میں حیران بھی یہ خط کہاں سے آیا ہے؟

میں نے خط کھولا تو میری نگاہیں تحریر پر جم گئیں خطب میں ہی تھی۔ یہ خط فرحان لکھا تھا۔

”پیرا ہن زیست میں کتنے ہی پوند لگا گئی ہو۔

احساس کا کوڑا تمہارے ہی ہاتھ میں ہے، جیسی تو پشت پو لکیریں ہیں۔ درو کی نیسیں اٹھتی ہیں تو تڑپ بھی نہیں سکتے۔ ذہن الجھ جاتا ہے، حالات کے تقاضے

سوال کرتے ہیں تو گنگ ہو جاتا ہوں۔ میرے ضمیر پر

ایک بوجھ سا ہے۔ میری خطا یہی تھی کہ میں نے

روسوں کی زنجیریں توڑنے کی سعی کی تھی۔ تم نے مجھے

دیکھی آگ میں جھونک دیا تو کیا چاہت کا یہ تقاضا تھا

کہ میں تم سے الٹا کرتا کہ اس آگ سے دور ہٹ

جاؤ اپنے چہرے کو چھپا لو کہ اس آگ کی پیش سے

جلجھل نہ جائے تم مجھے اس الاؤ میں جلتا ہوا چھوڑ کر

سکھیں بھی چلی جاؤں تو مجھے لگتا تھا۔ مگر تم تو اپنا فرض

بھی پیچھے چھوڑ کر کہیں بھی چلی گئیں۔ میرے دامن

میں تو تمہاری ہی خیرات ہے پھر یہ فرار کیا معنی

چھپے یوں تو نہیں مر جاتے، کیا ایثار کی منازل اتنی

محکم تھیں کہ تم جذبول کی پیش محرومی کے احساس اور

چاہت کے زخموں سے کھرا گئیں؟ لوگ یوں تو نہیں

جتنے کہ حالات کو شکست دے دیں مگر جراتیں

خود دیں۔ مجھے تمہاری جستجو نہیں کہ میں نے تو ان

دو سچوں کو بند کر دیا ہے جن سے تمہاری کوئی بھی

شک دکھائی دے سکتی ہے۔ ضرورت تو ان معصوم

بچوں کو ہے جنہوں نے تمہاری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔

مگر تم نے انہیں متا بھری آغوش دی تھی۔ جو تمہارا

فرض تھا ایسا فرض جس پر تم نے بچپن کی محبت اپنوں کی چاہت، جذباتیت کے بشری تقاضے اور زندگی کی خوشیاں نثار کر دیں۔ پھر تم انہیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟ شاید تم کھرا گئی تھیں یا تمہیں خوف تھا کہ تمہارے اندر کی عورت تمہیں احساس کے شعلوں میں نہ دھکیل دے تمہارے کردار کے آئینے کو پاش پاش نہ کر دے، تمہیں فرض کا بھی احساس نہ رہا اور تم نے وہ زنجیریں بھی کاٹ دیں جنہیں کبھی فرض سمجھ کر تم نے خود ہی پہنا تھا۔ اس طرح تو سبھی جی لیتے ہیں۔

مرحوم فخر بھی اسی انداز سے جیسے تھے۔ یہ زندگی نہیں

فرار ہے۔ یہ فرض نہیں ڈھونگ ہے سامنے آ کر

جرات کے ساتھ جو کہ تم میں چٹانوں سے ٹکرانے کا

حوصلہ ہے۔ لوٹ آؤ کہ دو معصوم بچے تمہاری راہوں

پر لگا ہیں بچھائے تمہارے منتظر ہیں۔ وہ اس یقین اور

اس میں بندھے ہیں جو تم انہیں دے گئی ہو۔ انہیں تو

فریب نہ دو جرات کے ساتھ کہہ دو کہ تم یہ فرض اور

بندھن نہیں نبھا سکتیں۔ تمہاری وہ جرات ایثار اور

حوصلہ صرف دکھاوا تھا اپنے چہرے سے یہ نقاب نوج

دوتا کہ تمہارا یہ چہرہ وہ بچے بھی دیکھ لیں جو متا بھری

آغوش کے منتظر ہیں۔ آئینہ سامنے رکھ کر بتاؤ۔ کہ

تمہیں کسی نے متا بھری آغوش میں دی تھی؟ بہتر

تعلیم و تربیت اور حوصلہ نہیں بخشا تھا۔ جس حوصلے اور

جرات کے ساتھ تم نے حالات کو شکست دی اور پھر

جیتی بازی ہار گئیں۔ خود ہارنے والے اتنے بے

حوصلہ نہیں ہوا کرتے مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ

میں نے تمہارا بھرم رکھا تو تم بھی میرا بھرم رکھو، میری

طرح جیو۔ لوٹ آؤ کہ چمن زار حیات کے یہ پھول

کھلا رہے ہیں۔ اداس ہیں۔ میرا نہیں تو اپنا بھرم رکھ

لو کہ آئی کتنی ہیں کہ تم پیکر جرات و استقلال ہو اور یہ

ایک ماں کا یقین ہے۔“

خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس

انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی

تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ میں تو بس کچھ عرصے دور

رہنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ یہ رشتے اتنے

میں نے کب لڑوٹ دیا ہے وہ اسے پلایہ تک پہنچا دیں۔

میں واپس اپنے گھر آئی تو بچے مجھ سے لپٹ کر بے ہوش ہو گئے۔ انہوں نے ان گنت سوال کئے میں انہیں کیا بتانی میں بھی انسان تھی لیکن شکست و ریخت کا تھا شائیں دکھانا چاہی تھی۔

فضلو بابا بیمار تھے۔ انہی سے فرحان نے میرا پتا لیا تھا۔ میں نے ان کی مزاج پر سی کو تو مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وقت پر آگئی ہو بیٹی۔ سانس کا رشتہ نہ جانے کب ٹوٹ جائے۔“

میں نے انہیں تسلی دی۔ میری آمد کی خبر انہیں تو مل گئی ہوگی جن کی میں نعم البدل بھی مگر ان میں سے کوئی نہیں آیا تھا میرے بچے۔ چو نے بتایا کہ انکل اور آنٹی اکثر آتے رہتے ہیں وہ انہیں بھی اپنے ساتھ سیر و تفریح کے لیے بھی لے جاتے تھے میں سمجھتی تھی کہ شاید بچا بھی اور بھیا آتے ہوں گے۔ لیکن جب چو نے کہا کہ انکل ہی بابا کا علاج کرنے آتے ہیں تو میں حیران رہ گئی مجھے کیا خبر تھی کہ کاٹنا میں ہی تھی۔ مجھ سے تو سب کو ملنے سے منع کر دیا تھا لیکن میری عدم موجودگی میں ان بچوں کو میری کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

شام کا وقت تھا جب فضلو بابا کی حالت خراب ہو گئی میں پریشان تھی کہ بچہ بھاگ کر اندر گیا۔ ریسپورڈ لگایا اور پھر فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ میں فضلو بابا کے کمرے سے باہر کھڑی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے کسے فون کیا ہوگا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا کمرے میں آئی تو اس نے بتایا کہ انکل تو نہیں ملے ان کے دوست آرہے ہیں۔ انکل امجد بھی بہت اچھے ہیں۔

ڈاکٹر امجد نے بابا کا معائنہ کیا اور نسخہ لکھ کر دیتے ہوئے بولے کہ بہتر ہے۔ انہیں اسپتال میں داخل کروادیں مگر بابا نے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر امجد کے جانے کے بعد بابا نے کہا کہ میں کچھ دیر ان کے

گھر آئی تھی۔

بابا چند لمحے چمت پر لگا ہیں جمائے پلو ۲ پتے رہے اور پھر انہوں نے کہا۔

”بیٹی! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارے والدین کے بارے میں جانتا ہوں تو میں نے کہا تھا کہ تمہارے والدین یہی ہیں میں نے غلط بات نہیں کہی تھی۔ شفو میرے خاندان کی بیٹی تھی۔ صاحب کو اس سے محبت تھی لیکن خاندانی اصول اور رسمیں سدراہ تھیں۔ صاحب ان دونوں دو بچوں کے باپ تھے وہ شفو سے دوسری شادی کے خواہاں تھے لیکن اپنے والد کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔“

بابا کہہ رہے تھے اور میں خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی اب کس راز سے پردہ اٹھنے والا ہے؟

بابا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”صاحب نے گھر والوں سے چوری جیسے شفو سے شادی کر لی۔ گو شفو کے والدین راضی نہ تھے لیکن میں نے انہیں متا لیا تھا۔ پھر اس زمانے میں ایک تھانیدار کی بڑی حیثیت تھی اور صاحب تو زمیندار گھرانے سے بھی تعلق رکھتے تھے خیال تھا کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے والدین پر ظاہر کر دیں گے لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ تمہاری ولادت کی خبر ملی تو صاحب شفو کے گھر پہنچے تین دن رہے اور لوٹ آئے۔ حالات ایسے تھے کہ چوٹیں کھٹنے ڈیوٹی دینا پڑتی تھی۔ صاحب نے شفو کو ساتھ لانا چاہا مگر اس کے والدین رضا مند نہ ہوئے۔“

مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ میں کون ہوں۔ بابا نے کتنے برسوں اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھا۔ میں بت بنی بیٹی ہوئی تھی۔

بابا نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر فسادات زور پکڑ گئے۔ ان دنوں صاحب نے بیگم صاحب کو بھی اپنے میکے چلے جانے کو کہا تھا۔ بچے تو پہلے بیچ دیئے تھے مگر بیگم صاحبہ رضامند نہ ہوئیں۔ پھر صاحب بھی چپ ہو گئے۔ ایک روز

مختصر

حمید نے ایک مرجع بتایا کہ اس نے ایک محفل میں
اچاس ابلے ہوئے اٹھ کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا
”تو ایک اٹھ اٹھ کھالیتے تاکہ پورے پچاس ہی
ہو جاتے۔“ تسلیم نے مشورہ دیا۔
”کیوں کھالیتا ایک اور اٹھ؟“ حمید ذرا خشکی سے
بولے۔ ”تم چاہتے ہو کہ میں ایک اٹھ کی خاطر اپنے آپ
کو ہاں غور مشہور کر لیتا۔“

☆

اخبار پڑھ کر

ناشتے کی میز پر اخبار دیکھتے ہوئے رمضان نے
بیگم کو بتایا۔
”پرسوں رات والی محفل موسیقی کی رپورٹ اخبار
میں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کتنی کامیاب محفل تھی۔“
”جی ہاں۔ مجھے بھی اخبار پڑھ کر ہی پتا چلا ہے کہ ہم لوگ
اس سے کتنے لطف اندوز ہوئے تھے۔“ رمضان کی بیگم
نے جواب دیا۔

اچانک خبر آئی کہ شفو کے گاؤں پر حملہ ہو گیا ہے۔
صاحب مجھے ساتھ لے کر اس گاؤں کی جانب روانہ
ہو گئے میرا گاؤں تو پہلے ہی جل گیا تھا اس طرح ہمیں
تم ہی ملیں۔ تم اپنے مرجوم ماموں کے بازوؤں میں
تھیں صاحب نے مجھے سختی سے منع کر دیا کہ میں اس
بلت کو راز رکھوں اور کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ بابا کی
آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کا سانس دھونکی کی طرح
چل رہا تھا۔

میں ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔
”اپنے باپ کی مجبوریوں کی بنا پر انہیں معاف
کر دیتا ہوں! وہ تمہیں اپنی بیٹی اپنا خون بتا کر بیگم صاحبہ
کی آغوش میں نہیں دے سکتے تھے۔ پھر وہ لاکھ کہتے
کوئی یقین نہ کرتا۔ بڑے صاحب اسی روز آئے تھے
جس روز ہم تمہیں لے کر آئے۔ تمہاری باپ نے
تمہاری پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ کی، بیگم

صاحبہ نے بھی تمہیں اعلیٰ تربیت دی اور میں اس گھر کی
چمکیداری کے فرائض اس لیے انجام دیتا رہا کہ
تمہارے قریب رہوں۔ تم میرے خاندان کی آغوش
میں رہو۔“ بابا کی آواز بیٹھ گئی اور وہ چپ ہو گئے۔

”بابا! آپ..... آپ نے مجھے یہ بات
آج..... آج کیوں بتائی بابا پہلے..... پہلے کیوں نہیں
بتائی.....!“ میں ان سے لپٹ کر ہلک پڑی۔ میرے
آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بھرائی ہوئی آواز میں کہہ
رہی تھی۔

”اس خاندان کے بزرگ بزدل ہیں جو اپنی
بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتے لیکن رسمیں نبھانے کے لیے شہر
چلتے ہیں۔“

معاد قداموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گھوم
گھر دیکھا فرحان ڈاکٹر امجد کے ہمراہ دروازے میں
کھڑے تھے۔ میں آچل میں منہ چھپائے اندر چلی
گئی۔

بابا کی حالت بگڑتی گئی۔ ای اور ابو بھی آ گئے
تھے۔ انہیں فرحان ہی نے اطلاع دی تھی۔ نسرین بیجا
ہفتانہ آ جاتی تھیں۔ بابا پندرہ روزہ بیمار رہ کر چل
بے۔ میرا برا حال تھا۔ بابا اگر کچھ نہ بھی بتاتے تو مجھے
ان کی موت کا اتنا ہی دکھ ہوتا کہ انہوں نے مجھے
گودوں کھلایا تھا۔

بابا کی وفات پر میں نے جی کھول کر آنسو
بھائے تھے۔ ابو اور امی مجھے تسلیاں دے رہے تھے۔
بھیا سر جھکائے بیٹھے تھے اور مجھے کہیں دور سے بابا کی
آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سیف الملوک کا یہ شعر
اکثر گایا کرتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ
قریب ہی کھڑے وہی شعر گارہے ہوں۔

ڈک لے آکھیں یہ دے اٹھرتے کج نہیں
بندہ مویاں
اکیس حیاتی دے دکھ ڈاڈے تے مکدے نہیں
بن مویاں

☆.....

عمر رفتہ کو آواز دینے والے بوڑھے کی کہانی

ایک اسی سالہ بوڑھے کا دلچسپ قصہ اس کا دعوا تھا کہ وہ پچیس سال پہلے ہونے والی ڈکیتی کے ملزم کی شناخت کر سکتا ہے۔

عمر رفتہ

یاسمین فرخت



لی آئی والوں نے دادا کو متعدد مصروفی ڈال دی۔
 غلطی ہوئی نہیں ہے چنانچہ ڈاکو گرفتار نہیں کیا جاسکا۔
 بورگولے بینک کو بھی دس ہزار ڈالرواپس منڈل سکے۔
 بورگولے میں ڈاکے کی کچھ بھی حیثیت رہی۔
 مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دادا اچانک
 بہت ہی اہم شخص بن گئے۔ پورے بورگولے اس
 کی عزت کرنا شروع کر دی۔ دادا نے بھی سیاست
 میں حصہ نہیں لیا تھا مگر چونکہ بورگولے کا پورا علاقہ راکھ
 پبلکن افراد پر مشتمل تھا اس لئے قدرتی طور پر ان
 شمار بھی ری پبلکنز میں ہوتا تھا۔ جولوگ ان کے بارے
 میں مشکوک تھے وہ دادا کے اس کارنامے کے بعد
 انہیں براہ راست ڈاکو کا دیدار کرنے کا شرف حاصل
 ہوا تھا۔ دادا کو پکا اور سچاری پبلکن سمجھنے لگے تھے۔
 بورگولے میں وقوع پذیر ہونے والے کل
 واقعہ کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو یہ جاننا
 چاہئے کہ وہاں لوگوں کے بینک کی ڈاکازنی
 بارے میں کسی قسم کے احساسات تھے۔ بیس سال
 ہونے والی واردات پر ابھی تک اس طرح گفتگو
 جاتی تھی جیسے کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہو اور پچھلے
 سال سے دادا بھی ہفتے میں کم سے کم تین مرتبہ
 ضرور کیا کرتے تھے کہ اگر کبھی انہوں نے بینک
 ڈاکا ڈالنے والے شخص کو دوبارہ دیکھا تو وہ پہلی ہی
 میں اسے پہچان جائیں گے۔ انہیں بجا طور پر ناز
 کہ وہ ایک بار دیکھا ہوا چہرہ بھی بھول نہیں سکتے۔

☆☆☆

کل ایک بچے سے پہر کو دادا گھر سے باہر
 اور ٹہلتے ہوئے بورگولے کے کاروباری حصے میں
 موسم خوشگوار ہو تو وہ ہمیشہ سے یہی کرتے آئے ہیں
 وہاں پہنچ کر وہ اسب کے ہارڈ ویئر اسٹور پر رے
 صبح کا اخبار پڑھنے کے لیے مانگا پھر سڑک پار کر
 جیک پامر کی بار برشاپ کے سامنے پڑی ہوئی
 تک گئے اور وہاں دھوپ میں اخبار پڑھنے بیٹھ گئے
 اس وقت دادا کی عمر اسی سال سے زیادہ
 ہے لیکن انہیں دیکھ کر عمر کا صحیح اندازہ لگانا بہت

بورگولے بینک کو میری پیدائش سے دو
 سال قبل ۱۹۳۷ء میں لوٹا گیا تھا اس بات سے شاید
 آپ یہ سمجھیں کہ مجھے اس ڈاکے کے بارے میں کچھ
 بھی یاد نہیں ہوگا مگر ایسا نہیں ہے۔ بورگولے کے ہر
 شخص کو بینک کی ڈاکازنی یاد ہے۔ جب سے یہ سانحہ
 ہوا ہے لوگ اس کے بارے میں مسلسل گفتگو کرتے
 رہے ہیں۔ میں اس کو لفظ بہ لفظ بالکل اسی طرح بیان
 کر سکتا ہوں جس طرح پرانے زمانے کے وہ لوگ
 بیان کر سکتے ہیں جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔

کل تک بینک کی ڈاکازنی ہمارے علاقے میں
 وقع پذیر ہونے والی سب سے اہم اور سب سے سنسنی
 خیز بات تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہ روئے زمین کا عظیم
 ترین سانحہ تھا۔ جس نے پولیس کے محکمے سے تعلق
 رکھنے والے تقریباً ہر شخص کو بورگولے کی جانب متوجہ کر
 دیا تھا شریف پبلکنز نے اپنے سترہ نابینا کے سامنے
 ڈاکو کو بار بار گالیاں دی تھیں لیکن کل جس وقت اس
 نے گالیاں بکنا شروع کیں۔ صرف سولہ نابینا موجود
 تھے میر نے ڈاکے کی واردات ہوتے ہی گورنر کو فون
 کیا تھا کہ ڈاکو گرفتار کرنے کے لیے فوج کے دو تین
 دستے روانہ کیے جائیں۔ مگر ہر ممکن کوشش کے باوجود
 بینک کو دو ہالہ ہونے سے نہ بچایا جاسکا اور بورگولے
 کے ہر شخص کو ٹھوڑے بہت نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

ایف بی آئی اور ریاست کی پولیس کے افراد کو
 ہفتوں تک بورگولے کے اندر اور باہر ڈاکو کی تلاش
 میں سرگرم رہے۔ تصویریں دکھائیں۔ تاکہ وہ
 ڈاکو شناخت کر سکیں۔ دادا نے بتایا کہ ان میں سے
 ایک میرے دادا اس حادثے کے چشم دید گواہوں میں
 سب سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ بینک میں موجود
 افراد ڈاکو کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکے تھے کیونکہ اس
 نے اپنے ہیٹ کو نیچے جھکا رکھا تھا اور کوٹ کے کالر
 اٹھا کر ان سے اپنا منہ ڈھک لیا تھا۔ دادا واحد شخص
 تھے جنہوں نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ کار میں
 بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا نہ اس کا ہیٹ نیچے جھکا تھا اور نہ
 کوٹ کے کالروں سے اس کا منہ ڈھکا ہوا تھا۔ ایف

کے ہر شخص کو اطلاع ملی کہ بینک میں ۱۱ کا ڈالنے والا واپس آ گیا۔

☆☆☆

میں بورگوے فارمیسی میں جو کھٹکھا رہا تھا اور مس مولیٰ سے جو وہاں سیلز گرل تھی گفتگو کر رہا تھا۔ دراصل مجھے مولیٰ سے محبت ہو گئی تھی مگر میں ابھی تک اس کے ساتھ ایک شام بھی نہیں گزار سکا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ باتوں باتوں میں اسے شام کے کھانے پر مدعو کروں کہ اچانک کسی نے دکان کے پچھلے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ بینک میں ڈاکا ڈالنے والا آچکا ہے اور اب اس کا رخ اسی دکان کی طرف ہے۔

میں اور مولیٰ آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ڈاکو سے بچنے کے لیے کون سے حفاظتی اقدامات بہتر رہیں گے اور ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ وہ اندر داخل ہوا۔

اس کا لباس گرد آلود اور جسم دبلا پتلا تھا۔ عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بال آدھے سے زیادہ سفید تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بڑے تھے اور چہرے پر جھریاں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ کسی زمانے میں وہ یقیناً خوب صورت رہا ہوگا لیکن وہ ابھی تک اسے آپ کو خوب صورت سمجھ رہا تھا کیونکہ اس نے مولیٰ کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دہائی اور بڑی بے ہودگی سے بولا ”لڑکی تمہارے پاس سگریٹ ہیں؟“

مولیٰ تازہ یک پر کریم لگا رہی تھی اس نے خاموشی سے یک اٹھایا اور اجنبی کے چہرے پر دے مارا اور بھاگ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

اجنبی نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے کاغذی نیکیں اٹھائے اور اپنے چہرہ اور کپڑوں کو صاف کرنے لگا میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت اس کے منہ سے جو الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ انہیں بھی بیان کروں مگر میں ایسا کروں گا نہیں کیونکہ اس قسم کے الفاظ بورگوے میں بہت ہی کم سننے میں آتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ الفاظ مولیٰ کی شان میں ادا کیے گئے تھے۔

اپنے آپ کو تھوڑا بہت صاف کر کے اس نے

ہے۔ جوانی کے دور میں وہ لوہار کا کام کیا کرتے تھے مگر اب بھی وہ بوڑھے نہیں لگتے پچاس سال کی عمر سے پہلے وہ گئے ہو گئے تھے اس لیے ان کے بال سفید ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بات کے علاوہ کراب وہ سہ پہر کے وقت تھوڑی دیر دھوپ میں بیٹھنے لگے ہیں۔ مجھ میں اور ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے بلکہ مئی کے قول کے مطابق وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی صحت مند واقع ہوئے ہیں ان کی پستانی ابھی تک جوں کی توں باقی ہے اور آج بھی انہیں ہر وہ چہرہ اچھی طرح یاد ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی کے کسی بھی حصے میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔

باربر کی دکان کے سامنے والی بیچ پر دادا کے قریب نیٹ بارلو..... بیٹھا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک اجنبی شخص نے اپنی کار پارک نیٹ بارلو نے دادا کی کمر پر کہنی ماری اور پوچھا۔ ”یہ کون شخص ہے؟“ دادا نے اخبار سے نظریں ہٹائیں اور مسکرا کر بولے۔ بینک میں ڈاکا ڈالنے والا۔ پھر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

نیٹ بارلو نے دادا کا بازو پکڑ لیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہیں یقین ہے؟“ ”بینک مجھے یقین ہے“ دادا نے جواب دیا۔ ”کیونکہ میں کسی کا چہرہ نہیں بھول سکتا۔“

نیٹ بارلو نے یہ سن کر قہقہے بھری اور سیدھا باربر شاپ میں جا گھسا۔ وہاں پانچ یا چھ افراد بیٹھے ہوئے جبکہ سے گفتگو کر رہے تھے۔

نیٹ بارلو نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کار سے اترنے والے شخص کی طرف اشارہ کیا اور بولا ”بینک میں اسی شخص نے ڈاکا ڈالا تھا۔“

وہ لوگ فوراً ہی دکان کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے جبکہ نے جلدی جلدی کھڑکیاں بند کی لیں۔ دکان کو مقفل کیا اور دکان بند ہے کا کارڈ لگا کر وہاں سے کھسک گیا۔

اور تب دس منٹ کے اندر اندر بورگوے

دروازے کا رخ کیا فارمیسی سے ملحق بورگو لے گیراج تھا۔ اجنبی نے گیراج کے دروازے پر سکرٹ کی مشین دیکھی اور وہ مشین کے پاس کراچی جیب میں کچھ سکے تلاش کرنے لگا۔

باب گیراج میں میری کار کی صفائی کر رہا تھا اور یقینی طور پر اسے بھی ڈاکو کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ کوئی سوال جواب کیے بغیر اس نے اپنے ہاتھ کے رینچ سے اجنبی کو نشانہ بنایا مگر ایک تو اس کا نشانہ درست نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ اس کے ہاتھوں میں گریس لگا ہوا تھا رینچ اجنبی کے گلے کے بجائے ڈاکٹر بائر کی نئی کیڈیلاک کے شیشے پر لگا اور اسے چور چور کر دیا جہاں تک باب کا تعلق ہے وہ تیزی سے میری کار کے نیچے گھس گیا اور وہاں بڑا ہوا اس وقت تک کا پتا رہا جب تک خطرہ دور نہیں ہو گیا۔

شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر اجنبی نے گیراج میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور جب کچھ نظر نہ آیا تو ٹھہر گیا ہوا اشارہ دستوران کی سمت چل دیا دستوران کے مالک مسٹر گریموری کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے اجنبی کو دیکھا وہ غوطہ لگا کر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے بسکٹوں کی الماری کے پیچھے دب گئے اجنبی کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک بوسیدہ سے رجسٹر کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

بورباورگو لے طوفان کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ مسٹر ہینسن نے جو نئے بینک کے پریزیڈنٹ تھے اپنے نائب کو ہدایت کی کہ وہ سرکاری تعطیل کی منہی بینک کے باہر لگا کر صدر دروازہ مقفل کر دے خود انہوں نے بینک کی ساری رقم اور اہم کاغذات ٹائم والٹ میں بند کیے اور پچھلا دروازہ بھی اندر سے مقفل کر لیا اور تب انہیں اپنے نائب کی دراز میں رقم سے پر ایک تھیلا نظر آیا جسے وہ گھبراہٹ کے باعث والٹ میں رکھنا بھول گیا تھا۔ ٹائم والٹ کی خوبی ہے کہ ایک مرتبہ اس کی کھڑی میں جو وقت مقرر کر دیا جائے اس سے ایک بھی منٹ پہلے اسے کھولنا ناممکن ہے۔ رقم کا تھیلا پاکر مسٹر ہینسن کھوپسینے آگئے اور وہ

نفل میں تھیلا دبا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے کہ اسے کہاں چھپائیں۔ عین اسی وقت فریڈ نے جو اپنی دکان کی ساری رقم بین بورکر بینک میں جمع کرائے لے آیا تھا، پچھلے دروازے سے دستک دی وہ جانتا تھا کہ موجودہ دور میں اگر بینک کلوٹ بھی لیا جائے تب بھی رقم جمع کرانے والے کو پوری رقم واپس ملتی ہے جبکہ دکان پر رکھی ہوئی رقم ہمیشہ غیر محفوظ ہوتی ہے اب جبکہ ایک ڈاکو بورگو لے میں دندنا پھر رہا تھا۔ دکان میں رقم رکھنا انتہائی ناوانی کی بات تھی۔ چنانچہ اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے چلا کر کہا دروازہ کھولو مجھے اندر آنے دو میں رقم جمع کرائے آیا ہوں۔

اندر سے مسٹر ہینسن نے جو رقم جمع کرنے کے لیے فرش راہ بن جاتے تھے باز بلند جواب دیا۔ بینک بند ہے تمہیں بھی یہی معلوم کہ آج سرکاری تعطیل ہے۔ دونوں اندر اور باہر سے ایک دوسرے پر مارج رہے تھے برس رہے تھے کہ حفاظتی پولیس کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا۔

شیرف پلکھن ان لوگوں میں سے تھا جنہیں بالکل شروع میں ڈاکو کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی اسے اس بات پر ہمیشہ فخر ہا ہے کہ وہ براڈین اور پھر تیلانخص واقع ہوا ہے پس اطلاع ملتے ہی اس نے سوچا کہ ڈاکو کو بستی میں پکڑنے کی کوشش کی جائے تو عوام کی املاک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ دو چار معصوم شہری گولیوں کی زد میں آجائیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ بستی سے باہر راستے کو رکاوٹیں کھڑی کر کے بند کر دیا جائے اور جب ڈاکو فرار ہو کر ادھر سے گزرے تو اسے زرنے میں لے لیا جائے۔

شیرف نے وقت ضائع کیے بغیر اسٹیٹ پولیس کی کمک طلب کرنے کیلئے فون کیا اور جتنی بھی رائفلیں اکٹھا کر سکتا تھا۔ اکٹھائیں اور اپنے جتنے بھی ٹائمن کے سامنے ڈاکو کو جتنی بھی گالیاں دے سکتا تھا۔ گالیاں دیں۔ پھر اپنی فوج ظفر موج کو لے کر بستی کے جنگل سرے پر سرک بند کرنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔

وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شمالی حصے کی سڑک پر پہلے ہی رکاوٹیں کھڑی کی جا چکی ہیں اور صرف جنوبی حصہ ایسا بچا ہے جو ضروری توجہ کا مستحق ہے۔

اجنبی کے جاتے ہی لوگوں کا جم غیر گھروں سے، دکانوں سے اور ہر اس جگہ سے جسے چھپنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ لکلا اور بچ پر بیٹھے ہوئے دادا کے گرد گھیرا ڈال کر گھڑا ہو گیا۔ لوگوں کی اس حرکت پر دادا کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا مصیبت ہے ایک شریف آدمی دھوپ میں بیٹھ کر سکون سے اخبار بھی نہیں پڑھ سکتا۔ تم لوگوں نے میری دھوپ بھی روک رکھی ہے اور مجھے اس طرح گھور رہے ہو جیسے میں کوئی ایسی چیز ہوں جو پہلی بار تمہیں نظر آئی ہے۔

ہر شخص یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ اجنبی نے دادا سے کیا گفتگو کی جب چاروں طرف سے اسی سوال کی بوچھاڑ ہوئی تو دادا ابولے ”وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔“ ”کیا اس علاقے کا ہر شخص پاگل ہو گیا ہے؟“ اور میں نے اس سے کہا۔ ”جس علاقے میں ری پبلکن بھرے ہوں۔ وہاں اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔“

ہم لوگ دادا کے منہ سے صرف اتنا ہی اگلا اسکے اسی اثنا میں اسٹیٹ پولیس وہاں پہنچ گئی اور اس نے دادا سے بینک کے ڈاکو کے متعلق دریافت کیا۔ دادا نے حیرت سے پوچھا۔ ”بینک کا ڈاکو؟ کیسا بینک اور کیسا ڈاکو؟“ پولیس والے سوال کو چھپنے سے باز نہ آئے تو دادا نے اخبار لپیٹا ”گھور کر ان لوگوں کو دیکھا اور گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔“

دادا کے اس طرز عمل سے ایک عجیب سی گتھی بن گئی جسے اپنے اپنے طور پر ہر شخص سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اجنبی کار اور لباس اور چلیے کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ دادا کے علاوہ دوسرے جن لوگوں نے اجنبی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ میں اور مولیٰ تھے۔ مولیٰ اتنی زیادہ سراسیمہ تھی کہ ابھی تک اس کے منہ سے صحیح الفاظ اذانیں ہو رہے تھے۔ رہ گیا میں تو میں نے مناسب سمجھا کہ سوالوں کے لائق ہی سلسلے سے محفوظ رہنے کیلئے خاموشی اختیار کروں میں

جس وقت وہ مقررہ مقام پر پہنچا اس وقت جو ہمیر اپنے ٹریک سے بھوسے کا ٹریلر باندھے ہوئے شہر کی سمت آ رہا تھا۔ شیرف نے اسے روک کر سارا بھوسہ سڑک پر الٹا دیا اور بھوسے کے پیچھے ٹریکٹر اور ٹریلر کھڑے کر دیے۔ اس طرح نصف سڑک بند ہو گئی۔ باقی نصف سڑک بند کرانے کے لیے اسے ادھر سے گزرتے ہوئے مانک کی ماڈل ٹی کی مدد لینا پڑی ماڈل ٹی کے ایک کچھ کمزور تھے اس لئے وہ پھسل کر ایک گڑھے میں گر گئی مانک کا کہنا ہے کہ اگر شیرف نے جلد ہی ماڈل ٹی کی مرمت نہیں کروائی تو وہ عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دے گا۔

اجنبی کو ان انتظامات کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ اشاریہ ستوران سے باہر نکل کر وہ اپنی کار کی سمت تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ بستی کے مرد و زن کھڑکیوں اور چھتوں پر سے اسے جھانک رہے تھے سارے علاقے میں صرف دادا ہی ایک ایسے شخص تھے جو بار بار شاپ کے سامنے دھوپ میں بیٹھے ہوئے اطمینان سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اجنبی دادا کے پاس گیا اور بچ پر بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگا۔

عین اسی وقت مسز پابلوچ نے جو بار بار شاپ کے اوپر رہتی تھیں اپنے شوہر کی شاٹ کن اٹھائی اور کھڑکی سے باہر نکال کر اس کا ٹریلر چڑھالیا بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کا ارادہ ڈاکو کو ڈرانا تھا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور گولی سڑک پار کرنی ہوئی اسب کے ہارڈ ویئر اسٹور کے شوپیس کے پیشے پر پڑی۔

اپنے شیرف پبلکنز کی بد قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ اجنبی شخص شمال کی جانب سے بستی کے باہر نکل گیا اور جنوب کی جانب شیرف نے جو رکاوٹیں کھڑی کی تھیں وہ کسی کام نہ آئیں۔ مدد کے لیے آئی ہوئی اسٹیٹ پولیس.... البتہ وقت پر کام آئی اور اس نے جو ہمیر کے ٹریلر میں دو بارہ بھوسا بھروانے اور سڑک کی رکاوٹیں ہٹوانے میں شیرف کی بھرپور مدد کی۔ بعد میں شیرف نے بتایا کہ جوش و خروش کے باعث

نے کہا کہ مجھے اس کی صورت صرف اس وقت نظر آئی تھی جب وہ ایک اور کریم سے لت پت ہو چکا تھا۔ اس لئے میرے لئے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ اس کے اصل خدوخال کیا تھے۔

میرا خیال ہے کہ اسٹیٹ پولیس انجینی کی اس بات سے متفق.... ہوئی تھی کہ علاقے کا ہر شخص پاگل ہو گیا ہے مگر مسٹر سب اور چیف مورگن وہ لوگ تھے جنہوں نے ڈاکو کی آمد کے دستاویزی ثبوت پیش کر کے سب لوگوں کی لاج رکھ لی۔

مسٹر سب کو جیسے ہی پتہ چلا کہ ڈاکو واپس آ گیا ہے۔ انہوں نے اسٹور کے دروازے کے پیچھے چھپ کر اس کی کار کے نمبر نوٹ کر لیے چیف مورگن جو نو اتارنے کا اتنا شوشین ہے کہ اپنی ساری رقم اس شوق کی نذر کر دیتا ہے ڈاکو کی آمد سے مطلع ہوتے ہی اپنے بہن کے اپارٹمنٹ میں جوئے پینک کی چھت پر ہے پہنچا اور دور بین جیسے کسی مخصوص ٹینس کی مد سے اس نے مین اسٹریٹ پر گھومنے والے انجینی کے کئی نو اتار لیے اگر یہ دو ثبوت نہ ہوتے تو یقینی طور پر بورگو لے کی پوری ہستی دیوانوں کی ہستی قرار پائی۔ پولیس ناکام و نامراد واپس چلی گئی تو ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور جس وقت شہر سے کچھ صحافی خبریں حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچے تو لوگ یا تو اس بات کو بھول چکے تھے یا بھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کسی نے انہیں کوئی قابل ذکر بات نہیں بتائی بے چارے ایک ایک کا منہ نکتے پھرتے تھے مگر کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو انہیں گھاس ڈالے۔

میں دادا کے پیچھے پیچھے گھر گیا وہ اپنے کمرے کے سامنے والے گھن میں بیٹھتے تھے اور بہت ناراض نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کی خفگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ دھوپ میں بیٹھ کر اطمینان سے اخبار نہیں پڑھ سکے ہیں۔

”اتنا ادھم کیوں مچا ہوا ہے؟“ انہوں نے پوچھا ”تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔“ میں نے کہا۔ ”پچھلے بیس سال سے تم مسلسل کہتے چلے آ رہے ہو کہ اگر

تمہیں دوبارہ ڈاکو نظر آجائے تو تم اسے فوراً پہچان لو گے چنانچہ قدرتی طور پر لوگ اس وقت پریشان ہوئے جب تم نے کہا کہ وہ واپس آ گیا ہے۔“ ”اوہ!“ دادا نے ایک گہری سانس لی ”اچھا“ لوگ اس کو ڈاکو سمجھے۔

میں نے کہا ”پھر کسے سمجھتے۔ بورگو لے ساری زندگی میں صرف ایک ہی ڈاکو داخل ہوا ہے۔ جواب میں انہوں نے بھنا کر میری طرف دیکھا اور منہ سے ایسی آواز سن نکالیں جن کا کوئی پیر نہیں تھا۔ میں خاموش ہو کر گھر میں چلا گیا۔ پارٹمنٹ بعد نیٹ بار لو وہاں پہنچا اور اس نے دور ہی سے چہنچا جانا شروع کر دیا۔ ”تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے، بل را سٹن کہ تمہی نے مجھے پینک کے ڈاکو کی آمد کے بارے میں بتایا تھا۔“

دادا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نیٹ بار لو جھاگ اڑاتا ہوا صحن تک پہنچ گیا غصے کے باعث اس کی مٹھیاں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ مارنے مرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ دادا کے مقابلے میں وہ اتنا بوڑھا اور کمزور شخص تھا کہ اگر دادا اس کی طرف منہ کر کے ذرا ٹنگڑی سی چھینک مار دیتے تو وہ چاروں خانے چت ہو جاتا۔ ”کسی شخص کی بات کر رہے ہو؟“ دادا نے پوچھا۔ ”وہی شخص.... وہی.... دیکھو تم انکار نہیں کر سکتے۔“ دادا نے اخبار اٹھایا اس کے اندرونی صفحات کھولا اور بڑی شان سے کسی چیز کو تلاش کر کے بولے۔ ”یہ دیکھو۔ ایک نظر اس تصویر پر ڈالو۔ اس کے نیچے لکھا ہے۔“ ”پینک میں ڈاکا ڈالنے والا۔“ دیکھا تم نے اب میری بات سمجھنے کی کوشش کرو میں اخبار پڑھ رہا تھا تم نے مجھ سے پوچھا ”یہ کون شخص ہے؟“ اور میں سمجھا کہ تم تصویر کے متعلق پوچھ رہے ہو پس میں نے تصویر کے نیچے لکھی ہوئی تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔ ”پینک میں ڈاکا ڈالنے والا۔“ اب اگر تم کسی دوسرے شخص کو ڈاکو سمجھ بیٹھے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ سارا قصور تمہاری سمجھ کا ہے۔“

نیٹ بار لو کم و بیش دو منٹ تک تصویر دیکھتا اور

مسکرائیے

ایک امریکی بچے نے سر راہ ایک پادری کو دیکھ کر کہا۔ ”بیوسمز“
پادری نے شگفتہ انداز میں کہا: ”تم مجھے مسز کے بجائے فادر کہہ کر مخاطب کرو تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

بچہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”اچھا، تو آپ یہاں کھو جتے پھر رہے ہیں اور میری اتنے سال سے مجھ سے بھی کہے جا رہی ہیں کہ انہیں معلوم نہیں، میرا باپ کون ہے۔“

تھوڑی سی جرح کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ بینکوں کو لوٹتا رہا ہے اور بیس سال قبل بورگولے بینک کو بھی اسی نے لوٹا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ دوبارہ بورگولے اس بات کا جائزہ لینے گیا تھا کہ آیا وہاں ایک بار پھر بینک کو لوٹا جاسکتا ہے یا نہیں۔

☆☆☆

آج صبح ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی صحافیوں نے آنا شروع کر دیا تھا اور ابھی تک ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ صحافیوں کی بڑی تعداد سے ہمارا چھوٹا سا ڈرائنگ روم بالاب بھر گیا تھا میں نصف درجن مرتبہ دادا کو بلانے کیلئے اوپر گیا وہ اپنی جھولنے والی کرسی پر اس طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے جیسے پوری رات یونہی گزاردی ہو۔ میں انہیں نیچے اترنے اور صحافیوں سے ملاقات کرنے کیلئے آمادہ نہ کر سکا۔ اور جب ایک سر بھرا صحافی پچھلے زینے سے اوپر چڑھ آیا تو دادا نے اسے بتایا کہ انہوں نے جس شخص کو دیکھا تھا وہ بورگولے بینک میں ڈاکا ڈالنے والے شخص سے بالکل مختلف تھا۔ صحافی نے بے درپے دو چار سوال اور کے تو دادا نے بوکھلا کر اس کی طرف دو جوڑے جوتے پھینکے۔ صحافی غصے میں آئے سے باہر

اس کے پیچھے لکھی ہوئی عبادت کو پڑھتا رہا۔ پھر اچانک اس کا منہ لٹک گیا اور وہ دل ہی دل میں اپنی غلطی تسلیم کر کے واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔

دادا نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور اوپر والے کمرے میں چلے گئے ان کے جاتے ہی میں نے صحن میں پڑا ہوا اخبار اٹھایا اور بینک میں ڈاکا ڈالنے والے شخص کی تصویر کو غور سے دیکھا پھر میری نظر اخبار کے صفحات پر پڑی اور میں اخبار لیے لیے اوپر چڑھ گیا۔ دادا اپنی جھولنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔

”دادا“ میں نے کہا۔ ”بڑی عجیب بات ہے کہ یہ اخبار آج کا ہے لیکن اس کے اندرونی صفحات دو ہفتے پہلے کے ہیں۔“

دادا نے اخبار میرے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے دیکھ بغیر بولے۔ ”شہر والے بورگولے میں پرانے اخبار بھیج کر اکثر ہم لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اسب کو اخبار کی رقم واپس لینے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔“ میں نے اخبار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”میں اسب کو صورتحال سے آگاہ کیے دیتا ہوں۔“

”نہیں“ دادا نے اخبار اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا۔ میرے خیال میں جب تک اسب کو خود ہی صحیح بات معلوم نہ ہو اسے پریشان کرنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”تمہاری مرضی“ میں نے کہا اور زینے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکنا تاکہ دادا حسب عادت اپنی جھولنے والی کرسی پر جھولنا شروع کر دیں لیکن ان کی کرسی نے ذرا بھی حرکت نہیں کی وہ جیسے ہوئے بیٹھ رہے۔

اگر آپ نے آج کے اخبارات کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو علم ہوگا کہ اسب کے دیئے ہوئے کار کے نمبر اور چیف مورکن کی اتاری ہوئی تصویروں کی مدد سے اسٹیٹ پولیس نے اجنبی کا پیچھا کیا اور تقریباً سو میل دور اسے گھر سے ملے کر گرفتار کر لیا۔ اور تب انہیں پتا چلا کہ وہ شخص..... والٹر ڈونالڈسن تھا جو بینک میں ڈاکا زنی کی کئی وارداتوں میں ایف بی آئی کو مطلوب تھا

ہو گیا مگر میں نے اسے سمجھایا بھجایا اور نیچے لے جا کر
تو س، بکھن اور چلے سے اس کی تواضع کی۔

صحافیوں نے بورگوے کے باشندوں سے بھی
انٹرویو لیے جنہوں نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح
دادا نے بیس سال قبل بینک میں ڈاکا ڈالنے والے
فحش کو دیکھا تھا اور کس طرح وہ دعویٰ کیا کرتے تھے
کہ اسے ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیں گے چنانچہ
جونہی وہ بورگوے آیا اور اس نے کار پارک کی۔ دادا
نے نیٹ بار لو کو بتایا کہ ڈاکو اگیا ہے۔ نیٹ بار لو نے
بھی سر ہلا کر اور دانت نکال نکال کر انٹرویو دیا۔ اس
نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ بروقت بارگوے کے لوگوں کو
ڈاکو کی آمد کی اطلاع نہ دیتا تو پورا بارگوے لٹ گیا
ہوتا۔ صحافیوں کی درخواست پر میں نے دادا کی ایک
پرانی تصویر کا کلیئو نکالا جیف مورگن سے اس کے
پرنٹ بنوائے اور سارے صحافیوں میں تقسیم کر دیے
دو چار پرنٹ اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں جو میں
نئے آنے والے صحافیوں کو دوں گا۔

صحافیوں سے نمٹ کر جب میں گھر پہنچا می
کچن میں تھیں اور یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں کہ
دادا ناشتا کرنے کے لئے پیچھے کیوں نہیں آئے۔
دوپہر کے وقت بھی وہ بچ کرنے نیچے نہیں اترے
البتہ میں ان کا کھانا اوپر لے گیا تو انہوں نے اپنی
مخصوص جھولنے والی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اٹلے سیدھے
چند نوالے کھالیے پھر میں سہ پہر کے وہ اخبارات
لے کر ان کے پاس گیا جن کے پہلے صفحہ پر دادا کا
عظیم نامہ اور فوٹو چھپا تھا اور پولیس کے ایک بڑے
افسر کا بیان بھی شائع کیا گیا تھا کہ دادا کو قرار واقعی
انعام دینے کیلئے غور کیا جا رہا ہے۔ مگر دادا نے مجھے
فوراً ہی اپنے کمرے سے نکال باہر کیا اور جب میں
باہر جانے لگا تو انہوں نے سارے اخبارات میری
پشت پر دے مارے۔

☆☆☆

”کیا ہو گیا ہے دادا کو؟“ میں نے می سے

پوچھا ”انہیں اپنے اوپر فخر کرنا چاہئے۔ میں ان ہمارے
گرر ہا ہوں پورا بورگوے ان پر فخر کر رہا ہے مگر وہ اس
طرح خاموش ہیں جیسے کسی عزیز کی موت ہو گئی ہو۔“
میرا خیال ہے کہ میں تمہارے دادا کی خاموشی کا
سبب سمجھ گئی ہوں اچھا یہی ہے کہ اب اس گھر میں
بینک کی واردات کا کوئی ذکر نہ کیا جائے اور ہم تازہ
ترین واقعات کو بالکل بھول جائیں۔“
”کیوں می؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے
انکی طرف دیکھا۔

”دیکھو بیٹا۔“ انہوں نے سمجھایا۔ ”بیس سال
پہلے جب اس شخص نے جس کا نام ڈونالڈ سن بتایا جاتا
ہے، بورگوے بینک میں ڈاکا ڈالا اس وقت وہ بالکل
نوجوان تھا کل تمہارے دادا سے دیکھتے ہی پہچان گئے
لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا
کہ وہ کتابوڑھا ہو چکا ہے جن لوگوں کو وہ روزانہ دیکھتے
آئے ہیں، ان کے بوڑھے ہونے کا انہیں کبھی اندازہ
نہیں ہوا تھا۔ مگر اس ڈاکو نے ان کی آنکھیں کھول دیں
انہیں احساس ہوا کہ جب وہ شخص جو عمر میں ان سے
بہت چھوٹا تھا، اتنا بوڑھا ہو سکتا ہے تو خود وہ کتنے
بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ ان کی خاموشی اور غم کا اصل
سبب یہی ہے وہ اچانک بجھ کر رہ گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، می“ میں نے کہا۔ ”اب میں
دوبارہ اس بات کو زبان پر نہیں لاؤں گا۔“
میں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ کسی
سے اس اخبار کا بھی ذکر نہیں کروں گا جس کے
درمیانی صفحے پندرہ دن پرانے ایک اخبار سے نکال کر
خود دادا نے لگائے تھے۔

میں می کے پاس سے اٹھ کر صحن میں جا پہنچا مجھے
پہلی بار دادا جان پر ترس آ رہا تھا مجھے پتا چل گیا تھا کہ
وہ اپنی جھولنے والی کرسی پر بے حس و حرکت کیوں
بیٹھے ہوئے ہیں۔

دراصل کرسی کے سامنے والی دیوار پر آئینہ لگا تھا
اور وہ مسلسل اسے گھورے جا رہے تھے۔

☆☆☆

عمران ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ، ۳۷۔ اردو بازار کراچی ۷۲۰۰

اعتراف شکست

سعدیہ رئیس

لوگ تو صرف دل کشی 'رعنائی اور خوشیوں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں
مجبوریوں اور دکھوں سے تو یوں بھاگتے ہیں جیسے وہ چھوٹ کی بیماری کی
طرح انہیں بھی لگ جائیں گے۔

ایک درماں نصیب کی کہانی اس کے تار تار دل کو ایک رفوگر کی ضرورت تھی





بچھونے پر صاعقہ گہری نیند سوری تھیں۔ ہاں اسی چھوٹی رافیعہ غافل پڑی تھی۔ اس نے احتیاط نہ دروازہ بند کر دیا تا کہ ان دلوں کی نیند میں خلل نہ پڑے، پھر آہستہ روی سے باورچی خانے میں چلی آئی۔ دودھ ابل گیا تھا اس نے قنات کھولتے ہوئے پانی میں چینی اور پتی ڈال کر چائے تیار کی پھر دوبارہ کمرے میں جھانکا، نازیہ اٹھ چکی تھی اور کافی کسلندی سے انگڑائیاں لے رہی تھی۔

بے فکر اور بے خبر سا انداز.... اب اس کا ہر انگ جیسے خود منہ سے بولنے لگا تھا۔ شانہ کے لیے یہی بہت بڑی فکر کی بات تھی، جواں بیتی کا ساتھ اور ایک لمبی مسافت بھری زندگی.... جہاں اب کہیں گھٹنا سا بے نہ رہا تھا۔ اس کی حقیر حیات کے شکستہ بام و در ہر لمحے اس کے جوصلے کو پست کرتے رہتے جنہیں وہ بہت مشکل سے مجتمع کر پاتی زندگی ایسے ہی جوڑ توڑ میں گزر رہی تھی۔

”ناشتا کرو ورنہ پھر لیٹ ہو جاؤ گی۔“ نازیہ کو پاؤں پیادے اٹھاتے دیکھ کر اس نے آواز دی، اسے دیکھ کر جیسے اس کے دم توڑتے جذبے دوبارہ زندہ ہو جاتے تھے۔ عجیب قوت تھی اس محبت میں... وہ بالوں کو بندھ میں جکڑتی اٹھ گئی۔

”رافیعہ کو تو اٹھا میں.... اس کی وجہ سے اور دیر ہو جاتی ہے مجھے۔“ حواس بحال ہوتے ہی اسے دیر سویر کی فکر ہوئی ورنہ مزے سے پڑی سوری تھی۔

دراصل کالج جاتے ہوئے وہ اسے اسکول چھوڑتی ہوئی جاتی تھی۔ واپسی میں شانہ اسے اسکول سے لے لیتی یا پھر کبھی صاعقہ چلی جاتیں، رافعہ بھی چھوٹی ہی تھی اگرچہ دس سال کی تھی مگر ابھی پہلی کلاس میں تھی۔ ناسازگار حالات میں اس کے دو ایک سال ضائع ہو گئے تھے۔

”وہ آج اسکول نہیں جائے گی، رات اسے بخار ہو گیا تھا۔“ اس نے سرسری انداز میں آگاہ کیا۔ اور اب تو وہ ہر بات کو سرسری انداز میں لینے کی کوشش کرتی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ نیلگون آسمان پر سفید چمک دار بادلوں کی نگڑیاں بہت دل آویز لگ رہی تھیں، سحر کا ایک پر اسرار سا طلسم ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی روح میں بھی ایسے ہی اسرار پوشیدہ تھے جو کسی پر بھی آشکار نہ تھے۔ اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا دیا روشنی کی کرنیں گہری نیند سونی نازیہ کے پر شباب چہرے کو چومنے لگیں۔ اس نے کسمسا کر رخ موڑا اور غراب سے قبل کے اندر منہ کر لیا۔

”اٹھ جاؤ۔ سات بجنے والے ہیں۔“ شانہ نے کبل کھینچ کر اسے آواز دی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، اسے اٹھانا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ بہت دیر بعد بڑی مشکل سے اس کی نیند ٹوٹی تھی، جھومتی جھامتی ناشتا کرنی تھی، چائے پینے کے بعد کہیں جا کر اس کی پوری آنکھیں کھلتی تھیں اور جب نظر کھڑی پر پڑتی تو وہ سرعت اور پھرتی میں سب کو مات دے دیتی۔ اس کی اس معصوما نہ حرکت پر شانہ کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ چند لمحوں کے لیے اس کے چہرے سے تمام مجروح احساسات کا وقتی طور پر خاتمہ کر دیتی۔

نازیہ اس کی بڑی بیٹی تھی۔ کچھ لا پرواہ اور غافل سی! ہر روز اس کی اذنی سستی اور بھرپور نیند آڑے آ کر اسے دیر کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے اٹھانے پر وہ بے بہرہ بنی پڑی رہی، شانہ نے تیز آواز میں ریڈیو چلا کر اس کے قبل کے اندر رکھ دیا۔ دوپے کو از سر نو درست کر کے اس نے اپنے وجود پر پلٹ لیا۔ کچھ دنوں سے اسے نامعلوم سا خوف ہونے لگا تھا اپنے گرد دو پٹا پلٹ کر شاید وہ اپنی ذات کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اندر کی تنہائی کبھی کبھی اسے ڈرانے لگی تو وہ باہر صحن میں چلی آئی، سحر نمودار ہو چکی تھی، برندوں کی چھبھائیں اس کے سر سے جذبات میں کوئی بھی تاثر دینے میں ناکام رہیں۔ وہ دوسرے کمرے میں آگئی جہاں مکمل اندھیرے کا راج تھا کھڑکیوں پر پڑے پردے روشنی کی سنہری کرنوں کو سینہ تان کر روکے ہوئے تھے۔ اندر فرنی

کی بھیمانی مانی چاہئے وہ آہستہ آہستہ میز ہمایاں اتر گئی، باہر نکلے تو کڑوے زہر لے ناثرات نے اس کے اندر باہر نکل پھیلا دی۔ چاک گریباں، گہری سرمئی میٹھ میں بلوس بیشر چٹانے اسے دیکھ کر بے اختیار سلام کیا۔ ”صبح بخیر... صبح بخیر...“ کچھ غم ہوتے ہوئے اس نے تہذیب و شرافت کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اس کے چہرے پر ایک لحظہ کو جبری مسکراہٹ جھلکی اور غائب ہو گئی۔ ”صبح بخیر...“ اس کے صرف لب ہی ہلے، وہ اتنا ہولے بولی تھی جسے وہ مشکل سن پایا۔

”خیریت رہی... صبح کیسے۔ کوئی کام تھا تو مجھ سے کہہ دیا ہوتا؟“ وہ اکساری کی تمام حدیں پار کر لیتے تھے۔ اور اسی بات سے شانہ چڑتی تھی۔ ”نہیں شکر! کوئی خاص کام نہیں، ذرا سبزی لینی تھی... رکنا بھائی!“ سبزی والے کو چلتا دیکھ کر وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی اور جب سبزی لے کر پہنچی تو شبیر چٹا اسی عاجزی سے سراپا انتظار بنا کھڑا تھا مگر اب اس کا مزید کسی مکالے کا موڈ نہ تھا اس لیے وہ اپنے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”آئیے... جائے ہمیں ہمارے ساتھ۔“ تقاضہ اخلاق وہ بھر پور طریقے سے نبھاتا تھا۔ ”جی نہیں! شکریہ“ وہ خشک لہجے میں بولی اور میز ہمایاں چڑھنے لگی۔

اوپر آئی تو اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ شبیر چٹا اس گھر کا مالک مکان تھا اور وہ بہ حیثیت کرائے دار یہاں مقیم تھی۔ مگر اس کی باتیں اس کیلئے ناقابل برداشت ہونی جاری تھیں۔

شاید اتنے ماہ و سال کی قید تنہائی نے اسے آدم بیزار بنا دیا تھا یا پھر کوئی دوسری الجھن تھی جو اسے پریشان کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے بالکل بھی شرم نہ تھی اور اسی بات پر اسے اس پر تازہ آتا تھا۔ صاعقہ ٹھٹھ چلی تھیں اور وہیں بیٹھی ناشتا کر رہی تھیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں... کیا ہوا یہ منہ کیوں اتنا لال ہو رہا ہے۔“ اس کا غصہ چھپانہ رہا۔ ”کچھ نہیں! بس ایسے ہی...“ اس نے ٹالنے

ایک عرصے تک چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے کر اس نے اپنا حشر کر لیا تھا۔ شاید وہ یہ سب بناوٹی کرنے لگی تھی تاکہ نازیہ اس کی وجہ سے پریشان نہ ہو۔ اس نے جائے کا کپ اس کے آگے رکھ دیا وہ سلاکس کھانے میں مشغول ہو گئی جب کہ شانہ نے صرف چائے کی پیالی پر اکتفا کیا۔ کرسی کی پشت سے کمر لگا کر وہ دھیرے دھیرے سب بھرنے لگی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ صبر اور ضبط کے گھونٹ اپنے اندر اتار رہی ہو۔ شاید اپنے وجود کی کھوکھلی عمارت کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے صبر کے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے تھے کیوں کہ صبر سے زندگی کے مقاصد کے دروازے بالآخر ایک دن کھل ہی جاتے ہیں۔

مگر زیست کے اس مہیب جنگل میں کبھی کبھار اسے بہت ٹھٹھن ہونے لگتی۔ زندگی یوں تو بہت آسان دکھائی دیتی ہے لیکن جب جینا ایک مشکل امر ہو جائے تو یہی زندگی دیال بن جاتی ہے اور ابھی اس نے عمر عزیز کے صرف پینتیس برس گزارے تھے مگر کانٹوں کی راہ گزرنے اسے لہو لہان کر دیا تھا۔

”اچھا امی! میں چلتی ہوں۔“ نازیہ نے غلت میں چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور کرسی چھوڑ دی۔

”ارے، مگر اکیلی کہاں؟ دروازہ تو ابھی آئی نہیں۔“ اس کے ارادے پر وہ فکر مند ہو گئی۔

”آج میں اسے اس کے گھر سے لے لوں گی، آپ کیوں پریشان ہو جاتی ہیں ذرا اسی بات پر۔“ اس نے ماں کے فکر مند چہرے کو دیکھ کر بے تاب سے تسلی دی اور سبک ہوا کے جھوٹے کی طرح میز ہمایاں اتر لی چلی گئی اور وہ دیر تک کھڑی اسے دور جاتا دیکھتی رہی، اس کی پھونکوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

”خدا تمہیں سدا خوش اور آباد رکھے۔“ بے اختیار دعا دیتے ہوئے اس کی پلکوں پر شبنم ٹھہر گئی۔ کرب کی جس منزل سے وہ گزر رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

چکی منزل پر بھی لوگ جاگ کھڑے تھے۔ پانی کی موٹر پوری آواز کے ساتھ چل رہی تھی، گلی میں سبزی والا آواز لگاتا ہوا آگیا اسے خیال آیا کہ دوپہر میں شام

کاٹنے لگی ”پیسے تو ہیں نا؟“ اسے شش و پنج میں دیکھ کر انہوں نے کچھ اندازہ لگایا۔

”ہاں! اتنے تو ہیں... لیکن اسے کس کے ساتھ لے کر جاؤں؟“ اکیلے آتے جاتے وہ بہت گھبراتی تھی۔ ”راشدہ آپا کے ہاں فون کر دو، بھلے برے وقت میں جیسا بھی ہو کم از کم پوچھ تو لیتی ہیں، کیا بھلا سامان ہے ان کے بیٹے کا...“ وہ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے لگیں۔

”فیصل....“ اس نے یاد دلایا۔

”ہاں فیصل.... جب کہو فوراً کام کر دیتا ہے بچہ اور اگر ان کے میاں ہوں بھائی صاحب تو وہ بھی کر دیتے ہیں ہمارا کام... ابھی پچھلے ہفتے تو انہوں نے گوشت لا کر دیا تھا۔“ صاعقہ کے انکشاف پر وہ تڑپ گئی۔

”آپ بھی حد کرتی ہیں امی! وہ ہمارا خیال کر لیتے ہیں یہ بہت ہے، اچھا نہیں لگتا کہ انہیں اور زیر بار کریں، آپ کو ان سے گوشت نہیں منگوانا چاہئے تھا خواہ مخواہ کا احسان...“ کہتے ہوئے دل پر شدید ضرب پڑی، یاد کے ہالے میں ایک مانوس سا، اپنا اپنا سنا، دل سے قریب... ایاز کا چہرہ ابھر آیا۔ ایاز! جو اس کا شوہر تھا۔

”ارے کیا احسان؟ میں نے پیسے دیے تھے انہیں“ صاعقہ نے فوراً اس کی غلط فہمی دور کی۔

اس نے شکی نگاہوں سے انہیں دیکھا، اگرچہ صاعقہ اس کی ماں تھیں مگر وقت نے دونوں کو درمند سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔

دونوں سے ایک دوسرے کا درد چھپا ہوا نہ تھا، نہ ہی وہ دونوں اپنی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپاتی تھیں۔ ”پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس؟“ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی جیسے ان کے جھوٹ کر پکڑ کر محفوظ ہو رہی ہو۔

”ہاں! میں بتانا بھول گئی دراصل وہ جو میرا سروکار سیٹ تھا نا، یونی بے کار پڑا ہوا تھا اتنے دن سے اور رکھے رکھے ہمیں دے بھی کیا رہا تھا۔ میں نے اسے بکوا کر بھائی صاحب سے ایک جگہ انویسٹ کر دیا ہے۔“ بات بہت اہم تھی مگر کہنے کا انداز عام سا تھا اس کے

کی تو بہت کوشش کی مگر آنکھیں بھرا آئیں۔

”کچھ تو ہے نا... کہاں سے آ رہی ہو آخر؟ بتائے غائب ہو گئیں کم از کم مجھے جگا تو دیتیں اور اب اتنی نڈھال ہو رہی ہو۔“ عمر اور تجربے نے صاعقہ میں استقلال اور ٹھیراؤ پیدا کر دیا تھا مگر اس کے اندر تو جیسے اب تک پارہ ٹھکر رہا تھا وہ چھوٹی سی معمولی بات پر حساس ہو جاتی، بے چینی اور اضطراب کا پارہ اس کی روح میں اتر ا ہوا تھا ذرا سی بات پر دل چھوٹا ہو جاتا اور حوصلہ چھوٹنے لگتی تھی۔

”عجیب بد نظر آدمی ہے یہ بشر چنا... مجھ سے ایک بل اس کا وجود برداشت نہیں ہوتا اور وہ جب دیکھو راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“ کوشش کے باوجود اس کے آنسو روک نہ سکے اور اس کے گالوں پر پھیل گئے۔

اس کے دامن میں صرف محرومیاں اور غم ہی رہ گئے تھے۔ کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا بس ایک عزت رہ گئی تھی یا پھر جان سے پیاری نازک سی دونوں بیٹیاں.... نازیہ اور رافعہ یا صاعقہ کا مہربان وجود تھا وہاں کے لیے۔ باقی سب سے تو وہ حالات کے دھارے میں ہاتھ دھو چکی تھی۔ دل پر اتنے زخم لگے تھے کہ اگر کھول کر دکھائی تو گئے نہ جانے مگر یہاں دیکھنے کو کون رہ گیا تھا۔ لوگ تو صرف دل کشی، رعنائی اور خوشیوں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ مجبوریوں اور دکھوں سے تو یوں دور بھاگتے ہیں جیسے وہ چھوٹ کی بیماری کی طرح انہیں بھی لگ جائیں گے۔

”دفع کرو... نہ سوچا کرو اتنا، دنیا تو بس ایسی ہی ہے۔ صافقہ نے حسب معمول سرسری انداز میں ٹالا ”لاؤ سبزی مجھے دو میں بنا دوں تم اپنا کام کر لو“ انہوں نے اپنا خالی کپ سر کا کر وہیں سبزی کاٹنے کے لیے جگہ کر لی، کامیابی سے وہ اس کا دھیان ہٹا چکی تھیں۔

”کام تو ہے لیکن... رافعہ! کیا آپ نے اسے دیکھا اب بھی بخار ہے۔“ اس کا ذہن آ زردہ سوچوں سے ہٹ کر رافعہ کی طرف چلا گیا۔

”ہاں لگ تو رہا ہے۔ بہتر ہے ڈاکٹر کو دکھا دو۔“ صاعقہ نے خیال ظاہر کیا، وہ کچھ سوچتے ہوئے ہونٹ

ہوتی تھی اور دل پر نامعلوم سی اداسی چھا جاتی تھی۔ ان کے ڈھکے چھپے اشاروں میں بھی کافی کھلی وضاحت تھی اور کئی بار تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ اسی کے گھر ہو کر بھی گئی تھیں۔ ان کے بھائی کا نام ولی تھا۔ چار بھائیوں میں تیسرا نمبر تھا مگر جدوجہد پریشان زندگی گزار رہا تھا۔ زندگی اس کیلئے مذاق بن گئی تھی بیوی طلاق لے کر علیحدہ ہو گئی تھی۔ بچہ بھی تین چار سال کا تھا۔ دراصل راشدہ آپا اپنے بھائی کیلئے اس کی ہم راہی کی خواہاں تھیں۔ وہ دونوں کا جوگ چاہتی تھیں اور ان کی اس خواہش پر اسے غصہ آتا تھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے راشدہ آپا... بیٹی میری جوان ہو رہی ہے اور میں ان کے بھائی سے بیاہ رہ چالوں۔“ وہ دل میں خوب کڑھتی تھی۔

پھر اس نے ان سے رخ دے کر بات کرنا چھوڑ دیا شاید وہ بھی مایوس ہو گئیں تھیں اس لیے کوشش ترک کر دی۔ لیکن آخری کوشش کے طور پر انہوں نے صاعقہ سے اس پر دیاؤ بھی ڈلوایا تھا اور ان کی بات پر وہ آپے سے باہر ہو گئی تھی۔

”مجھے نہیں کرنی شادی... ان سے کہیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دیں، مجھے اپنی مرضی سے چینی دیں کیوں خواہ وہ میری ہم دروین رہی ہیں۔“ وہ آگ اگلنے لگی، دھڑکنیں بے خبر اڑھو گئیں اور درد کی ٹیسیں پورے جسم و جان میں دوڑ گئیں۔ قلب میں آویزاں ایاز کی تصویر پوری شد و مد سے ابھر کر عیاں ہو گئی۔ اس روز وہ خوب روئی تھی۔ تب صاعقہ نے کانوں کو ہاتھ لگا کر آئندہ کے لیے توبہ کر لی تھی اور راشدہ آپا بھی مایوس ہو گئی تھیں۔ البتہ اس کے طرز عمل سے بد دل ہو کر انہوں نے جوش و خروش سے ہر دوسرے روز آنا کم کر دیا تھا۔ لیکن ان کا مینا فیصل اور میاں اسی طرح ان کے ہر کام کے لیے مستعد رہتے تھے شاید ثواب سمجھ کر یا خدمت غلطی کے جذبے کے تحت۔

راشدہ آپا، صاعقہ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ جب انہوں نے یہ گھر کرائے پر لیا تھا تو اتفاق سے دو بلاک چھوڑ کر ہی راشدہ آپا کا گھر تھا یوں دعا سلام سے بڑھ کر بات و ایسکی اور گہرے میل جول تک جا پہنچی تھی

دل کے اندر بڑے زور سے کچھ ٹوٹا جیسے کچھ پرانے خواب یا ماضی میں سنبھال کر رکھا جانے والا اس کی گڑیا کا جیولری باکس ٹوٹ گیا ہو۔

اس کی دادی کے قوتوں کا سر و کا وہ نایاب طلائی سیٹ انہوں نے چپ چاپ ہی ختم کر دیا تھا۔

”یہ یادنی ہے جانی۔“ اس کا دل دکھ سے لبریز ہو گیا۔ ”میرے پاس بھی تو دو ایک سیٹ رکھے ہیں وہ بھی تو کام آسکتے تھے۔“ اسے شدید اعتراض ہوا، اس کی ناراضگی میں شکایت پوشیدہ تھی۔

”وہ بھی کام آئیں گے خیر سے، نازیہ کی شادی پر، میرا کیا ہے بیٹی۔ اب تو پہننا اور ڈھننا بھی اچھا نہیں لگتا پھر کیا فائدہ تھا اس کا، کسی کام تو آیا نا۔“ صاعقہ کے لہجے میں گئے زمانوں کے درد نہاں تھے۔

وہ چپ رہ گئی مگر دل میں ملال بھر گیا۔ قسمت نے اس کے ساتھ خوب مذاق کیا تھا۔ درد تو دیر مگر درد کا درماں نہ ہا تھا۔ بے بسی کا احساس اسے ہر پرل رلاتا تھا۔ رافیعہ اٹھ کر وہیں چلی آئی۔ اس کا چہرہ بخار سے دھب رہا تھا۔

”میرا خیال ہے اس کا بخار تیز ہو گیا ہے تم پہلے اس ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“ صاعقہ نے نشوونما سے رافیعہ کو دیکھا جس کا چہرہ سست رہا تھا۔ ”مگر اس وقت تو راشدہ آپا کے ہاں کوئی نہیں ہوتا فیصل آفس جاتا ہے اور انکل آج کل خود بیمار ہیں۔“ اس نے غور کر کے عذر تراشا۔

دراصل راشدہ آپا سے کچھ دنوں سے وہ خود کافی کھینچ رہی تھی۔ ان کی عجیب و غریب باتیں اسے ہضم نہ ہوتی تھیں اسے دیکھتے ہی وہ اکثر نا فصیح کاروپ دھار لیتیں۔

”اکیلا جی ہے۔“ بچیوں کا ساتھ ہے، ابھی زمانہ بڑا خراب ہے تم خود سمجھ دار ہو۔ ہمارے مذہب نے ہمیں بہت سی آسانیاں دی ہیں یوں اکیلی کب تک چو گی؟ زندگی ایک دوسرے کے سہارے گزرتی ہے خدا ”مرحوم“ کو جنت نصیب کرے اب یہ اس کی مرضی... مگر اب آگے کی بھی سوچو۔“ نہ جانے وہ اسے کیا سمجھانا اور بتانا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کی باتوں سے اسے ابھرنے

گھر شبانہ نے ان کے خلوص کو ٹھکرا دیا اور اب وہ جان بوجھ کر ان کے گھر سے کوئی بھی کام کروانے میں شامل نہ ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے عذر تراشی ہی لیا۔ ”پھر اسے کس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ گی یا میں لے جاؤں؟“ صاعقہ کو دوسرا حل یہی نظر آیا۔ ”نہیں... آپ کہاں سیڑھیاں اتریں گی۔ ویسے ہی آپ کی ٹانگوں میں تکلیف ہے۔“ اس نے یہ مشورہ بھی رد کر دیا۔

”پھر کیا کرو گی۔“ وہ زچ ہو گئیں۔
”ناظمہ آئی کے ہاں پتا کر لیتی ہوں شاید فرحان ہو یا پھر ان کی بیٹی آسیہ کے ساتھ چلی جاؤں گی“ اس نے آپ ہی فیصلہ کر لیا۔

”ہاں.... یہ صحیح رہے گا۔ اچھے پڑوسی بھی خدا کی نعمت ہوتے ہیں مشکل وقت میں انہوں نے ہمیں بہت زیادہ اخلاقی سہارا دیا تھا ایک آواز پر لپیک کہتے ہیں، ماں باپ کی تربیت دونوں بہن بھائی آسیہ اور فرحان میں منہ سے بولتی نظر آتی ہے۔“ شبانہ کو ان کی بات سے بالکل بھی اختلاف نہ تھا کیوں کہ اس گھر ان سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے، اماں کے بعد ان لوگوں نے بہت خوش خلی سے ان کا ساتھ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، تم اسے لے جاؤ، روٹی میں ڈال لوں گی۔“ صاعقہ نے کسی ارادے سے کہا۔
”میں جلدی آ جاؤں گی امی۔“ اس نے فوراً ہی انہیں روٹی ڈالنے سے منع کرنا چاہا۔
”چار روٹیاں بیلنا کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔“ صاعقہ کو کوئی بھی کام دوجھرنہ ہوتا تھا۔

بیٹی کے درد نے انہیں بہت ذمہ دار اور خود سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ رافیہ کے گرد جادر لیٹ کر ناظمہ آنٹی کے گھر چل دی۔ ایک گھر چھوڑ کر ہی ان کا گھر تھا آدمی رات کو بھی آواز دینے پر ناظمہ آنٹی اپنے بیٹے فرحان کو دوڑا دیا کرتی تھیں۔ اس کی بیوی کو بڑا سہارا دیا تھا انہوں نے، دن کے دس بج چکے تھے صبح میں جاگ ہوئی تھی وہ آہستہ قدموں سے رافیہ کو لے ناظمہ آنٹی کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

جس وقت وہ واپس گھر لوٹی تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا سورج اپنی تمام تر جولانی کے ساتھ چمک رہا تھا صاعقہ شاید اسی وقت فارغ ہو کر بیٹھی تھیں رافیہ بخار کے باعث بہت آہستہ سے چل رہی تھی۔
”کانی دیر ہو گئی تمہیں۔“ صاعقہ نے استفسار کیا۔
”ہوں... بخار بھی زیادہ ہے اور وہاں کلینک پر رش بھی بہت تھا۔“ وہ خود بھی تھک گئی تھی۔ رافیہ بیڈ پر لیٹ گئی اس کے چہرے پر نقاہت برس رہی تھی۔
”کون کیا تھا ساتھ۔“ صاعقہ نے معمول کے سوال کیے۔

”فرحان ہی ملا... آسیہ تو اپنی سہیلی کے ساتھ جامع گئی ہوئی تھی۔“ اس کا لہجہ بجھا بجھا اور چہرہ تاریک تھا جسے صاعقہ نے اس کی تھکاوٹ پر محسوس کیا۔
”کھانا لگاؤں... بھوک لگ رہی ہو گی، صبح سویرے کی چائے پینکائی ہوئی ہے حلق میں۔“

شبانہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں عورت مکمل اور بھرپور دکھائی دیتی ہے اور یہ ایک خطرناک موڑ ہوتا ہے۔ صاعقہ کو بھی شبانہ کی بھرپور نسوانیت دیکھ کر اس کی تنہائی اور بے امانی کا سوچ کر خوف آنے لگتا تھا۔

”بھوک نہیں ہے امی ابھی“ اس نے صاف منع کر دیا
”ارے واہ! ہم پاگل بنے اتنی دیر سے انتظار کر رہے ہیں، تمہاری وجہ سے میں نے بھی نہیں کھایا کھانا۔“
”ابھی تو آئی ہوں امی۔ پہلے ذرا رافیہ کو دیکھ لوں بہت غمگین حال ہو رہی ہے۔“ چائے کے باوجود وہ اپنے لہجے کو ہم وار نہ رکھ سکی۔ اس کے کم زور لہجے میں حوصلے کی کمی اور دکھ کا طوفان تھا۔ آنکھوں میں جھلملاتے ستارے صاعقہ سے چھپ نہ سکے۔

”ارے تم رو رہی ہو، کیا ہوا۔“ اس کا کرب صاعقہ کو اپنے اندر کروٹیں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ ایک شبانہ ہی تو ان کے کلیجے کی ٹھنڈک کا سامان رہ گئی تھی ورنہ باقی سب تو ختم ہو چکا تھا اس بھری دنیا میں دونوں کو ایک دوسرے کا بہت سہارا تھا۔

”شبانہ... بولتی کیوں نہیں، کیا ہوا ہے، رافیہ تو ٹھیک ہے نا“ انہیں گہری تشویش ہوئی۔

”لوگوں کی ذہنیت اتنی گندی کیوں ہوتی ہے ہی۔“
 شاید تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔
 ”ذہنیت... کیا کسی نے کچھ کہہ دیا۔“
 صاعقہ ٹھٹھکی گئیں۔

اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ ہارے ہوئے انداز میں برسوں کی ٹنگان بھی صاعقہ کے دل کو کچھ ہوا۔ جوان بیٹی کا دکھ انہیں دیکھ کی طرح چاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی انہیں ایسا لگتا کہ جیسے زندگی کا دوسرا نام صرف ”دکھ“ ہونا چاہیے تھا۔ دکھ جوان کے وجود میں ابھرنے لگا تھا جو تھان کے وجود میں ملنے والا ایک ناسور بن گیا تھا جو ہر آن رستار ہوتا تھا۔ یہ دکھ بھی کبھی کبھی اس طرح احاطہ کر لیتے ہیں کہ کسی سمجھور کی طرح اپنے اندر سالم انسانوں کی زندگیوں کو سمو کر انہیں ہمیشہ کیلئے غم و اندوہ کے گہرے سمندر میں ڈبو دیتے ہیں۔

”ابھی آتے ہوئے سچے وہ... بشیر چٹا کھڑا تھا فرحان کو میرے ساتھ دیکھ کر کہنے لگا کہ... شدت غم سے وہ جملہ پورا نہ کر پائی۔“
 ”کہ... اچھا شکار پھانسا ہے۔“ کچھ توقف کے بعد اس نے بہ مشکل جملہ پورا کیا۔

”خدا غارت کرے اس شوہر بے حیا کو، اس کی آنکھ میں حیا ہی کہاں ہے وہ تو بے ضمیر انسان ہے ایسے لوگ اسی طرح کے اوجھے وار کرتے ہیں اپنی نیت اور خیال کے آئینے میں سامنے والے کو جانتے ہیں۔“ صاعقہ کو خود بھی بہت صدمہ ہوا تھا مگر وہ شبانہ کے سامنے چٹان بن کر اسے سمجھانے لگیں۔

”مگر میرے دامن میں تو چھیننے ڈال دیے نا... فرحان تو میرے بھائیوں جیسا ہے مجھے باجی کہتا ہے۔“ اسے کسی طور بھی فرار نہ آ رہا تھا۔

”بیٹی! دیکھو مولی اگر کچھڑ میں بھی گر جائے تو اپنی تب و تاب نہیں کھوتا جب تک اپنی شخصیت میں جھول نہ ہو کوئی دوسرا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ اس کی بے بسی دیکھ کر صاعقہ بھی ذہنی طور پر پریشان ہو گئیں تھیں۔
 ”دفع کرو اسے، میں راشدہ آپا سے بات کروں

گی ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے، اب یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔“ صاعقہ نے اسی وقت ارادہ باندھ لیا۔
 ”چلو اٹھو! بے کار سوچوں میں اپنا ذہن پراگندہ نہ کرو۔“ اسے بہ دستور سوچ میں ڈوبے دیکھ کر صاعقہ نے اس کا شانہ ہلایا۔ وہ ہولے سے گردن ہلا کر لفافے سے گولیاں نکال کر خوراک کا تعین کرنے لگی۔ ان گزریے دور برسوں میں پہلی بار وہ شدید ذہنی کیفیت کا شکار ہوئی تھی۔ اتنے دن سے اپنے غم میں ہی گم تھی اور اب سنبھلنے کی کوشش کی تو پہلا ہی کاری دار اس کے ہوش اڑا گیا وہ رافیعہ کو دوا دینے لگی، صاعقہ نے کھانا گرم کر دیا دھوپ کھلی ہوئی تھی اور سارے برآمدے میں بھڑکی تھی۔ شبانہ نے غور سے دھوپ کو دیکھا اب اس کی زندگی میں بھی دھوپ بھڑکی تھی کہیں بھی تو خندک نہ رہی تھی اس وقت اطلاعی کھٹی بجی۔

”نازیہ آئی ہوگی۔“ صاعقہ دروازے کی طرف بڑھیں اور دروازہ کھول دیا۔
 سامنے ہی بشیر چٹا کی طلاقی یافتہ بہن رمنا اور کرخت صورت بیوی مبینہ کھڑی تھیں۔

”ارے آپ.... خیریت ہے۔“ صاعقہ رسمی بھی مکسرانہ پائیں اور یہی صورت حال ان دونوں کے چہرے پر تھی۔

”اندر آجائیں۔“ صاعقہ نے تقاضہ اخلاق نبھایا ورنہ تو وہ لوگ انہیں اپنے اطوار اور کرداروں میں بھلنے نہ لگتے تھے۔

”نہیں! ہم بس آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ آئندہ محلے میں ملنے جلتے وقت ذرا احتیاط سے کام لیں، یہ جن لوگوں سے آپ ملتی جلتی ہیں نا، آئندہ ان سے بالکل نہیں ملیے گا۔“ مبینہ نے سرد انداز میں انہیں آسیہ اور فرحان کے گھر والوں سے نہ ملنے کی تنبیہ کی صاعقہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”یہ کیا بات ہوئی... ہماری مرضی ہم کسی سے بھی ملیں ہمارے اور ان کے...“ ان کی بات ادھوری رہ گئی۔
 ”دیکھو بڑی بی! بہتری اسی میں ہے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں وہ شرافت سے مان لو، ہم لوگ اگر اکیلی اور آزاد

”ہم نے تم دونوں کو منع کر دیا ہے ذرا سہجہ کر قدم اٹھانا۔“ جانے سے پہلے مبینہ نے تاک کر دھمکی آمیز وار کیا۔

صاعقہ اور شبانہ ان کی اس درجہ ڈھٹائی اور دھونس پر لرز کر رہ گئیں عجب مقام آ گیا تھا کہ ہر روز بن بند ہوتا نظر آ رہا تھا۔ آزمائش کے دن بہت ٹھن ہو گئے تھے۔ اور آزمائش کی یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ شاید اس دن سے جب شبانہ پیدا ہوئی تھی کیوں کہ لڑکی کی قسمت اس کی پیدائش سے متھی ہوئی ہے۔ اول روز سے ہی اس کے والدین کو اس کی ذات سے بہت سے خوف اور خدشات لاحق ہو جاتے ہیں مگر وہ تو بڑی بختوں والی ثابت ہوئی تھی کیوں کہ شادی کے چھ برس بعد والدین کی جھولی اس نے خوشی سے بھر دی تھی اس کی پیدائش اس کے والدین کی شادی کے چھ سال بعد مکمل میں آئی تھی۔ آئندہ دو سال بعد اس کے بھائی کلیم کی پیدائش کو بھی اس کے خوش بخت قدموں کا اعجاز قرار دے دیا گیا تھا۔ شاید آزمائش کے دن جب شروع ہوئے تھے جب شبانہ یتیم ہوئی تھی۔ باپ کی شفقت اور چھاؤں سے محروم ہونے کا کڑا دکھ شبانہ، صاعقہ اور کلیم نے مل کر سہا تھا۔ چلتا ہوا کاروبار سنبھالنے کے لیے صاعقہ نے اپنی ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ شبانہ اور کلیم سے انہیں بڑا سہارا تھا وہی دونوں اس وقت ان کی طاقت تھے۔ دن روتے سکتے گزر رہی گئیں شبانہ کا ایک اچھا رشتہ آیا تو انہوں نے اسے رخصت کرنے میں دیر نہ کی کیوں کہ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہ تھا اس لیے صاعقہ کو اس کی بڑی فکر تھی وقت کی اونچ نیچ نے انہیں بہت محتاط کر دیا تھا۔ بیوگی کی چادر اوڑھ کر انہوں نے مستقل مزاجی سے حالات کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ شبانہ کو ڈولی چڑھا کر یہ بوجھ کافی حد تک کم ہو گیا تھا کلیم اور شبانہ ان کی زندگی کے وہ ستارے تھے جان کی امید کے افق پر پوری تب و تاب سے جگمگا رہے تھے۔ ابھی دونوں کے دم سے انہوں نے آبلہ پانی کا یہ ٹھن سفر طے کیا تھا۔ شبانہ کی شادی کے بعد ان کی تمام امیدیں کلیم سے وابستہ

رہتی ہو تبھارا کوئی سر پرست نہیں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ماں بیٹیاں اپنی من مانی کرنی پھر وہ لوگ ملنے کے قابل نہیں، ان سے راہ و رسم مت بڑھاؤ۔“ رمنہ نے از حد بد مزہی سے بات کی، بشیر چنانے خوب کان بھر کر بھیجا تھا ان دونوں کے خلاف۔

”آپ ہماری کرائے دار ہیں۔ یہ گھر ہمارا ہے آپ سے پہلے سے ہم اس محلے میں رہتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ کون کس فاش کا ہے آپ کے گھر برا بھلا بتانے کے لیے کوئی مرد موجود نہیں، اس لیے بہتر ہے کہ آپ ان لوگوں سے میل جول نہ رکھیں۔“ مبینہ نے رمنہ کی بد اخلاقی کو لیول کرنے کے لیے لہجہ کو نرم کر لیا تھا لیکن پتھر مارنے سے باز نہ آئی تھی۔

”ہماری ان سے کافی پرانی دعا سلام ہے۔ ہم اپنا اچھا برا جانتے ہیں آپ کو فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔“ شبانہ ویسے ہی غصہ کر کے بیٹھی تھی اس لیے اس کا لہجہ فطری طور پر تنگھا ہو گیا۔ بشیر چنانہ کی اس کانیاں حرکت پر اسے مزید غصہ آ گیا تھا۔

”بہتر یہی ہے کہ آپ صرف اپنے رشتے داروں سے ملیں یا پھر جو بھی کام ہے ہم سے نہیں۔“ مبینہ اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

”ہم یہاں مفت میں نہیں رہ رہے، کرایہ دیتے ہیں آپ کو... زر خرید نہیں ہیں آپ کے...“ شبانہ سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔

”یہ کرایہ تو پرانا ہو گیا ہے۔ تم دونوں کی بے بسی اور لا چاری کا لحاظ ہے ورنہ کرائے اب بہت بڑھ گئے ہیں۔“ رمنہ نے در پردہ دھمکی دے ڈالی۔

”دنیا میں صرف ایک آپ کا گھر ہی نہیں رہ گیا۔ بہت گھر ہیں اور بھی... ہم دوسرے گھر کا بندوبست کر لیں گے۔“ شبانہ نے اتنی ذلت کا تصور بھی نہ کیا تھا۔

”او! بہت لوگ ہیں... بہت لوگ۔“ رمنہ تمسخرانہ ہنسی، اس کی ہنسی کا زہر اس کے بدن میں پھیل رہا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کی کنپٹی کی نیلی لسیں ابھر آئیں وہ مزید ایک لفظ بھی نہ بول پائی۔ بشیر چنانہ نے اپنی ذلالت کھل کر ظاہر کر دی تھی۔

ہو گئیں، وہ ان کی ذہنی عمر اور ٹوٹے ہوئے خیالوں کا سہارا تھا مگر قسمت کو ابھی اور آزمائش منظور تھی۔ وہ ایک منحوس دن تھا جب کلیم صبح کا گیا شام کو بھی نہ لوٹا اور انہیں ایک دائمی انتظار سونپ گیا وہ راہ گئی رہ گئیں مگر وہ زندہ سلامت نہ لوٹا، جب اس کا بے جان لاشہ رکھ آیا تو وقتی طور پر وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھیں۔ راہ چلتے ہوئے وہ دگر واپس کے تصادم کی زد میں آ گیا تھا صاعقہ غم بے بسی سے دیکھتی رہ گئیں اور شبانہ بھائی بھائی بیکار رہ گئی۔ مگر کلیم آغوشِ گد میں جا سویا۔ صاعقہ کا اب شبانہ کے سوا کوئی نہ رہا تھا، وہ تنہا اپنے گھر میں رہنے لگیں۔ شبانہ اور ایاز نے انہیں اپنے ساتھ رہنے پر بہت مجبور کیا مگر صاعقہ نے انکار کر دیا کیوں کہ شبانہ بھرے پرے سسرال میں رہتی تھی اور صاعقہ کو یوں سمدھیانے کا احسان لینے میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ کاروبار سے غافل کیا ہوئیں کہ بد اعمال ملازمین نے سارا کاروبار بھی چوہٹ کر دیا ان کا گھر اپنا ذاتی تھا جسے فروخت کر کے انہوں نے چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا اور باقی پیسہ اپنے داماد ایاز کے پاس کاروبار میں لگا دیا۔ بعد میں صاعقہ کی ضد سے ہار کر شبانہ اور ایاز ان کے پاس آ کر رہنے لگے۔ شبانہ کو مشترکہ نظام سے نجات ملی تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ ورنہ وہاں گھریلو اور کاروباری دونوں طرح سے پھجوری پکی ہوئی تھی۔ جب ایاز نے علیحدہ ہو کر اپنے کاروباری داغ بیل ڈالی اور اس کی ترقی و خوش حالی بھی سب کو نظر آئی تو اس کے دوسرے بھائیوں نے بھی علیحدہ علیحدہ رہائش اختیار کر لی۔ بونس میں ایاز کو ترکے کی مزید رقم ملی اور کاروبار چمکنے لگا۔ مگر شبانہ کے اندر سے احساسِ زیاں ختم نہ ہوتا تھا باپ اور بھائی کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر آنے والے بل سے وہ خوف زدہ رہتی تھی اور دعائیں مانگتی رہتی تھی مگر اس کی دعائیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ شاید اس کے بخت سو گئے تھے اور بد قسمتی نے اس کا گھر کی دہلیز دیکھ لی تھی۔ ایاز کی بیماری نے سب کچھ ختم کر دیا۔ اس کی طبیعت کافی دن سے گری گری رہنے لگی تھی جب چیک اپ کروایا تو یہ

جان لیوا انکشاف ہوا کہ وہ بلند کینسر کے آخری اسٹیج پر ہے اور اس خبر کے ساتھ ہی شبانہ کی خوشیوں کا سورج بھی غروب ہو گیا ایاز کے علاج معاملہ میں اس نے روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہا دیا یہاں تک کہ کاروبار بھی آخری کنارے پر پہنچ گیا اور وہ چھوٹا سا فلیٹ چھوڑ کر انہیں کرائے کا گھر لینا پڑ گیا۔ مگر گھر بدلنے سے یا راستہ بدلنے سے تقدیریں نہیں بدل جایا کرتیں۔ قسمت کا لکھا کھلا ہوتا ہے، ایک سو گوار دن ایاز نے اپنی دو پیاری پیاری بیٹیوں اور نوخیز بیوی کو عمر کے خوب صورت موڑ پر سو گوار اور تنہا چھوڑ دیا۔ صاعقہ کی بھی دھلتی عمر بھی کوئی جمی رشتہ باندھنا ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ شبانہ بہت خوف زدہ رہنے لگی تھی ابھی خود اس کی عمر بھی کم تھی اور شباب مکمل تھا مگر اس کی زندگی میں ادھر واپس آ گیا تھا جس کے سوا نے اس کے روپ کو دانتہ کر دیا تھا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس کے بے داغ دامن پر گندے چھینٹے پھینکے جا رہے تھے اسے اپنی عصمت و عفت کی شفاف چادر کو بچانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔

یوں تو ایک مدت سے رشتوں ناتوں کا ٹوٹ تعلق بننا چلا آ رہا ہے، لڑی کی طرح یہ رشتے ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے ہیں مگر خود غرضی اور مفاد پرستی میں ڈھلے ہوئے قالب نہ کسی کی مشکل دیکھتے ہیں نہ پریشانی اس کا بھی ماسوائے چند ایک کے کوئی برسان حال نہ رہا تھا۔ ایاز کے بھائیوں نے تو صرف رقی قرابت داری پر رقرار رہی تھی کہیں ملتے تو حال احوال پوچھ لیا جاتا۔ ایک صرف راشدہ آبا تھیں جو مستقل مزاجی سے بھاری تھیں مگر اب کچھ دنوں سے ان کی انوکھی سی بات پر وہ ان سے کترانے لگی تھی اس کی بیٹی اب سترھویں سن کر پار کر رہی تھی ایسے میں راشدہ آبا کا عجیب سا اصرار اسے سبک یا کر دیتا اس دن وہ بازار سے گھر لوٹی تو دھک سے رہ گئی۔ راشدہ آبا آج پھر آئی ہوئی تھیں اسے شدید کوفت ہوئی کیوں کہ وہ اکثر ویش تر اپنے مذکورہ بھائی کے ساتھ ہی آنے بھانے آتی رہتی تھیں، مگر جب اندر آئی تو ان کے ساتھ ان کے بیٹے فیصل کو دیکھ کر اسے اطمینان ملا۔ فیصل

بہت سعادت مند بننا تھا۔ راشدہ آپا کے اس لائق فرزند کو ہر کوئی آنکھ بند کر کے اپنی فرزندگی میں لینے پر تیار ہو جاتا مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ ان کی گھاگ نظریں آج کل قد کاٹھ نکالتی ہوئی نازبہ پر ہیں۔ وہاں موضوع گفتگو مالک مکان کی تازہ تازہ ٹیک حرکت تھی۔

”ایاز کے سامنے کوئی بات نہ تھی۔“ اسے راشدہ آپا کے الفاظ جیسے ہوئے لگے۔ اس کے چہرہ چھید وجود میں اب مزید نجاش نہ رہی تھی اس نے شامی نظروں سے راشدہ آپا کو دیکھا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ان کی ہمت کیسے ہوئی یہ بکواس کرنے کی ... ارے ہم شریف خاندانی لوگ ہیں۔“ انہیں جلال آگیا ”بلا وجہ تنگ کر رہے ہیں جب کہ کرایہ تو میں باقاعدگی سے دیتی ہوں، دراصل پچھلے دنوں کچھ مسائل رہے تو...“ صاعقہ نے روانی میں کہنا شروع کیا مگر شانہ کی تینبی نظریں ان کی زبان روک دی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ دیکھوں کی سمجھ کی جائے اسے مظلومیت کی زندگی پسند نہ تھی مگر گزاری پڑ رہی تھی۔ پسندنا پسند پر بھلا اختیار ہی کب ہوتا ہے ایسے میں جب تمام اختیارات کے سامنے بھی بے بس ہوتے ہوں۔

”مسائل کا حل نکالا جاتا ہے نا صاعقہ... ذرا سوچو تم دونوں تنہا اور اکیلی ہو، کل کلاں خدا نہ کرے کچھ ہوا... یہاں تو بیل کا بھروسہ نہیں اور پھر یہاں تو جوان بچیاں بھی ساتھ میں ہیں۔ تم لوگوں کو محفوظ چھت کی ضرورت ہے گھر بدلنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، اصل مسئلہ تو تمہارے اکیلے پن کا ہے۔ میں نے تو چاہا تھا کہ تم لوگوں کی تنہائی کا کچھ بندوبست کروں، بھلا کیا برائی ہے اس بات میں، ہمارے مذہب میں جس طرح مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے اسی طرح عورت کے لیے بھی یہ نرمی ہے کہ بیوہ ہونے کے بعد وہ دوسرا نکاح کر سکتی ہے جب کہ اب تو یہ ناگزیر ہو گیا ہے، تم کس کس کی زبان روکو گی؟“

وہی ایک بات... وہی ایک اصرار جسے سن کر شانہ سلگ گئی۔

”پچھا ہی لے لیا میرا۔ میری زندگی میں

کہیں بھی سکون نہیں، ایک ہی ہم درد ملیں اور وہ بھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئیں۔“ وہ دل میں بہت تلملانی اور فوراً وہاں سے اٹھ گئی۔

”ارے تم کہاں چلیں۔ شانہ؟ اس طرح معاملات سے نظریں چرا کر تم کیا سمجھتی ہو کیا تمہارے مسئلے حل ہو جائیں گے؟ بالکل نہیں... وہ بڑھتے بڑھتے دلدل بن جائیں گے ایسی دلدل جو جو دو کو آکٹو پس کی طرح جکڑ لیتی ہے نہ جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔“ راشدہ آپا نے ایسا خوف ناک نقشہ کھینچا کہ وہ دہل گئی۔ انہوں نے پھر اس کی دھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے حتیٰ سے لب پہنچ کر خود کو کوئی ناگوار بات کہنے سے روکا۔ ایاز کی تصویر اب تک اس کے دل میں بسی ہوئی تھی اس کی رفاقت میں بیٹے ہوئے پہ وہ کیسے بھول سکتی تھی اب تک اپنے تکیے پر اس کے وجود کی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی اس پر رقت طاری ہو گئی۔

”یہ... نا... ممکن ہے راشدہ آپا۔“ لڑکھڑاتے لفظوں میں جواب دے کر وہ رخ موڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ صاعقہ اور راشدہ آپا نے ایک دوسرے کو تاسف سے دیکھا اس کی حالت قابلِ رحمت تھی۔ صاعقہ کو معلوم تھا کہ وہ اب گھنٹوں اپنی بریادی کا ماتم کرے گی۔ نازک سی جان اور پہاڑی زندگی... کمبیر مسائل اور تنہا سفر!

☆☆☆

رافعہ کے اسکول میں میلہ لگا تھا اور وہ بہت ضد کر کے اپنے شوق سے میلے میں گئی تھی۔ چھوٹی سی عمر تھی اس طرح چھوٹے چھوٹے شوق اس کے دل میں بھی تھے جنہیں شانہ پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی تھی مگر بھی وہ اس کی دسترس سے دور ہوتے تب شانہ کڑھ کر رہ جاتی۔ اب بھی وہ اس کی خواہش اور خوشی کی خاطر میلے میں شرکت کر رہی تھی اسکول کی عمارت رنگارنگ جھنڈیوں اور آرائشی اشیاء سے مزین تھی۔ وہ ٹکٹ لے کر اندر چلی آئی اور رافعہ کے چہرے پر مسرت کی انوکھی سی چمک پھیل گئی بھی

جواب ہی نہ دے سکی۔

”شبانہ... دیر نہ کریں، گاڑی میں بیٹھیں میں گھر جا رہا ہوں۔“ کوئی جواب نہ پا کر انہوں نے خود ہی اندازہ لگا کر اسے نہ جانے حکم دیا تھا یا پھر اصرار! مگر بہر حال اس وقت وہ ان کی پیش کش نہیں ٹھکرا سکتی تھی۔ ولی نے فرنٹ ڈور کھول دیا، ناچاراً سے بیٹھنا ہی پڑا۔ رافیعہ البتہ اس ”آسانی“ پر اچھلتی کودتی پچھلی سیٹ میں دھنسن گئی۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔ اس کے کتابی چہرے پر تھکاوٹ اور ابتری کے آثار تھے وہ ولی کے ساتھ بیٹھ تو گئی تھی مگر اب متذبذب تھی۔

”کیا سوچتے ہوں گے، اپنے مطلب کے لیے ساتھ قبول کر لیا خواہ عارضی ہی سہی! مگر وہ اٹوٹ ساتھ جس کی تمنا کی تھی اسے ٹھکرا دیا... لیکن اس میں میرا کیا قصور؟ حالاں کہ یہ سب جانتے ہیں کہ میں کتنی مجبور ہوں۔“ وہ شرم سار ہوئی رہی۔

”وہی سب اس وقت آپ جا کہاں رہی تھیں... کہیں جا رہی تھیں یا گھر ہی آ رہی تھیں۔“ اس کی دلی حالت سے بے خبر موڑ کاٹتے ہوئے ولی نے سرسری پوچھا۔

”اسکول... وہ، رافیعہ کے اسکول میں میلہ لگا تھا۔“ وہ بلاوجہ بوکھلا گئی۔

”ہوں... میں بھی آج اتفاق سے آفس سے جلدی اٹھ آیا، دراصل شاہی کو کافی دن سے اکیلے پن کا احساس زیادہ ہو رہا ہے اسی لیے اس کی خاطر جلد چلا آیا اولاد کی خاطر انسان کو کبھی کبھار اپنے دل کے خلاف بھی فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں اب وہ تو بچہ ہی ہے، آپ ہی بتائیے میں اسے کہاں سے لاکر دوں ماں کا پیارا؟“ بات برائے بات انہوں نے موضوع نکالا تھا۔

اس کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی، جس ذکر سے بچتی تھی وہی مذکور تھا۔ جو موضوع ناپسند تھا وہی خاص طور پر نکالا گیا تھا۔ رافیعہ پچھلی سیٹ پر اونگھ رہی تھی۔

شبانہ کو اپنا آپ بہت اکیلا محسوس ہوا اس نے اپنے وجود پر کئی برسوں کی ٹھکن محسوس کی۔

”امی اور نازیہ کا ہی دھیان لگا ہوگا ہم میں،

بے ضرر اور معمولی سی بات بھی دل کی خوشی کا پورا سامان کر دیتی ہے۔ وہ خود اندھیرے اجاز راستوں میں بھٹک رہی تھی مگر رافیعہ کے لیے اس وقت ایک مکمل خوشی بن گئی تھی۔ واپسی پر خاصی دیر ہو گئی تھی جب وہ دونوں گھر کی طرف پلٹیں تو دن ڈھل رہا تھا۔ سورج بھی واپسی کے سفر پر گامزن تھا۔ ملگجیا سا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا عموماً وہ شام سے پہلے گھر میں موجود ہوتی تھی مگر اس وقت دیر ہو چکی تھی۔ اسے کچھ خوف سا محسوس ہوا مگر مختلف آیات کا درد کرنی وہ سواری کے لیے مطلوبہ سڑک پر چلی آئی۔ علاقہ تو کافی گنجان آباد تھا۔ رکشا قریب ہی شاپنگ مال بھی تھا اسے کچھ ڈھارس رہی رکشا بھی جلد ہی مل گیا مگر آگے راستہ بند تھا۔

”ادھر تو راستہ بند ہے... دوسرا راستہ پکڑو“ ٹریفک سارجنٹ نے اطلاع دی۔

”اب کدو کو جانا ہے۔“ رکشا والا اس رکاوٹ سے بیزار ہو گیا تو جھنجھلائے لگا۔

وہ پریشان ہو گئی۔ دوسرا راستہ اس کا جانا پہنچانا نہ تھا اور خود بھی وہ زیادہ راستوں سے واقفیت نہ رکھتی تھی۔ وہ وہیں اتر گئی اور سوچ میں پڑ گئی کہ جائے تو جائے کہاں۔ وہ بیٹی کے ساتھ ”ماں“ کے رتے پر کھڑی تھی مگر اندر سے دل کپکپا رہا تھا۔ معاشرہ تو کسی کو بھی نہیں بخشا پھر وہ کون سی اٹوٹ تھی۔ چند بدلتا ش لوگوں کی حریص نظریں اس کے جسم کو چھیدنے لگیں اسی وقت ایک سوزوکی کار اس کے پاس آ کرکی۔ وہ ڈر کر چونکی اور غیر ارادی کچھ قدم پیچھے ہو گئی۔ رافیعہ کا ہاتھ تمام کر اس نے یہ کار کو دیکھ کر دھانے والے ”لوفر“ کو چار چھ سنانے کا فیصلہ کر لیا مگر ڈرائیونگ سیٹ پر ولی کو دیکھ کر اس کا سارا غصہ اور طراری جاتی رہی، اس کی جگہ ایک گھبراہٹ سی چہرے پر ابھر آئی۔

”آپ یہاں کیسے... اکیلی کہاں جا رہی ہیں؟“ فرشتہ غیب بن کر وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔

جن کا ذکر ہی اسے پسند نہ تھا اس وقت وہ اس کی طمانیت قلب کا باعث بن گئے تھے۔ ایک لمحہ تو وہ

چپٹھے ہی ولی کی جلتے آئے۔ سبزی بنائی صاعقہ کا معلم حیرت سے واہو گیا۔ ایک خوگوار احساس نے ان کے ابھرے ہوئے رخساروں پر مسکراہٹ پھیلا دی۔ ولی نے اس کا بیگ اور شاہر تائی پر رکھ دیا۔ وہ رافیہ کو بیڈ پر لٹانے کے لیے بیڈ تک گئی۔

”زہ نصیب... آؤ ابھی بیٹھو، چائے وغیرہ پینے صاعقہ ایک نامعلوم جوش سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

”پھر بھی آئی! ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ ولی نے ان سے بھی معذرت کر لی۔ اس نے جھلا کر ہاتھ میں تھما تکیہ دیوار پر دے مارا اور پاؤں پچھتی باہر آ گئی۔

”آپنی دیر لگا دی۔ وہ چلے بھی گئے چائے پانی کو تو پوچھ لیتیں۔“ صاعقہ کسی ”خوش فہمی“ میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

”آپ نے پوچھ لیا یہی بہت ہے۔ اب وہ اتنے بھی وی آئی پی نہیں کہ میں ان کے آگے بچھی جاؤں۔“ اندر کی جھلاہٹ نے اس کے لہجے میں چٹ سی پیدا کر دی تھی۔

”ہائیں!...“ صاعقہ بھونچکا رہ گئیں۔

”تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میں سمجھی کہ شاید... شاید...“ ان کے الفاظ مکمل نہ ہو پائے مگر شبانہ ان کا مقصد بالکل سمجھ گئی تھی۔

”کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہی ہیں آپ... بھلا یہ میری عمر ہے شادی کی؟ جوان بیٹی کی ماں ہوں میں اور آپ راشدہ آپا کی باتوں میں آکر بلا وجہ میرے پیچھے پڑ گئیں۔“ وہ کڑے تیوروں سے ان پر برس پڑی۔

”ارے واہ! یہاں تو نیکی ہی گلے کو آجاتی ہے۔ اور یہ تم راشدہ آپا کو کیوں برا کہہ رہی ہو، ہر آڑے وقت میں ساتھ دیا ہے انہوں نے ہمارا۔ ہوگی تم جوان بیٹی کی ماں مگر ابھی تم بوڑھی تو نہیں ہوئیں۔ وہ تو تم کو اور تمہاری بچیوں کو تحفظ دینا چاہتی ہیں۔“ انہوں نے سمجھانے کا بیڑا اٹھالیا۔

”مجھے کسی کی مہربانی کی ضرورت نہیں، میں خود اپنی زندگی جی سکتی ہوں۔ ہزاروں لاکھوں عورتیں

دراصل مجھے معلوم نہ تھا کہ ای دیر ہو جائے گی اور نہ جلدی گھر کے لیے نکلتی... ویسے بھی نازیہ اب ”بڑی“ ہو گئی ہے مگر ذرا سی بات پر بچوں کی طرح پریشان ہو جاتی ہے۔“ ان کی بات سراسر نظر انداز کر کے اس نے موضوع بدل کر وی بہت کچھ باور کرانے کی کوشش کی۔

”جی ہاں! کراچی کی سڑکوں کا ویسے ہی کچھ بھر وسانہیں، آئے روز کے ٹریفک جام سے بہت سے کام لیٹ ہو جاتے ہیں۔ آپ تو اس وقت اکیلی تھیں ایک سے دوسرا ہٹ ہوئی ہے تو اتنا محسوس نہیں ہوتا۔“ وہ جانے کیا باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

آہستہ آہستہ اس کے مزاج پر جھلاہٹ طاری ہونے لگی۔

اچھے خاصے ڈینٹ اور نرم مزاج والے اسے کانٹے کی طرح کھکنے لگے۔

”ہر مرد کی ایک سی فطرت ہوتی ہے۔ بھنورا صفت، بشیر چتا کے رخ واقعے کے بعد ایسے یہ ”ہم دردیاں“ صرف ڈھونگ اور مطلب پرستی لگتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر مستعمل ہوئی رہی، گاڑی رکی تو ایسے معلوم ہوا کہ گھر آچکا ہے ورنہ وہ اپنے ہی خیالات میں گم تھی۔“

”جی... شکریہ۔“ سوچ اور عمل میں تضاد کے باعث اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

”اندر آئیں۔“ اس نے رسمی اخلاق نبھایا۔

”نہیں! اب چلتا ہوں، شاہی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“ انہوں نے شائستگی سے معذرت کر لی۔

رافیہ نیند میں جھومتی گاڑی سے اتری تو اسے سہارا دینا پڑا جب کہ اس کا بیگ اور شاہر ابھی سیٹ پر ہی رکھے تھے اس نے پریشان ہو کر سوچا رافیہ کو سنبھالے یا سامان اٹھائے۔

”آپ اسے لے کر چلیں سامان میں پہنچا دیتا ہوں۔“ وہ اس کی پریشانی بھانپ گئے تھے۔

اس کے دل کا چورا سے کچھ کہنے لگا نہ جانے اسے خود پر غصہ آیا تھا یا ولی پر، اسے اندازہ نہ ہو پایا بس حد درجہ چڑ گئی تھی وہ۔

وہ رافیہ کو تھامے اندر داخل ہوئی تو اس کے

لاوارث اور بے آسرا ہوتی ہیں وہ بھی رہتی ہیں اس دنیا میں۔“ وہ ایک نئے عزم سے اپنے موقف پر ڈٹ گئی۔ صاعقہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئیں وہ کچھ بھی سننے اور سمجھنے پر آمادہ نہ تھی۔

”اس برس نازیہ پورے سترہ کی ہو جائے گی۔“ اس نے برسوں کا انداز میں حساب لگایا۔ ساتھ ساتھ اس کی فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی، کم سنی کی کشش نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا جو کسی اندرونی خوشی کی غماز تھی۔ اس روز اس کی کالج سے چھٹی تھی مگر حسبِ عادت وہ دیر سے نہیں آئی۔ اس کی رنگت جیسے ٹھہری جا رہی تھی اور ملکونی مسکراہٹ میں ایک پراسرار سی طمانیت بھی جھلک رہی تھی اور بیزاری کا کہیں شائبہ تک نہ تھا جو عموماً رہتا تھا۔ دراصل حالات کی وجہ سے وہ بھی اپ سیٹ ہو جاتی تھی اور بھی کبھار اس کی بے زاری سے سب عیاں ہو جاتا تھا مگر آج کل تو وہ مکمل طور پر بدلی ہوئی تھی۔ شبانہ کی چھٹی حس نے کوئی الارم بجایا، وہ گہری تشویش کا شکار ہو گئی۔

”آج تو بہت خوش لگ رہی ہے نازیہ۔“ اس کے قریب آ کر محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے اس نے ہر صورت کچھ معلوم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ نازیہ نے لاڈ میں آ کر اپنا سر اس کی آغوش میں رکھ لیا۔ ”جب بھی اچانک ہی مہرباں بادلوں کا سایہ ہو جائے اور پھر ان بادلوں کی فرحت بخش بو چھاڑ سے ہر طرف جل جھل ہو جائے... ایک ایک گوشہ سیراب ہو جائے تو اسے کیا کہیں گے امی۔“ وہ شاید بے اختیار ہوئی تھی۔

اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شبانہ کی انگلیاں ایک لمحہ کو ٹھہری گئیں۔ اس نے اپنی گود میں سر رکھی نازیہ کو بغور دیکھا۔ اس کے بیضوی چہرے پر ایک نئی کہانی لکھی نظر آئی اس کی پلکوں کے لرزدہ سائے سب کچھ عیاں کر رہے تھے۔ وہ عمر کے اس سنگین موڑ پر تھی جہاں خوابوں میں زندہ رہ کر اپنی دنیا بسائی جاتی ہے اس نے ایک نظر میں سب کچھ جان لیا اس وقت اسے اپنا آپ بہت کم زور اور اکیلا

لگا۔ نازیہ بڑی ہو گئی تھی عمر کے ایسے نازک موڑ پر بے سایہ شاہراہ پر کھڑی تھی ایسے میں اگر کوئی ہم درد اور مہربان مل جاتا ہے تو وہی پہلی محبت بھی بن جاتا ہے۔ ”کون ہے وہ... وہ کون ہے نازیہ“ اسے اپنی آواز پر اپنی محسوس ہوئی۔

نازیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ابھی تو اس نے کچھ بتایا ہی نہیں تھا اور اس نے ساری بات سمجھ لی تھی۔ ”وہ بہت اچھا ہے امی... بہت زیادہ مخلص ہے مجھ سے، اس نے میرے درد کو خود ہی محسوس کیا ہے۔ میں نے تو اسے کبھی اپنے منہ سے کچھ نہیں بتایا مگر وہ کہتا ہے کہ اس نے میری آنکھوں سے میری زندگی کی محرومیوں کو پڑھا ہے۔ اس نے خود میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، میرے دکھ کو بانٹا ہے، وہ... وہ کہتا ہے کہ وہ میرے سارے دکھوں کا ازالہ کر دے گا۔ وہ بہت مہربان ہے۔“ وہ بے اختیار بولتی چلی گئی۔ اس کی شخصیت کے موتی ٹکھری مالا کے موتی کی مانند ادھر ادھر بکھرتے گئے۔ شبانہ نے پہلی بار اس کی گہرائی کو محسوس کیا۔

اس کی بہت کوشش کے باوجود اس کی شخصیت میں کہیں ٹوٹ پھوٹ رہ گئی تھی جو آج اس پر عیاں ہوئی تھی۔ اپنی طرف سے تو اس نے باپ کی کمی پوری کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر یہاں اسے احساس ہوا کہ وہ ناکام رہی۔

”امی... امی!“ اسے چپ، سوچوں میں گم دیکھ کر نازیہ نے اسے شدت سے پکارا۔

وہ ڈر گئی کہ شاید شبانہ ناراض ہو گئی ہے یا پھر اسے صدمہ ہوا ہے۔

”امی مجھے معاف کر دیں اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ دراصل... وہ ہے، اپنا اچھا کہ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“ نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ اسے اس کے سوا کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔

شبانہ کے ہونٹوں پر مجروح مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا، بن باپ کی بچی کو وہ کب تک کانٹوں سے بچاتی۔

”کیا نام ہے اس کا؟“ اس کے لہجے میں سنگینی کا عنصر تھا۔ وہ جس لمحے سے ہمیشہ خوف زدہ رہی وہ بالآخر سامنے آئی گیا۔

”اس کا نام کا شان ہے اور وہ مجھ سے دو سال سینئر ہے وہ بہت اچھا ہے امی۔“ اسے بھرپور یقین تھا اور یہی یقین وہ شبانہ کو بھی دینا چاہتی تھی۔ مگر شبانہ ایک کڑی مسافت طے کرتے کرتے حالات اور وقت سے بے اعتبار ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ اسے درست نہ لگتا اور ایک بات کو وہ بار بار سوچتی، ارادے باندھتی اور توڑ دیتی مگر یہاں تو نازیہ نے کمال خود اعتمادی سے اپنا سامھی بھی خود چن لیا تھا۔

”ایسی کی شادیوں کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا بنی! اکثر پسند کی شادیاں ناکام رہتی ہیں کیوں کہ شادی کے بعد دونوں کی ایک دوسرے سے توقعات پوری نہیں ہو پاتیں، لوگ افیئر چلانے سے نہیں گھبراتے، نہ ہی فلرٹ کرنے سے ڈرتے ہیں ہاں جب بات شادی کی آتی ہے پھر وہی لڑکی بدنام ہوتی ہے۔ لڑکے کا کچھ نہیں جاتا وہ تو اپنا گھر بسا ہی لیتا ہے۔ انگلیاں تو لڑکی ہی پر اٹھتی ہیں۔“ اس نے مناسب الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

دراصل وہ بہت خوف زدہ تھی۔ ایاز کے بعد سارے رشتے اجنبی ہو گئے تھے اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی وہ، مگر اب بات اپنی ذات سے بڑھ کر بیٹی کی عفت و عصمت کی تھی۔

”وہ ایسا نہیں ہے امی... وہ مجھ سے فراڈ نہیں کر رہا۔ اس نے تو اپنے ڈیڈی سے بھی میرا ذکر کر دیا ہے انہیں بھی اس تنجوگ پر کوئی اعتراض نہیں۔ ایک دن میں اسے آپ سے ضرور ملواؤں گی۔“ وہ بہت نڈر ہو کر بول رہی تھی۔ کا شان کی محبت نے اسے بے خوف بھی کر دیا تھا اور نڈر بھی! اور شبانہ اسی وقت سے خوف زدہ رہتی تھی ایک طرف بیٹی کا خیال تھا تو دوسری طرف دنیا والوں کا ڈر بھی تھا کیوں کہ بات کو فسانہ بننے میں دیر ہی لگتی لگتی ہے۔ صرف ایک مل میں ہی اپنا وجود پرایا ہو جاتا ہے اور نازیہ اپنے شعور کی

دنیا میں ابھی نو آموز تھی۔

☆☆☆

بے چا پ اور ٹھہرے ہوئے دنوں میں ایک بالچل کا آغاز ہوا تھا۔ نازیہ کے خمدار لبوں پر ایک پیاری سی مسکان بکھری رہتی تھی مگر شبانہ کو بہت سے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا۔ ایک مدت ہو گئی تھی اسے دل سے خوش ہوئے اور اب بھی وہ ڈرتی تھی۔ اس دن بھی وہ اپنی سوچوں سے نیم جاں ہو رہی تھی کہ دروازے کی کنڈی بجنے پر چونک گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے دلی کو دیکھ کر ششپا گئی۔

”آ... آپ؟“ ان کی غیر متوقع آمد نے اسے پریشان کر دیا۔ انہوں نے اپنی گود میں شاہمی کو بھر رکھا تھا۔ ”جی وہ... دراصل ایک درخواست کرنی تھی۔“ وہ کہنے میں متامل تھے۔

شبانہ کو یک دم کسی ”خاص“ بات کی توقع ہوئی اس کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلے اور برہمی کے آثار پھلکنے لگے۔

”میں ذرا مصروف تھی... خیر کیا کوئی خاص کام ہے؟“ اس نے رکھائی برتنے میں عار محسوس نہ کیا۔ اور اندر آنے کو رٹا بھی نہ کہا۔

”مصروف تو میں بھی ہوں جناب، دراصل راشدہ آپا کہیں رشتے داروں میں گئی ہوئی ہیں اور مجھے ارجنٹ ایک کام سے جانا ہے... کیا آپ شاہمی کو تھوڑی دیر رکھ لیں گی۔“ توقع کے برعکس بات سن کر اسے کافی ہشیمانی ہوئی تاثرات بدلے اور چہرے پر نرمی آ گئی۔

”یہ بھی کوئی کام ہے، ابھی رافیعہ اسکول سے آجائے گی تو وہ بھی خوش ہو جائے گی۔“ اس نے پانچ سالہ شاہمی کو پیار سے دیکھا جو ولی کی گود میں تھا۔

”ٹھیک ہے پھر... تو بیٹا آپ یہاں آنٹی کے پاس رکھے میں ابھی کچھ دیر میں آتا ہوں۔“ ولی نے اسے نیچے اتارنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی گود سے زخم مار کر لہراتا ہوا بے اختیار شبانہ کی طرف لپکا اور اسے سنبھالنے کے چکر میں ولی اس کے بے حد فریب ہو گئے۔ وہ کچھ نکل سی ہو کر پیچھے ہوئی۔

”اُمیم سوری... یہ شرارتی بچہ بد کمیزی کر رہا ہے
ابھی دھڑام سے نیچے کرتے تا تو پتا چلتا۔“ ولی نے
اس سے معذرت کے ساتھ ہی شاہی کو بھی گھر کا۔
ولی کے جانے کے بعد شاہی کھیل کود میں مگن
ہو گیا۔ وہ اپنی تنہائی کا ستایا ہوا تھا اس لیے رافیعہ کے
ساتھ اس کا دل لگ گیا تھا۔ اسے تو کھیل میں ولی یاد بھی
نہ رہے تھے البتہ شاہانہ دیر ہونے پر فکر مند ہوئی تھی۔

☆☆☆

”ابھی تو وہ مصروف ہے امی! اس کے
ڈیڈی بزنس ٹور پر گئے ہوئے ہیں۔“ نازیہ کو
اس پر خود سے زیادہ بھر دیا تھا۔

اس کے اطمینان پر اسے مزید تشویش ہو رہی تھی
اور ابھی تو یہ بات صرف اس کے اور نازیہ کے درمیان ہی
تھی۔ صاعقہ کو اس کی جھنجک بھی نہ پڑی تھی اگر معلوم
ہو جاتا تو طوفان کھڑا ہو جاتا۔ وہ پرانے خیالات کی تھیں
جب کہ شاہانہ اس معاملے کو دوستی اور اعتماد سے حل کرنا
چاہتی تھی۔ جب وہ حد سے زیادہ بدگمان ہو گئی اور
اندیشوں میں گھر گئی تو ایک دن وہ اسے لیے چلی آگئی۔
”امی... یہ ہیں کاشان“ تعارف کراتے
ہوئے اس کے لبوں پر نقا خر جھلک رہا تھا۔

اس نے چونک کر دہلی پتلی قامت کے کاشان
کو دیکھا جس کے بال گھنگریالے تھے اور چھوٹی چمک
دار آنکھوں میں اشتیاق جھلک رہا تھا۔ اپنی پینٹ کی
جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑے اسٹائل سے کھڑا ہوا
تھا۔ وہ عمدہ جرسی کے ساتھ سیاہ پینٹ میں ملبوس تھا اور
مجموعی طور پر دل کش لگ رہا تھا۔ اس کی اچانک آمد پر
وہ پریشان ہو گئی اسے نازیہ پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اسے
بغیر بتائے اپنے ایڈ ونچر میں گھر لے آئی تھی اور اب
دل کھول کر صورت حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔
اس نے سرسری انداز میں اپنے سر اپنے کو دوپٹے سے
ڈھانپا۔ کاشان اسے ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ جیسے
اس کی پریشانی سے خود بھی لطف لے رہا ہو۔

”آؤ بیٹا... بیٹھو۔“ اس نے اسے کرسی پیش کی۔
”شکریہ...“ وہ ہلکے سے کھنکھار کر کرسی پر بیٹھ
گیا اور چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈالی۔
”کہاں یہ امیر زادہ اور کہاں ہمارا غریب

نازیہ ان دنوں بہت خوش تھی شاید یہ ان محبتوں کا
اعجاز تھا جو اسے مل رہی تھیں بلکہ پھر ساری محرمیوں کے
ازالے نے اس کے چہرے پر مسکندگی اور عنایتی بھر دی تھی
اور اسے خوش دیکھ کر شاہانہ نے بھی سوچ لیا کہ اس کے
صبر کے صلے میں آج نازیہ کو وہ سب کچھ میسر آ رہا تھا
جن سے محروم رہی تھی۔ کاشان ایک دولت مند گھرانے
سے تعلق رکھتا تھا اور نازیہ کو اس نے تحائف سے لاد دیا
تھا۔ ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے اسے موبائل بھی لے
کر دیا تھا۔ شاہانہ کو پہلے ان ”مہربانیوں“ پر اعتراض
ہوا۔

”یہ سب ٹھیک نہیں ہے نازیہ! وہ لڑکا دونوں
ہاتھوں سے تم پر لٹا رہا ہے شادی سے پہلے یہ سب کچھ
ہمارے معاشرے کے لڑکے لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا
۔“ اسے اس کی بے خوفی سے خوف آنے لگا تھا۔
”امی یہ تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں! وہ دل کا
بہت پیارا ہے میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔“
نازیہ کے گمان میں کہیں بھی نہ خوف تھا اور نہ کوئی
خدشہ اسے دھڑکارہا تھا۔

”مگر تم دونوں کے درمیان کلاس کا فرق تو
ہے نا، پھر اتنی بہت سی لڑکیوں کو چھوڑ کر وہ ہمیں
کیوں لفٹ دے رہا ہے۔“ اس کی بات پ نازیہ
بے ساختہ ہنس دی۔

”یہ تو دل کی بات ہوئی نا امی... جب اسے میں
پسند آگئی تو پھر یہ کلاس کا فرق کئی معنی نہیں رکھتا اور
درمیان میں کہیں ظالم سماج بھی نہیں ہے۔ اس کے
ڈیڈی بھی تقریباً راضی ہیں۔ کچھ دنوں میں آپ کو ملو

نہیں ہاں آپ کی "صاعقہ" اور اس کی "نازیہ" راضی نہیں ہوگی۔

ان تعلیمات نے ہولی اسے راشدہ آپالے نام اور ایلر سے پڑا لے لگی تھی۔ اب تک ایاز اس کے خوابوں کی سند ہر ارجمان تھا وہ اس کے علاوہ کسی اور کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ وہ جیتے ہوئے خوش گوار دن جواب صرف اس کے آئیے یادوں کا عظیم سرمایہ تھے اور راشدہ آپا کی ذیل اندازی سے اس کی یادوں کی دنیا میں پھل مچ گئی تھی۔ اسی لیے وہ ان سے متفر ہو گئی تھی اور نازیہ کی حمایت کر رہی تھی۔

"کیسے نہیں راضی ہوگی نازیہ، ابھی وہ نادان ہے جب ہم اسے برا بھلا بتائیں گے تو وہ ضرورت کو سمجھے گی۔" صاعقہ نے اس کی عقل کے تالے کھولنے چاہے۔ "امی یہ پرانا دور نہیں ہے پچیاں پہلے کی نسبت زیادہ باشعور اور منجور ہو گئی ہیں اب والدین کے فیصلے پر وہ آنکھ بند کر کے عمل نہیں کرتیں ان کی اپنی سوچ اور اپنا نظریہ ہوتا ہے۔" اس نے صاعقہ کو صاف صاف بتا دیا تاکہ وہ کوئی امید لگا کر نہ رہیں۔

"یہ ساری تربیت کی بات ہوتی ہے۔ ابھی ہم نے اسے اتنی آزادی نہیں دی کہ وہ ہمیں نظر انداز کر کے دوسروں کو فوقیت دے، میں آج نازیہ سے خود بات کروں گی۔" صاعقہ نے ارادہ ظاہر کیا۔

"بے کار ہے امی! وہ اور کا شان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور میں اسے مجبور نہیں کر سکتی کیوں کہ ایک عرصے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں خواہشوں کی بجھک ہوئی راکھ کے علاوہ مسرت و شادمانی کی جھلک دیکھی ہے۔" کا شان اسے وہ ساری خوشیاں دے گا جن سے وہ محروم رہی، وہ لوگ بہ خوشی اسے اپنا رہے ہیں۔

اسی وقت مالک مکان کے گھر سے منیبہ چلی آئی صاعقہ کو اس کے سردے تیوروں سے ہمیشہ خوف آتا تھا اور شانہ کے اندر غصے کی کھون شروع ہو جاتی تھی۔ اس کی بلا وجہ کی تسلط پسندی سے وہ سخت بیزار تھیں۔

خانہ۔ "وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی رہی۔" تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تمہاری کوئی بڑی بہن بھی ہیں۔" کچھ دیر بعد اس نے نازیہ کو مخاطب کیا اور اس کی بات پر نازیہ کھلکھلا پڑی۔ شانہ بھی خائف سی ہو گئی۔ "اکثر لوگوں کی یہی رائے ہے میری والدہ کے بارے میں... جناب آپ کے سامنے میری امی جان بیٹھی ہیں۔" اس نے لطف لے کر حقیقت حال بتائی۔ "اوہ... سوری! اس میں میرا کوئی قصور نہیں، تمہاری مدر بہت بیک اور ناس لیڈی ہیں۔" اس کے منہ سے بے اختیار تعریفی جملہ پھسلا۔

شانہ کو وہ بہت بے تکلف اور خوش اخلاق لڑکا لگا، اس نے اپنے دل کی بات بہت آرام سے کہہ دی تھی۔ نازیہ کی طرح کم عمر اور کچھ کچھ نادان سا وہ اسے نازیہ کے لیے مناسب لگا۔ تھوڑی سی بات چیت کے بعد سارے اندیشے بھی جاتے رہے اور اسے ایک گونا سکون کا احساس ہوا۔ "یہ لڑکا کون تھا؟ امرا غیر اتھو خیرا۔" صاعقہ کو معلوم ہوا تو باقاعدہ باز پرس کی گئی۔

"نازیہ کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" شانہ نے بڑی سہولت سے اطلاع دی۔ "ہوش میں تو ہو شانہ، ساری زندگی کا معاملہ ہے یہ نہ جان نہ پہچان اور تم نے یوں اسے گھر کے اندر بلا لیا۔ نازیہ کو سمجھانے کے بجائے تم خود بھی بچی بن گئیں اس کے ساتھ۔" صاعقہ نے لتاڑا۔ "ایک دن اپنا بھی وجائے گا..." وہ جیسے فیصلہ کر چکی تھی۔

"اور وہ جو راشدہ طے کیے بیٹھی ہے اپنے فیصلے کے لیے۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔ "رہنے دیں ان کا ذکر، ہم دردی کی آڑ میں اپنا مطلب نکالنا ہے ان کو... اب نازیہ اور فیصل کا لاچ دے کر وہ مجھے اپنے بھائی کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں۔" وہ حد درجہ بدگمان تھی۔

"ارے باگل... تمہیں کون مجبور کر رہا ہے، کان کھول کر سن لو؟ میں تمہیں نازیہ کو ایسی ویسی جگہ

صاعقہ کو خود ہی کافی رنجیدہ میں مردانہ سبوتا کر کے
شبانہ کو حوصلہ دے رہی تھیں۔

”مگر ای! وہ منحوس عورت ہمارے کردار پر حملہ کر کے
گئی ہے۔ کیا جس کے باپ بھائی اور شوہر نہیں رہتے وہ
ایسا ہی بے وقعت ہو جاتا ہے کہ لوگ اس کی پاکیزگی کو بھی
کچھڑ میں تھیر دیتے ہیں۔“ وہ ہچکیاں لینے لگی۔
”اگر کوئی برف سا شفاف بھی ہو تو دنیا والے
اس کے دامن پر بھی تہمت کا داغ لگا دیتے ہیں۔ یہ
کوئی ایسی بات نہیں ایسا تو ہوتا آرہا ہے۔“ صاعقہ
اسے رمان سے سمجھاتی رہیں۔

”میں نے کسی کا کیا گڑا ہے، کیوں مذاق بن
کر رہ گئی ہیں۔“ دکھ سے اس کی آواز کانپ گئی۔
”اکیلی عورت پر لوگ ایسے ہی انگلیاں اٹھاتے
ہیں اور تمہارے ساتھ تو دو معصوم بچوں کا ساتھ بھی
ہے۔ میں نے تو اسی لیے چاہا تھا کہ اگر راشدہ آیا۔“
وہ تذبذب کی کیفیت میں بات مکمل نہ کر پائیں کیوں
کہ شبانہ اس ذکر پر چراغ پا ہو جایا کرتی تھی۔

”کپاسیرے مسئلے کا ایک ہی حل رہ گیا ہے؟ کیا
میں اپنی مرضی سے باعزت زندگی گزارنے کا کوئی حق
نہیں رکھتی؟ میری اپنی بیٹی میرے قد کے برابر آگئی
ہے میں کیا شادی رچانی اچھی لگوں گی۔ آپ بھی حد
کرتی ہیں، بس جو راشدہ آپانے کہہ دیا وہی آپ بھی
کہنے لگتی ہیں۔“ وہ توقع کے مطابق ناراض ہوئی۔
”وہ تو نازیہ کو بھی لینے کو تیار بیٹھی ہیں، تم حامی
تو بھرو۔“ صاعقہ نے اس کے اتنی ارادے کی زنجیر
توڑنے کی کوشش کی۔

”نازیہ کی آڑ لے کر وہ اپنے بھائی کا گھر
بسانا چاہ رہی ہیں، ایسی بھی کیا موقوف پرستی؟“ اسے
کسی پر اعتبار نہ رہا تھا۔

”اس میں برائی کیا ہے ابھی تم خود ہی پریشان
ہو رہی تھیں۔“ صاعقہ کی بات نے اسے بھڑکا دیا۔

”پلیز! آئندہ میرے سامنے یہ ذکر نہیں کیجیے
گا۔ اب میں نازیہ کی رخصتی کا سوچ رہی ہوں میری
پہلی ترجیح اب میری اولاد ہے، مجھے ان کے مستقبل اور

کام ہو وہ ہم سے کہو اور ان لوگوں کو منہ نہ لگاؤ۔“ اس
کا لہجہ کافی ترش تھا۔

”دیکھو بھئی! ایاز مرحوم تمہارے سامنے ہی اس
دنیا سے گئے اس کے بعد تو ہمارے صرف چند ایک
رشتے دار ہی رہ گئے ہیں یا پھر آسیہ اور فرحان وغیرہ سے
ہماری پرانی راہ و رسم ہے۔ اور تو ہم کسی سے بھی نہیں
ملنے۔“ صاعقہ نے جتنی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”میں نے پہلے بھی وارننگ دی تھی مگر لگتا ہے تم
لوگوں نے کان نہیں دھرے۔ ہماری اس محلے میں
بڑی پرانی محلے داری ہے ہمیں معلوم ہے کہ وہ لوگ صحیح
نہیں۔ بہتر ہے کہ آئندہ ان سے بالکل بھی تعلق نہ
رکھو۔“ اس کے انداز میں فرعونیت تھی۔

”کیوں نہ ملیں، ہم ان لوگوں سے آخر آپ کو کیا
تکلیف ہے؟“ شبانہ کی برداشت جواب دے گئی۔
”دیکھو! جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں،
ہماری آنکھوں میں مرجھیں نہ مہر وہم بھی سب دیکھ رہ
ہیں کہ کون آرہا ہے اور کون جا رہا ہے۔ وہ لوگ کردار
کے صحیح نہیں ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ تم لوگ خود ہی بد
کردار ہو جو آئے دن دروازے پر نئے نئے چہرے
منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں۔“

”بات سنوئی بی.... بیٹی تمہاری جوان ہو گئی ہے
اور اس کا باقاعدہ چکر بھی چل رہا ہے۔ عشق ضرور اندھا
ہوتا ہے مگر بڑوسی اور محلے دار اندھے نہیں ہوتے۔“ اس
نے ہاتھ نچا کر بڑی بے رحمی سے اس کی عزت نفس کو
چکنا چور کر دیا۔ غصے سے شبانہ کا منہ سرخ ہو گیا۔

”بکواس نہ کرو، ہم اس قماش کے لوگ نہیں
ہیں۔ وہ میرا ہونے والا داد ہے کوئی غیر نہیں۔“ اس کے
ضبط کی ساری حدیں ختم ہو گئیں تو وہ اس پر برس پڑی۔
وہ جتنی جھکتی چلتی تھی اور شانہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس
کو جو دیس دھوپ کے نیزے گڑے ہوئے ہیں۔

”تم دل پر نہ لوشانہ.... یہ دنیا تو ہے ہی ایسی
جہاں کسی کم زور کو دیکھتی ہے وہیں حاوی ہونے لگتی
ہے۔ بس ہمیشہ کم زور پر ہی چلتا ہے سب کا۔“

خوشیوں کو دیکھنا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح اس نے صاف جواب دے دیا اور صاعقہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

زندگی جیسے کروٹ بدل رہی تھی، دنوں سے دل پر چھائے ناامیدی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ نازیہ کو خوش دیکھ کر شبانہ کے اپنے وجود میں توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ کاشان کی صورت میں مایوسی کی دھند کہیں دور ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ خوشیوں اور امیدوں کے پھولوں سے سجا، آرزوؤں کے گلہلوں کی مہک سے بھرا استانا نازیہ کی سونی زندگی میں بہار لے آیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی جین خواہشوں اور ضرورتوں کے لیے وہ پیٹھی کرکھتی رہتی تھی اب وہ صورت حال نہ رہی تھی۔ نازیہ کا رنگ و روپ دن بدن نکھر رہا تھا۔ ذرا سی فراغت اور بے فکری نے اسے اس قدر پیارا کر دیا تھا کہ اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

”راشدہ آپا نے مجھ سے جواب مانگا ہے۔“ صاعقہ یہ تمام نظارے دیکھ کر مایوس ہو گئی تھیں مگر پھر بھی جواب طلب کر لیا۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی کئی بار منع کیا ہے اس عمر میں یہ چونچلے نہیں کر سکتی میں...“ شبانہ چیخ کر بولی۔ ”چونچلے ارے نکاح جیسے مقدس بندھن کو تم چونچلا کہہ رہی ہو؟ بہر حال وہ تو فیصل کے لیے نازیہ کا ہاتھ مانگ رہی ہیں۔“ صاعقہ نے اسے اصل بات بتائی تو وہ اور بھی زیادہ برامان ہو گئی۔

”یہ ناممکن ہے... آپ سب جانتی ہیں پھر بھی کہہ رہی ہیں۔ نازیہ کی خوشی کا شان ہے اور میں اس کی خوشیوں کے گلستان میں کانٹے نہیں بھر سکتی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”انہوں نے اچھے برے وقتوں میں ہمارا بہت ساتھ دیا ہے اور پھر اپنی ہیں، شرافت و کردار کے لیے کسی ضمانت کی ضرورت بھی نہیں۔“ اس کی خود سری بر صاعقہ کو کافی دکھ ہوا۔ بیٹی کی محبت میں شبانہ نازیہ کی محبت میں طرح نظر انداز کر رہی تھی اور شبانہ نازیہ کی محبت میں اس درجہ غرق تھی کہ اسے کچھ احساس ہی نہ ہوا۔

”اچھا میں ذرا آگے آئی ہوں۔“ صاعقہ نے بات کو غیر اہم ثابت کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“ صاعقہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔ کچھ دنوں سے وہ ان سے مشورہ لیتا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔

”روزی سے نازیہ کے کپڑے لینے ہیں۔“ اس نے صرف اطلاع دی۔ اس کا رویہ بہت روکھا سا تھا۔ نازیہ کی خوشی کے آگے وہ کسی کو بھی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ ”مجھے ان کے کسی بھی احسان کی ضرورت نہیں۔ میں ان کے احسان کے بدلے میں اپنی بیٹی کو بیعت نہیں چڑھا سکتی۔“ اس نے صاعقہ سے صاف کہہ دیا۔ جب وہ گھر لوٹی تو مزید تیوریاں چڑھ گئیں ننھے شاہی کو صحن میں دوڑتے بھاگتے دیکھ کر اس کا پارہ اوپر ہو گیا۔

”روزی ڈیوٹی لگا دی ہے ہماری، اچھا بہانہ ہے۔“ وہ ناگواری سے بڑبڑائی۔

”تمہارا کیا لیتا ہے، بچہ ہی تو ہے کھیل کر خوش ہو جاتا ہے۔“ صاعقہ کو اس کی باتوں پر اب غصہ آنے لگا تھا۔

”تینہ حیلے بہانے مجھ پر اثر نہیں کریں گے۔“ اس نے سختی سے انہیں باور کرایا۔

دراصل بیٹے دنوں کی محرومیوں اور پریشانی نے اسے چڑا بھی کر دیا تھا اور وہ بھی اب یہاں تک کہ وہ اپنے اور پرانے میں فرق کرنے کے بھی قابل نہ رہی تھی۔ راشدہ آپا کی محبت اسے ہم دردی اور مطلب پرستی لگ رہی تھی۔ شاہی کھیلنے ہوئے اچانک آکر اس سے لپٹ گیا۔

”آئی... آئیں میرے ساتھ کھیلیں۔“ وہ اس کے بدلے ہوئے رویے کو بالکل بھی محسوس نہ کر پاتا تھا۔

”بلاوجہ وہ یہ حربے اختیار کر رہی ہیں ایک آدھ بار بچے کو لفٹ کیا دے لی انہوں نے روز کا ہی معمول بنالیا۔“ وہ ہر رخ کو اپنے خیالات کے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

”ارے واہ! بچے سے کیا یہ رکھنا۔ اس کا جی لگتا ہے وہ خوش ہوتا ہے یہاں آکر ورنہ اپنے گھر میں تو اکیلا ہی رہتا ہے، کیا ہے جو یہاں کھیل لیتا ہے تو۔“ صاعقہ کو ہر محسوس ہوا۔

دوسرا کھر دیکھ رہے ہیں بلکہ راشدہ آپا کو یہ بھی بتا رہی تھیں کہ وہ ہمیں کوشش کر کے قسطوں میں دو کمروں کا فلیٹ دلا دیں گے تاکہ کرائے کے جھنجٹ سے جان چھٹے۔“ صاعقہ نے اسے اطلاع دی۔

”جب ہم خود ہی اپنے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں تو پھر راشدہ آپا کا احسان لینے کی کوئی ضرورت نہیں، کا شان اس سلسلے میں مسلسل کوششوں میں لگا ہوا ہے۔“ اس نے صاعقہ کی بات کو جھٹل کر پھر کا شان کی اہمیت جتائی۔

”ارے واہ! یہ بتاؤ کہ کا شان ہے یا والدہ دین کا چراغ! وہ نازیہ کو پسند کرتا ہے تو اس سے کہو کہ اسے عزت سے بیاہ کر لے جائے، ہم اپنے معاملات خود نمٹالیں گے۔“ صاعقہ کو شدید غصہ آ گیا۔

”آپ کو راشدہ آپا کے علاوہ کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا۔“ ثابانہ نے تملاک پر ہلو بدلا۔

اس سے پہلے کہ صاعقہ مزید کوئی جواب دیتیں رافیہ کی چیخ پر دونوں چونک گئیں۔ اس کی انگلی چھری سے کٹ گئی تھی، زخم کافی گہرا تھا اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی انگلی پر پٹی لپیٹ دی اور ابھی اسی خیال میں تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کہ کال بیل ہوئی اور ولی چلے آئے۔ ان کی گود میں ہنستا سکراتا شاہی تھا۔

”ارے یہ کیا ہوا۔“ خون اب کپڑے کی پٹی سے پھوٹ کر پٹی کو بھی سرخ کر گیا تھا۔

”اس کی انگلی کٹ گئی۔“ ثابانہ کی آواز کپکپا گئی۔

”چلو جلدی.... ڈاکٹر کے ہاں چلو۔“ وہ جھٹ مافیہ کو لے کر گاڑی کی طرف لپکے پیچھے پیچھے بھی بھاگئی۔

”بڑے وقت پر آ گئے آپ اگر دیر ہو جاتی تو....“ اس کے پاس شکر یہ کہ لفظ نہ تھے۔

”جی ہاں! وقت پر اپنے ہی کام آتے ہیں اور ہاں! اگر زیادہ دیر ہو جاتی ہے تو پھر صرف نقصان بگھٹتا پڑتا ہے۔“ ان کی ذومعنی بات ٹھک سے اس کے دل پر لگی وہ کافی پشیمانی محسوس کرتی رہی۔

”اب ولی اتنے بھی برے نہیں ہیں مگر....“

اس مگر کے آگے لوگوں کا خوف، دنیا کا ڈر اور تماشا

”اونہ! بس رہنے دیں....“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ یک دم سوگوری اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ ایاز کی یاد کسک بن کر ہمیشہ اسے اداس کر دیتی تھی۔ اب اس کی سونی زندگی کی ساری خوشیاں نازیہ سے وابستہ تھیں اس نے تو اپنی زندگی ایاز کی یادوں کے سہارے گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے ہر وہ شخص برا لگتا تھا جو اسے ایاز کی یادوں کے حصار سے نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس روز شانہ کا موڈ بہت زیادہ خراب ہو گیا۔ دو روز پہلے صاعقہ نے گا جری کھیر پکائی تھی اور ایک قاب فرحان اور آسیہ کے گھر بھی بھجوائی تھی جس پر ان کی مالکہ مکان نے فوراً ایکشن لیا اور ان پر چڑھائی کر دی۔ دراصل فرحان اور آسیہ کے گھر والوں سے اس کی ذاتی چپقلش چل رہی تھی اس لیے وہ چاہتی تھی کہ وہ لوگ بھی ان سے نہ لیں۔

”تم ماں بیٹیوں کو اتنا سمجھایا مگر ذرا اثر نہیں۔

اپنی من مانی کرنی پھر رہی ہو، خواہ منہ پر کالک لگے یا جگ بھر میں رسوائی ہو، شریف عورتوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔“ وہ اوجھے پن پر اتر آئی تھی اور ان کو اکیلا اور بے سہارا سمجھ کر ان پر شیر ہو رہی تھی۔ صورت حال ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔

”بس کچھ دنوں کی بات ہے، کا شان نے اس سلسلے میں نازیہ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا اچھا لڑکا ہے وہ یقیناً کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کرے گا۔“ غیر محسوس طور پر وہ کا شان کو اپنے گھر کا مضبوط ستون سمجھنے لگی تھی۔

”نہ بھئی.... مجھے تو بخشو، میں اس لڑکے کا احسان نہیں لے سکتی۔“ صاعقہ نے ناگواری سے انکار کر دیا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! وہ اور نازیہ مستقبل میں ایک ہونے والے ہیں۔ وہ کوئی غیر نہیں۔“ اسے بہت برا محسوس ہوا، آنے والی خوشیوں میں وہ روڑے لٹکا رہی تھیں۔

”میں تو راشدہ آپا کے پاس چلی جاؤں گی۔

ویسے بھی صاحب بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ ہمارے لیے

نازیہ چائے لے آئی تو وہ کچھ دیر بیٹھ گئے۔

”پاپا..... پاپا.....“ شاہمی دوڑتا ہوا چلا آیا۔

”ارے ادھر نہیں، یہاں آؤ، لو یہ سیکٹ لو۔“

اس کے لہجے میں از خود ہی تنہے شاہمی کیلئے مٹھاس بھر گئی اور دل کی ساری کدورت جاتی رہی۔

رات وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی زندگی نے

عجیب ہی ڈھب اختیار کر لیا تھا سر پر کوئی سایہ نہ رہا تھا

کوئی محرم راز نہ رہا تھا کہ جس سے اپنی ذات کے دکھ

بانجی۔ ہاں دکھ کی ایک فصل اس کے اندر تیزی سے

پنپ رہی تھی پریشانیوں اور مسائل سے وہ نظر نہ

چراغ تھی۔ ایک وقت تھا جب باپ اور بھائی کے

بعد وہ شوہر کے رشتے سے بھی محروم ہو گئی۔ تب اس کی

ساری ہمتیں جواب دے گئیں اور اسے ادراک ہوا

کہ دل کی سر زمین محبت کے رشتوں کی فصل سے پھلتی

پھولتی ہے۔ ہر رشتہ اپنی جگہ ضروری اور ہر ساتھ اپنی

جگہ معتبر ہے۔ باپ ہے تو چھاؤں، بھائی ہے تو مان

اور شوہر سارے وجود کے گرد ایک مضبوط احاطہ....

ان رشتوں سے محروم ہونے کے بعد جب اس کے

حوصلوں کی دیوار محروم ہونے کے بعد جب اس کے

حوصلوں کی دیوار ڈھیر ہی تھی تو راشدہ آبا کی توجہ اور

محبت نے ایک بار پھر اسے جینے کے قابل بنا دیا۔

انہوں نے بڑی فراخ دلی سے صاعقہ اور شانہ کے

دکھوں کو سمیٹا تھا ار تب شانہ نے یہ جانا تھا کہ ان

پیارے رشتوں اور محبتوں کے بغیر زندگی نامکمل اور

ادھوری ہے۔ اسے راشدہ آپا سے انسیت بھی ہو گئی تھی

اور عقیدت بھی کہ جب اس میں جینے کی رتق بھی پانی

نہ رہی تھی راشدہ آپا نے اسے اس کی پھول سی بچپن کی

طرف متوجہ کیا تھا مگر پھر ان کی شدید محبت اور اپنائیت

اس کا دم گھونٹنے لگی، وہ غیر ارادی طور پر ان کے اکثر

مشورے مان لیا کرتی تھی مگر جب انہوں نے اس کے

دل کی سوگوار سلطنت کے تخت سے ایاز کو ہٹانے کی

کوشش کی تو وہ ان سے بدظن ہو گئی اور اب انہی کی وجہ

سے وہ ذہنی طور پر الجھ گئی تھی کیوں کہ وہ بلا تکلف اس

لے معاملے میں دل انداز کر رہی ہیں۔

”سنو بی بی! یہ جو دونوں بچیاں ہیں نا، نازیہ اور

رافیعہ! ابھی ان کے بزرگ موجود ہیں کچھ اختیار ہم

بڑھیلوں کو بھی ہے ان پر۔“ اس کے انکار کی سن گن ملی تو

راشدہ آپا نے اس کے لیے صاعقہ نے چپ سادھ لی

تھی شاید مصلحتاً یا پھر شانہ کی من مانی کے صدمے میں۔

”اور گھر کا بندوبست بھی ہم خود کر لیں گے

دیکھو جلد بازی میں ایسا ویسا قدم مت اٹھالینا ورنہ

ساری عمر سر پکڑ کر روؤ گی، ابھی تو نازیہ کم عمر ہے بھلا

اسے زمانے کا کیا تجربہ! دوست دشمن کی پہچان کرنا

سیانوں کا کام ہوتا ہے۔“ انہوں نے جس تجربے کی

بھٹی میں ایندھن بن کر سبق حاصل کیے تھے وہ سب

اس کے گوش گزار کر دیے مگر وہ انہی سمجھی رہی۔

”ہر بات میں رخ نہ... ہر کام میں ٹانگ اڑانا

ان کا فرض ہے۔“ اسے بہت ناگوار گزرا۔

گھر کے معاملے کو انہوں نے صاعقہ کے

ساتھ مل کر خود ہی طے کر لیا جب کہ کا شان نے کچھ ہی

دن پہلے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ گھر کا بندوبست بس

ہونے ہی والا ہے اب یہ نگر او پریشانی کا باعث بن

سکتا تھا اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ تقریباً ایک ہی

وقت میں دونوں طرف سے گھر کا بندوبست ہو گیا تھا

شانہ کو ان کی بات ماننی پڑی کیوں کہ ابھی کا شان

باقاعدہ اس کی ٹیلی میں شامل نہیں ہوا تھا۔

”جب تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو سب

کے منہ بند ہو جائیں گے شادی کے بعد ہم صرف

کا شان کو اہمیت دیں گے۔“ شانہ نے نازیہ کو بھی یہی

سمجھایا تا کہ وہ کا شان کو اپنے لفظوں میں سمجھا دے

گھر بدلنے میں ابھی کچھ وقت تھا تا ہم فیصلہ ہو چکا تھا

۔ کا شان نے نازیہ کو گھر کی ترتیب کیلئے دس ہزار

روپے دیے تھے شانہ دنگ رہ گئی۔

”دل کا بڑا اور ہاتھ کا کھلا ہے۔“ نازیہ کو بہت

فخر تھا اس پر اور شانہ اسے صبر کا انعام سمجھ رہی تھی ایک

عرصے کے بعد ایک بند روزن کھلا تھا کا شان نے

نازیہ کی زندگی میں گلاب کھلا دیے تھے اس کے نکتے

ہوئے سرو قد کی نزاکت کی اپنی ہی نرالی چھب چھب تھی۔ بلاشبہ وہ بہت پیاری تھی۔ نازیہ میں اسے اپنے جو بن کی جھلک نظر آرہی تھی، بے اختیار اس کی نگاہ آئینے پر ٹھہر گئی۔ وقت اور حالات نے اس کے حسن پر ٹھوڑا سا اثر ضرور ڈالا تھا مگر اب بھی وہ مکمل اور بھرپور تھی۔ آنکھوں کی جوت ضرور بجھ گئی تھی مگر نوانیت نے اسے نکھار دیا تھا۔ کاشان تو اکثر مذاق میں اسے ”یک لیڈی“ کہتا تھا تب نازیہ اس کی پرنداتی بات پر دینک بنتی رہتی وہ محور ہو کر اس کی تقریقی ہنسی کی جھنکار اور چہرے سے پھوٹی کرنوں کو دیکھتی رہ جاتی۔ اس روز نازیہ کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ صاعقہ فلوکا شکار تھیں ناچار اسے ہی ناشتے کا سامان لینے بیکری جانا پڑا۔ اگرچہ وہ بہت پر اعتماد ہو کر نیچے اترتی تھی مگر بشیر چٹا کو ایستادہ دیکھ کر اسے عدم تحفظ کا شدید احساس ہوا اس کی حریص اور بھوکے نظریں اسے اپنے وجود کے پار اترتی محسوس ہوتی تھیں ایاز کی وفات کے بعد سے اس کی آنکھوں سے شرم اور پاکیزگی ختم ہو گئی تھی۔ اسے یہاں دیکھ کر وہ کل اٹھا۔ ”زہے نصیب، اداب... اداب! حیرت بیجا کیلی کہاں جا رہی ہیں۔“ اس کی بے تکلفی بڑھتی جا رہی تھی۔

اب اسے کون سا یہاں رہنا تھا جو وہ اس سے مرو تا پیش آتی اس لیے نظر انداز کر کے بڑھ گئی صرف اس کی وجہ سے اسے گھر بدلنا پڑ رہا تھا۔ اس کی رذیل حرکتوں نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اسے اس سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک دم ہی اسے محسوس ہوا جیسے عقب سے اس کی چادر کا پلو پھینچ سا گیا ہے، اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لمبے کو اس کے حواس جواب دے گئے۔ وہ اس کا پلو پکڑے مکر وہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”اگر تم چاہو تو اسی گھر میں رہ سکتی ہو، میں کرایہ بھی نہیں بڑھاؤں گا...“ وہ کھلی مینگی پر اتر آیا تھا۔ اس کی پیش کش میں لالچ اور ہوس جھلک رہی تھی۔ شبانہ کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا اس سے بل کہ وہ کوئی سخت ایکشن لیتی، سوزو کی کار اس کے بالکل قریب آر

لی۔ اگلے ہی لمبے بشیر چٹا نے اس کا پلو چھوڑ دیا۔ ”یہاں کیل میں انک گیا تھا آپ کا پلو۔“ اس کے تاثرات ایک سر بدل گئے اور اس نے ڈھٹائی سے بات بنادی۔ شبانہ بری طرح سلگ گئی کچھ کہنا اپنی ہی رسوائی تھی۔ عین وقت پر ولی پہنچ گئے اور بات ختم ہو گئی۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں اس وقت؟“ وہ اسے وہاں دیکھ کر ٹھٹھک گئے اور شاید اس کے رنگ بدلتے چہرے سے بہت کچھ بھانپ بھی گئے۔

وہ کوئی بھی جواب دینے کے قابل نہ تھی کہ اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے انک رہے تھے۔

”آئیے بیٹھیں....“ انہوں نے فرنٹ ڈور کھول دیا اور وہ کسی معمول کی طرح فرنٹ سیٹ میں سما گئی۔ اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اندر ہی اندر شکستگی اور توڑ پھوڑ کا عمل ہو رہا تھا۔ ولی نے کن آنکھوں سے اس کی جھلملاتی آنکھوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی۔

”ہم کسی کی زبان نہیں روک سکتے نہ ہی کسی کے دیکھنے پر پابندی لگا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کے اعمال درست کر سکتے ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کا دوسروں پر اتنا بس نہیں چلتا جتنا کہ خود پر چلتا ہے۔ جہاں تک اسے خود پر اختیار ہوتا ہے وہاں سے وہ اپنا دائرہ کار خود متعین کر سکتا ہے۔“ اس کے دل کی تحریر کو کس آسانی سے پڑھ لیا تھا انہوں نے، بے اختیار اس کی آنکھوں سے ٹائپ آنسو ٹپکنے لگے۔ ایاز کے بعد اس نے اپنے آپ کو اپنی ذات کے گنبد میں قید کر لیا تھا مگر اس وقت بے اختیاری میں وہ کم زور پڑ گئی تھی۔

”ارے آپ رویوں رہی ہیں، کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟ میں تو ایک عام سی بات کر رہا تھا۔ پلیز آپ رویں نہیں مجھے معلوم ہے آپ کی پرابلم... بہت جلد آپ کو دوسرے گھر کا قبضہ مل جائے گا۔“ وہ اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

”بس پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔“ اس نے بات بنانے کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو پائی۔

☆☆☆

اے مزید اس گھر میں رتنا اور انہاں۔

”راشدہ آپا سے بات کریں، ہفتہ بھر پہلے ہی اوپر ہو گیا مگر ابھی تک ہم یہاں بیٹھے ہیں۔“ اس نے اصل واقعہ گول کر دیا بس صاعقہ سے جلد گھبرانے پر اصرار کرنے لگی۔

وہ کہہ رہی تھیں کہ ابھی چند روز اور لگیں گے۔ مکان مالک گھر پر پینٹ کروا رہا ہے۔“ صاعقہ اصل بات سے لاعلم تھیں اس لیے مطمئن تھیں۔

”مگر اب ہمارا ایکری منٹ یہاں ختم ہو چکا ہے میں ایسے بدلیمنٹ اور اوچھے لوگوں کا ایک منٹ کا احسان لینے کی روادار نہیں۔“ وہ کافی سختی سے بولی۔

”مگر اب اتنی جلدی کہاں جائیں“ صاعقہ فکر مند ہو گئیں۔

بے امنی کا احساس انہیں اندر ہی اندر گھائل کر رہا تھا۔ جوان بیٹی کا روگ دیکھنا نہ جاتا تھا اور اپنی عمر سے بڑھ کر قید نکالتی نواسی نازیہ کو دیکھ کر وہ حد درجہ فکر مند رہنے لگی تھیں۔ اب یہ ایک نیا ہی مسئلہ ہو گیا تھا۔

دل کی خواہش نے پھر زور پکڑا۔

”میں نے تو چاہا تھا لیکن“ انہوں نے کہنے کی کوشش کی۔ شبانہ بن کہے ہی ان کی بات سمجھ گئی اور فوراً ٹوک دیا۔

”ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے! اب خوشی کی ایک عمر ہوتی ہے اور اب نہ ہی وہ وقت رہا ہے اور نہ ہی اچھی لگنوں گی۔“ اس بار اس کے لہجے میں سختی نہ تھی بلکہ مایوسی تھی۔

”ایک دن تم بھی ضرور خوشیاں پاؤ گی۔“ صاعقہ نے اسے دل سے دعا دی۔

”کیا تھا اگر میری بات مان لیتی، اس کی زندگی بھی سنور جاتی۔“ وہ ہنستا سانس بھر کر سوچ کر یہ کہیں۔

راشدہ آپا کی دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور دو بیٹے بھی شادی شدہ تھے لیکن دونوں علیحدہ گھروں میں رہتے تھے۔ فیصل ان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جس کے لیے وہ نازیہ کی طلب گار تھیں مگر شبانہ کے روکھے رویے نے انہیں بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ صاعقہ سے بہنا پڑا اور محبت کی وجہ سے انہوں نے شبانہ کی کج خلقی

لو نظر انداز کر دیا تھا۔ امبولے میں گھر کا بندھن کھینچا گیا تھا ابھی وہاں کام مکمل ہونے میں کچھ دن باقی تھے اور شبانہ اس گھر میں رہنے کی روادار نہ تھی۔

”ایسا کرو تم لوگ چند روز کے لیے میرے گھر آ جاؤ، تمہارا سامان بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔“ ان کے خلوص میں کہیں بھی کمی نہ آئی تھی۔

شبانہ چپیں بہ چپیں ہونے لگی۔ وہ جتنا ان سے بچتا چاہ رہی تھی اتنا ہی زیر بار ہو رہی تھی۔

”ارے بھئی بے سوچنے کا وقت نہیں ہے عزت اسی میں ہے کہ راشدہ آپا کی بات مان لو۔ کل ہی وہ الٹی کھو پڑی منیبہ آئی تھی اور کافی بدتمیزی سے گھر خالی کرنے کا کہہ گئی ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ راشدہ آپا بڑی جتنی عورت ہیں آڑے وقت میں کام آتی ہیں ایک ہم ہی بے قدر رہے ہیں۔“ صاعقہ نے اسے درپردہ کچھ بتایا۔

مگر جو کچھ وہ چاہتی تھیں اس کے لیے وہ بھی راضی ہو ہی نہیں سکتی تھی، اس کی واحد خوشی اب صرف نازیہ تھی اور اسی میں اس کا سکون بھی تھا۔ کاشان بہت خیال رکھنے والا تھا۔ کچھ ہی دن پہلے اس نے نازیہ کو کافی اچھی شاپنگ کرائی تھی۔

”یہ صحیح نہیں ہے نازیہ! اسے کہو کہ اسے والد کو رشتہ لے کر بھیجے۔ میں نہیں چاہتی کوئی الٹی سیدی بات تم سے منسوب ہو کر سب میں پھیلے لوگ ہم پر انگلیاں اٹھائیں۔“ شبانہ اس کی خوشیوں کو اس سے چھیننا بھی نہیں چاہتی تھی مگر زمانے سے خائف تھی جو کسی کو بھی نہیں بخشا، جو ایک پل میں شفاف دامن کو داغ دار کر دیتا ہے۔

”ارے سوئیٹ امی! آپ کتنی بھولی ہیں، کاشان صحیح کہتا ہے کہ تمہاری مدد تو بالکل پرانی فلموں کی ہیروئن لگتی ہیں۔ مدھو بالا اور یتا کماری جیسی ہیں بالکل۔“ نازیہ اسے بتانے کے بعد ہل کر بیڑی۔ وہ لوگ راشدہ آپا کے گھر چلی آئیں اگرچہ وہ یہاں رہنے پر راضی نہ تھی مگر حالات کے آگے بے اختیار تھی۔ اپنی مرضی تو اس نے نازیہ کے لیے چلائی تھی مگر اکثر وہ اسے راشدہ آپا کی بات ماننی پڑ جاتی

دراصل وہ چاہتی تھی کہ راشدہ آپا سے سرخرو ہو جائے، وہ نازیہ کی اس خوشی میں دل سے شریک ہوں تاکہ جو رتی بھر بھی ملال ان کے دل میں ہے وہ جاتا رہے۔

”آپ نے خود ہی کہا تھا کہ گھر کا مسئلہ منٹ جائے تو پھر اس کے ڈیڈی کو بلا لیتا۔“ نازیہ نے یاد دلایا تو وہ اپنی یادداشت پر خود ہی حیران ہوئی۔ بہت سی باتیں وہ بھولنے لگی تھی اور اسے اپنے ذہن پر زور ڈال کر انہیں یاد کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو بہت سیدھی اور آسان سی بات بھی اسے بہت دیر میں سمجھ میں آتی تھی۔

”کس قدر بے اوسان ہوتی جا رہی ہو تم۔“ صاعقہ اس کا حال دیکھ کر کڑھتی رہیں مگر اسے اپنے حال کی پروا بھی کب رہی تھی اس نے اپنی ذات کے لیے خوشیوں کو خود پر حرام کر لیا تھا۔ اسے سمجھانا اور آمادہ کرنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی اسے سمجھانا اور آمادہ کرنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی جب کہ ایک ماں کے دل سے وہ یہ چاہتی تھیں کہ شائد بھی کسی مخلص ساتھی کے ساتھ ایک بار پھر اپنا گھر آباد کر لے۔ لیکن اس موضوع پر وہ ہمتے سے اکھڑ جاتی تھی۔

انہی دنوں راشدہ آپا کو زندگی کے سلسلے میں بہو کے پاس جانا پڑ گیا وہ بیٹے کے گھر دوڑی چلی گئیں۔ پیچھے کی انہیں فکر نہ رہی تھی کیوں کہ صاعقہ اور شائد گھر پر موجود تھیں۔ ان کے جانے سے سارا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا جیسے کہ ایک نہیں کئی افراد گھر سے گئے ہوں۔

شاہمی اسکول سے سیدھا یہیں آ جاتا تھا۔ رافیعہ اس کے ساتھ کھیل میں مگن ہو جاتی تھیں اور نازیہ تو اپنے خوابوں کے حصار میں کاشان کے سنگ بہت مگن اور سرور سی تھی۔ شائد کے ساتھ دینے کی وجہ سے وہ اتنی دلیری سے آگے بڑھ بھی گئی تھی اور اب تو اسے کاشان کی محبت کا بہت سہارا تھا۔ درمیان میں کہیں ظالم سماج نہ آیا تھا گھر کی دیکھ رکھ صاعقہ نے از خود ہی اپنے ذمے لے لی تھی اور شائد کو پرانے خوابوں کی اجمد دیکھنے کی فرصت مل گئی تھی۔ اب وہ ہوتی اور اس کے گزرے ہوئے دن... وہ خوش گوار

تھی اور بھی صاعقہ پر کسی بابت پر مل کر پڑتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہی کی مدد لیتی پڑ جاتی تھی۔ جب کہ وہ ایسا نہ چاہتی تھی۔ اب بھی وہ راشدہ آپا کے سوالات اور جرح سے بچ نہ سکی۔

”پھر تم نے کیا سوچا؟ فیصل کے لیے تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔“ وہ اس پر زور دے رہی تھیں اپنی منوانے کے لیے۔ مگر وہ نازیہ کی خوشیوں میں ریکاوٹ نہیں ڈال سکتی تھی۔ اولاد کے لیے مضبوط چٹان بن گئی تھی۔

”یہ بہت مشکل ہے راشدہ آپا! میں نے تو چاہا تھا مگر اس سے پہلے ہی اس کی سہیلی کے بھائی کا رشتہ آ گیا۔ لڑکا اچھا ہے اور میں وہاں ہاں کر چکی ہوں۔“ انکار کا یارا تو نہ تھا مگر دل کڑا کر کے بے مروتی سے انہیں جواب دے دیا۔ وہ ہکا بکارہ گئیں۔

”انتہا بڑا فیصلہ آپ ہی کر لیا۔... صاعقہ اور میں کسی گنتی میں ہی نہیں۔“ وہ اس پر خفا ہونے لگیں۔

”اب یہ تو نصیبوں کا کھیل ہوتا ہے راشدہ آپا! جہاں مقدر ہوتا ہے وہیں جوڑ ملتا ہے۔“ شائد نے خجالت کے باوجود دلیری سے جواب دیا۔

”بی بی! مقدر سونے کے نا کے کی طرح ہوتا ہے ذرا ہاتھ بہکا اور زندگی کی ڈور الجھی، یہ کوئی دانش مندی نہیں کی تم نے۔ زندگی بہت مشکل ہوتی ہے اس کا اندازہ تو ہو گیا ہو گا تمہیں۔“ انہوں نے اسے کھلے لفظوں میں بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی ان کی باتوں میں ان کی بزرگی اور جبر کے بی مہک تھے مگر وہ نازیہ پر اپنی مرضی مسلط کر کے اس کی آنکھوں سے خواب نوچنے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔ صاعقہ اور راشدہ نے ٹھک ہار کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

راشدہ آپا کے گھر میں بھی اسے سکون نہ ملا۔ جانے کیسی بے چینی تھی اسے اپنا دل حقیقی خوش سے عاری محسوس ہو رہا تھا۔ وقت سست روی سے گزر رہا تھا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے میں ہی کئی بار اس کا دل بھی ڈوب ڈوب جاتا، شاید وہ نازیہ کی طرف سے فکر مند تھی۔

”آخر کاشان رشتہ لے کر کیوں نہیں بھیج رہا اپنے ڈیڈی کو؟“ وہ نازیہ پر جھنجھلائے لگی۔

نے اس کی حوالے گھری چپایاں کر دیں۔
وہ اس کے ساتھ اس کے گھر تک چلی آئی۔
لاکھول کر اندر داخل ہوئی تو ہر طرف ابتری نظر آئی
بچن بھی اونداھا پڑا تھا۔ لاؤنج میں فلور کشن اوپر تلے
پڑے ہوئے تھے۔ سینئر ٹیبل پر پڑی چائے کی خالی
چپالیاں۔ پرانے اخبار اور شاہی کی جرسیاں سب
کچھ خلط ملط تھا، ہر جگہ ریکارڈ کر توجہ مانگ رہی تھی۔
”عورت کے بغیر گھر کیسا اجڑ جاتا ہے، ویران
ہو جاتا ہے قبرستان کی طرح۔“ اس نے دل میں سوچا۔
”مرد کے بغیر؟“ اس کے اندر سے کہیں سوال ابھرا۔
”مرد کے بغیر تو زندگی سونی ہو جاتی ہے، سب
کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔“ اپنے دل کا حال تو اسے
معلوم ہی تھا اس لیے اس بے درد جواب پر وہ ٹنڈال
سی ہو گئی۔

”دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم
ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔“ کہیں
سے کسی نے اس کے ذہن پر دستک دے کر دروازہ
کھولنے کی کوشش کی اپنی کیفیت سے گھبرا کر وہ
شاہی کو ڈھونڈنے لگی، شاہی اپنی لیزر رگن جانے
کس کونے کھدے سے ڈھونڈ کر لے آیا اس کے
دوسرے ہاتھ میں ایک پلیٹ بھی تھی۔

”آنٹی! یہ دیکھیں، آج پاپا سے ٹشٹے میں
آلیٹ جمل گیا۔ پاپا کو تو کچھ آتا ہی نہیں بھی کھانا
جلاتے ہیں اور بھی اپنا ہاتھ۔ اگر میری ماما ہوتیں تو
وہ مجھے مزے دار چاکلیٹ کیک بنا کر کھلاتیں۔“

دل کی ایک معصوم سی خواہش بے ساختہ اس کے
لیوں پر آئی تھی، ذرا سے بچے کے دل میں بھی حسرتیں
تھیں۔ وہ اسے ہم دردی سے دیکھنے لگی۔ اپنا دکھ چھوٹا
اور اس کا دکھ بڑا دکھائی دیا اس نے آگے بڑھ کر اس
کے ننھے سے ہاتھ تھام کر چوسے۔ اسی وقت کچھ کھٹکا
ہوا۔ وہ ڈر کر بچی تو جہاں کی تہاں رہ گئی۔ وہاں ولی
کھڑے تھے اور کم و بیش ان کا بھی یہی حال تھا۔ پھلکتی
”آپ یہاں؟“ وہ ان کی آنکھوں سے پھلکتی
ان جانی سی مسرت آمیز چمک سے خائف ہو گئی۔

دن جب وہ اپنا زکے سنگ ہواؤں میں اڑتی تھی۔ اس
کے ساتھ میں کس قدر تحفظ اور محبت تھی مگر پھر زندگی کی
شاہراہ پر اسے اکیلا ہی چھوڑ گیا ساتھ ہی سارا اطمینان
اور فراغت بھی اپنے سنگ لے گیا۔ وعدے....
امیدیں سب ادھورے رہ گئے یہاں تک کہ اس کی
ذات کا سفر بھی ادھورہ رہ گیا۔ سوچتے سوچتے تشنہ
کامی کا احساس اس قدر بڑھا کہ بے اختیار اس کے
آنسو ڈھلک آئے، کسی کا سایہ سامحوس ہوا دیکھا تو
شاہی کھڑا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا اس کے
پھولے پھولے گالوں پر بھی آنسوؤں کے نشانات
تھے اور گلابی ہونٹ دائرے میں سٹھے ہوئے تھے۔ وہ
بھی اکیلے پن کا سایا کاٹ رہا تھا۔ ماں کی جدائی کا
دکھ سہہ رہا تھا اس کبھی سی عمر میں وہ بھی تو دمگی تھا۔
اسے بے اختیار گول مٹول سے شاہی پر پیار آ گیا۔
”ارے شاہی! تم رورہے ہو؟“ اس نے اس
کا ہاتھ تھام کر خود سے قریب کر لیا۔

”آنٹی... آپ بھی تو رورہی ہیں کیا آپ کا
بھی کھلونا کم ہو گیا۔“ اس کی معصومانہ بات نے اس
کے دل پر ضرب ہی لگائی۔ وہ تو اپنا سب کچھ کھو چکی تھی
اس کا سب سے قیمتی ہیرا کم ہو گیا تھا۔ اب تو کچھ بھی
نہ رہا تھا اس کے پاس صرف چند بچی بچی یادیں ہی
اس کا اثاثہ تھیں۔

”آپ کی کیا چیز کم ہو گئی؟“ ایک دل شکستہ
مسکراہٹ کے ساتھ اس نے شاہی کا حوصلہ بڑھایا۔
”میری لیزر رگن وہاں گھر پر ہی رہ گئی۔ اب
میں کس سے کھیلوں؟“ وہ منہ بسور کر بولا۔
”تو آپ رافیعہ کے ساتھ کھیل لوں۔“ وہ اسے
سمجھانے لگی۔

”رافیعہ گندی ہے میری بات نہیں مانتی، میں
اپنی لیزر رگن سے کھیلوں گا، رینجرز بنوں گا اور ڈھش
ڈھش کروں گا۔“ آج رافیعہ سے اس کی لڑائی ہو گئی
تھی اس لیے وہ اداس ہو رہا تھا۔

”جاؤ یعنی اس کے ساتھ جا کر اس کی لیزر رگن
لے آؤ ورنہ یہ ایسے ہی تنگ کرتا رہے گا۔“ صاعقہ

درا میں اپنا واسطہ بھول گیا تھا اس لیے پلٹ کر آ گیا۔“ وہ صفائی دینے لگے۔

”شاہی کو لیئر رکن لیتی تھی اس لیے میں اس کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“ اس نے بھی نوراً وضاحت دی مبادا کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔

”آپ ادھر بیٹھ جائیں آرام سے۔“ گھر کی بے ترتیبی پر شرم سار ہوتے ہوئے انہوں نے جلدی جلدی صوفے سے فالتو سامان ہٹایا۔

”نہیں! آپ تکلیف نہ کریں۔ میں تو ابھی واپس گھر ہی جا رہی ہوں کیوں کہ نازیہ کی منگنی وغیرہ کی تیاری بھی کرنی ہے، اب تو وہ میرے قد برابر ہو گئی ہے۔“ ابھی دور دور تک منگنی کا پتا نہ تھا مگر اس نے قصداً انہیں بتایا تھا اور ان کی آنکھوں کے دیپ بجھتے دیکھ کر اسے افسوس تو ہوا تھا لیکن وہ اب خود کو صرف نازیہ اور رافیعہ کی ماں ہی سمجھتی تھی۔

شاہی نہ جانے کس کونے میں گھس گیا تھا، اسے دلی کے سامنے مزید کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔

”راشدہ آپا تو شاید مزید کچھ دن میں آئیں گی اگر آپ کو کوئی بھی کام ہو مجھے کہہ دیجئے گا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں نا۔“ ان کے اخلاص پر اسے مطلب پرستی کا شبہ ہونے لگتا تھا۔

”ساری پریشانی گھر ہی کی ہے اب تو اتنے دن ہو گئے۔“ نازیہ کا رشہ اسی لیے التوا میں پڑا ہوا تھا اس لیے ولی کے استفسار پر اسے خیال آیا کہ ولی سے اس کا تذکرہ کر دے۔

”یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے، اگر آپ سمجھیں تو! راشدہ آپا آجائیں تو پھر آپ چلی جائیے گا اپنے گھر۔“ ان کی گول مول سی بات پر شبانہ کھرا گئی۔

وہ جو کچھ بھی کہنا چاہا رہے تھے وہ اسے سننا نہیں چاہتی تھی حتیٰ کہ ننھے شاہی کی بے چارگی اور دکھ دیکھ کر بھی اس کا دل موم نہ ہوا۔

اسے نازیہ کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ کا شان سے بے دھڑک ملتی تھی اور یہی بات اسے خوف زدہ کر رہی تھی کوئی بھی جذباتی لمحہ اس کی ساری زندگی کو تاریک

کر سکتا تھا اس لیے جھانے کا اس پر ولی اثر نہ ہو رہا تھا۔ گھر کا معاملہ التوا میں پڑا ہوا تھا۔ ادھر اسے راشدہ آپا کی طرف سے بھی دھڑکا تھا۔ وہ فیصل کے لیے اس پر دباؤ ڈال سکتی تھیں مگر وہ نازیہ کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ خواب ٹوٹنے سے اس کے دل کو گھٹس پینچے اسی لیے راشدہ آپا کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس نے کا شان کو بلا کر اس سے رازداری سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

راشدہ آپا اپنی بہو کو ساتھ لے کر ہی پلٹیں کیوں کہ وہ اسے وہاں اکیلے نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ گھر میں چہل پہل ہو گئی نازیہ اور رافیعہ کے ہاتھ ایک کھلونا آگیا بڑے دنوں بعد اسے ایسا لگا کہ جیسے ہر سمت نازیہ بھڑکتی ہے۔ شاید دل جب کسی ایک فیصلے پر پہنچ جاتا ہے تو ایسا ہی اطمینان وجود کے اندر راتا ہے۔

”نازیہ تو بہت پیاری ہے امی! اسے ہم نہیں چھوڑیں گے اپنے فیصل کے ساتھ اس کی جوڑی خوب سجے گی۔“ راشدہ آپا کی بہو بیٹیاں تو نازیہ کی موخنی صورت پر لٹ ہو گئی تھیں۔ پھر وہی ہوا جس کی شبانہ کو توقع تھی۔

”ہاں بھئی! اب تو زیادہ ووٹ ہمارے ہو گئے ہیں اب نازیہ کو ہمارا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“ راشدہ آپا نے اس سے تقاضا کر دیا۔

شبانہ نے محل بھری مسکراہٹ سے ان کی بات سنی۔ عجیب بھید بھری مسکراہٹ تھی اس کی۔

”نازیہ تو آپ ہی کی ہے راشدہ آپا۔ مجھے کب انکار ہے۔“ اس کے مثبت جواب پر نازیہ ہکا بکار ہو گئی؟ اب تک تو وہ اس کے لیے راستہ ہم وار کر آئی تھی مگر اب اچانک راشدہ آپا کے دباؤ میں آ کر اور ان کی محبت میں اس نے فیصل کے لیے ہامی بھری تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے اتر آئے۔ ان گنت، لالچاں! وہ بے اختیار بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی کیوں کہ وہ کسی برعالم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس کے دل کی دنیا اجازت کر شبانہ مطمئن تھی۔ مگر

نازیہ ان ذرا سے دنوں میں ہی سرسوں کا چھول بن گئی۔ اس نے شبانہ کی منت بھی کر لی اور خوشامد بھی مگر شبانہ تو جیسے پتھر کی بن گئی تھی۔ اس کے آنسوؤں نے اس پر اثر نہ کیا وہ شبانہ سے بدن ہو گئی جس نے اس کی محبت کا مذاق اڑایا تھا۔

بھی اسے لگتا جیسے راشدہ آپا نے اسے کچھ کھول کر بلایا ہے یا پھر صاعقہ نے اپنی ممتا کا واسطہ دے کر اسے مجبور کر دیا ہے۔

شبانہ نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔ اس روز جب اس نے خاموشی سے کاشان سے بات کرنے کے لیے گھر بلایا تو منصوبے کے تحت اس نے نازیہ رافیہ کو شاہی کے ساتھ اس کے گھر روانہ کر دیا اور صاعقہ اپنے کمرے میں گہری نیند سوتی رہیں، کسی کو کانوں کا خبر نہ ہوئی وہ کھل کر کاشان سے بات کرنا چاہتی تھی کیوں کہ اسے نازیہ کا مستقبل بہت عزیز تھا اور کاشان نے اب تک اپنے والد کو نہیں بھیجا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کب نازیہ سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ توقع کے مطابق وہ فوراً ہی چلا آیا۔ ”خیریت! آپ نے مجھے کیسے یاد کیا اور یہ نازیہ وغیرہ کہاں ہیں؟“ اس نے فوراً بتلائی نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ اس کی بے تابی پر وہ مسکرا دی۔

”اصل کام تو مجھے ہے آج تم سے، اسی لیے میں نے تمہیں اکیلے میں بلایا ہے، نازیہ اپنی سسکی کے گھر گئی ہوئی ہے۔“ اسے بیٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے تمہید باندھی۔

”آپ کی مسکراہٹ تو مونالیزا جیسی ہے۔“ اسے مسکراتا دیکھ کر اس نے حسب عادت اسے سراہا۔

مگر اس کے مذاق پر وہ آج سنجیدہ رہی۔

”دیکھو! نازیہ تو ابھی نادان ہے اور چھوٹی بھی ہے۔“ اس نے بات کا آغاز کیا۔

”بالکل صحیح! یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ نازیہ ابھی چھوٹی اور ناسمجھ ہے اور میرے لیول سے تو کافی چھوٹی ہے وہ۔ اچھا ہوا کہ آپ نے خود ہی یہ ذکر چھڑ دیا، دراصل مجھے یہ کہنا تھا کہ....“

”ارے پیسوں سے منہ بھر دوں گا۔“ جاتے جاتے بھی وہ اس کی مجبوریوں کی قیت لگا گیا تھا۔ کئی روز تک تو شبانہ گم سم رہی۔ یہ سب اس نے اپنے ہاتھوں کیا تھا بغیر جانے پر تھے اس پر اعتماد کیا اور نازیہ کو بھی نہ روکا۔ شاید اس کی کمزوری جیسے گوجا تھا اس نے۔

ایک بہت بڑی تباہی سے وہ بچ گئی تھی مگر بے لمانی کا احساس ہوا ہو گیا۔

نامعتبر ہونے کا دیکھ کر ہی طرح رلا گیا۔ وہ جو خود کو بہت مضبوط سمجھ رہی تھی اس کی حقیقت دنیا کی نظر میں ایک شکنہ کی سی تھی۔

نازیہ کے تو صرف خواب ٹوٹے تھے مگر اس کا حوصلہ اور اعتماد ہی طرح ٹوٹا تھا۔

وہ نازیہ کی ماں ہی نہیں ایک عورت بھی تھی جس کی پاکیزگی، عظمت اور سوانیت ہی اس کا غرور ہوئی ہے اس لیے اس نے راشدہ آپا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ فیصل اور نازیہ کے رشتے کے ساتھ ساتھ اس نے ولی کے لیے بھی ہامی بھری۔ کیوں کہ اس کے تار تار دل کو ایک رفوگر کی اشد ضرورت تھی۔

دشت بے اماں میں ہر طرف بڑھتے ہوئے تاریک سائے اب اسے ڈرانے لگے تھے۔ اس نے آخری بار ایاز کے لیے آنسو بہا کر ان آنسوؤں کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر ہی نہیں اتار لیا۔

☆☆